رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

سیاسی جرائم نمبر

سوسائٹی

قیمت=/50روپے

نئے اُفق قیمت=/50روپے شمارہ مارچ ۲۰۱۵ رجسٹریشن نمبر - ایس ایس ۰

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبع ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات سنے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

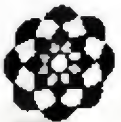
مشتاق احمد قریشی

ناموسِ رسالت ﷺ پر حملے کی ایک اور مذموم کوشش؟

گزشتہ دنوں ناموسِ رسالت ﷺ پر رکیک حملوں کے خلاف ہونے والی احتجاجی ریلیوں، جلوس و جلسوں میں تمام مسلمانوں کے جذبات بے قابو ہو گئے تھے اور ہر اہلِ ایمان نے مقدور بھر اپنے غم و غصے کا اپنے طور پر اظہار کیا تھا جس میں مغربی دنیا خصوصاً یورپی یونین، اسکینڈ نیوین ممالک کے خلاف اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ محسنِ انسانیت نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالی خاکے شائع کر کے عالمی سطح پر مسلمان عالم کی شدید دل آزاری کی اور ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی جس میں وہ سو فی صد کامیاب رہے۔ دراصل یہ دشمنانِ ایمان اور دشمنانِ اسلام کا براہ راست عاشقانِ رسالت مآب پر توہین آمیز حملہ ہے اگر اس حملے کی وجوہات پر غور کیا جائے تو اس کی کڑیاں اُن ہی سازشی عناصر سے جا ملیں گی جنہوں نے ناروے اور یورپی ممالک کے اخبارات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاکے شائع کیے تھے۔ درحقیقت اس طرح سازشوں نے ایک بار پھر سر عام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دردناک عظیم گستاخی کا ارتکاب بھی کیا ہے۔ تمام دنیا کی غیر مسلم قوتیں چاہے وہ ہندو ہوں عیسائی ہوں کہ یہودی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں کہ مسلمانوں کو کس طرح بے چین و بے آرام کیا جائے کہ وہ سراپا احتجاج بن کر تنگ آمد بجنگ آمد کسی طرح سے دہشت گردی پر اتر آئیں یقیناً یہ اُن کا خیال درست ہے کہ مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر والہانہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں کہ اُن کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینا تو بہت معمولی بات ہے۔

مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی سازش امریکہ کے یہودیوں کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے یہودی جو روزِ اول سے اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر کمربستہ ہیں اب نئے رنگ ڈھنگ سے میدانِ عمل میں اُترے ہیں۔ اب وہ پس پردہ رہ کر امریکی عیسائیوں اور دیگر اقوام کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اپنی اس مہم پر وہ بے دریغ سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ امریکی تحقیقاتی ادارے کی رپورٹس کے مطابق 9/11 کا سانحہ بھی اُن کا ہی پیدا کردہ تھا۔ اس کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا جواز جو پیدا کرنا تھا۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر خالص اسلامی ریاست افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہودیوں کے متعلق تو اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے یہ قوم تو ہمیشہ سے اپنے نبیوں کا قتل کرتی رہی ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں آنے والے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ

السلام تک کو انہوں نے اپنے طور پر تو مار ہی ڈالا ہے۔ یہ قومِ ابلیس ہے جیسا کہ ابلیس نے حقِ رسالت اور احترامِ نبوت کے آگے حکمِ الٰہی کے باوجود سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہیں سے حضرات انبیاء السلام سے عداوت و دشمنی کا سلسلہ چلا آ رہا ہے جو اب تک جاری ہے۔ شعائرُاللہ کی توہین و تضحیک کا سلسلہ جاری ہے۔ حالیہ دنوں میں اشتعال انگیز کارٹون کی اشاعت کے پیچھے بھی توہینِ انبیاء کا نظریہ ہی کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں یہودی منصوبہ سازوں کو متعصب عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ایک امریکی رسالے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق گزشتہ دنوں ڈنمارک کے اخبار جیلنڈز پوسٹن کا ثقافتی مدیر فیلمنگ روز جس نے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے وہ اشتعال انگیز کارٹون شائع کیے تھے گزشتہ سال اُسے امریکہ کے اسلام دشمن مہم چلانے والی تنظیم کے سرغنہ اور یہودی مصنف ڈینیل پائپس نے خصوصی دعوت دے کر امریکہ مدعو کیا تھا یہ وہی ڈینیل پائپس ہے جس نے اسلام دشمنی پر مبنی متعدد کتب لکھی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف کھلے عام زہر اگلتا ہے۔ اس ہی شیطانی ذہن کے مالک نے بڑی کثیر رقم خرچ کر کے یہ اشتعال انگیز کارٹون بنوائے تھے تا کہ مسلمانوں کی دل آزاری ہو سکے اور اس سلسلے میں اُس نے ایک کارٹون بنانے کا مقابلہ بھی منعقد کرایا تھا۔ جس میں پہلے مرحلے میں چالیس افراد نے اپنے نام لکھوائے تھے لیکن جب انہیں اصل منصوبے سے آگاہ کیا گیا تو پھر مقابلے کے میدان میں صرف بارہ تیرہ ہی کارٹون ساز رہ گئے جنہوں نے مختلف کارٹون بنائے اور ان میں سے منتخب کارٹون ڈنمارک کے اخبار نے شائع کر دیے۔ اس طرح یہودی منصوبہ کامیاب ہو گیا مسلمانوں کے جذبات بھڑک اُٹھے اور انہوں نے عالمی سطح پر اپنی ناراضگی و اشتعال کا برملا اظہار کیا۔ جس سے ڈنمارک کا اربوں ڈالر کا نقصان بھی ہوا بیشتر اسلامی ممالک نے ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا اس طرح منصوبہ ساز یہودی تنظیم نے دوہرا فائدہ حاصل کیا مسلمانوں کو مشتعل کر کے اُن کے اپنے ممالک میں اربوں کا نقصان پہنچایا دوسری طرف اپنے حلیف اور مذہبی حریف عیسائیوں کو معاشی نقصان پہنچا کر اپنی اہمیت واضح کر دی اور یہودی مصنوعات کے لیے مارکیٹ پیدا کر لی۔ دشمنِ اسلام ہمیشہ یہ بھول جاتا ہے کہ مسلمان اپنے آقا اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت پر ہر قسم کی آنچ آنے سے پہلے اپنی جانیں نذر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہر نابکار ابلیسی قوت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کے مانند جم جاتے ہیں ایک ہو جاتے ہیں تمام مذہبی و مسلکی اختلافات بھول جاتے ہیں ایک اللہ اور آخری رسول کی ایک امت بن کر سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں انشاء اللہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا اور دشمن ایمان دشمن اسلام کو منہ کی کھانا پڑے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔



گفتگو

عمران احمد

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کی مثال باہم محبت کرنے آپس میں رحم دل ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ جب اس کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بھی بیداری اور بخار میں اس کے ساتھ شریک ہونے کو پکار اٹھاہے۔'' (متفق علیہ)

عزیزانِ محترم ..... سلامت باشد!

مارچ کا نئے افق حاضرِ مطالعہ ہے تمام اہلِ وطن کو یوم قرارداد پاکستان مبارک ہو، وہ قرارداد پاکستان جس کی ہر دور میں ہم نے دھجیاں بکھیریں جس پر ہم نے کبھی عمل ہی نہیں کیا لگتا ہے نہ اس پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں اگر ہم نے اس قرارداد پر عمل کیا ہوتا یا اس کو دل سے قبول کیا ہوتا تو آج ملک کے یہ حالات نہ ہوتے یوں ہم ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ کر دشمن پر الزام نہ دھرتے بہر حال اس پر بات بہت لمبی ہوسکتی ہے لیکن دل اتنا زخمی ہے کہ بس..... سو آئیں نئے افق کی بات کریں، اس ماہ کا پرچہ سیاسی کرائم یا جرائم نمبر ہے ویسے آج کل جو جتنا بڑا سیاست دان ہے وہ اتنا ہی بڑا مجرم ہے، ہم نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر تحاریر جمع کرکے آپ قارئین تک پہنچائیں اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس بارے میں اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ گزشتہ ماہ غلطی سے محترم غلام میراں کے ناول یارب کے پہلے صفحے پر ''آخری حصہ'' تحریر ہوگیا تھا یہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا اس شمارے میں اس کی تیسری قسط شامل ہے آئندہ ماہ اس کی آخری قسط ہوگی۔ اب آیئے اپنے محبت ناموں کی طرف۔

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس۔ السلام علیکم!

نہ کٹ مروں جب تک خواجہ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

فرانس کے گستاخ میگزین نے جوتے کھانے کے بعد بھی گزشتہ دنوں گستاخانہ خاکے پھر سے شائع کردیے۔ جب اس کے دفتر پر حملے کے نتیجے میں ایڈیٹر سمیت 15 سے زائد افراد ہلاک ہوئے تو گویا کہرام مچ گیا۔ وہ اس لیے کیونکہ مرنے والے مسلمان نہیں تھے۔ مسلمانوں کا لہو تو ہر روز پانی کی طرح بہتا ہے اور یہ امن کے نام نہاد علمبردار تب نہیں بولتے فرانس کے صدر کی قیادت میں اس واقعہ کے خلاف ملین مارچ کیا گیا جس میں عالم کفر کے تقریباً ہر فرعون نے شرکت کی اور واویلا مچایا کہ یہ کھلم کھلا دہشت گردی ہے۔ اہل اسلام کا سوال ہے کہ کیا ہمارے

نبی محترم کی توہین کرنا، دہشت گردی نہیں۔ ہمیں دہشت گرد کہنے والو سن لو، ہم اس دین کے پیروکار ہیں جو ہمیں تمام انبیا کرام کی عزت واحترام کرنے کی تعلیم دیتا ہے ہمارے دلوں میں کسی ایک بھی پیغمبر کے بارے میں ذرہ برابر بھی بغض نہیں۔ تم اس اسلام کے ماننے والوں کو دہشت گرد کہتے ہو جو حضرت عیسیٰ کا نام لیتے ہوئے علیہ السلام پڑھتے ہیں جو انبیا پر درود وسلام بھیجتے ہیں دہشت گرد وہ ہوتا ہے جو کس کے مذہبی ومعاشی نظام میں اپنے بغض وعناد کے دھماکے کرے اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، ہمیشہ تم نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین کے ناپاک منصوبے بنائے اور ان پر عمل کیا۔ تاریخ چیخ چیخ کر بتائے گی کہ آج تک اس دھرتی پر اسلام کے ماننے والوں نے کسی بھی پیغمبر کی توہین کرنا تو دور کی بات اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا ہے تم ہمارے دین کی عصمت پر ڈاکہ ڈال کر ہم سے یہ توقع رکھتے ہو کہ ہم خاموش تماشائی بنے رہیں تم ہمارے نبی اکرم کا مذاق اڑا کر (نعوذ باللہ) ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہم آنکھیں بند کرلیں تم ہماری عزیز از جان ہستی کی عفت پر فقرے اچھال کر ہمیں صبر وتحمل کی تلقین کرتے ہو۔ تو پھر یہ بات جان لو، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی اور اپنے گھناؤنے آزادی اظہار رائے جیسے نظریات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ وقت دور نہیں جب امت مسلمہ کے ہاتھ تمہارے گریبانوں سے ہوتے ہوئے تمہارے ایوانوں تک پہنچ جائیں گے نبی اکرم ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنا اگر دہشت گردی ہے تو مسلمان بڑے شوق سے یہ دہشت گردی کرنے کو تیار ہیں۔ دنیا میں تم سے بڑا کوئی دہشت گرد نہیں جس نے عالم اسلام کی کسی چیز کو بھی نہیں بخشا۔ ہماری معیشت سے لے کر سیاست ہماری آزادی، ہمارا مذہب ہمارے معصوم بچے ہماری خواتین ہماری نوجوان نسل تم نے ان سب کو اپنے غلیظ عزائم کے ذریعے نشانہ بنا رکھا ہے اور پھر جب مظلومیت کی اس راکھ میں سے کوئی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو تم دہشت گردی کا راگ الاپتے ہوئے چیخ و پکار شروع کر دیتے ہو اے اہل مغرب، امن چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے امت مسلمہ سے ناانصافیاں بند کر دو اور جو ناانصافیاں کر چکے ہو ان کا ازالہ کرو اسلام کو ایک حقیقی طاقت سمجھتے ہوئے کھلے دل سے تسلیم کرو، تو جواباً عالم اسلام تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ زمین امن وآشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔ بصورت دیگر

اسلام کو قدرت نے اتنی لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اب بڑھتے ہیں پرچے کی جانب، عمران بھیا کیسے احوال ہیں۔ امید برحق ہے کہ ایڈیٹری کی پوشاک زیب تن کر کے سیاسی جرائم نمبر کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ ان شاء اللہ یہ خاص نمبر کامیابیوں کی نئی نوید لے کر آئے گا۔ فروری کا شمارہ دھواں دھار بارش کے دوران ملا۔ واللہ یہ بات تسلیم نہ کرنا بڑی کم ظرفی ہوگی کہ سرورق کے معاملے میں نئے افق بڑی تیزی سے معیار

کی بلندیوں پر جا رہا ہے۔ اب ہمیں تعریف کے لیے الفاظ اس طرح ڈھونڈنا پڑتے ہیں جیسے پچھلے دنوں پیٹرول ڈھونڈنا پڑا تھا اللہ اللہ، شہر کے ہر پیٹرول پمپ پر گویا محفل پیٹرول منعقد تھی الیکشن کے دنوں میں ہمارے ڈرائنگ روم میں سارا سارا دن بیٹھے رہنے والا ایم این اے بحران کے پہلے دن ہی پہلی دستیاب فلائٹ سے اڑان بھر کر لندن پہنچ گیا اور آج تک وہاں کسی نہایت اہم قومی مسئلے پر ملکہ الزبتھ کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف ہے۔ (ہاہاہا) اے رب العالمین ان نام نہاد عوامی نمائندوں کو گردن سے دبوچ کر اپنے پاس بلالے عمران بھائی آپ کی گفتگو سے میں بالکل متفق ہوں ویلنٹائن ڈے کی صبح کو اٹھ کر اگر ہر نوجوان ایک بار یہ تصور کرلے کہ آج اس کی بہن بھی کسی کے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانے جارہی ہے تو امید ہے کہ یہ لعنت ختم ہوجائے گی۔ اس بار بھی کم ساتھی محفل میں حاضر ہوئے۔ ادیب سمیع صاحب، آپ ہمارے لیے نہایت محترم ہیں۔ ہم آپ کے جذبات سمجھتے ہیں لیکن بڑے احترام سے عرض کروں گا کہ کوشش کیا کریں۔ تبصرہ حد سے زیادہ طویل نہ ہو آپ جذبات میں بہہ کر اختصار کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں اس طرح دوسرے ساتھیوں کی حق تلفی ہوتی ہے اس کے علاوہ ماضی کی یادوں اور افسانوں کی بجائے اگر تبصرہ نئے افق کی کہانیوں اور پالیسی پر ہو تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔ ریحانہ سعیدہ، تم اگر تبصرہ نہ ہی کرتی تو کیا تھا ہمارا بھی کرسی صدارت کا شوق پورا ہوجاتا۔ بہرحال اچھا لکھا تم نے دعاؤں میں یاد رکھا کرو، مشتاق احمد قریشی صاحب نے بیش قیمت معلومات سے نوازا۔ یقین کریں صرف دستک کی وجہ سے میں نے اس دفعہ نئے افق کو جلد کروا کر رکھ لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہمارے درمیان موجودگی کسی نعمت سے کم نہیں۔ اگر کوئی سمجھے تو! کہانیوں کی بات کی جائے تو ''یارب'' کا آخری حصہ متاثر کرنے میں کامیاب رہا دیگر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سلسلے وار ناول قلندر ذات جمود کا شکار ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ امجد جاوید صاحب کوئی خاص تبدیلی نہیں لے کر آسکے۔ دوسری طرف جگت سنگھ مسلسل مثبت تبدیلیوں کی طرف گامزن ہے جبکہ اکثر تاریخی ناولوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ مصنف مرحوم کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ اب آتے ہیں خوشبوئے سخن کی طرف عمران بھیا ایمان کی بات ہے اس دفعہ اپنی غزل دیکھ کر اتنی ہنسی آئی کہ افغانستان کے ہاتھوں روسی فوج کی درگت پر بھی نہیں آئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ عمر اسرار بھائی نے حد ہی کردی۔ ڈیڑھ سال قبل نئے افق میں شائع ہونے والی میری غزل دوبارہ اٹھا کر چھاپ دی وہ بھی کمپوزنگ کی بے شمار غلطیوں کے ساتھ جبکہ تین چار نئی غزلیں ارسال کرچکا ہوں ان کا کوئی نام ونشان نہیں مل سکا۔ اب خدا ہی جانے اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے جسے ہماری ناقص عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بہتری کی ضرورت ہے۔ خیر اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ نئے افق یونہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے اور اللہ تمام مسلمان بھائی بہنوں کی مشکلات اپنی رحمت سے ختم

کرے، آمین۔

مہر پرویز احمد...... میاں چنوں۔ سلام مسنون گفتگو میں حاضر ہوں خوش آمدید کا منتظر ہوں۔ سرورق لا جواب ہے اتنا خوب صورت منظر تو صرف خوابوں میں دیکھا جا سکتا ہے اتنے خوب صورت گھنے جنگل میں تنہا یہ لڑکی کیا کر رہی ہے اس کو ڈر نہیں لگتا۔ دستک میں مفکرانہ تحریر پڑھ کر حب الوطنی اور ایمان تازہ ہو گیا آخری حصہ غلام میراں کا پڑھا آخری لائن تک پتا نہیں چلا طٰہٰ کو کس نے معاف کیا امجد جاوید کی تحریر حب الوطنی کی منہ بولتی تصویر ہے کاش عملی طور پر بھی ایسے ہی جاں نثار لوگ وطن عزیز کی باگ ڈور سنبھالیں۔ سلیم اختر کی نیا جنم لا زوال تحریر ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مشرقی عورت کی قربانی کا کیا کہنا اور مشرقی مرد کے ظلم و ستم کو بھی مات دینے کا کیا کہنا۔ طاہرہ جبیں تارا کی تحریر ہوس زدہ حاسد لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ خلیل جبار کی ندامت کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں عارف رمضان جتوئی انتقام کے لہو میں ڈوبی تحریر لائے۔ ریاض بٹ کوہ نور خوب تلاش کرتے ہیں۔ کاش دو صفحات اشعار کے بھی ہوتے مجھ جیسے بہت سے لوگ نئے افق میں شمولیت کا شکار ہو جاتے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ فروری کا شمارہ ایک سرد اور خنک شام کو ملا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں سرورق کے متعلق بار بار کیا لکھوں؟ اتنا منفرد اور سندر ہوتا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔ اس بار میری کہانی موجود ہے یہ میری کہانی کچھ وقفے کے بعد شائع ہوئی خیر دیر آید درست آید کے مصداق میں ادارے کا شکر گزار ہوں کہ میری سعی کو پذیرائی بخشتے ہیں اور قارئین پسند کرتے ہیں مشتاق احمد قریشی کی تحریر قیام پاکستان میں علماء کرام کا کردار ایک جامع مفصل اور حقیقت پر مبنی تحریر ہے۔ اس بات سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ قیام پاکستان میں علماء کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہماری نئی پود جو انڈیا کے ڈراموں اور گانوں کی رسیا ہے اور جن کے ذریعے انڈیا ہماری نئی پود کے اخلاق اور کردار کو تباہ کر رہا ہے نئی پود اس سے یا تو بے بہرہ ہے یا پھر جان بوجھ کر اس زہر کو اپنے اندر اتار رہی ہے خدارا سنبھل جایئے۔ اب بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف سب سے پہلا خط بہن ریحانہ سعیدہ (لاہور) کا ہے آپ نے بھائی کو بالکل فراموش کر دیا آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ ہمیشہ کی طرح کافی عرصہ بعد بھائی عمر فاروق ارشد (فورٹ عباس) تشریف لائے ہیں۔ بھائی میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور دوبارہ کہانیاں لکھ رہا ہوں اس بار کوہ نور کہانی پرچے میں موجود ہے اس پر تبصرہ ضرور کیجیے گا بھائی میں نے تو آپ کو یاد کیا تھا اور دل سے یاد کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو معذرت چاہتا ہوں محمد اسلم جاوید بھائی سانحہ پشاور ہماری برداشت سے باہر ہے۔ یقین کریں تین چار دن میں گم صم رہا۔ نہ تو اخبار کا مطالعہ کیا اور نہ ٹی وی کے نزدیک گیا۔ ریاض حسین قمر بھائی شکریہ کا شکریہ۔ آپ کو کامیاب ایڈیشن پر مبارکباد۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ

باری تعالیٰ آپ کو ہر دکھ، بیماری اور پریشانی سے محفوظ رکھے، آمین۔ جب آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں تو میری دونوں کہانیاں اعتراف جرم اور کوہ نور پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ادیب سمیع چمن (حیدرآباد) آپ کا خط کیا ہے آپ کی آپ بیتی ہے آپ نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ ہمت والے ہیں آپ کے خط سے جہاں دکھ ٹپک رہا ہے۔ وہاں آپ کے جذبے، جواں مردی اور حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنا بھی ظاہر ہو رہا ہے بھائی ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رت بھی تم حوصلہ رکھنا

کہانیوں میں سب سے پہلے قلندر ذات اور جگت سنگھ پڑھیں جگت سنگھ کے متعلق تو پہلے اپنے کسی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ کہانی میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن اپنے من پسند رسالے میں پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے قلندر ذات کی یہ قسط بھی جاندار ہے طاہرہ جبیں تارا کی کہانی عشق لا حاصل، ایک خوب صورت اور سبق آموز کہانی ہے۔ بہن آپ کی تحریریں دن بدن خوب سے خوب ہوتی جا رہی ہیں۔ خلیل جبار کی کہانی ندامت حسب معمول اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے تھی جو لوگ اپنی بیویوں کے ہوتے ہوئے نرگس جیسی لڑکیوں کی طرف راغب ہو کر ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں ان کا انجام شہزاد جیسا ہی ہوتا ہے جاوید احمد صدیقی کی کہانی پراسرار ہوٹل بھی ایک اچھی کہانی ہے بہت خوب، باقی کہانیاں بھی اچھی اور خوب صورت ہیں خوشبوئے سخن میں عمر اسرار، طاہرہ جبیں تارا، ریحانہ سعیدہ، قدیر رانا، عمر فاروق ارشد بازی لے گئے۔ رانا حذیف ناطر، محمد اسلم جاوید نے بھی اچھا لکھا۔ بلکہ خوب لکھا صفحہ صفحہ بکھری کترنیں بھی پرچے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ السلام علیکم! کئی رنگوں سے سجا منفرد اور انتہائی جاذب نظر ٹائیٹل والا نئے افق ملا اور دلچسپ کہانی نمبر بھی بہار دکھا رہا تھا دستک لازوال اور اقرا دل میں اترنے والی گفتگو میں بھی زبردست رہی۔ محفل قارئین میں حدیث شریف تو ہر مسلمان کے لیے ایک انمول سبق ہے بشرطیکہ مسلمان کچھ ذرا بھی احساس کریں تو قسمت ہی بدل جائے۔ گفتگو میں ساحل دعا بخاری کی وضاحت کرنا بھی خوب رہا دعا سے یہ لوگ جنڈر کو کیوں نہ سمجھ گئے میں نئے افق کے قارئین کو اتنا بھی کند ذہن نہیں سمجھتا ہوں آپ کے تبصرہ کو ذرا تفصیل میں ہونا چاہیے نا، ریاض بٹ جی یاد کرنے کا شکریہ۔ مگر اس دفعہ آپ کی غیر حاضری لگ گئی۔ آپ کا تبصرہ ایک درد دل رکھنے والا ہی کر سکتا ہے دعا ہے کہ اللہ سب کو اپنے امان میں رکھے۔ محمد اسلم جاوید صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا ضرور آتے رہیں جناب ادیب سمیع چمن اللہ کریم آپ کی گھریلو اور معاشی مجبوریاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

صدقے دور کردے آمین۔ پڑھائی اور اسکولوں کے متعلق بھی آپ کا تبصرہ زبردست تھا۔ ماریہ، اقرا وسیم آپ کی خاموشی شکر ہے کہ ٹوٹی۔ آپ کی مبارک سب کو قبول ہے لیکن یہ کیا صرف 5 تبصرے، بھئی سب لوگ گفتگو میں حاضری جلدی دیں ہم لوگ پر اصرار احتجاج کرتے ہیں۔ اس دفعہ 12 کہانیاں دی گئی ہیں پہلے تو عرض ہے کہ دل چسپ کہانی نمبر میں تین کہانیاں مثلاً مار گزیدہ (اسد علی) ایک رات (شہناز بانو) اور دوسری دنیا (حسیب جواد علی) تو پوری پوری ماورائی اور پراسرار تھیں کسی بھی پہلو سے اس نمبر کے لیے موزوں نہ تھیں اب ایسی کہانیوں میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ایک اور ظلم یہ ہوا کہ اس کہانی نمبر کے لیے سفرنامہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دلچسپ ہے بڑا زبردست اور پھر مذہبی موضوعات پر مبنی بڑی اچھی رہی مگر اس شمارہ کے لیے بالکل نامناسب اور انجم فاروق ساحلی کی مسٹر دلچسپ بھی ایسی ہی کہانی رہی کہ انتہائی غمگین موضوع پر یہ تین ٹکڑوں پر مبنی کہانیاں کہاں سے ہمارے لیے دلچسپ ہوئی؟ جی ہاں سسپنس سے بھرپور مذہب کی تفصیل لیے انتہائی دلچسپ اور صاف ستھری کہانی کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے غلام میراں صاحب ضرور لکھا کریں اور اس کہانی کو تو آگے ضرور لے کر چلیں۔ ہاں ڈیڑھ کا پہاڑہ بھی آپ نے خوب فٹ کیا ہے، زبردست جناب۔ بہترین رہی کھلاڑی اناڑی (محمد اعظم خان) رہی دلچسپ اور خوشگوار کہانی اور تریاق اور آتش انتقام بھی زبردست تھیں اور مزہ آگیا پڑھ کر عزت نفس اچھی رہی صرف واقعات کو اور بھی پھیلایا جاسکتا تھا بہرحال خوب تھی۔ دونوں سلسلے بے حد دلچسپ اور پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ دونوں مصنف کو مبارک باد۔ ہاں آپ کا شکریہ کہ پراسرار لکھی کوٹیشن صفحہ 87 پر شائع کی گئی اور دونوں بدیسی کہانیوں میں اسرار احمد صاحب کی نوآموز قاری کے لیے بے حد دلچسپ رہی نایافت تو راحیلہ ناز پہلی دفعہ لے کر آئی ہیں اچھی رہی ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن دونوں ہی بڑے اچھے رہے۔ تمام قارئین کو سلام اور دعائیں۔

ادیب سمیع چمن.... **حیدر آباد**۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ دعا ہے کہ رب تعالیٰ آپ کو ہر آفت ہر مصیبت ہر پریشانی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔ آپ کا سایہ تادیر سلامت رہے۔ آپ اور آپ کے اہلخانہ سدا خوش اور ہنستے مسکراتے رہیں نیز آپ کے ادارہ کے تمام ساتھی تمام اسٹاف اور ادارت کے صاحبان کراچی کے ہر مصیبت پریشانیوں سے محفوظ رہ کر نئے افق کے نت نئے ولولے اور جلوے سجاتے رہیں آمین۔ بہرکیف نئے افق کا مطالعہ جاری ہے تمام اہل قلم جن میں طاہر قریشی، بہن راحیلہ ناز صاحبہ، جناب اسرار احمد، اسعد علی، محمد اعظم صاحب، سلیم اختر صاحب، جناب خلیل جبار، بہن شہناز بانو، انجم فاروق ساحلی، امجد جاوید، شمیم نوید، عرفان احمد، عمر اسرار صاحب، ساحل دعا بخاری، محترم ریاض بٹ، محمد اسلم جاوید، قدیر رانا، ریاض حسین قمر صاحب، یہ سب نئے افق کے گلستان کے وہ پھول ہیں جن سے نئے افق کا گلستان مہک رہا ہے ان میں کئی

تحریریں بلکہ جتنے بھی لکھنے والے ہیں سب کا اپنا اپنا انداز ہے اور یقین جانیے سب ہی نئے افق پر ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں۔ میری سب سے محترم بہن شاعرہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ کی ہر غزل جو سب سے پہلے نمبر پر ہوتی ہے، ان کی بھی خدمات کو سلام پیش کرتا ہوں خدا یہ گلشن ہمیشہ سجائے رکھے۔ نواز شریف صاحب سے گزارش ہے کہ محترم وزیراعظم صاحب یہ کیسا پیٹرول سستا کیے جا رہے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ گوشت، چاول، دالیں، گھی، دودھ غرض سوائے پیاز اور آلوؤں کے ہر اشیا آپ کا منہ چڑا رہی ہے اور جناب وزیراعظم صاحب پاکستان میں پیسہ کہاں چلتا ہے بلکہ زرداری صاحب اور آپ کی جادوگری سے تاجر، دکاندار، چھاپڑی والا، ہر دکان والا بڑے مزے سے خوف خدا سے عاری ہو کر ساڑھے آٹھ کی جگہ نو روپے، ساڑھے نو کی جگہ 10 روپے وصول کر کے جہنم کی آگ کی طرف بڑھے جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں ذرے ذرے کا حساب ہے حلال میں حرام مکس حکومت کردار رہی ہے کبھی غور کیا ہے اس بات پر دکانداروں کو ذرا خدا کا خوف نہیں کہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ وہ پچاس پیسے زیادہ نہیں تو پچاس پیسے کا مال بھی ملے گا۔ آج پورا پاکستان مصیبتوں اور آفات کی زد میں گھرتا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے توبہ کریں ناپ تول میں کمی نہ کیا کریں ملاوٹ نہ کیا کریں اور وزیراعظم صاحب سب سے زیادہ پکڑ اللہ کے ہاں آپ کی حکومت کی ہوگی۔ اللہ پاکستان پر اور پاکستان کے تمام لوگوں پر رحم کرے اپنی حق صداقت اور ایمانداری کی راہ نصیب فرمائے، آمین

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ "گفتگو" کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک پہنچ جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 'فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

مشتاق احمد قریشی

اللہ

اللہ

تفسیر: آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے تمام سوالات کا جو ذاتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں ملحد اور منکرین کرتے رہتے ہیں سب کا مفصل جواب ہی نہیں دیا بلکہ یہ بات بھی خوب اچھی طرح بتادی کہ اللہ کا نبی جسے شرف کلام الٰہی بھی حاصل ہوا ہو جبکہ حضرت موسیٰ سے پہلے نہ بعد کسی نبی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا کہ وہ براہِ راست ربِ کائنات سے ہم کلام ہوا ہو۔ ایسے جلیل القدر نبی کے ساتھ جو واقع جس طرح پیش آیا وہ اللہ نے اس آیتِ مبارکہ میں ارشاد فرمادیا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے براہِ راست گفتگو فرمائی تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا' تو انہوں نے اپنے شوق کا اظہار ''رب ارنی'' کہہ کر کیا جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ''لن ترانی'' فرما کر دیا۔

''یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا' اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی اور ثابت ہوا کہ دنیا میں کوئی انسانی آنکھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی کو دیکھنے پر کسی طرح بھی قادر نہیں ہے لیکن روزِ آخرت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جب نئی زندگی عطا فرمائے گا اور سب کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا تو ان آنکھوں میں اتنی قوت بصارت عطا فرمادے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو برداشت کرسکے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا صرف اہل ایمان متقی لوگوں کو ہی یہ سعادت میسر ہو۔ آیتِ مبارکہ میں ربِ ذوالجلال نے واضح فرمادیا ہے اس نے اپنے نبی کی خواہش کو پورا کرنے اور آئندہ آنے والی تمام امتوں اور انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنی تجلی پہاڑ طور پر فرمائی تو وہ پہاڑ رب کی تجلی برداشت نہ کرسکا اور نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت کرسکے وہ بھی بے ہوش ہوکر گر پڑے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ انسانی قوتِ ادراک کی حدود کیا ہیں' انہیں عملاً معلوم ہوگیا کہ انہوں نے یہ سوال دیدار الٰہی کا کرکے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے' تب ہی انہوں نے فوراً ہی اعتراف کیا کہ اے مالکِ دوجہاں تیری ذات پاک ہے' میں توبہ کرتا ہوں' میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا' میں پہلا مسلمان ہوں کیونکہ رسول تو پہلا مسلمان ہی ہوا کرتا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہے' سب سے پہلے وہ اپنی رسالت اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلامِ الٰہی پر ایمان لاتا ہے کیونکہ پیغمبروں کو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان کا اعلان کریں۔ نبی کا سب سے پہلے ایمان لانے کا اعلان قرآنِ کریم میں کافی مقامات پر

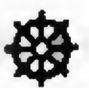
آیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ تجلیِ الٰہی کیسی تھی! یقیناً کوئی انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بیان کر سکے نہ اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک بڑا ہی حیران کن اور خوفناک منظر رہا ہوگا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کلماتِ الٰہی سن رہے ہوں گے اور ربّ کائنات سے ہم کلامی کے شوق میں ان کی روح سمتِ الٰہی بلند ہو رہی ہوگی۔ ایسی حالت میں وہ یقیناً بھول گئے ہوں گے وفورِ شوقِ الٰہی ان پر حاوی ہو گیا ہوگا ایسے میں انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر فرمائش کر دی ہوگی۔ ان کی یہ فرمائش یا مطالبہ جو اس کرۂ بشریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی امر سمجھانے کے لئے کہ اسے اگر ممکن بنا دیا جائے تو بھی کسی انسان میں وہ طاقت ہی نہیں ہے جو دیدارِ الٰہی کو برداشت کر سکے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی جلیل القدر ہستی کی فرمائش دیدارِ الٰہی جو ان کی حبِ الٰہی اور شوق و امید کا مظہر ہے کہ وہ عالم شہود میں ذات باری کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دوٹوک دیا۔ ''کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ خصوصی شفقت و محبت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھا دیا کہ تم میں وہ طاقت ہی نہیں ہے' اس بات کو ہی دلیل سے اس طرح سمجھایا اور فرمایا۔ ''ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔'' کیونکہ پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ جھیلنے والا ہے اور زیادہ متاثر ہونے والا بھی نہیں ہے اور پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ قبولیت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن جب ''اُن کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) غش کھا کر گر پڑے۔''

اس سارے واقعے کو اگر سمجھا جائے اور سوچا جائے تو یہ ایسی حقیقت ہے جو قرآنِ کریم کے حوالے سے ربّ کائنات نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمام عالمِ انسانیت کو سمجھائی ہے۔ اس کے علاوہ ہر انسانی کوشش اس سلسلے میں بے معنی اور صرف لفظوں کے ذریعے ذہن انسانی کو الجھانا ہی ہوگا۔ جس طرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح ہم کلام ہوتے تھے وہ کن ذرائع اور ادراک سے ہدایات اخذ کرتے تھے' کلمات کس طرح کے تھے؟ یہ سب تصورات ہم عاجز بندوں کی محدود قوتِ فکر و فہم کے لئے ناقابل تصور رہیں۔ اس لئے کہ ہماری قوتِ مدرکہ محدود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور ربّ کائنات کا تعلقِ خاص کیا تھا؟ کیسے تھا یہ تعلق ہماری محدود سوچ و ادراک میں نہیں سما سکتا اس لئے اس سلسلے میں خاموشی ہی سب سے بہتر ہے۔

(جاری ہے)



حصہ اول

ھدف

نوشاد عادل

انسان کی زندگی کی اہمیت اب ہمارے ہاں سکہ سے بھی کم رہ گئی ہے اور اس کی وجہ اگر حکمران ہیں جو اپنی حکومت بچانے اور پیسہ بڑھانے کے لیے معصوم جانوں سے کھیل کر عوام کو اس طرف الجھا دیتے ہیں اور خود بہت خاموشی سے اپنی چال چل جاتے ہیں۔ مگر ان کی یہی حرکات کئی موضوعات کو جنم دے کر انہیں پھنسا دیتے ہیں۔
نوشاد عادل نے معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں اور دہشت گردی پر بہت غوروفکر کے بعد قلم اٹھایا ہے۔
سیاسی جرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک چشم کشا تحریر جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

''یہ کراچی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ لاشیں ہی لاشیں...... ہر طرف چیخ و پکار اور رونا سنائی دے رہا ہے۔ میڈیا نے الگ طوفان کھڑا کر رکھا ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' ڈی ایس پی زاہد علی نے پریشان لہجے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسپکٹر کریم خان سے کہا۔
''سر! کل رات رئیس علی نواز کے فارم ہاؤس پر پارٹی تھی۔ پارٹی میں سو کے قریب لوگ شریک تھے۔ رات گئے تک پارٹی چلتی رہی اور ساڑھے بارہ بجے تک خوب دھوم دھڑکا ہوتا رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کو نکلنا شروع کیا۔ لیکن لگ بھگ بیس افراد ایسے تھے جو ابھی بھی پارٹی میں مست تھے۔ باقی سب اپنے اپنے گھروں کو پہنچ چکے تھے۔ ڈیڑھ بجے تک سب خیریت رہی' مگر ڈیڑھ بجے کے بعد پارٹی میں شریک لوگ ہارٹ اٹیک سے مرنے لگے اور دو بجے تک سب ہی موت کی آغوش میں جا چکے تھے۔ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کسی ایک آدمی کو بھی بچایا نہیں جا سکا' ان سب کو ایک ساتھ ہارٹ اٹیک کیسے ہوا' اس کی توجیہہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔'' کریم خان نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔
''ایک ساتھ سولوگوں کو ہارٹ اٹیک۔'' ڈی ایس پی گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی پسینہ بن کر ٹپک رہی تھی۔
''ہاں سر! اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی دل کا مریض نہیں تھا۔''
''ضرور کھانے میں کچھ ملایا گیا ہوگا۔'' ڈی ایس پی نے اپنا خیال پیش کیا۔
''نہیں سر! ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ کسی کی بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاطاً وہاں موجود کھانے پینے کی چیزوں کے سیمپل حاصل کر کے لیبارٹری میں بھیج دیے ہیں۔''
''جتنے بھی شیف یا ویٹر تھے ان پر بھی تو شک کیا جا سکتا ہے؟'' ڈی ایس پی نے ایک اور خیال پیش کیا۔
''ان پر شک کرنا بالکل بیکار ہے سر۔''
''کیوں' کیا تم ان سے تفتیش کر چکے ہو؟'' ڈی ایس پی نے سوالیہ نظروں سے کریم خان کی طرف دیکھا۔
''وہ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو کریم خان۔'' ڈی ایس پی بالکل بوکھلا گیا۔ کچھ دیر میں بوکھلاہٹ کم ہوئی تو بولا۔ ''اور رئیس علی نواز کے خاندان والے۔''

''ان کے دو بیٹے۔ ایک بیٹی اور ایک اکلوتی بیوی۔ سب ختم۔ کسی بیماری کی وجہ سے رئیس علی نواز خود پارٹی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب یا تو انہیں خوش نصیب کہہ سکتے ہیں یا......'' کریم خان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اب رئیس علی نواز کہاں ہے؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔

''وہیں جہاں انہیں ہونا چاہئے۔''

''مطلب؟''

''آغا خان اسپتال میں ہیں۔ سنا ہے کہ ان کی حالت بہت نازک ہے۔'' یہ کہہ کر کریم خان کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ ''شک کی سوئی بار بار ایک ہی آدمی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔''

''کیا رئیس علی نواز کی طرف؟''

''نہیں۔'' کریم خان نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''تو اور کس پر؟''

''پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک تھے ان سب کی لاشیں موجود ہیں۔ صرف ایک آدمی ہے جس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کہاں ہے اور زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔'' کریم خان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''تو وہ صاحب کون ہیں جن کی طرف تمہارے شک کی سوئی اشارہ کر رہی ہے۔'' ڈی ایس پی نے تجسس سے پوچھا۔

''طارق محمود۔'' کریم خان کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ کریم خان نے اجازت طلب نظروں سے ڈی ایس پی کی طرف دیکھا، انہوں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ کریم کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں بولو۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر وہ لگ بھگ چلا اٹھا۔ ''کیا...... کیا کہہ رہے ہو۔'' اور ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ ڈی ایس پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''او کے میں تھوڑی دیر میں وہیں پہنچتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر کریم خان نے فون ڈس کنیکٹ کر دیا اور تھکا تھکا سا کرسی پر گر گیا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کا پسندیدہ کھلونا اس کے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا ہو۔

ڈی ایس پی جو کافی دیر سے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو دیکھ رہا تھا زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ ''کیا ہوا۔ کس کا فون تھا اور یہ تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟'' انہوں نے ایک ہی سانس میں تین سوال کر ڈالے۔

کریم خان کچھ دیر تک ڈی ایس پی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''طارق محمود بھی ختم۔''

''اوہ۔ یعنی اب اس پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔''

ڈی ایس پی کے چہرے پر بھی پریشانی کے بادل چھانے لگے۔

''شک تو کرنا ہی پڑے گا سر! اس پر یا کسی اور پر کیونکہ وہ ہارٹ اٹیک سے نہیں مرا۔''

''تو پھر وہ کیسے مرا؟''

''کسی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔'' کریم خان انتہائی مایوسی سے بولا۔

''اوہ مائی گاڈ۔ گولی کس نے ماری۔ کچھ پتہ چلا۔''

''نہیں۔''

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور ڈی ایس پی کے کیبن میں خاموشی راج کرنے لگی۔ دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر ڈی ایس پی نے ہی کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیس بہت الجھ گیا ہے۔ تم بغیر کسی دباؤ کے اس کیس پر کام کر سکتے ہو۔ مگر یہ کیس جلد سے جلد سلجھانے کی کوشش کرنا اور ہاں کسی بھی مدد یا تعاون کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔''

''جو بھی مانگوں گا' آپ دیں گے۔'' کریم خان نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں خوشی سے۔''

''مجھے اعیان چاہیے۔''

کریم خان کی بات سن کر ڈی ایس پی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کریم خان سے پوچھا۔ ''تم نے ابھی کیا کہا؟''

''سر! مجھے اعیان چاہیے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک افسر ہے بلکہ ہم سب میں بہترین۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' ڈی ایس پی نے کریم خان کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ کریم خان کوئی ایسا مطالبہ کرے گا جسے وہ چاہتے ہوئے بھی پورا نہیں کر سکتے تھے۔

''ہاں سر! انسپکٹر اعیان کے ساتھ مل کر میں یہ کیس آسانی سے سلجھا سکتا ہوں۔'' کریم خان ابھی تک امید کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

''تم جانتے ہو کہ وہ کتنا جنونی اور بدتمیز انسان ہے۔ وہ ہمیشہ قانون کو پاؤں کی جوتی پر رکھ کر کام کرتا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ سینڈیکیٹ کیس میں اس نے کیا قیامت ڈھائی تھی۔ خون کی ندیاں بہا دی تھیں اس نے۔ سینڈیکیٹ کے ممبرز کو کتنی بے دردی اور بے رحمی سے مارا تھا اس نے۔ اس طرح تو کوئی پاگل بھی نہیں مارے گا کسی کو یاد ہے نا میڈیا نے کتنا دہال مچایا تھا۔ وہ تو کسی طرح اسے معطل کر کے حالات قابو میں کیے تھے۔ ورنہ ہمارے محکمے کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو گیا تھا۔'' ڈی ایس پی نے ایک بار اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ کو بھی یاد ہونا چاہیے کہ پچھلے پندرہ سالوں سے سینڈیکیٹ نامی گینگ نے شہر میں کتنی دہشت پھیلا رکھی تھی اور ہم لاکھ کوشش کے باوجود ان تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ وہ اتنا طاقتور گینگ تھا کہ قانون اس کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔ مگر اعیان نے صرف تین مہینوں کی محنت کے بعد وہ کیس ہمیشہ کے لیے حل کر دیا تھا اور ان کو ختم کرنے کا واحد راستہ وہی تھا جو اعیان نے اختیار کیا تھا۔'' کریم خان نے ایک اور ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''سوری کریم خان! فی الحال تم کو اعیان کے بغیر ہی کام کرنا ہو گا۔ اعیان کا سسپینشن ابھی ختم نہیں ہو سکتا۔'' ڈی ایس پی نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان مایوسانہ انداز میں باہر نکل آیا اور سپاہی آصف سے بولا۔ ''گاڑی نکالو۔'' اور اسے اس جگہ چلنے کو کہا جہاں طارق محمود کا قتل ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خان وہاں پہنچ کر سب انسپکٹر چراغ دین اور سرفراز سے تفصیل معلوم کر رہا تھا۔ یہ دونوں سب انسپکٹر' کریم خان کی ٹیم کا حصہ اور اس کے دو بازو کی مانند تھے۔ بے حد ایماندار اور کریم خان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ چراغ دین نسبتاً خوش مزاج جبکہ سرفراز اپنے حال میں مست رہنے والا انسان تھا۔

جبکہ کریم خان کی شہرت پورے محکمے میں بہت اچھی تھی۔ وہ چھ فٹ ایک انچ قد کا مالک تھا۔ رنگ گورا اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کی چھ ماہ پہلے ثوبیہ سے شادی ہوئی تھی جو ان دنوں اپنے میکے دوسرے شہر گئی ہوئی تھی۔

کریم خان کا ایک ہی دوست تھا' اعیان جسے وہ جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ کریم خان کا کوئی دوسرا دوست نہیں تھا یا پھر یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ اعیان نے کریم خان کو کسی دوسرے سے دوستی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور اعیان جیسا دوست پا کر اسے بھی کسی دوسرے دوست کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جتنی محبت کریم خان کو اعیان سے تھی اس سے زیادہ محبت وہ کریم خان سے کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے کچھ بھی۔

کریم خان کی شہرت ایک ایماندار اور ہوشیار پولیس آفیسر کی حیثیت سے پورے محکمے میں زبان زد عام تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عزت کروانے کے لیے عزت کرنا بے حد

ضروری ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے نہایت محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا اس لیے اس کی ٹیم کا ہر ممبر اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں وہ چھوٹے بڑے بیس سے زائد کیسز پر کام کرچکا تھا جنہیں اس نے بنا کسی پریشانی کے حل کر بھی کرلیا تھا۔ اس کے شاندار ریکارڈ سے ڈی ایس پی زاہد علی بہت خوش تھا اور وہ کریم خان کی بہت عزت کرتا تھا اور پیچیدہ کیسز اسے ہی دیئے جاتے تھے۔

مگر کریم خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیس اس کے لیے کتنی بڑی مصیبت کا باعث بننے والا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کیس کی وجہ سے اس کی زندگی میں کیسی ہلچل مچنے والی ہے یا شاید یہ ہلچل شروع ہوچکی تھی۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

''سر! اسے صرف ایک ہی گولی ماری گئی ہے وہ بھی سیدھی سر میں۔'' چراغ دین نے بتایا۔

''اس کے بعد گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے چلتی گاڑی میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ گولی لگنے سے طارق محمود گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا اور گاڑی درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔'' سرفراز نے مزید تفصیل سے آگاہ کیا۔

کریم خان نے دیکھا کہ گاڑی کی حالت واقعی بہت بری تھی اور اس سے زیادہ بری حالت طارق محمود کی تھی۔ اس کے سر میں ایک سوراخ تھا۔ باقی جسم پر بھی کئی چوٹیں تھیں جو کہ یقیناً ایکسیڈنٹ کی وجہ سے آئی ہوں گی۔ گاڑی میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

''اس کا مطلب ہے قاتل ماہر نشانے باز ہے۔'' کریم خان نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''چلتی گاڑی میں سیدھی سر میں گولی اتارنا بہت بڑی بات ہے۔''

''سر! ایک اور سنسنی خیز خبر بھی آپ کو سنانی ہے۔'' چراغ دین نے کہا۔

''وہ کون سی؟''

''سر! پارٹی والی جگہ سے رئیس علی نواز کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں۔ جبکہ سب کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے پارٹی میں بالکل شرکت نہیں کی تھی۔'' چراغ دین نے کریم خان کے سر پر ایک اور بم پھوڑا۔

''خیر دیکھتے ہیں۔ تم لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور پارٹی میں ملنے والے فنگر پرنٹس ہر لاش سے میچ کرو۔ دیکھو کوئی نئی بات سامنے آتی ہے یا نہیں۔'' کریم خان کی ہدایت ملتے ہی دونوں حرکت میں آ گئے۔

پارٹی میں رئیس علی نواز کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا بہت ہی اچنبھے کی بات تھی جبکہ اس کے سارے ملازمین اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پارٹی میں شریک نہیں ہوسکے تھے کیونکہ وہ ایک دن پہلے ہی اسپتال میں داخل ہوچکے تھے۔ دال میں کچھ نہ کچھ تو کالا ضرور تھا جسے کریم خان نے سفید کرنا تھا۔

کریم خان نے جیپ میں بیٹھتے ہی آصف کو آغا خان اسپتال چلنے کا کہا، رئیس علی نواز اسی اسپتال میں زیر علاج تھے۔ کریم خان اس سے مل کر کچھ باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ آصف سڑک پر جیپ دوڑانے لگا اور کریم خان کا دماغ کیس کی باریکیوں پر دوڑنے لگا۔

''رئیس علی نواز اس کھیل کا ماسٹر مائنڈ ہوسکتا ہے۔'' یہ کریم خان کی سوچ تھی۔

''نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کا اپنا خاندان اس کی لپیٹ میں کیوں آتا۔''

''مگر ہوسکتا ہے کہ اپنے خاندان کو بھی اس نے اس لیے نشانہ بنایا ہو کہ کسی کو اس پر شک نہ ہونے پائے۔ ویسے بھی کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رئیس علی نواز کیا پانا چاہتا تھا اتنی بڑی واردات کے ذریعے۔''

''لیکن وہ ایسی کیا چیز پانا چاہتا تھا جس کے لیے اسے ایسا انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس کی ایک ساتھ اتنے سارے لوگوں سے دشمنی ہو اور اگر ہو تو اتنے دشمنوں کا اپنے دشمن کی پارٹی میں ایک ساتھ جمع ہونا

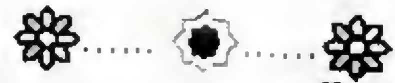
بھی ناممکن ہے اور غریب شیف اور ویٹر کس دشمنی کا شکار ہوئے۔'' کریم خان خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی ان کے جواب بھی دے رہا تھا۔

''مگر پارٹی میں رئیس کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا۔ طارق محمود کا قتل۔ کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں تو گڑبڑ ضرور ہے۔'' کریم خان کے شک کا دائرہ سمٹتے ہوئے رئیس علی نواز پر مرتکز ہو رہا تھا۔

وہ طرح طرح کے خیالوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا آغا خان اسپتال پہنچ گیا۔

ابھی وہ اپنی جیپ سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے دل میں جلنے والی امید کی شمع پھڑ پھڑا کر دم توڑنے لگی۔ اسپتال کے سامنے ہی کسی چینل کا رپورٹر ایک خبر کی کوریج کر رہا تھا۔

''ناظرین میں اس وقت آغا خان اسپتال کے باہر موجود ہوں اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق رئیس علی نواز جو یہاں زیر علاج تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے' کہا جا رہا ہے کہ......''



شام ڈھل چکی تھی اور رات دھیرے دھیرے جوان ہوتی جا رہی تھی۔ چاند اپنا قدم آسمان کے سینے پر رکھ کر اپنی چاندنی کو زمین پر بکھیر رہا تھا۔

کریم خان اس وقت اعیان کے ساتھ ڈیفنس کے ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ عیان چھ فٹ دو انچ کا لمبا چوڑا جوان تھا' اس کا کسرتی بدن بالی ووڈ کے کسی ہیرو کی یاد دلاتا تھا۔ نیلی نیلی نشیلی آنکھیں' جن میں اگر کوئی ایک بار دیکھ لے تو اپنے آپ کو بھولنے پر مجبور ہو جائے۔ چوڑی پیشانی اس کے ذہین ہونے کی گواہی دے رہی تھی اور لمبے لمبے بال ہوا میں اڑتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم رہے تھے۔ رنگ روپ ایسا کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جو اسے ایک بار دیکھے وہ دوبارہ دیکھنے پر مجبور نہ ہو۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ کسی یونانی دیوتا جیسا لگتا تھا جو شاید غلطی سے زمین پر اتر آیا تھا۔

پارک میں کئی حسین نگاہیں اعیان کو گھور رہی تھیں۔ مگر وہ ان سے سب سے بے نیاز کریم خان سے باتوں میں مصروف تھا جو اسے اپنی آج کے دن کی دوڑ دھوپ کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''پچھلے تین سالوں میں بیس سے زیادہ کیسز حل کر چکا ہوں۔ مگر آج تک اتنا الجھا ہوا کیس نہیں ملا۔ سو لوگ ایک ساتھ کیسے ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے' کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کھانے پینے کی ہر چیز کا ٹیسٹ کروایا لیکن سب بیکار۔ جس پر شک کرتا ہوں تھوڑی دیر بعد اسی کے مرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس الجھن نے تو میرے دماغ کے سارے تار ہلا کر رکھ دیے ہیں۔'' کریم خان پریشانی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔

''میرے پاس خنجر ہے۔'' اعیان نے کہا۔

''تو میں کیا کروں۔ ڈر جاؤں۔'' کریم خان نے سہمنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''ارے توبہ کرو۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو اپنے خنجر سے تمہارے کیس کے الجھے ہوئے دھاگے کاٹنے کی بات کر رہا ہوں۔'' اعیان نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ! میں سمجھا تم خنجر دکھا کر مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔'' کریم خان نے تیزی سے سانسیں لیتے ہوئے کہا' جیسے اس کی سانسیں اعیان کی بات سن کر اکھڑ گئی ہوں۔

''تمہارے پاس لٹوانے کو ہے ہی کیا۔ عزت تو کب کی بھابھی کے ہاتھوں لٹوا چکے ہو۔'' اعیان کی اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ اور اچانک کسی کو دیکھ کر اعیان کی ہنسی کو بریک سے لگ گئے۔ اس نے فوراً کریم خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے گیٹ کی جانب کھینچتا ہوا بولا۔ جلدی نکلو یہاں سے۔''



''پیاری ہانی! زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ کہنے کی ہمت کر رہا ہوں اور دعا ہے کہ یہ پہلا موقع آخری ثابت نہ ہو۔ بچپن میں ایک بار تمہاری گہری سیاہ آنکھوں سے

آنکھیں کیا ملائیں کہ میں تمہاری آنکھوں کے اندھیروں میں کھو سا گیا۔ لوگ زندگی بھر روشنی کی تلاش میں رہتے ہیں، مگر جب میں سیاہ آنکھوں کے اندھیروں میں ڈوبا تو پتہ چلا کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

گزشتہ آٹھ برسوں سے میں ان اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پوری زندگی اسی ایک پل میں بتا دوں۔ بچپن میں جب بچے کھیلنے کودنے اور کھانے پینے کے بارے میں سوچتے ہیں میرے پاس تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ سوتا تو تمہارے خواب دیکھتا اور جاگتا تو تمہیں ڈھونڈتا رہتا اور ہر روز خدا سے ایک ہی دعا کرتا تھا کہ وہ تمہاری ایک جھلک دکھا دے۔"

ہانیہ ہر روز کی طرح اس خط کو پڑھے جا رہی تھی جو اسے آج سے نو سال پہلے ملا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں، تب ہی اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے خط کو سائیڈ ٹیبل کی دراز میں چھپا دیا۔ پھر وہ اٹھی اور اپنے گلابی گالوں پر سجے آنسوؤں کو پونچھ کر دروازہ کھولا۔



"اب بتا بھی دو کہ پارک میں تم نے ایسا کون سا بھوت دیکھ لیا جو مجھے کھینچتے ہوئے یہاں لے آئے۔"

دونوں اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کریم خان حیران پریشان سا اعیان کے ساتھ کھچا چلا آیا تھا۔ راستے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی اعیان خاموش تھا اور اب جبکہ ہوٹل میں بیٹھ کر ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے کر اور تھوڑا بہت کھا کر بھی وہ چپ رہا تو کریم خان کو پوچھنا ہی پڑا۔

"کچھ نہیں یار۔ بہت تیز بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے تمہیں لے آیا۔" اعیان نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا۔" کریم خان تقریباً چیخ ہی اٹھا۔ اس کی چیخ سن کر قریب بیٹھے ہوئے لوگ مڑ کر انہیں عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ جھینپ گیا۔ "مگر اس طرح لانے کا کیا مطلب ہے۔ سیدھی طرح نہیں کہہ سکتے تھے کیا۔" اس کی جھنجلاہٹ میں کمی نہیں آئی۔

اعیان اس کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ یہ مسکراہٹ کریم خان کے غصے کو اور مہمیز دینے لگی۔ "تم......تم......تم۔" وہ اعیان کو کوئی اچھی سی گالی دینا چاہتا تھا مگر جب اس موقع پر کوئی گالی یاد نہیں آئی تو بولا۔ "تم پاگل ہو۔"

"اس میں کوئی شک ہے کیا۔"

"جو تھوڑا بہت شک تھا۔ وہ بھی آج دور ہو گیا۔"

"اس طرح جلتے بھنتے رہو گے تو کالے ہو جاؤ گے اور ہو سکتا ہے ہماری پیاری سی بھابھی اس کالے سانڈ کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔" اعیان پر کریم خان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جو ابھی تک کھا جانے والی نظروں سے اعیان کو گھور رہا تھا۔ اس نے چائنیز رائس لیے اور اپنے ہاتھوں سے کریم خان کو کھلانے لگا۔ تھوڑا سا نخرہ دکھانے کے بعد کریم خان کو کھانا ہی پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مزید دیر کی تو اعیان زبردستی اس کے منہ میں نوالہ ٹھونسنے کی کوشش کرے گا۔ پھر کریم خان نے عیان کو نوالہ کھلایا اور دونوں ایک دوسرے کو کھلانے لگے۔ آس پاس بیٹھے لوگ حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ جب بھی ساتھ کھانا کھاتے تھے تو ایک دوسرے کو کھلا کر ہی کھاتے تھے۔



دانشور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک پل ایک لمحہ انسان کی زندگی کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی سوچ تک بدل جاتی ہے۔ وہ جینے کا نیا طریقہ سیکھ جاتا ہے اور اتنا کچھ بدل جاتا ہے کہ خود انسان ہی بدل کے رہ جاتا ہے۔

لیکن ہانیہ کی زندگی کسی لمحے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک خط کی وجہ سے بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ خط جو اسے نو سال پہلے ملا تھا۔ وہ خط جس نے اسے محبت کے اندھیرے راستوں پر لا کھڑا کیا تھا اور اب وہ اس راستے پر اتنی دور آ چکی تھی کہ اس کا واپس لوٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اب اس کی سوچوں کا محور صرف وہ شخص تھا جس کا نہ اسے نام معلوم تھا' نہ پتہ اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایسی گمنام محبت کا شکار ہو چکی تھی ہانیہ۔ صرف وہ خط تھا جو لکھنے والے سے متعلق واحد نشان تھا اور اس خط کے علاوہ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی ہانیہ نے اس گمنام کو اپنے دل پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اس انجان شخص کی محبت میں ڈوب چکی تھی بلکہ محبت کی منزلوں سے بھی آگے نکلتے ہوئے وہ اس سے عشق کرنے لگی تھی۔ اگر اسے شرک کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ شاید اسے پوجنے تک لگتی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس سے جتنی محبت وہ انجان شخص کرتا ہے اتنی محبت دنیا میں اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

ہانیہ اسے حد سے زیادہ چاہتی تھی مگر پھر بھی اسے اپنی محبت اپنے محبوب کی محبت کے آگے حقیر نظر آتی تھی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور وہ بھی صرف ایک خط کی بدولت' جو نو سال پہلے اسے ملا تھا۔

پچھلے نو سالوں میں اسے عادت سی ہو گئی تھی کہ جب تک وہ اس خط کو پڑھ نہیں لیتی تھی اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ حالانکہ ان برسوں میں وہ اس خط کو لاکھوں بار پڑھ چکی تھی لیکن ہر بار وہ تحریر اسے بالکل نئی لگتی تھی اور ہر بار اسے پہلے سے زیادہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ اب تو یہ اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتی' خوش ہوتی اور پھر خدا سے گلہ کرتی جس نے ابھی تک اس کا محبوب اس سے نہیں ملایا تھا اور پھر دعا مانگتے مانگتے سو جاتی۔

مگر آج وہ نہ خدا سے گلہ کر سکتی تھی اور نہ ہی دعا مانگ سکتی تھی اور وجہ یہ تھی کہ کوئی دخل اندازی کرتے ہوئے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی اس کی ممی کھڑی تھی۔

''لو بیٹا! آج شام کو تمہارے نام یہ خط آیا تھا۔ میں دینا ہی بھول گئی۔ اب یاد آ گیا۔ نگوڑی کیسی یادداشت ہو گئی ہے۔'' ممی خط اسے تھما کر نیچے چلی گئی۔

اس نے خط دیکھا جس پر اس کے گھر کا پتہ لکھا ہوا تھا مگر وہ تحریر اس کے لیے نامانوس تھی اور نہ ہی بھیجنے والے کا کوئی نام لکھا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر کاغذ باہر نکالا۔ اس پر لکھی تحریر دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی' کیونکہ اس تحریر کو وہ کیسے بھلا سکتی تھی۔ یہ وہ تحریر تھی جسے وہ ہر رات پڑھتی تھی۔ اسے لگا جیسے اسے اس کی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔

اس خوشی میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ لفافے پر جس تحریر میں پتہ لکھا تھا وہ مختلف تھی اور یہ شاید اس کی بہت بڑی غلطی ثابت ہونے والی تھی۔

زیادہ خوشی' غم اور غصہ انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ماند کر دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہانیہ کے ساتھ بھی تھا۔ اس خط کو پا کر وہ ساری دنیا کو بھول چکی تھی۔

اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر دراز ہو کر خط پڑھنے لگی۔

''پیاری ہانی! تمہارا شہر کیا چھوڑا' ایسا لگتا ہے اپنا دل' اپنی جان' اپنی دنیا سب کچھ وہیں تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ پہلے دن میں ایک دو بار تمہارا دیدار ہو جاتا تھا تو پوری رات چین سے تمہارے خوابوں میں کٹ جاتی تھی۔ مگر اب تو کم بخت نیند بھی کہیں گم ہو گئی ہے اور چین بھی۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے۔

جب تمہیں دیکھنے کی تڑپ نے میرا جینا حرام کر دیا تو میں تمہارے شہر واپس آ گیا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ تم بھی وہ شہر چھوڑ کر کہیں جا چکی ہو۔ کہاں گئیں' یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ اگر تم کچھ اور دن مجھے نہ ملیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مر جاؤں گا' تم جہاں کہیں بھی ہو۔ پلیز میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ پاگل ہونا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری باہوں میں اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔ زندگی کی تپتی دھوپ میں تمہاری گھنی زلفوں کا طلبگار ہوں۔ تم آ جاؤ نا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔ مجھے مرنے سے بچا لو...... بچا لو نا......

پلیز..... پلیز..... مجھے بچالو..... بچالو..... بچالو۔"

ہانیہ کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور دل میں اٹھنے والی بے چینی اسے پاگل کرنے لگی۔ وہ پورا خط پڑھنے کی ہمت ہی نہیں کرسکی۔ وہ آنکھیں بند کرکے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ کافی دیر بعد جاکر اس نے کچھ سنبھالا لیا تو خط کو آگے پڑھنے لگی۔

"پاگل تو شاید میں ہو ہی چکا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں ہو۔ یہ خط کس طرح تم تک پہنچاؤں گا۔ کچھ نہیں جانتا۔ تمہاری کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ خط لکھے جارہا ہوں۔

مگر کچھ پتہ ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین بھی ہے کہ کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں تم مجھے ملوگی ضرور کیونکہ میری محبت سچی ہے اور قدرت اتنی ظالم نہیں ہے کہ وہ مزید ہمیں ملنے سے روکے۔ ہم ایک ہوکر ہی رہیں گے۔ قدرت کو ہماری محبت کی قدر کرنی ہی ہوگی۔

ہانی! تمہیں پتہ ہے۔ اب مجھے روزانہ دہری زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ ساری ساری رات آنسوؤں میں غوطہ زن رہتا ہوں اور صبح ہوتے ہی ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالیتا ہوں۔ خود بھی ہنستا ہوں اور لوگوں کو بھی ہنساتا ہوں۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ ایک بار ہنسنے کے لیے مجھے دل ہی دل میں کتنی بار رونا پڑتا ہے۔ کوئی میرے دل کے آنسوؤں کو جان بھی کیسے سکتا ہے۔

اور میں خود بھی نہیں چاہتا کہ کوئی انہیں دیکھ یا جان پائے۔ مگر کبھی کبھی اس مصنوعی زندگی سے تنگ آکر سوچنے لگتا ہوں کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ اس کا ختم ہوجانا ہی بہتر ہے..... مگر پھر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ میری یہ زندگی تو صرف تمہاری امانت ہے اور میں تمہاری امانت میں خیانت کیسے کرسکتا ہوں۔

اس وقت رات کے چار بج کر چالیس منٹ ہورہے ہیں۔ اب میں سونے لگا ہوں..... صبح چھ بجے سے پہلے پہلے جاگنا ہے ورنہ امی شور مچادیں گی۔"

خط ختم کرکے ہانیہ نے الٹ پلٹ کے دیکھا نہ تو لکھنے والا کا نام لکھا تھا اور نہ ہی کوئی ایڈریس۔ وہ دیوانوں کی طرح خط کو الٹ پلٹ کرتی رہی جیسے کاغذ کے کسی کونے سے نام پتہ جھڑ کر گرے گا۔ اس نے لفافے کو بھی چھان مارا مگر اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملی۔

اس کے چہرے پر گہری مایوسی کے بادل چھانے لگے اور اس مایوسی نے اسے پاگلوں کی طرح چلانے پر مجبور کردیا۔

"نہیں..... یہ بے ایمانی ہے۔ نو سال پہلے تم مجھے ایک خط تھما کر غائب ہوگئے تھے اور نو سال بعد پھر صرف ایک خط بھیج دیا۔ خود نہیں مل سکتے کیا' کہاں ہو تم' میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ میں تم کو اپنی بانہوں میں چھپالوں گی۔ ایک بار آجاؤ پھر بھی تم کو خود سے الگ نہیں ہونے دوں گی۔ صرف ایک بار مل جاؤ نا' صرف ایک بار۔"

ہانیہ کی آواز اس گمنام محبوب تک تو کیا پہنچتی' نیچے سوئے ہوئے اس کے ممی پاپا تک ضرور پہنچ گئی۔ اس کی ممی دوڑتے ہوئے اوپر آگئی۔

"کیا ہوا' کیا ہوا بیٹی' کیوں چلا رہی ہو؟'

"کک..... کچھ نہیں..... مم..... ممی۔ وہ ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔" ہانیہ شرمندگی سے بولی۔

اس کی زندگی بھی تو ایک خواب بن کر رہ گئی تھی جس کے ٹوٹنے' بکھرنے کا اب وقت قریب آگیا تھا۔ مگر وہ معصوم اس بات سے انجان تھی۔



رات دیر تک کریم خان اور اعیان مستیاں کرتے رہے۔ رات گئی بات گئی کی طرح۔ نئی صبح بہت سی پریشانیاں لیے بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کررہی ہے۔ ویسے بھی اس کیس نے کریم خان کے دن کا چین اور سکون اڑا کر رکھ دیا تھا۔ مگر رات کی نیند ابھی سلامت تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی رات اور راتوں کی نیندیں اپنی پیاری بیوی ثوبیہ کے نام کررکھی تھیں۔ اگرچہ ثوبیہ ابھی اپنے میکے گئی ہوئی تھی' مگر خواب میں کریم خان کا ساتھ نبھانے سے باز نہیں آتی تھی۔

لگتا تھا کہ اس کے خوابوں کو بھی شاید قسمت کی نظر لگنے والی تھی اور قسمت کے آگے تو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

کریم خان اپنے کیبن میں سب انسپکٹر سرفراز کے ساتھ رئیس علی نواز اور طارق محمود کے کیس پر ڈسکس کر رہا تھا۔ اگرچہ ڈی ایس پی زاہد علی نے کریم خان کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رکھا ہوا تھا مگر دباؤ ڈالنے کے لیے میڈیا ہی کافی تھا۔ جس کی ہر پانچویں خبر میں پولیس کی دل کھول کر کھچائی کی جا رہی تھی۔

"سر! ساری رپورٹس آ چکی ہیں۔" سرفراز نے کہا۔ کریم خان کی نظریں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھن کو محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں، بولو۔ کیا رپورٹس ہیں۔" کریم خان جلد سے جلد یہ کیس حل کر کے بے چینی سے نجات پانا چاہتا تھا۔

"سر! ان رپورٹس میں کئی باتیں چونکا دینے والی ہیں۔ نمبر ایک طارق محمود کا قتل شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ طارق محمود پارٹی میں شریک ہی نہیں ہوا تھا۔ کوئی ہے، جس نے اسے قتل کر کے اس کی شناخت چرائی اور اس کے دعوت نامے پر پارٹی میں شرکت کی۔ اب وہ کون ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے نمبر دو رئیس علی نواز کی پارٹی سے دو ایسے لوگوں کے فنگر پرنٹس ملے ہیں جو کسی بھی لاش کے فنگر پرنٹس سے میچ نہیں ہو رہے..... نمبر تین پہلے فنگر پرنٹ کی پہچان ہو چکی ہے وہ کمال نام کے کسی شخص کے ہیں جو سات سال پہلے مار پیٹ کے جرم میں چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا ہے..... نمبر چار دوسرے فنگر پرنٹ کی پہچان نہیں ہو سکی نمبر پانچ۔ جائے وقوعہ سے یہ لاکٹ ملا ہے۔" سرفراز کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ سرفراز نے کریم خان سے اجازت لی اور اس کے کیبن سے باہر نکل کر بات کرنے لگا۔

کریم خان نے لاکٹ ہاتھ میں لے کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ اس لاکٹ کو تو وہ ہزاروں بار دیکھ چکا تھا اور یہ لاکٹ جس گلے کی زینت بنتا تھا اسے بھی وہ جانتا تھا۔

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

سونے کی چین میں جڑے سونے کے لاکٹ پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ملاپ سے ایچ کا حرف بنا ہوا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتا تھا۔ یہ لاکٹ اسپیشل آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا اور اسے اپنی آنکھوں پر کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ لاکٹ ہمیشہ اعیان کی گردن میں دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اس لاکٹ کے بارے میں اعیان سے کئی بار پوچھا تھا مگر اس نے کبھی بھی ڈھنگ کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ ہمیشہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا لی اور ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔

"اعیان تم یہ لاکٹ ہر وقت کیوں پہنے رہتے ہو؟"

"کیونکہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔" اعیان نے ایک نٹ کھٹ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب کیا ہے تمہارا؟" وہ الجھی ہوئی نظروں سے اعیان کو دیکھتا ہوا بولا۔

"مطلب صاف ہے۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔"

"میں تم سے لاکٹ کے بارے میں بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بکواس ہی کیے جا رہے ہو۔" کریم خان جھلا گیا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کہ تم نے جوک سنانے کی فرمائش کی ہے۔" اعیان نے معصوم بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"یار مذاق مت کرو۔ یہ ایچ کون ہے۔"

"تمہارا نام کریم خان ہے نا۔"

"ہاں۔"

"خان میں کے کے بعد ایچ آتا ہے نا۔"

"ہاں آتا ہے۔"

''بس اسی لیے میں یہ لاکٹ پہنے رہتا ہوں۔''
اعیان اس لاکٹ کو بڑے پیار سے چھوتا ہوا بولا۔
کریم خان نہ جانے اور کتنی دیر تک ماضی میں کھویا رہتا کہ اس کے موبائل کی مسلسل بجتی بیل نے اسے ماضی سے حال میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جیب سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔
''ہیلو...... کیا...... کہاں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے اتنا ہی کہا۔ اسے ایک اور قتل کی خبر ملی تھی۔



ہانیہ رات کو دیر سے سوئی تھی۔ اس لیے صبح دیر تک سوتی رہی۔ جب وہ ناشتہ کر رہی تھی تو اس کے نام ایک اور خط آ گیا۔ اس نے خط لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی وہ لفافہ کھول بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا' جو نا معلوم تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو۔''
''ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ہانیہ کو وہ آواز کچھ سنی سی لگی۔
''ہاں میں ہانیہ ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟''
''میں تمہارا محبوب۔ کیا تم مجھ سے کل شاہ رکن عالم کے مزار کے پاس مل سکتی ہو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
اس بے تکی بکواس نے ہانیہ کا خون کھولا دیا۔ وہ غصے سے چلائی۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔''
''میں ہی وہ گمنام شخص ہوں جس نے آپ کو وہ خط بھیجے تھے۔'' دوسری طرف سے شرارتی لہجے میں بولا گیا۔
''کیا...... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' اسے جیسے یقین ہی نہیں ہوا۔ اسے لگا اس نے سننے میں غلطی کی ہے۔
''یار میں ہی ہوں جس نے کچھ سال پہلے آپ کو خط بھیجا تھا اور آج کل بھی میں ہی آپ کو خط بھیج رہا ہوں۔ اب میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''میں ابھی آ رہی ہوں۔ کہاں ہیں آپ۔'' یہ سن کر ہانیہ بے تاب سی ہو گئی تھی۔
''ابھی نہیں کل شام پانچ بجے۔ شاہ رکن عالم کے مزار پر۔'' اجنبی نے پھر کہا۔
''کل نہیں۔ آج اور ابھی ملتے ہیں نا۔'' ہانیہ کے لہجے میں برسوں کی تڑپ تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنے محبوب تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔
''آج نہیں۔ کل ہی ملیں گے۔''
''اچھا اپنا نام تو بتا دو اور یہ نمبر آپ کا ہی ہے نا...... آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔'' ہانیہ بے خودی ہو کر کئی سوال ایک ساتھ کرتی گئی۔
''ارے بابا سانس تو لینے دو۔ کل تو ہم مل ہی رہے ہیں۔ تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ اوکے بائے' ٹیک کیئر۔'' اجنبی نے اس کا جواب سنے بغیر ہی لائن کاٹ دی۔
وہ کچھ دیر تو حیرانی سے اپنے موبائل کو دیکھتی رہی پھر پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔



کریم خان کی پولیس جیپ پوری رفتار سے سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ شہر سے باہر کی طرف تھا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ شہر کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ کافی آگے آ کر اس نے اپنی جیپ کچے راستے پر ڈال دی اور کوئی دو کلو میٹر اسی کچے راستے پر چلتے ہوئے اپنی جیپ ایک کھنڈر کے آگے روک دی۔ جس کے باہر اس کی پوری ٹیم کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔
یہ کھنڈر کسی پرانی حویلی کے تھے۔ جو اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ پچھلے کچھ سالوں میں یہاں آنے والے کئی لوگ پراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس لیے اب اس کھنڈر کو آسیب زدہ تصور کر لیا گیا تھا اور لوگ یہاں سے کترا کر نکل جاتے تھے۔
کریم خان اپنی ٹیم کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ حویلی کے کمروں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس اندھیرے کی وجہ سے وہ کمرے کافی ہیبت ناک نظر آ رہے تھے۔ اس نے سپاہیوں کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور چراغ دین اور سرفراز کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں قتل ہوا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ ناپید تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چراغ دین نے ٹارچ روشن کر کے اس کا رخ لاش کے چہرے کی طرف کر دیا۔ لاش کا چہرہ دیکھ کر کریم خان کا منہ کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ کمرے میں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت دونوں سب انسپکٹر نہیں دیکھ سکے ورنہ وہ ضرور پوچھتے اور کریم خان اس وقت کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

یہ لاش اسی شخص کی تھی جسے اس نے کل پارک میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اعیان کے ساتھ وہاں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ شاید اسی کو دیکھ کر اعیان چونکا تھا اور کریم خان کو کھینچتا ہوا ہوٹل لے گیا تھا۔

اس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کو کیا لگتا ہے اس کا قتل کس نے کیا ہوگا۔''

''اس میں لگنا لگانا کیا سر! یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ کسی بھوت کے علاوہ......''

ابھی چراغ دین اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ باہر سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ وہ تینوں چونکے اور باہر کی طرف بھاگے۔

ایک سپاہی زمین پر گرا ہوا تھا جبکہ باقی سپاہی ڈرے سہمے اس سے کچھ دور کھڑے تھے۔ کریم خان دور سے ہی چلایا۔ ''کیا ہوا؟''

''سر! کسی نے میری ٹانگ پکڑ رکھی ہے۔'' سپاہی بہت گھبرایا ہوا تھا۔

کریم خان اس کی طرف بڑھا۔ سپاہی کی ایک ٹانگ جھاڑیوں کے اندر تھی۔ کریم خان نے ٹٹول کر دیکھا۔ سپاہی کی ٹانگ کسی جنگلی بیل میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کریم خان کی ہنسی چھوٹ گئی اور اس نے سپاہی کی ٹانگ بیل سے باہر نکالی۔ باقی سب لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب اسے کسی بھوت کا کارنامہ سمجھ کر سہمے ہوئے تھے اور اب وہ خود اپنی ہی بے وقوفی پر مسکرا رہے تھے۔

''سرفراز تم سپاہیوں کو لے کر کھنڈر کی اچھی طرح تلاشی لو اور چراغ دین تم روشنی کا انتظام کرو۔'' کریم خان نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرہ روشن تھا اور کریم خان کے ساتھ چراغ دین اس کمرے میں موجود تھے جبکہ سرفراز ابھی بھی اپنی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔

لاش اتنی بری حالت میں تھی کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کسی شیطان نے مارا ہو یا پھر بدلے کی آگ میں جل کر انسان سے حیوان بن چکے کسی شخص نے بھنبھوڑا ہو۔ مرنے کے بعد بھی لاش کی آنکھوں میں خوف صاف جھلک رہا تھا۔

لاش کے ماتھے پر زخم تھے جس سے لگ رہا تھا کہ اس کا سر زور زور سے دیوار یا فرش سے ٹکرایا گیا ہوگا۔ اس کے کچھ دانت بھی ٹوٹے ہوئے تھے جو لاش کے پاس ہی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ بھی آس پاس ہی پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا ہاتھ کہنی سے کچھ نیچے سے الگ ہو کر لاش کے پاس پڑا تھا جبکہ ایک کان بھی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ سینے، پیٹ اور کمر پر پچیس سے زیادہ چھوٹے بڑے زخم تھے جو کسی چاقو یا خنجر سے لگائے گئے تھے۔ جس نے بھی اس شخص کو مارا تھا، بہت ہی بے رحمی سے تڑپا تڑپا کے اور نہایت اطمینان سے مارا تھا۔ کریم خان جیسا انسپکٹر بھی لاش کی ایسی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے لرز اٹھا تھا۔

پھر اس کی نظر اس کٹے ہوئے ہاتھ پر گئی جس پر سات کا عدد گدا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بے خیالی میں سات کے ہندسے کو گھورتا رہا۔

''اس قتل کی اطلاع کس نے دی تھی۔'' اس نے چراغ دین سے پوچھا۔

''کال کسی پی سی او سے آئی تھی۔'' چراغ دین نے جواب دیا۔

''اس کی شناخت ہوگئی یا نہیں؟'' اس کی آنکھیں لاش پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''نہیں سر!''

''جلد سے جلد اس کی پوری تفصیل معلوم کرو۔اس کے دوست دشمن سب ہی کی فہرست کل تک میری میز پر ہونی چاہئے۔''اس نے چراغ دین کو آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد سرفراز بھی اس کمرے میں آ گیا۔

''سر!ہم نے پورا کھنڈر چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔'' کہتا ہوا کریم خان کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد شہر پہنچ کر وہ ایک جیولرز کی دکان پر اس لاکٹ جیسا دوسرا لاکٹ بنوا رہا تھا جس کے بننے میں پورے دو گھنٹے لگ گئے۔اس نے دونوں لاکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھے۔کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لاکٹ ہیں یا ان میں سے کون سا پرانا ہے اور کون سا نیا۔

دونوں لاکٹ لے کر اس نے اعیان کے گھر کا رخ کیا۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لاکٹ اعیان کا ہے بھی یا نہیں۔اگر اعیان کے گلے میں لاکٹ ہوا تو کوئی بات نہیں تھی اور اگر لاکٹ غائب تھا تو پھر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے پاس جو لاکٹ ہے وہ اعیان کا ہی ہے کیونکہ اعیان کبھی بھی وہ لاکٹ خود سے جدا نہیں کرتا تھا۔

کریم خان مسلسل اعیان کے دروازے کی بیل بجا رہا تھا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اعیان دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔اتنی بار بیل بجانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا گیا تو اس نے جھنجلا کر آخری بار بیل بجانے کا ارادہ کیا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

''اتنی صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' اعیان نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''بارہ بج چکے ہیں جناب اور آپ کے لیے ابھی صبح ہی ہے۔'' کریم خان نے سے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے وہ کہاوت تو سنی ہی ہوگی کہ جب میں جگا۔ تب ہوئی صبح۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہوں تو میرے لیے صبح ہی ہوئی نا یار۔'' اعیان پلکیں جھپکا کر معصومیت سے بولا۔

کریم خان نے کچھ نہیں کہا' بس تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔اعیان اس کے گھر کے اندر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب کریم خان اندر داخل نہیں ہوا تو اسے بولنا ہی پڑا۔

''مانا کہ آج میں بہت خوبصورت لگ رہا ہوں۔اس لیے تم مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔مگر میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔اندر آ کر آرام سے بیٹھ کر مجھے دیکھتے رہنا۔ویسے بھابھی سے کہنا پڑے گا کہ تم انہیں طلاق دے کر مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔مگر میں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی نہیں کرنی۔میں گے نہیں ہوں یار۔'' اعیان نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''بکومت۔'' کریم خان جھینپتا ہوا بولا اور اندر آ گیا۔

''سچ تو ہمیشہ کڑوا ہی لگتا ہے میری جان۔'' اعیان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔اندر آ کر اعیان ایک صوفے پر لیٹ گیا اور کریم خان نے اس کے سامنے نشست سنبھالی۔

''کیا لو گے۔ٹھنڈا پانی' سوڈا پانی یا لیموں پانی۔''اب اعیان نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جن چیزوں کا نام لے رہا ہے وہ لانے کا ارادہ بھی ہو۔بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کریم خان کے منہ سے ''کچھ نہیں'' کہلوانے کے موڈ میں ہو۔

''کافی۔''

''کولڈ کافی' وہائٹ' بلیک یا گرین؟'' اس نے آنکھیں موندے ہی پوچھا۔

''میرے باپ جیسی بھی بنا لو۔'' کریم خان اس کی نان اسٹاپ چلتی زبان کو روکنے کے لیے بولا۔

اعیان اٹھا اور مسکراتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کریم خان کو یاد آیا کہ اس نے اعیان کے گلے میں لاکٹ پر تو دھیان دیا ہی نہیں۔عیان

کی باتوں میں الجھ کر وہ اپنے مقصد کی بات بھول گیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد اعیان کافی کے دو کپ بنا کر لے آیا۔ کافی پیتے ہوئے کریم خان نے غور کیا تو اس نے دیکھا کہ اعیان کے گلے میں وہ لاکٹ نہیں تھا۔
''اعیان آج تم نے اپنی جان سے پیارا لاکٹ کیوں نہیں پہن رکھا۔'' تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔
''سونا چاندی عمر بھر ساتھ نہیں دیتا میری جان۔'' اعیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''تو کیا تم نے اسے اتار کر کہیں رکھ دیا ہے۔''
''نہیں' وہ تمہارے پاس ہے۔ چلو جلدی سے میرا لاکٹ نکالو۔'' اعیان نے کہا۔
اعیان کے جواب سے کریم خان بھونچکا رہ گیا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ اعیان کا جواب یہ ہوگا کہ کہیں کھو گیا۔ مگر اعیان تو۔
''میرے...... پاس...... کیوں ہونا چاہئے۔'' کریم خان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''کیوں اور کیسے جیسے سوال بچوں کے منہ سے اچھے لگتے ہیں۔ چلو جیب میں ہاتھ ڈالو اور نکالو میرا لاکٹ۔''
''تمہیں پتہ ہے یہ مجھے کہاں سے ملا ہے؟'' کریم خان نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا۔
''تم سے جو کہا گیا ہے پہلے وہ کرو۔ بعد میں اپنی زبان کھولنا۔'' اعیان نے پھر شرارتی انداز میں کہا۔
کریم خان نے چپ چاپ نیا والا لاکٹ نکالا اور اعیان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔
اعیان اس لاکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی چونکا' پھر اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یار پولیس والے ہو کر دھوکا دیتے ہو۔ یہ میرا لاکٹ نہیں ہے۔''
''وہ میرے پاس ہے۔ تم فی الحال اسے ہی پہنے رہو۔'' کریم خان نے کہا۔ وہ حیران تھا کہ دونوں لاکٹ ایک جیسے تھے پھر اعیان نے کیسے پہچانا۔
''تو یہ بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔'' اعیان لاکٹ کو کریم

نظم

کون...... کس مقام پر بچھڑ گیا
ہم سے
کچھ یاد نہیں
یاد رہا تو بس اتنا
کہ جو بچھڑ گیا
ایک بار
وہ پھر دوبارہ
ملا نہیں

کاجل شاہ...... خانیوال

خان کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔
''اسے پہن لے نا یار۔'' اس بار کریم خان کا لہجہ قدرے ملتجی تھا۔ وہ اعیان کو لاکٹ پہنانا چاہتا تھا کیونکہ جس طرح وہ جانتا تھا کہ اعیان ہر وقت وہ لاکٹ پہنے رہتا ہے۔ تو کوئی اور بھی ضرور جانتا ہوگا اور اعیان کے گلے میں لاکٹ نہ دیکھ کر کوئی شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا اور کریم خان اسے ہر طرح سے بچانا چاہتا تھا۔
اعیان نے اس کی بات مان لی اور برا سا منہ بناتے ہوئے وہ لاکٹ پہن لیا۔ کافی ختم کر کے اس نے اعیان سے اجازت لی اور باہر نکل گیا۔
اگر اعیان کی جگہ کوئی اور یوں کریم خان کے شک کے دائرے میں آتا چاہے وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہوتی تو وہ اب تک اسے لاک اپ میں ڈال چکا ہوتا مگر وہ اعیان کو ہر طرح کے شک سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ویسا ہی لاکٹ بنوا کر اعیان کو زبردستی پہنا بھی دیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اعیان پر کوئی الزام آتا ہے وہ ہر الزام اپنے سر لے لے گا۔ یہی تو اس کی دوستی تھی۔
جب اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا تو اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اعیان کی وجہ سے

وہ سارا دن کافی ذہنی اذیت کا شکار رہا تھا جس کی وجہ سے وہ خود کو بہت تھکا تھکا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹا مگر نیند اسے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

موبائل کی مسلسل بیل سے اس کی نیند ٹوٹی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا اور اسکرین پر لکھا نام دیکھ کر مسکراتے ہوئے کان سے لگالیا۔

"ہیلو میری ثوبی۔ کیسی ہو۔" وہ بولا۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر مجھے میرا پیارا پیارا سا بے بی کچھ پریشان لگ رہا ہے۔" دوسری طرف سے ثوبیہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

وہ تنہائی میں کریم خان کو اکثر بے بی کہہ کر بلاتی تھی اور جب زیادہ ہی پیار آتا تھا تو راجہ کہہ کر پکارتی تھی۔

"تم پاس نہیں ہو تو دل پریشان ہی رہے گا نا۔ تم آجاؤ نا۔" کریم خان نے اپنے لہجے کو ہر ممکن خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

"ارے رے رے۔ میرے بے بی کو میری اتنی یاد آرہی ہے کہ یاد میں تڑپ تڑپ کے جھوٹ بھی بولنا سیکھ گیا ہے۔ چلو اب یہ نوٹنکی بند کرو اور سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے۔ تم پریشان کیوں ہو۔" ثوبیہ نے پہلے پیار سے ڈانٹا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یار ہر کوئی میری بات مان لیتا ہے مگر ایک تم ہو کہ۔"

"یہ بیکار کی باتیں کبھی ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔ ابھی تو یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے؟" ثوبیہ نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ سب میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اچھا جی ایسا ہے کیا۔" ثوبیہ چہکی۔

"تم سے ایک کام ہے۔ کرلو گی؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"بے بی تمہارا ایک کیا سارے کام کرنے کو تیار ہوں مگر اتنی دور سے کیسے کروں، مجبور ہوں۔" ثوبیہ رندھے ہوئے لہجے کا ناٹک کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں لینے کے لیے اعیان کو بھیج رہا ہوں۔ تم کسی بھی بہانے اسے آٹھ دس دن روک کے رکھنا۔ اس کے بعد اعیان کے ساتھ آجانا۔" کریم خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور کوئی حکم میرے سرتاج!" ثوبیہ کی یہ بات اچھی تھی کہ وہ کریم خان کی ہر بات بغیر زیادہ سوال کیے مان جاتی تھی۔

"اور اعیان کو یہ بھی مت بتانا کہ میں نے تمہیں اسے روکنے کے لیے کہا ہے۔" اس نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کریں۔ اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا۔ امی بلا رہی ہیں۔ بعد میں کال کرتی ہوں۔ بائے اور ہاں بے بی کھانا وقت پر کھاتے رہنا۔ باہر کی تلی بھنی چیزیں مت کھانا بیمار پڑ گئے تو عیادت کی بجائے ناراض ہوجاؤں گی۔" ثوبیہ فون بند کرنے سے پہلے بیویانہ فریضہ نبھاتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا موبائل بیڈ پر پھینکا اور نہانے کا ارادہ کرتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بیڈ کی طرف آیا۔ اس نے یہی سوچا کہ ثوبیہ کوئی بات کہنا بھول گئی ہوگی اس لیے دوبارہ فون کیا ہے۔ مگر اسکرین پر کوئی انجان نمبر بلنگ کر رہا تھا۔ اس نے ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"کریم خان! میری بات غور سے سنو۔ آج رات بارہ بجے فیز فائیو اسٹریٹ نمبر دو، بنگلہ نمبر تین میں کمال کے چار ساتھی اکٹھے ہونے والے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں گرفتار کر سکتے ہو۔ وہ سفید رنگ کا بنگلہ ہے۔ بائے۔" یہ کہتے ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی اور کریم خان ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔

ابھی اس نے موبائل کان سے ہٹایا ہی تھا کہ میسج کی ٹون بجی۔ اس نے دیکھا وہی انجان نمبر تھا اور اس پر وہی ایڈریس بھیجا گیا تھا جو ابھی فون کرنے والے نے بتایا تھا۔

کریم خان نے اسی نمبر پر کال بیک کی لیکن موبائل سوئچ آف ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔ شکریہ۔''

وہ موبائل ایک طرف رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی جو ساڑھے دس بجا رہا تھا۔ اسے جو بھی کرنا تھا ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر کرنا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سرفراز کا نمبر ڈائل کیا۔

''السلام علیکم سر!'' سرفراز کی آواز سنائی دی۔

''میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس کے بارے میں تفصیلی انفارمیشن نکلواؤ اور ہو سکے تو لوکیشن بھی ٹریس کرلو۔''

''اوکے سر! آپ نمبر سینڈ کردیں۔''

''ہو سکے تو ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے یہ ساری تفصیل چاہیے۔''

''جی سر! میں کوشش کرتا ہوں۔'' سرفراز نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس نے چراغ دین کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو سر! رات کو ہماری یاد کیسے آ گئی۔'' چراغ دین کی شوخ آواز سنائی دی۔

کریم خان نے چراغ دین کو پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ابھی مجھے انفارمیشن ملی ہے کہ رات کے بارہ بجے کمال کے چار ساتھی یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کرنا ہے۔''

''اوکے سر! مگر یہ کمال کون ہے اور کس جرم میں گرفتاری کرنی ہے۔''

''یہ وہی کمال ہے جس کے فنگر پرنٹ رئیس علی نواز کی پارٹی سے ملے تھے۔''

''اوہ! اس ناچیز کو کیا کرنا ہے۔'' چراغ دین نے حیران ہو کر کہا۔

''تم ٹیم کو لے کر ساؤتھ اسٹریٹ پر میرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور ہاں تم لوگ سادہ لباس میں آنا اور پولیس کی گاڑی کا استعمال مت کرنا۔ وہ بائیک بھی مت استعمال کرنا جس پر پولیس لکھا ہو اور پولیس کے جوتے بھی مت پہننا۔'' کریم خان کسی انجانے شک کی وجہ سے وہاں جا رہا تھا۔ اس لیے وہ کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

''اور کوئی حکم سر!'' چراغ دین نے حیرت سے سنتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ بس میرے آنے تک سب وہاں پہنچ جانے چاہئیں۔ اوکے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے ہولسٹر میں ریوالور لگایا اور بائیک لے کر فیز فائیو کی طرف دوڑا دی۔ وہ وہاں پہنچ کر لوکیشن دیکھنا چاہتا تھا۔

بیس منٹ بعد وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ اس گلی میں ابھی کنسٹرکشن ہو رہی تھی اور کئی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کا ہی بنگلہ تھا جس کا صرف گیٹ کالا تھا اور اس پر بھی بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

اس نے بڑے غور سے آس پاس کا معائنہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بائیک پر بیٹھ کر ساؤتھ اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی ٹیم اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنی ٹیم پر ڈالی جو اس کی ہدایت کے مطابق سادہ لباس میں تھی۔ پھر اس نے آصف سے کہا۔

''اپنا موبائل مجھے دو۔''

آصف کو کچھ حیرت ہوئی پھر اس نے اپنا موبائل کریم خان کو دے دیا۔ کریم خان اس پر کچھ ٹائپ کرتا رہا پھر موبائل آصف کو واپس دیتے ہوئے بولا۔ ''تم سب کو لے کر اس پتے پر پہنچ جاؤ اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس سفید بنگلے کی نگرانی کرو۔ ہم کچھ دیر بعد وہاں پہنچیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر! اور کچھ۔'' آصف نے موبائل میں ایڈریس دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی اس بنگلے میں داخل ہو یا باہر آئے۔ مجھے فوراً اطلاع دینا اور اگر کوئی اس بنگلے سے نکل کر کہیں جائے تو خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس کا پیچھا کرنا۔''

آصف ٹیم کو لے کر جانے ہی والا تھا کہ کریم خان نے ایک اور حکم جاری کیا۔ "سب لوگ اپنے اپنے موبائل وائبریٹ پر کرلیں۔"

سب نے ہدایت پر عمل کیا اور چراغ دین کے علاوہ سب وہاں سے روانہ ہوگئے۔

سب کے جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور چراغ دین کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے پیچھے چل دیئے۔ کچھ دور جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بائیک نثار شہید پارک کے پاس روک دی۔ پارک میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ زیادہ تر سناٹا تھا۔ وہ ایک طرف گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور چراغ دین ابھی بیٹھنے ہی والا تھا کہ کریم خان کا موبائل وائبریٹ ہونے لگا۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ سرفراز کی کال تھی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو سر!" دوسری طرف سے سرفراز کی پرجوش آواز آئی۔

"کچھ معلوم ہوا۔" اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر پوچھا۔

"سر! یہ نمبر کمال کا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کمال وہی شخص ہے جس کی لاش ہمیں صبح کھنڈر میں ملی تھی۔"

"اوہ۔" پھر وہ بولا۔ "میں اور چراغ دین' نثار شہید پارک میں تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ تم جلدی سے یہاں پہنچ جاؤ۔" اس نے لائن کاٹنے کے بعد موبائل میں وقت دیکھا۔ سوا گیارہ ہورہے تھے۔ اس نے موبائل اپنی جیب میں رکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چراغ دین الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھے جارہا تھا۔

کریم خان جلد بازی میں گرفتاریاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان پر نظر رکھ کر کمال کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹیم تربیت یافتہ تھی' پھر بھی اگر کچھ گڑبڑ ہوتی تو وہ ان کے بہت قریب تھا۔

کریم خان کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی اپنی مرضی نہیں چلاتا تھا بلکہ اپنے ٹیم ممبرز سے بھی مشورے لیتا رہتا تھا' شاید ساتھیوں میں اس کی عزت کی ایک وجہ یہ بات بھی تھی۔

رئیس علی نواز کی پارٹی میں دو ایسے لوگوں کے فنگر پرنٹ پائے گئے تھے جو کسی لاش سے میچ نہیں ہورہے تھے اور ان میں سے ایک کمال کے فنگر پرنٹ تھے اور کریم خان اس کے ساتھیوں پر نظر رکھ کر کمال تک پہنچنا چاہتا تھا مگر سرفراز کی باتوں نے تو معاملہ ہی کچھ اور کردیا تھا۔ جس کمال پر اسے شک تھا اس کی لاش وہ صبح ہی دیکھ چکا تھا اور جس نمبر سے انفارمر نے کال کی تھی وہ بھی کمال کا ہی تھا۔

اس ایک بات نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا تھا کیونکہ جس طرح سے کوئی ایک کے بعد ایک سارے ثبوت مٹاتا جارہا تھا' اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے انہیں گرفتار کیے بنا چھوڑ دیا تو ان کا مارا جانا یا پھر غائب ہوجانا یقینی تھا۔

اور یہ بات بھی اسے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ کمال کے فون سے اسے کال کرنے والا کون تھا۔ کال کرنے والا کم از کم اعیان تو نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس کی آواز تو کریم خان لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا اور اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ انفارمر نے لہجہ بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنی اصلی آواز میں ہی بول رہا تھا۔ آخر انفارمر نے کمال کا نمبر ہی کیوں استعمال کیا تھا؟

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اسی نے کمال کو قتل کیا تھا اور اب اسی کے نمبر سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع دی تھی مگر وہ تھا کون اسی بات سے کریم خان سخت جھلاہٹ کا شکار ہورہا تھا۔

کیا کمال کا کوئی ایسا ساتھی تھا جو بغاوت پر اتر آیا تھا اور اسے مارنے کے بعد اب اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفتار کروانا چاہتا تھا یا پھر وہ کمال کا کوئی دشمن تھا۔ جو بھی معاملہ تھا کریم خان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کریم خان کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہو۔ یا پھر اسے کسی سازش میں پھنسانے کے لیے بلایا گیا ہو۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا

کہ اسے سامنے سے سرفراز آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل میں وقت دیکھا گیارہ بج کر چھبیس منٹ ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر اس نے سرفراز اور چراغ دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ساڑھے دس بجے کسی انجان نمبر سے مجھے ایک کال آئی تھی۔ اس نے مجھے بنگلے کا پتہ سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ کمال کے چار ساتھی رات بارہ بجے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم چاہیں تو انہیں گرفتار کر سکتے ہیں۔ اب کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ جس نمبر سے مجھے کال آئی تھی وہ کمال کا تھا اور کمال کی لاش ہم صبح ہی دیکھ چکے ہیں۔''

''سر! جتنی بے رحمی سے کمال کو قتل کیا گیا ہے وہ ضرور بھوت بن گیا ہوگا اور اس کا بھوت چاہتا ہوگا کہ اس کے مارنے والوں کو سزا ملے اسی لیے اس نے کال کی ہوگی۔'' چراغ دین جیسے ضعیف الاعتقاد سے ایسی ہی بات کی امید رکھی جا سکتی تھی۔

چراغ دین کی بات سن کر اتنی پریشانی میں بھی کریم خان کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ایک نظر سرفراز پر ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو کہ بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔

''سر! مجھے لگتا ہے کہ کمال کے ہی کسی ساتھی نے اس کا مرڈر کیا ہے۔ اب اسے ڈر ہے کہ اس کے ساتھی اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں، وہ انہیں گرفتار کروانا چاہتا ہے۔'' سرفراز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''وہ کون ہے، کون نہیں؟ یہ بعد میں سوچیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی ہمیں کیا کرنا ہے۔''

اس سے پہلے کہ چراغ دین یا سرفراز کوئی جواب دیتے اس کا موبائل پھر بج اٹھا۔ اس نے دیکھا اسکرین پر آصف کا نام چمک رہا تھا۔

''ہاں ہیلو۔''

''سر! ابھی ابھی ایک آدمی نیلی مرسڈیز میں آیا ہے اور کار باہر ہی کھڑی کر کے وہ بنگلے کے اندر جا چکا ہے۔'' آصف نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

''او کے۔ ہمارے آنے تک تم لوگ بنگلے سے دور ہی رہو۔ کوئی اور بنگلے میں آئے تو مجھ سے رابطہ کرنا۔'' اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

''ہاں اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے پھر سے وہی سوال اپنے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھا۔

''سر! اگر وہ سچ مچ کمال کے ساتھی ہیں تو ان میں سے کوئی بھی بچ کر جانا نہیں چاہیے۔ وہ اس کیس کی تفتیش میں ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔'' چراغ دین نے اس بار عقل کی بات کی تھی۔

''سر! چراغ صحیح کہہ رہا ہے۔ اب ہمیں جلد سے جلد اس بنگلے پر پہنچ جانا چاہیے۔'' سرفراز نے بھی چراغ دین کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان کچھ بولنا چاہتا تھا کہ پھر آصف نے کال کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک اور آدمی بنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ کریم خان نے ٹائم دیکھا گیارہ بج کر پچپن منٹ ہو رہے تھے۔ اب اس نے بھی دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گھاس سے اٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں سفید بنگلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے نظر دوڑائی تو اس کے ساتھی مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے اس بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس وقت بارہ بجنے ہی والے تھے جب ایک سرخ رنگ کی کار بنگلے کے باہر آ کر رکی جہاں پہلے ہی سے دو کاریں موجود تھیں۔ اس سرخ کار میں سے دو آدمی اتر کر بنگلے میں چلے گئے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کمال کے چاروں ساتھی اس وقت بنگلے میں پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے اشارہ کر کے اپنی ٹیم کو پاس بلا لیا۔

''پہلے میں بنگلے کے اندر جاؤں گا اور مجھے کور کرتے ہوئے چراغ دین میرے پیچھے آئے گا۔'' پھر اس نے ایک طرف کھڑے تین ممبرز سے کہا۔ ''تم تینوں ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے ہمارے پیچھے آنا۔'' اپنے ساتھیوں کو اس نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں

کاروں کے پاس ہی چھپے رہنا اور سرفراز تم بنگلے کی پچھلی طرف چھپ جاؤ اور آصف تم اس طرف چھپ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' کریم خان نے سب ساتھیوں کو ان کی پوزیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم پر باہر سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان سے سیدھا بھڑنے کی بجائے تم لوگوں کو بس یہ دھیان رکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بنگلے کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔ اندر میں سب سنبھال لوں گا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا، پھر بولا۔ ''چلو سب جلدی جلدی اپنی پوزیشن لے لو۔'' اس کے کہنے کی دیر تھی کہ سب حرکت میں آ گئے۔

وہ ریوالور ہاتھ میں لے کر بنگلے کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آنے لگے۔ اس نے قریب پہنچ کر اندازہ لگا لیا کہ گیٹ اندر سے لاک نہیں ہے، اس نے ہلکا سا دھکا دیا اور گیٹ کھلتا چلا گیا۔

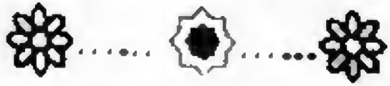
وہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو گیٹ کے پاس ہی رکنے کا اشارہ کیا اور باقی تینوں کے ساتھ آگے چلنے لگا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ شاید انہیں اس طرح کسی کے آنے کی امید ہی نہیں تھی۔ کریم خان نے ایک گہری سانس کھینچ کر دروازے پر زور کی لات ماری اور دروازہ کھلتے ہی وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر موجود چاروں افراد انہیں دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔ ''کک..... کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟''

کریم خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔''

ان کی حیرانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان پر قابو پا لیا تھا اور جب تک ان کی حیرت دور ہوتی انہیں بے بس کر دیا گیا۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے کریم خان کے ہاتھ آنے والے نہیں تھے۔

ان چاروں کے پاس سے جدید ریوالور برآمد کر لیے گئے۔ بنگلے کی تلاشی لی گئی مگر انہیں کچھ نہیں ملا۔



انسان سوکھے پتوں کی طرح ہوتا ہے۔ جسے قسمت کی ہوا کب کہاں اڑا لے جائے کوئی نہیں جانتا اور یہ زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صدیوں تک ایک کے بعد ایک خواب دکھاتی رہتی ہے، پھر کسی دن اچانک سب کچھ بکھیر کر رکھ دیتی ہے اور انسان کو اپنے خوابوں کی قبر پر آنسوؤں کے پھول چڑھانے کے لیے زندہ چھوڑ دیتی ہے۔

ایسے ہی کئی خواب زندگی نے ہانیہ کی آنکھوں میں بھی سجا رکھے تھے۔ جو پورے ہونے والے تھے یا ٹوٹنے والے تھے۔ کوئی نہیں جانتا۔

اس کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت آئی جب اس کے ہائی اسکول کا رزلٹ آیا تھا۔ اس نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے ٹھیک پندرہ دنوں بعد اس کے نام ایک خط آیا جسے پڑھ کر اسے پتہ چلا کہ کوئی لڑکا اس سے حد سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر وہ لڑکا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس لڑکے نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

ہانیہ کو وہ خط پڑھنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ روزانہ وہ خط پڑھنے لگی اور خط پڑھتے پڑھتے کب اسے اس لڑکے سے محبت ہوئی، وہ خود بھی نہیں جانتی۔

انہی دنوں اس کے پاپا کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا۔ وہ بہت روئی، بہت چلائی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ وہ اپنے محبوب کا شہر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نئے شہر میں آ کر وہ ہر دم اداس رہنے لگی۔ یہاں کئی لڑکوں نے اس سے دوستی کرنی چاہی مگر اس نے سب کو دھتکار دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا محبوب اسے ضرور تلاش کر لے گا۔

ہانیہ نے اپنی گمنام محبت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ اگر وہ بتاتی بھی تو لوگ اسے پاگل سمجھ کر اس کا مذاق ہی اڑاتے اور اپنا مذاق بنوانا کسے پسند ہوتا ہے۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کی محبت گہری ہوتی جا رہی تھی اور آخر کار ایک دن اس کا یقین صحیح ثابت ہو گیا۔ پورے نو سال بعد اس کے نام ایک اور خط آیا۔ نئے لفافے میں بند وہ خط ایسا لگتا تھا جیسے آٹھ یا نو سال پہلے لکھا گیا ہو۔ اس سے اگلے دن پھر ایک خط آیا اسے دیکھ کر بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی آٹھ یا نو سال پرانا ہو اور یہ بھی نئے لفافے میں بند تھا۔ دوسرے خط کے بعد اس گمنام محبوب کی کال آئی تو اسے سارے جہان کا خزانہ مل گیا۔ محبوب نے اس کے دیدار کی تمنا پوری کرتے ہوئے اسے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ خوش کن لمحات تھے۔

اس نے دن میں کئی مرتبہ اپنے محبوب کو کال کرنے کے بارے میں سوچا لیکن کال نہیں کر پائی اور آج تو جیسے وقت نے بھی اپنی رفتار انتہائی دھیمی کر لی تھی، گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یا شاید ہانیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کے لیے ایک ایک پل کا شاصدیوں برابر لگ رہا تھا۔

اس رات اسے نیند بھی نہیں آئی اور جب وہ زیادہ ہی بے چین ہوئی تو رات کو ایک بجے کے قریب اپنے محبوب کو کال ملا ہی دی۔ کئی بیلیں جانے کے بعد کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو۔'' بولنے والے کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سے جاگا ہو۔

''ہیلو کیسے ہیں آپ؟'' ہانیہ چہکتے ہوئے بولی۔

''یہ خیریت معلوم کرنے کا کون سا وقت ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے۔'' ہانیہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا۔

''تو اتنی رات کو صرف نام معلوم کرنے کے لیے کال کی ہے۔'' وہ لگ بھگ چیختے ہوئے بولا۔

''نہیں بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ کل آنا مت بھولنا۔'' وہ معصومیت سے سہمتے ہوئے بولی۔

''ارے میں نے ہی تمہیں بلایا ہے تو میں خود آنا کیسے بھول سکتا ہوں۔'' اس بار اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

''اپنے بارے میں کچھ تو بتائیے نا۔'' ہانیہ کا مقصد تو صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا تھا۔

''کل سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''مگر مجھ سے کل تک کا انتظار نہیں ہو پا رہا ہے۔''

''پلیز۔ ابھی مجھے سونے دو۔ بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ کل جو دل چاہے پوچھ لینا۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔

ہانیہ نے اپنا موبائل ایک طرف رکھا اور وہ بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔



کرو گے یاد تو ہر بات یاد آئے گی
گزرتے وقت کی ہر موج ٹھہر جائے گی
یہ چاند بیتے زمانوں کا آئینہ ہوگا
یہ چاند......

موبائل کی مسلسل بجنے والی بیل نے کریم خان کو نیند کی وادی سے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیے ہی ادھر ادھر ہاتھ مارا مگر موبائل نہیں ملا تو مجبوراً اس نے آنکھیں کھول دیں۔ موبائل تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا جب اس نے موبائل ہاتھ میں لیا تو اس وقت لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔ اس نے کال ہسٹری چیک کی تو اعیان کی دس مس کالیں آ چکی تھیں۔ ابھی وہ اعیان کو کال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل پھر سے گنگنانے لگا۔

''ہیلو۔'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو کو مارو گولی۔ پہلے یہ بتاؤ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے۔ کہیں بھابی کی غیر موجودگی میں کسی اور۔''

''بکواس بند کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔''

''اور تم بھی یہ جان لو کو تمہیں کال کر کر کے میری انگلیاں بھی دکھنے لگی ہیں۔ تمہیں کچھ احساس بھی ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ انگلیاں کتنے کام کی چیز ہوتی ہیں۔'' اعیان اپنی عادت کے مطابق شروع ہو چکا تھا۔

''سو رہا تھا یار۔'' اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

ابھی بھی اسے بہت گہری نیند آ رہی تھی۔
"کس کے ساتھ۔"
"تمہارے بھوت کے ساتھ۔" اس نے چڑ کر کہا۔
"پھر بھی ابھی تک زندہ ہو۔ یقین نہیں آ رہا۔" اس کے چڑنے کا اعیان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔
"کل تم فری ہونا۔" اسے پتہ تھا کہ اعیان کی بکواس یونہی چلتی رہے گی اس لیے اس نے اپنا ہی سوال کر دیا۔
"یار ابھی میں اتنا بھی فالتو نہیں ہوا ہوں کہ فری میں بٹنے لگوں۔ چلو تمہاری خاطر بٹ بھی جاؤں گا۔ پہلے یہ تو بتاؤ کام کیا ہے۔"
"تم کل اپنی بھابھی کو لینے چلے جاؤ۔ تم جانتے ہو کہ میں اس کیس میں کتنا الجھا ہوا ہوں۔ ورنہ میں خود ہی چلا جاتا۔"
"اوہ تو کل بھابھی یعنی تمہاری اسی پرانی بیوی کو واپس لانا ہے۔ میں تو سمجھا کہ تم نئی شادی کر رہے ہو۔ میں تو ابھی کسی نکاح خواں کے پاس بھی جانے والا تھا۔ ویسے تم فکر مت کرو۔ آج یا کل اسپیشل برانچ تم سے یہ کیس لے لے گی۔ پھر تم ہو گے اور فرصت ہی فرصت۔ آرام سے لے آنا بھابھی کو۔"
"تمہیں کس نے بتایا۔" وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔
"کس نے بتایا۔ کیسے بتایا' یہ مت پوچھو۔ کیونکہ وہ بات اب گزر گئی۔ مطلب بھوت کال میں چلی گئی اور تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے بھوتوں سے کتنا ڈر لگتا ہے۔" اعیان بناوٹی خوف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
"ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہو۔ کبھی کوئی بات ڈھنگ سے نہیں بتا سکتے کیا۔" کریم خان غصے سے بولا۔
"بھائی جو پیدا ہی الٹا ہوا ہو۔ اسے تم کیسے......"
"تم کل ثوبیہ کو لینے جا رہے ہو نا۔" وہ اعیان کی بات کو بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اعیان کی یہ بکواس کبھی ختم نہیں ہو گی۔
"ارے ہاں بابا۔ کل تمہاری ثوبیہ کو لینے چلا جاؤں گا۔"
"تھینکس یار۔"
"اپنے تھینکس کی چٹنی بنا کے ڈبل روٹی پہ لگا کے کھا لو۔ دوست کو تھینکس بولتے ہو۔ تم میں ذرا سی بھی شرم حیا ہے کہ نہیں۔ جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اعیان نے غصہ دکھاتے ہوئے کال کاٹ دی۔ کریم خان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑنے لگی' وہ جانتا تھا کہ اعیان بہت بڑا ڈرامے باز ہے۔



"ہانی! بیٹا جلدی سے اٹھ جاؤ۔ ساڑھے نو بجنے والے ہیں۔" ممی کی آواز سن کی اس کی آنکھ کھل گئی۔
"کیا ہے ممی۔ اتنی صبح کو اٹھا دیا۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ابھی بھی وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔
"آج تمہاری آنٹی کے ہاں جانا ہے۔ پچھلے ایک مہینے سے تمہارے انکل بلا بلا کر تھک گئے ہیں۔ آج تمہارے پاپا بھی تیار ہو ہی گئے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ بستر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔" ممی نے اسے بستر پر دراز دیکھ کر پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
ہانیہ اپنی ممی کی بات سن کر گھبرا گئی اور ایک دم بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "اوہ ممی۔ آنٹی نے اس سنڈے کو نہیں۔ اگلے سنڈے کو بلایا ہے۔"
"اگلے سنڈے کو نہیں۔ آج ہی بلایا ہے۔ صبح سے دو بار فون بھی کر چکی ہیں۔" ممی اس کے چہرے کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی جس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔
"کیا مجھے بھی جانا پڑے گا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پچھلے ایک ہفتے سے تو کتنی خوش تھی کہ آنٹی کے گھر جاؤں گی اور اب۔"
"ممی آج میرا کہیں جانے کا دل نہیں کر رہا۔" اب وہ اپنی ممی کو کیسے بتاتی کہ آج اسے اپنے محبوب سے ملنے جانا ہے پھر آج وہ کہیں اور کیسے جا سکتی تھی۔
"ارے تم چلو تو۔ دل بھی لگ جائے گا تمہارا۔" ممی

نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''ممی میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' اس نے ایک اور بہانہ بنایا۔

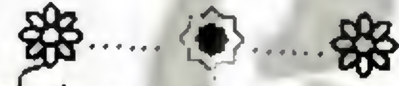
''چلو میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔'' ممی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ کسی قیمت پر بھی کہیں اور جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے ایک کے بعد ایک بہانہ بنا رہی تھی۔ مگر ممی تھی کہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

''ممی میری ایک سہیلی کئی برسوں کے بعد باہر سے آ رہی ہے۔ مجھے اس سے ملنے جانا ہے۔ اس لیے ......'' آخر کار اسے بولنا ہی پڑا۔

''تو جب سے جھوٹ پہ جھوٹ کیوں بولے جا رہی تھی میں اور تمہارے پاپا جا رہے ہیں۔ شام تک آ جائیں گے۔ کھانا فرج میں رکھا ہے، گرم کر کے کھا لینا۔'' ممی یہ کہتی ہوئی ناراضگی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

''سوری آنٹی۔ آپ سے تو کئی بار مل چکی ہوں۔ مگر اپنی زندگی سے پہلی بار ملنے والی ہوں۔ اس سے کیا ہوا وعدہ کیسے توڑ سکتی ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور مسکرانے لگی۔



کریم خان نے اعیان کی باتوں کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا وہ جانتا تھا کہ اعیان ایسے ہی ناراض ہونے کا ناٹک کرتا ہے اور خود ہی مان بھی جاتا ہے۔ اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا ساڑھے نو بج رہے تھے۔

رات کو کمال کے ساتھیوں کی گرفتاری، بنگلے کی تلاشی اور دوسری کارروائی پوری کرنے میں تین بج گئے تھے اور اسے چار بجے ہی سونا نصیب ہوا تھا۔ اس لیے وہ صبح دیر تک سوتا رہا تھا۔

کمال کے ساتھیوں کے بارے میں سوچ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ انہوں نے اتنی تیز رفتاری سے اپنی کارروائی کی تھی کہ بوکھلاہٹ میں وہ بیچارے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے اور ہکا بکا سے اپنے ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

فریش ہونے کے بعد وہ تیار ہو کر آفس پہنچ گیا جہاں چراغ دین اس کے کیبن میں انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

''انہوں نے کچھ بتایا۔'' اس نے رات کو گرفتار ہونے والوں کے بارے میں پوچھا۔

''جی سر! صرف کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ بتایا ہے۔'' چراغ دین بولا۔

''کیا کیا بتایا۔ اب یہ تم بتاؤ۔''

''سر! ان میں سے ایک کا نام جانو ٹی ٹی ہے۔ اس کا تعلق کوبرا گینگ سے ہے۔''

''وہاٹ...... جانو ٹی ٹی۔ کوبرا گینگ۔ کیا بول رہے ہو۔ صبح صبح نشہ پی کر کے آئے ہو کیا۔'' کریم خان چلا ہی اٹھا۔ کیونکہ چراغ دین جس گینگ کے بارے میں بتا رہا تھا وہ بہت ہی خطرناک مانا جاتا تھا۔ اور اس گینگ کا دائرہ کار صرف کراچی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی دہشت پورے ملک پر مسلط تھی۔

''سر! میں تو پی کے بہک رہا ہوں۔ پوری بات سنیں گے تو آپ کو بن پیئے ہی چڑھ جائے گی۔'' چراغ دین کے لہجے میں ضرور کوئی بات تھی۔

''مگر ہم تو وہاں کمال کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے گئے تھے۔ یہ جانو ٹی ٹی اور کوبرا گینگ بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ کیا کمال بھی کوبرا گینگ سے تعلق رکھتا تھا؟'' اسے اب یہی لگ رہا تھا کہ کمال کا تعلق اسی بدنام زمانہ گینگ سے رہا تھا۔

''یہ معلوم نہیں ہو سکا۔'' چراغ دین بولا۔

''تو کیا ہم نے جو گرفتاریاں کی ہیں، ان کا کوئی تعلق کمال سے نہیں ہے؟'' اس وقت کریم خان کی حالت دیکھنے لائق تھی۔

''سر! تعلق تو دور کی بات ہے۔ ان میں سے کوئی کمال کو جانتا تک نہیں۔'' چراغ دین نے جواب دیا۔

''جانتا تک نہیں سے کیا مطلب۔ وہ کمال کے ساتھی نہیں ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی سر! ان میں سے کوئی بھی کمال کا ساتھی نہیں

ہے۔ ان کو کمال کی تصویر بھی دکھائی گئی مگر انہوں نے کہا کہ اس آدمی کو تو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی کمال نامی کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے انفار مرنے ہمیں غلط اطلاع دی تھی۔" وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر گویا ہوا۔ "باقی کے تین کون ہیں؟"

سر دوسرا امان خان ہے جو گولڈن گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ تیسرے کا نام فواد سلیم ہے جو کنگ گینگ کا آدمی ہے اور چوتھا اجمل ہے جو کس گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ خود اس کو بھی نہیں پتہ۔" چراغ دین ایک کے بعد ایک بم کریم خان کے سر پر پھوڑتا جا رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے چراغ دین کو دیکھ رہا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو وہ سن رہا ہے وہ سچ ہے۔ کیونکہ جن گینگ کے نام چراغ دین نے اس کے سامنے لیے تھے وہ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت بڑے گینگ تھے اور ان کے بین الاقوامی گینگس کے ساتھ بھی روابط تھے۔ عام آدمی تو ایک طرف سیکورٹی ایجنسیاں بھی ان گینگس کا نام سن کر لرز جاتی تھیں۔ قتل' اسمگلنگ' اغواء برائے تاوان' انسانی اسمگلنگ' انسانی اعضاء کا کاروبار' لڑکیوں کا کاروبار' بلیک میلنگ' اسلحہ کی ترسیل اور منشیات سمیت یہ لوگ ایسی کئی غیر قانونی کارروائیوں میں ملوث تھے۔

کئی ایجنسیاں پچھلے پانچ سالوں سے ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں مگر ابھی تک ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائی تھیں۔ ان گینگس کے کام کرنے کا طریقہ عام مروجہ طریقہ کار سے یکسر مختلف تھا۔ وہ اپنے ارکان کو فون پر ہدایت دیتے تھے اور ارکان کا کام ان ہدایات پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ یہ اتنے خفیہ طریقے سے کام کرتے تھے کہ ایک ممبر کو گینگ کے دوسرے رکن کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا تھا۔ بس انہیں ٹاسک دیا جاتا تھا جسے انہیں پورا کرنا ہوتا تھا۔ انہیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی رکن اپنے گینگ کے بارے میں جانتا تھا تو وہ تھا صرف اس گینگ کا نام۔ اول تو اس گینگ کا ممبر پکڑا ہی نہیں جاتا تھا اور اگر کبھی کبھار کوئی گرفتار بھی ہو جاتا تھا تو پولیس سے اس کچھ معلوم نہیں کر پاتی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں کا تعلق الگ الگ گینگ سے ہے۔ کیا وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔" کریم خان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"جب وہ اپنے اپنے گینگ ممبرز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو ایسے میں الگ الگ گینگ سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نہیں سر! کل سے پہلے وہ نہ تو آپس میں کبھی ملے تھے اور نہ ہی کبھی بات کی تھی اور تو اور۔ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے۔" چراغ دین نے کہا۔

"تم کہتے ہو کہ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مگر ہم نے ان میں سے دو آدمیوں کو ایک ہی کار میں آتے دیکھا تھا۔" اس نے اہم سوال چراغ دین پر تھوپ دیا۔

"سر! اجمل اور فواد سلیم ایک ہی کار میں آئے تھے۔ کار اجمل کی ملکیت ہے۔"

"کار کس کی تھی اور کون کون ایک ہی کار میں آیا' میں نے یہ پوچھا کیا۔ تم سے جتنا پوچھا جائے اتنا بولا کرو۔ یہ بتاؤ وہ ایک ہی کار میں کیوں آئے' جبکہ وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔" کریم خان نے غصے سے کہا۔ عام طور پر وہ کبھی اپنے ماتحتوں پر اس طرح غصہ نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی بات بڑے سکون سے سنتا تھا۔ اس لیے چراغ دین اپنی شوخ طبیعت کی وجہ سے کبھی کبھی اس سے مذاق کر لیا کرتا تھا۔ مگر آج کریم خان کچھ زیادہ ہی غصے میں لگ رہا تھا اور اس کا غصے میں آنا فطری عمل تھا' کیونکہ پے در پے ہونے والے مختلف واقعات نے اسے گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا۔

"سر! ان سب کو ایک دوسرے کی فوٹو بھیجی گئی تھی تا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور اجمل کے باس نے اسے

بتایا تھا کہ فواد سلیم کو کس جگہ سے پک کر کے سفید بنگلے پر پہنچانا ہے۔ ایسی ہی کچھ ہدایات فواد سلیم کو اپنے باس سے ملی تھیں۔'' اس بار چراغ دین کا لہجہ مرجھایا ہوا تھا۔

''مگر ان کے باسز نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ بولا۔

''سر! یہ تو ان کو بھی نہیں معلوم۔ کیونکہ ان کو جتنا بتایا جاتا ہے اسی پر انہیں عمل کرنا ہوتا ہے۔ کچھ پوچھنے کا نہ ان کو حق ہے اور نہ ہی ان کی ہمت۔'' چراغ دین نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' وہ ہنکار کر بولا۔ ''یہ معلوم ہوا کہ وہ چاروں سفید بنگلے میں کس لیے جمع ہوئے تھے؟''

''وہاں کوئی پانچواں بھی پہنچنے والا تھا۔ جو انہیں بتاتا کہ انہیں کیوں بلایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے ہماری بھنک مل گئی ہو اور وہ وہاں نہیں پہنچا۔'' چراغ دین نے کہا۔

''جس طرح ان چاروں کو ایک دوسرے کی تصویر بھیجی گئی تھی تو اس پانچویں فرد کی فوٹو بھی بھیجی گئی ہوگی؟'' کریم خان نے ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! اس پانچویں آدمی کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔''

''تو پھر وہ اسے کیسے پہچانتے؟''

''وہ انہیں کوئی خاص قسم کا کوڈ بتاتا۔''

چراغ دین کی بات سن کر کریم خان پھر چپ ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا انہوں نے سب کچھ سچ سچ بتایا ہے۔''

''سر! آپ کو کوئی شک ہے۔ تفتیش سرفراز نے کی ہے۔'' چراغ دین نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر بعد چراغ دین مسکرایا تھا۔

کریم خان جانتا تھا کہ جب سرفراز تفتیش کرتا تھا تو مردے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتے تھے وہ چاروں تو پھر بھی زندہ انسان تھے۔

''وہ سفید بنگلہ کس کا ہے۔'' چراغ دین کے جواب سے مطمئن ہو کر کریم خان نے پوچھا۔

''اس بنگلے کا مالک دو مہینے پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔''

ان باتوں نے کریم خان کی جھنجلاہٹ میں اور اضافہ کر دیا تھا اور اس نے اشارے سے چراغ دین کو جانے کا کہا۔

چراغ دین کمرے سے نکل گیا مگر تیس سیکنڈ بھی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ وہ کیبن میں آ گیا۔

''ہاں۔ کیا بات ہے؟'' کریم خان نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! ایک بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔''

''کون سی بات۔''

''سر! ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔'' چراغ دین نے کہا۔

''کن سب میں؟''

''جن چاروں کو ہم نے رات کو اریسٹ کیا تھا۔''

''کیا بات مشترک ہے؟''

''سر! ان سب کی کلائی پر سات نمبر کا عدد گدا ہوا ہے اور ایسا ہی سات نمبر میں نے کمال کی کلائی پر بھی دیکھا تھا۔'' اتنا بتا کہ چراغ دین دوبارہ باہر نکل گیا۔

''یہ سات نمبر کا کیا اسرار ہے۔'' کریم خان نے اپنی پیشانی کو رگڑتے ہوئے سوچا۔ آج صبح سے ہی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ موبائل کی رنگ اسے واپس حقیقت میں کھینچ لائی۔ اس نے اسکرین دیکھی، یہ کوئی اور ہی انجان نمبر تھا۔ ''ہیلو۔'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''نیشنل ہائی وے پر جو جنگل ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

کریم خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔''

''وہاں تالاب کے پاس جو۔'' دوسری طرف سے کریم خان کی بات پر توجہ دیے بغیر مزید بولا گیا۔

کریم خان نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگوں کو کیوں مار رہے ہو۔''

مگر دوسری طرف اس بات کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔ بلکہ جہاں بات چھوڑی گئی تھی اس سے آگے بتانے لگا۔ ''لکڑی کا بنا ہوا ایک کاٹیج ہے۔ اس میں تمہیں.....''

''تم بہرے ہو گیا۔ میں اتنی دیر سے تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' اس نے پھر بات کاٹتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس بار وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

''کمال کے پاس شفقت چینا عرف ریڈ 001 کی لاش ملے گی' جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے۔'' دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔

اس بار کریم خان نے اس کی بات بیچ میں نہیں کاٹی۔ جب دوسری طرف سے بات پوری کی گئی تو وہ بولا۔ ''تم ہمیں غلط انفارمیشن کیوں دیتے ہو۔''

''یعنی آپ کو مجھ سے زیادہ ان مجرموں کی باتوں پر یقین ہے۔ تو کرتے رہو۔ میرا کیا جاتا ہے۔'' دوسری طرف سے اتنا کہہ کر لائن کاٹ دی گئی۔

وہ حیران پریشان بیٹھا کچھ دیر تک بے خیالی میں اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو گھورتا رہا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ پہلی بار کی طرح اس مرتبہ اس نے اس نمبر پر کال بیک کرنے کی کوشش نہیں کی' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ موبائل سوئچ آف کر دیا گیا ہوگا۔

اس نے آواز سنتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پہلے والی ہی آواز تھی جس نے اسے سفید بنگلے کے بارے میں انفارم کیا تھا۔ اس لیے کریم خان نے اس کے بارے میں جاننا چاہا تھا مگر وہ جو بھی تھا بہت ہی کائیاں تھا۔ کریم خان اس سے سوال کرتا رہا اور وہ اپنی ہی بات پوری کرتا رہا اور اس نے کریم خان کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور جواب دیا تو اس کے لیے ہی کئی سوال چھوڑ گیا۔ اب کریم خان کو فیصلہ کرنا تھا کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ وہ چاروں' جو بہت ہی پکے مجرم تھے' یا یہ انفارمر۔

چراغ دین اسے بتا چکا تھا کہ ان چاروں کی کلائی پر بھی مردہ پائے جانے والے کمال کی طرح سات نمبر کا عدد گودا ہوا تھا۔ جس سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ ان کا کمال سے کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے۔ جو اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا کہ وہ چاروں جھوٹ بول رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ انفارمر کمال کے موبائل سے کال کر رہا تھا' جس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اس کا کمال کے قتل سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قتل خود اسی نے کیا ہو۔

کریم خان کو انفارمر کی بات پر کچھ کچھ یقین بھی ہو رہا تھا کیونکہ انفارمر نے بتایا تھا کہ ان سب کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے اور کلائیوں پر گدا ہوا سات کا عدد اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے جن کا جواب فی الحال اس کے پاس نہیں تھا۔

لیکن ابھی جو انفارمیشن ملی تھی اس پر بھی عمل کرنا تھا۔ کریم خان نے سرفراز کو اپنے کیبن میں بلایا۔

''سرفراز! معلوم کرو کہ یہ کس کا نمبر ہے اور ہو سکے تو لوکیشن بھی ٹریس کرنا۔''

پھر کچھ دیر بعد اس کی ٹیم نیشنل ہائی وے کے جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ سب سے آگے کریم خان کی گاڑی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ اس کے باقی ماتحت اس کے پیچھے دو گاڑیوں میں آ رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں کی رفتار بہت تیز تھی' جیسے انہیں منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ لیکن پیچھے والی گاڑیاں کریم خان سے بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

چند منٹوں کے بعد وہ مطلوبہ کاٹیج کے پاس پہنچ چکا تھا جس کے باہر دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ کریم خان نے اپنی گاڑی تھوڑی دور روک کر کاٹیج کے گیٹ پر نظر ڈالی۔ اسے کسی کا ہاتھ گیٹ کو بند کرتا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر کاٹیج کی طرف دوڑنے لگا اور ساتھ ہی ہولسٹر سے اپنا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ گیٹ پر پہنچتے ہی اس نے زور سے لات مار کر گیٹ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے فرسٹ فلور سے ایک آدمی کو جنگل کی

طرف کھلنے والی کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

اس کا سارا دھیان اوپر کی طرف تھا۔ اس لیے وہ نیچے نہیں دیکھ پایا اور اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ زور سے گرا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

گرتے ہوئے اس کی پیشانی لوہے کی گرل سے ٹکرائی جس سے اس کے ماتھے سے خون نکلنے لگا۔ اس کے گھٹنوں میں بھی چوٹ آئی تھی۔ اسے سنبھل کر اٹھنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ اٹھتے ہی وہ پھر کھڑکی کی طرف بھاگا اور باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

دوسری طرف ایک چٹان تھی جس کی وجہ سے کھڑکی سے صرف پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے کودنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا۔ مگر اسے کسی ذی نفس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ اس کے گھٹنوں کی چوٹ اس کے مزید تیز بھاگنے میں مانع ثابت ہو رہی تھی اس لیے اس نے جنگل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرا یہ کہ اسے کچھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ آدمی کس سمت کو بھاگا ہوگا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنے قدم واپس کاٹیج کی طرف موڑ لیے۔

چلتے ہوئے اسے کافی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے کاٹیج کے سامنے کی طرف آ گیا۔ اس کے ماتحت گاڑیوں سے اتر کر اسی کی سمت آ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر چیخا۔

”آصف! تم سپاہیوں کو لے کر جنگل کی تلاشی لو۔ ابھی ابھی اس کھڑکی سے کوئی کود کر بھاگا ہے۔“

یہ ہدایت سن کر چراغ دین کے علاوہ باقی سب کریم خان کی بتائی ہوئی سمت کی طرف دوڑ گئے۔

چراغ دین بڑے غور سے کریم خان کے ماتھے کی چوٹ کو دیکھ رہا تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون بھی بہہ رہا تھا۔ ”سر! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟“

کریم خان نے اسے پوری بات بتا کر جیب سے رومال نکال کر ماتھے کے زخم کو دبایا اور پھر اسے باندھ لیا اور چراغ دین کو اشارہ کرتا ہوا ایک بار پھر مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی انہوں نے کاٹیج کے اندر دو ہی قدم رکھے تھے کہ اپنے سامنے کا نظارہ دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

کریم خان اس آدمی کا پیچھا کرنے کے چکر میں اس لاش پر دھیان نہیں دے پایا تھا اور لاش کی اتنی بری حالت تھی کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ایک کٹا ہوا سر کرسی پر رکھا ہوا تھا اور باقی جسم کچھ ہی دور زمین پر پیٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک پینٹ ہی پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ بالائی دھڑ برہنہ تھا اور پیٹھ کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور کھال کے کچھ ٹکڑے آس پاس بکھرے ہوئے تھے اور جس جس جگہ کھال ادھڑی ہوئی تھی وہاں وہاں نمک اور مرچیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تشدد کی انتہا تھی۔ کریم خان جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے سیدھا کر کے دیکھے کہ پیٹ کا کیا حال ہے۔

اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اسے ایک کھڑکی پر پردہ ٹنگا ہوا نظر آیا جسے اس نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اتار لیا اور لاش کے اوپر ڈال دیا۔ وہیں ایک طرف اس کا ریوالور بھی گرا ہوا تھا جسے اس نے اٹھا کر واپس ہولسٹر میں رکھ لیا۔

پھر دونوں نے مل کر پورے کاٹیج کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کاٹیج میں کافی توڑ پھوڑ نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مقتول نے مرنے سے پہلے قاتل کے ساتھ کافی مزاحمت اور مقابلہ کیا ہو اور اس بکھرے ہوئے سامان سے الجھ کر ہی کریم خان گرا تھا۔ ورنہ بھاگنے والا اس وقت اس کی حراست میں ہوتا۔

کریم خان نے سپاہیوں کو جنگل کی تلاشی کے لیے بھیج تو دیا تھا مگر اسے یقین تھا کہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا اور وہ ناکام ہی لوٹیں گے۔ کاٹیج کی تلاشی کے دوران بھی انہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو انہیں کسی قسم کی مدد فراہم کرتی۔ بھاگنے والا شخص کون تھا۔ یہ بات بھی کریم خان کو بری طرح الجھا رہی تھی۔ اس کی سوچ یہی بتا رہی تھی کہ وہ انفارمر تو نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اتنا پاگل ہرگز نہیں تھا کہ انہیں خبر دینے کے بعد کاٹیج میں بیٹھ کر ان کا

انتظار کرتا رہے کہ کب پولیس آئے اور کب وہ بھاگے۔ جبکہ کمال کے قتل میں کریم خان کو پورا یقین تھا کہ اس میں انفار مر کا ہی ہاتھ ہوسکتا تھا۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں الجھا ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر سرفراز کی کال آ گئی۔

"ہاں سرفراز! کیا خبر ہے۔" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

"سر! یہ نمبر شفقت چینا کا ہے۔" دوسری طرف سے سرفراز نے بتایا۔

"تم شفقت چینا کی تصویر میرے نمبر پر سینڈ کرو۔"

"اوکے سر! میں ابھی اس کی تصویر آپ کے موبائل پر سینڈ کرتا ہوں۔" پھر اس سے پہلے کہ کریم خان لائن ڈس کنیکٹ کرتا' دوسری طرف سے سرفراز چیختا ہوا بولا۔

"سر! ایک بات تو سنیں۔"

"ہاں بولو کیا بات ہے۔"

"سر! ہم نے شفقت چینا والے نمبر کی لوکیشن ٹریس کی تھی۔ وہ ہمیں پولیس اسٹیشن کے عقب میں میدان سے ملا ہے۔" سرفراز نے کریم خان کے لیے ایک اور الجھن کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم۔" وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

"جی سر! ہمارے ہی پولیس اسٹیشن کے عقب والے میدان سے یہ موبائل ملا ہے۔"

"تم نے وہاں آس پاس کسی کو دیکھا؟"

"نہیں سر! وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔" سرفراز نے بتایا۔

"ٹھیک سے یاد کرو۔ کوئی تو ادھر ادھر سے آ جا رہا ہوگا۔" کریم خان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"سر! جب ہم میدان کی طرف جا رہے تھے تو ہم نے ڈی ایس پی زاہد علی کو وہاں سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے علاوہ پورے میدان میں کوئی بھی نہیں تھا۔" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد سرفراز نے جواب دیا۔

"اوکے۔ چلو تم شفقت چینا کی تصویر تو سینڈ کرو۔" اتنا کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

اب کریم خان کو اپنی بے وقوفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کال بیک نہیں کی تھی کہ انفار مر نے موبائل سوئچ آف کر دیا ہوگا اور شاید یہ بات انفار مر بھی جانتا تھا' جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے موبائل پولیس اسٹیشن کے میدان میں پھینک دیا تھا۔ مگر اس نے یہ کیسے کیا ہوگا۔ اس کی سوچ کو میسیج کی ٹون نے توڑا۔ اس نے دیکھا کہ سرفراز نے ایم ایم ایس کے ذریعے شفقت چینا کی تصویر سینڈ کر دی تھی اور یہ تصویر اسی شخص کی تھی جس کا کٹا ہوا سر اس کے سامنے کرسی پر رکھا ہوا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ انفار مر سچ کہہ رہا تھا اور اب تک اس نے جو بھی بتایا تھا وہ بھی سب سچ تھا۔ وہ چاروں مجرم کمال کے ہی ساتھی تھے اور یہ شفقت چینا عرف ریڈ 001 ان سب کا باس تھا جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ ہونا چاہیے۔

یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور لاش کا دایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس کی کلائی پر کچھ بھی نہیں تھا پھر اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس پر سات کا عدد گدا ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ انفار مر نے اب تک انہیں بالکل صحیح معلومات فراہم کی تھیں اور وہ چاروں جھوٹ بول رہے تھے۔

اسی دوران کہیں سے موبائل بجنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے غور کیا تو اسے یہ آواز لاش کے پاس سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لاش کے پاس گیا اور پردہ ایک طرف ہٹایا۔ موبائل اس لاش کی پینٹ کی جیب میں تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو وہ نمبر اسے کچھ جانا پہچانا لگا۔ "ہیلو۔" وہ بولا۔

"ہاں ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز کو پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔

"سرفراز تم......!" اس نے حیرت سے کہا۔

"سر! آپ......آپ کے پاس یہ نمبر کیسے آ گیا۔" سرفراز نے بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمیں شفقت چینا کی لاش کی جیب سے ملا ہے۔ مگر تم کو یہ نمبر کہاں سے ملا" وہ ابھی تک حیران تھا۔

''سر! آپ نے رات کو جو نمبر دیا تھا۔ میں نے سوچا اسے بھی ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں شاید شفقت چینا کی طرح یہ بھی سوچ آن مل جائے۔'' سرفراز نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے یہ کمال کا نمبر ہے۔'' وہ بولا۔ کیونکہ اس نے رات کو معلومات حاصل کرنے کے لیے کمال کا ہی نمبر دیا تھا۔

''جی سر!''

''سرفراز! تم نے ان چاروں مجرموں سے ان کی کلائی پر گدے ہوئے سات کے عدد کے بارے میں نہیں پوچھا تھا کیا۔'' وہ بولا۔

''جی سر! پوچھا تھا۔''

''انہوں نے کیا بتایا تھا؟''

''سر! ایک نے بتایا کہ وہ سات سال سے اس گینگ کے لیے کام کر رہا ہے۔ پانچ سال پہلے اس کے باس نے ایک آدمی کو اس کے پاس بھیجا جس نے اس کی کلائی پر سات کا عدد گود دیا تھا۔

مگر اس کے باس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی کلائی پر سات کا ہندسہ کیوں گدوایا گیا ہے۔ باقی تینوں نے بھی لگ بھگ ایسے ہی جواب دیئے تھے۔''

''اوکے۔'' اس نے لائن کاٹ کر موبائل چراغ دین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لاش کی تلاشی لو اور دیکھو کہ اس کی جیب سے اور کچھ ملتا ہے یا نہیں۔''

کریم خان کی ہدایت پر چراغ دین نے اچھی طرح تلاشی لی مگر اس لاش کی جیبوں سے اور کوئی چیز نہیں ملی۔

شفقت چینا کی جیب سے کمال کا موبائل ملنے سے ایک بات تو واضح ہو رہی تھی کہ اس کا قتل بھی انفارمر نے ہی کیا تھا۔ کیونکہ یہ موبائل اسی کے قبضے میں تھا جس سے اس نے گزشتہ رات کریم خان کو فون کیا تھا۔ ویسے اس انفارمر کی ہمت پر اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایک اور بات بھی واضح ہو رہی تھی کہ کاٹیج سے بھاگنے والا انفارمر نہیں تھا کیونکہ وہ تو اس میدان میں موبائل پھینک رہا تھا۔ مگر بھاگنے والا کون تھا۔ رہ رہ کر یہ سوال اس کے دماغ میں گھوم کر اسے گھما رہا تھا۔

چراغ دین نے لاش کی تلاشی لینے کے چکر میں اسے سیدھا کر دیا تھا۔ لاش کے پیٹ کی حالت اس کی پیٹھ سے بھی زیادہ بری تھی۔ اتنی بری کہ کریم خان سے بھی نہیں دیکھی گئی۔

لاش کے پیٹ سے چھ سات جگہوں سے گوشت کی بوٹیاں کاٹی گئی تھیں۔ کریم خان نے آگے بڑھ کر پردہ واپس لاش کے اوپر ڈال دیا۔

پورے کاٹیج کی تلاشی تو وہ لے ہی چکے تھے اب دو کاروں کی تلاشی باقی تھی جو کاٹیج کے باہر کھڑی تھیں۔ اس لیے وہ دونوں کاٹیج سے نکل کر کاروں کے پاس آ گئے۔ دونوں کاروں کے دروازے لاک نہیں تھے۔ ایک کار کی تلاشی کریم خان اور دوسری کی تلاشی چراغ دین لینے لگا۔

''سر! مجھے اس کار سے یہ لفافہ ملا ہے۔'' اسے اپنے پیچھے چراغ دین کی آواز سنائی دی۔

وہ پیچھے گھوما اور چراغ دین سے وہ لفافہ لے کر کھولا تو اس میں سے تین سفید لفافے اور برآمد ہوئے۔ اس نے پہلا لفافہ کھولا تو اس میں کمال کی تین تصاویر تھیں۔ دوسرے لفافے میں ان چاروں مجرموں کی تصویریں تھیں جو اس وقت پولیس کی حراست میں تھے۔ جب اس نے تیسرا لفافہ کھولا تو اس میں موجود تصویریں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس لفافے میں ڈی ایس پی زاہد علی کی دو تصویریں تھیں۔ چراغ دین بھی ان تصویروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ آہٹیں سن کر اس نے گردن اٹھائی تو اسے اپنے ماتحت واپس آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جو ابھی ان سے کافی فاصلے پر تھے۔

کریم خان نے وہ تینوں سفید لفافے دوبارہ بڑے لفافے میں ڈال کر چراغ دین کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ تصویریں لے جاؤ اور ان کا ذکر سرفراز کے علاوہ کسی سے مت کرنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی کی چابی چراغ دین کو دی اور وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔



ممی اور پاپا کے چلے جانے کے بعد ہانیہ گھر میں اکیلی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ حالانکہ اس کا دھیان ٹی وی پر بالکل بھی نہیں تھا۔ اس نے بیزار ہوکر ٹی وی بند کیا اور بے مقصد پورے گھر میں ادھر سے ادھر چکراتی رہی۔ مگر آج وقت کی رفتار کل سے بھی زیادہ سست لگنے لگی تھی۔ اسے ایک ایک لمحہ ایک صدی سے بھی طویل محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک چکرانے کے بعد اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور میلز چیک کرنے لگی۔ مگر جلد ہی وہ اس کام سے بھی اکتا گئی اور اس نے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے رکھ دیا۔ اس کا آج کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔

وہ ہر پانچ منٹ بعد ٹائم دیکھ رہی تھی۔ لیکن لگتا تھا جیسے وقت بھی اس سے کسی وقت کی دشمنی نکال رہا تھا۔ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل میں آیا کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے بڑھا دے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ کیا ایسا کرنے سے ٹائم آگے بڑھ جائے گا؟ خدا خدا کر کے کسی طرح دوپہر ہوئی اور اس نے بارہ بجے ہی لنچ لینا شروع کر دیا۔ ویسے عام طور پر وہ دو بجے ہی لنچ کرتی تھی۔ مگر آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ لنچ کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ پھر بے چین ہو کر اٹھی اور قدآدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

سیاہ بڑی بڑی آنکھیں۔ آنکھوں پر لمبی گھنی پلکوں کا پردہ۔ ایسی آنکھیں جو جسے دیکھیں اس پر بجلی سی گرا دیں۔ ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی رسیلے ہونٹ اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ چہرہ گول اور ہلکے گلابی رخسار جن پر سیاہ تل قیامت ڈھا رہا تھا اور اسے دیکھ کر وہ شعر بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا کہ

اب میں سمجھا تیرے رخسار پہ تل کا مطلب
دولتِ حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے

صراحی دار گردن۔ کمر تک لمبے گھنے ریشمی بال۔ غرض وہ حسن کا چلتا پھرتا شاہکار تھی۔ ایسا حسن جسے دیکھ کر لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی آہیں بھرتی تھیں۔ لگتا تھا قدرت نے اسے فرصت میں بنایا تھا اور حسن کی ہر خوبی اس کے انگ انگ میں بھر دی تھی۔

کالج میں ہر دوسرا لڑکا اس کا دیوانہ تھا مگر وہ تو اپنے اس انجان شہزادے کی دیوانی تھی جس کے انتظار میں اس نے اتنے برس گزار دیئے تھے اور آج پورے نو سال بعد ان کے ملن کی گھڑی آ رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک یونہی آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی اور پھر خود ہی شرما کر رہ گئی۔ وہاں سے ہٹ کر وہ الماری کے پاس آئی اور ایک لباس نکال کر واش روم میں چلی گئی۔

جب وہ باہر آئی تو اس نے گلابی رنگ سوٹ پہن رکھا تھا جس پر بہت ہی نازک کام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید جارجٹ کا دوپٹہ۔ قدرت نے اسے اتنی خوبصورتی سے نوازا تھا کہ کبھی میک اپ کی حاجت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میک اپ کے نام پر اس نے آج اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک میں دیکھا ابھی ایک ہی بجا تھا۔ یعنی ابھی بھی وصال کی گھڑیاں ختم ہونے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ بے دم ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور گھڑی کی سوئیوں کو مچر مچر آگے بڑھتا ہوا دیکھنے لگی۔



اب آصف اور باقی سپاہی کریم خان کے نزدیک آ گئے تھے۔

"سر! ہم نے پورا جنگل چھان مارا۔ مگر ہمیں کوئی نہیں ملا۔"

"کوئی بات نہیں، تم سب اس کاٹیج کی تلاشی اس طرح لو کہ ایک سوئی جتنی چیز بھی تمہاری نگاہوں سے بچ نہ پائے۔" وہ بولا۔

حالانکہ وہ چراغ دین کے ساتھ تلاشی لے چکا تھا مگر

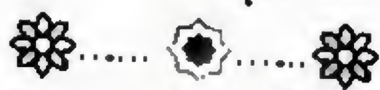
اپنے اطمینان کے لیے اس نے یہی بہتر سمجھا۔ سب اندر چلے گئے اور وہ کار سے ٹیک لگا کر پھر سوچ میں پڑ گیا۔

اگر یہ تصویر کار میں انفارمر نے رکھی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ڈی ایس پی زاہد علی بھی سیون اسٹار گینگ کا رکن ہے اور وہ ہمیں اپنے اگلے شکار کے بارے میں پیشگی اطلاع دے رہا ہے۔ یا وہ ہمیں چیلنج کر رہا ہے کہ اگر ڈی ایس پی کو بچا سکتے ہو تو بچالو۔

اور جس طرح پچھلے دو دنوں سے ڈی ایس پی بیماری کا بہانہ کر کے برائے نام ہی آفس آ رہا تھا' جبکہ وہ اس کیس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں لے رہا تھا' تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی انفارمر ہو۔ وہ شکار ہے یا شکاری۔ یہ تو اب اس کی کلائی دیکھ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

پوری ٹیم آدھے گھنٹے سے زیادہ کاٹیج کی تلاشی لیتی رہی لیکن وہاں کچھ ہوتا تو انہیں ضرور ملتا۔ وہ نامراد باہر نکل آئے۔ اس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی اور شہر آ کر وہ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے اترتے ہوئے آصف سے بولا۔ ''تم آر ٹی او جا کر ان دونوں کاروں کی تفصیل نکلواؤ۔'' یہ کہہ کر وہ مارکیٹ کے اندر چلا گیا جہاں اس نے ایک خوبصورت سی مردانہ رسٹ واچ خریدی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن آ گیا۔

اس نے سرفراز سے ڈی ایس پی صاحب کا معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ دو تین گھنٹے میں لوٹنے کا کہہ گئے ہیں۔ اب وہ ان کے لوٹنے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔



ہانیہ نظریں ٹکائے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتی رہی مگر پانچ منٹ میں ہی بیزار ہو گئی۔ پھر اس نے موبائل نکال کر اپنے محبوب کا نمبر ڈائل کیا۔ ''ہیلو۔ کہاں ہیں آپ؟'' اس نے دوسری طرف سے ہیلو سننے کے بعد کہا۔

''گھر پہ ہی ہوں۔ کیوں۔''

''آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔''

''پوچھو۔'' دوسری جانب سے سرسری انداز سے کہا گیا۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہاں بالکل کرتا ہوں۔''

''تو پھر پانچ بجے ہی ملنے کی شرط کیوں لگا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر رکی پھر بولی۔ ''اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔''

''ارے بس چار گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔ جہاں نو سال انتظار کیا ہے وہاں چار گھنٹے اور سہی۔'' دوسری طرف سے نارمل آواز سنائی دی۔

''ان چار گھنٹوں میں ہم کتنے ہی لمحات ساتھ گزار سکتے ہیں۔ جو آپ کی بے جا ضد کی وجہ سے یونہی ضائع ہو جائیں گے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

ہانیہ کی بات سن کر دوسری طرف کچھ خاموشی چھا گئی۔ وہ پھر بولی۔ ''کیا آپ نے کسی عامل سے مبارک گھڑی نکلوائی ہے۔ جو پانچ بجے سے پہلے ملنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' دوسری جانب سے جھینپی جھینپی سی آواز سنائی دی۔

''تو پھر کیسی بات ہے۔'' وہ اس بار قدرے غصے سے بولی۔ اسے غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ اس کا محبوب اس کی نو سال کی تڑپ کو کسی خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔

''اچھا بابا غصہ مت کرو۔ میں پندرہ بیس منٹ میں آتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔

اس نے ٹائم دیکھا سوا بج رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور باہر آ کر گھر لاک کر دیا اور ٹھیک دس منٹ بعد وہ شاہ رکن عالم کے مزار کی ایک بینچ پر بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔

ابھی اسے بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے سامنے سے کوئی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والے کی عمر چوبیس پچیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ سانولا۔ میانہ قد اور عام سا جسم۔

وہ سیدھا ہانیہ کی طرف آیا اور بینچ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی کیونکہ آنے والا

اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔
''سمیر..... تم یہاں کیا کر رہے ہو۔'' وہ حیران ہو کر بولی۔ وہ لڑکا کالج میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔
''خود بلا کر کہہ رہی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں نے۔ میں نے تم کو کب بلایا۔'' وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے بولی۔
''یاد کرو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو تم نے بلایا تھا۔'' سمیر نے کہا۔
''مذاق مت کرو۔ میں بھلا تمہیں کیوں بلاؤں گی۔'' اس بار اس نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا۔
''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ وہ خط تم کو میں نے ہی بھیجے تھے اور کل کال کر کے ملنے کا ٹائم بھی میں نے ہی دیا تھا۔'' سمیر کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پریشان ہے یا اکثر جھوٹ بولتے ہوئے ایسا ہوتا ہے۔
''کیا۔ وہ تم ہی ہو۔'' ہانیہ خوشی سے چلائی اور سمیر سے لپٹ کر رونے لگی۔ سمیر حیران پریشان رہ گیا۔ وہ نہ اسے چپ کرا پا رہا تھا اور نہ ہی خود سے الگ کر پا رہا تھا۔
''ہانی۔ لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ پلیز خود کو سنبھالو۔'' سمیر پریشانی سے بولا۔
''دیکھنے دو۔ اب میں تم سے الگ نہیں ہو سکتی۔ تم پھر مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔'' وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے جس محبوب کا اس نے نو سال انتظار کیا تھا وہ اب یہ موقع کیسے گنواتی۔
سمیر نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ کروایا۔ وہ سمیر سے الگ تو ہو گئی تھی مگر سمیر کا ہاتھ ابھی تک اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ سمیر کہیں بھاگ نہ جائے۔
''تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا۔'' وہ کچھ دیر بعد نارمل ہوئی تو سمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
''دھوکا' ارے کیسا دھوکا؟'' سمیر ایسے چونکا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔
''ہم چار سال تک کلاس فیلو رہے۔ تم پہلے سے مجھے نہیں بتا سکتے تھے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
ہانیہ کی بات سن کر سمیر نے سکون کی سانس لی اور بولا۔ ''کیسے بتاتا۔ کہاں تم اور کہاں میں۔''
''یہ فلمی ڈائیلاگ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔'' وہ گھورتی ہوئی بولی۔
''میرا مطلب تھا کہاں تم پریوں سے بھی زیادہ حسین اور کہاں میں کوے جیسا کالا۔ مجھے تم سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔''
''اگر تم پہلے سے ہمت کر لیتے تو ہم آج ایسے نہ ہوتے۔''
''تو پھر آج ہم کیسے ہوتے۔'' سمیر مسکراتے ہوئے بولا۔
''دو چار بچوں کے ماں باپ ہوتے۔'' وہ شرماتے ہوئے بولی۔
سمیر بھی مسکرانے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ''یار تم نے وہ خط بڑے عجیب لکھے تھے۔ تم تو میرا پتہ۔ موبائل نمبر۔ ای میل آئی ڈی سب جانتے تھے۔ پھر ان خطوط میں جھوٹ کیوں لکھا تھا۔''
خط کا نام سنتے ہی سمیر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ ''کیا سارے سوال آج ہی کرو گی۔ کچھ تو بعد کے لیے بھی بچا کر رکھو۔''



شام کے چار بج رہے تھے۔ ثوبیہ اپنی امی کے کمرے میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں دو تین دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے گھر میں اس وقت وہ دونوں ماں بیٹیاں ہی تھیں۔
ثوبیہ گوری چٹی۔ تیکھے نین نقش والی بے حد شوخ حسینہ تھی۔ وہ ہر کسی سے مذاق کر لیتی تھی۔ دوسروں کی نقل اتارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا

کہ کوئی اس سے مذاق مستی میں جیت جائے۔ مگر ایک شخص ایسا تھا جس کے آگے بولنے سے پہلے اسے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ اور وہ کوئی اور نہیں کریم خان کا دوست اعیان تھا۔ ویسے وہ اعیان کی بہت عزت کرتی تھی اور اعیان بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔

وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مگن تھیں کہ ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ اٹھی اور یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی کہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اعیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''آپ۔'' وہ حیرت سے بولی۔ حالانکہ رات کو کریم خان نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اسے لینے کے لیے اعیان کو بھیجے گا مگر وہ آج ہی ٹپک پڑے گا اسے یہ امید نہیں تھی۔

''آپ کے خصم نے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لیے اور یہ منہ بند کرلیں ورنہ مکھیاں کک مار کر دانت توڑ دیں گی۔'' اعیان نے ثوبیہ کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر اپنے خاص انداز میں کہا۔

اعیان کی بات سن کر اس نے جھٹ سے اپنا منہ بند کرلیا اور پھر بولی۔ ''کیسے ہو۔''

''بہت بھوکا ہوں۔'' اعیان پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

وہ اتنی حیران تھی کہ اس نے اب تک اعیان کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے کو پکڑے ہوئے تھی اب اعیان بیچارہ اسے دھکیل کر اندر کیسے آتا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ کوئی چارہ نہیں تو وہ آگے بڑھا اور ثوبیہ کے ایک ہاتھ کو دروازے سے ہٹا کر اندر آ گیا اور وہ شرمندہ سی دروازہ بند کرنے لگی۔

''سفر کیسا رہا؟'' اب وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔

''بھابھی صاحبہ۔ سفر راستے اور منزلوں کی باتیں بعد میں پہلے کھانے کو کچھ لاؤ۔'' اعیان مسکین سے لہجے میں بولا۔

ظاہر ہے وہ بیچارہ پانچ گھنٹے کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اب بھوک تو لگنی ہی تھی۔ اب اعیان اتنا شریف تو تھا نہیں کہ خاموشی سے میزبانوں کے رحم و کرم پر پڑا رہتا۔ وہ تو بالکل اپنا گھر سمجھ کر حکم چلا رہا تھا اور یہ ثوبیہ کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ جب بھی ملتا تھا ایسے ہی پیش آتا تھا۔

''ممی کہاں ہیں۔'' اعیان نے پوچھا۔

''ممی۔ کس کی ممی'' وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ کیونکہ وہ تو اپنی ماں کو امی کہتی تھی۔

''آپ کی ممی اور کس کی ممی۔ اب میری ممی تو آپ سے اتنی محبت کرتی نہیں جو خدا سے پرمیشن لے کر آپ سے ملنے آ جائیں اور نہ ہی میں کسی فرعون کی ممی کی بات کر رہا ہوں۔ جو عجائب گھر کا آرام چھوڑ کر آپ کی خدمت میں پیش ہو۔'' اعیان نے سنجیدہ لہجے میں۔

ثوبیہ کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ اعیان اتنی زور زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر ثوبیہ کی امی کو اپنے کمرے سے باہر آنا ہی پڑا کہ اتنا شور کون مچا رہا ہے۔

ان کو دیکھتے ہی اعیان ان کی طرف لپکا اور ادب سے سلام کیا۔ امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ جبکہ ثوبیہ کچن میں چلی گئی کیونکہ اسے اعیان کے پیٹ کا کچھ انتظام کرنا تھا اور امی کو ثوبیہ پہلے اعیان کے آنے کے بارے میں بتا چکی تھی۔

جب اعیان صوفے پر بیٹھ گیا تو امی بولیں۔ ''کیسے ہو بیٹا۔''

''آنٹی آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔'' اعیان نے سر جھکا کر نہایت ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔

امی اس سے پوچھتی رہیں اور وہ ہر بات کا سر جھکا کر جواب دے رہا تھا بالکل کسی معصوم بچے کی طرح۔ یہ اس بات کا بھی غماز تھا کہ وہ کتنا ہی شوخ اور شرارتی سہی لیکن بڑوں کی عزت اور احترام کرنا اس کا فرض ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی بھابھی کے ساتھ الٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا۔

اعیان کی یہی تو خوبی تھی کہ وہ اپنے رویے سے سب کو اپنا بنالیتا تھا۔ وہ بڑوں سے ملتا تو اتنی عزت اور احترام سے پیش آتا کہ وہ اس کے گرویدہ ہوجاتے اور چھوٹے بچوں سے ملتا تو ان کے ساتھ چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو اتنا ہنسی مذاق کرتا تھا کہ ان کا ہنس ہنس کے برا حال ہوجاتا تھا۔

اور جب اسے غصہ آتا تو وہ تباہی اور قہر کا ایسا دیوتا بن جاتا تھا کہ شیطان کی روح بھی کانپ جائے۔ غرض کہ اس میں انسانوں والی تمام اچھی اور بری خوبیاں موجود تھیں۔



تھوڑی دیر بعد ثوبیہ نے ڈائننگ ٹیبل سجا دی اور اعیان کے ساتھ امی بھی آکر ٹیبل کے گرد بیٹھ گئیں۔ جب ثوبیہ بیٹھنے لگی تو اعیان نے اسے ٹوک دیا۔

"ارے آپ کہاں بیٹھ رہی ہیں۔ جب تک میں ان چیزوں کے ساتھ انصاف کرتا ہوں آپ اپنا سامان پیک کرلیں۔ بس آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

ثوبیہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی وہ گھبرا گئی۔ اسے لگتا تھا کہ کم از کم آج کے دن تو اعیان جانے کی بات نہیں کرے گا۔ وہ کل اسے روکے رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لے گی۔ وہ بوکھلا کر بولی۔ "اب..... ابھی.....ابھی ہم کیسے جاسکتے ہیں؟"

"میں کار لے کر آیا ہوں۔ اس میں چلیں گے اور کیسے چلیں گے۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں میں آپ کو پیدل لے کر جاؤں گا۔" اعیان نے ثوبیہ کے گھبرائے ہوئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب تھا ابھی ابو باہر گئے ہوئے ہیں۔ دو تین بعد آئیں گے۔ تب چلیں گے۔" ثوبیہ کو جلدی میں یہی بہانہ سوجھا۔ وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پاچکی تھی۔

"میں انکل کو نہیں آپ کو لینے آیا ہوں۔" اعیان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ امی برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اس لیے اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ ہلکا رکھا تھا۔ مگر اسے گہری نظروں سے دیکھتا پاکر ثوبیہ چین کی سانس نہیں لے پا رہی تھی۔

"بیٹا ابھی تو تم لمبا سفر کرکے آئے ہو۔ تھک گئے ہوگے۔ ایک دو دن آرام کرکے پھر اپنی بھابھی کو لے جانا۔" امی نے کہا۔

"جی ٹھیک ہے آنٹی۔" اعیان نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اعیان کو امی کی بات مانتا دیکھ کر ثوبیہ نے سکون کی سانس لی۔

ثوبیہ نے کریم خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اعیان کو کم از کم آٹھ دس دن روکے رکھے گی مگر اعیان تو آج کے دن بھی رکنے کو تیار نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تو گھبرا ہی گئی تھی مگر شکر ہے کہ امی نے بات سنبھال لی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ امی کے ایک بار کہنے پر ہی اعیان نے جانے کا ارادہ منسوخ کردیا تھا۔

اب ثوبیہ خوش تھی کہ امی کے کہنے پر وہ دو تین دن تو رک ہی رہا ہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روک ہی لے گی۔ مگر ثوبیہ کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد جب امی کسی کام سے پڑوس میں گئی تو ان کے جاتے ہی اعیان بولا۔ "چلو بھابھی۔ تیار ہوجاؤ ہم ابھی جارہے ہیں۔"

"مگر ابھی تو آپ مان گئے تھے کہ دو تین دن بعد جانے کے لیے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"وہ بات پرانی ہوگئی۔ ہمیں آج اور ابھی گھر چلنا ہے۔"

"مجھے کچھ لینا ہے۔ اس لیے آج نہیں چل سکتی۔ ایسا کرتے ہیں پرسوں چلیں گے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کراچی میں دنیا بھر کا سامان مل جاتا ہے اور یہاں سے کہیں زیادہ اچھا۔ آپ کو جو لینا ہے وہیں سے لے لینا۔" اعیان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جانے کو تیار ہو۔

"وہ.....وہ.....وہ مجھے۔" اعیان کو اٹھتا دیکھ کر ثوبیہ

نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا بہانہ کرے۔

"مجھے تو آپ کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے یہاں روک مجھے قتل کروانا چاہتی ہیں۔" اعیان نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ تو کریم نے کہا تھا کہ آپ کو آٹھ دس دن اپنے پاس روک کے رکھوں۔ پھر آپ کے ساتھ آجاؤں۔ اس لیے میں آپ کو روک رہی تھی۔ اور آپ اتنا بڑا الزام۔" ثوبیہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پائی۔ وہ بالکل رونے جیسی ہوگئی تھی۔ اعیان کا الزام سن کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ پائی کہ اعیان اسے کھسکا رہا ہے۔

"اگر آپ سیدھی طرح بتا دیتیں تو سچ اگلوانے کے لیے مجھے اتنا بڑا الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔" اعیان مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو چکی تھی۔

اعیان کا آج ہی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس نے تو ویسے ہی مذاق میں ثوبیہ سے پیکنگ کے لیے کہہ دیا تھا مگر اس کی بات سن کر جس طرح سے ثوبیہ گھبرا گئی تھی اس سے اعیان نے اندازہ لگایا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مگر وہ آنٹی کی وجہ سے کچھ زیادہ کہہ نہیں پایا تھا۔ اب آنٹی کے جانے کے بعد اس نے ثوبیہ پر الزام کا پہاڑ گرا کر اسے بوکھلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ سچ بتاتی چلی گئی۔ سچ سننے کے بعد اعیان سات آٹھ دن یہاں آرام سے رہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور یہ بات اس نے ثوبیہ کو بھی بتا دی تھی۔



"مجھے تم مل گئیں۔ سب کچھ مل گیا۔ اب کوئی سوال معنی نہیں رکھتا۔ اب مجھے ایسے سوالوں کے جواب نہیں چاہئیں۔" ہانیہ نے سمیر کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ جب سے سمیر یہاں آیا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

"مجھے بھی تم مل گئی تو سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے خدا سے کچھ اور نہیں چاہئے۔" سمیر نے ہانیہ کے ہاتھ کو ہلکا سا دباتے ہوئے کہا۔ سمیر کی آنکھوں میں محبت ہی محبت نظر آرہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا عام سا چہرہ بھی بہت خاص نظر آرہا تھا۔

ہانیہ بے خود ہو کر سمیر کو دیکھے جا رہی تھی۔ سمیر تو پہلے سے اپنی پیاسی نظروں کو اس کے دیدار سے سیراب کر رہا تھا۔

دونوں اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بنا پلکیں جھپکائے۔ بنا کچھ کہے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے، ابھرتے رہے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں کھوئے رہتے کہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا جوڑا آپس میں کسی بات پر جھگڑنے لگا جن کی تیز آواز سے ان دونوں کی مدہوشی ٹوٹی۔

پہلے ہانیہ ہوش میں آئی اور ہوش میں آتے ہی اس نے سمیر کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی پلکیں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر شرم کی لالی دوڑتی چلی گئی۔ شرماتے ہوئے وہ کچھ اور حسین نظر آنے لگی۔ سمیر تو جیسے اس کی اس ادا پر مر مٹا تھا۔

"اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔" وہ بولی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ وہ اسے حد سے زیادہ چاہتا ہے اور یہ بات وہ خط پڑھ کر جان چکی تھی مگر وہ اس کی محبت کا اظہار اس کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

اب آنسو چاہے خوشی کے ہوں یا غم کے۔ انہیں تو انسانوں کا ساتھ نبھانے کے لیے آنا ہی ہوتا ہے۔

ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سمیر تڑپ گیا اور بولا۔ "اس سے بھی زیادہ۔" اور کھسک کے ہانیہ کے کچھ اور قریب آ گیا۔ اس نے ہانیہ کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے ستارے اپنی ہتھیلی میں سمیٹے اور انہیں اپنے ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔

سمیر کی اس حرکت سے ہانیہ کچھ اور شرما گئی۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھکتا چلا گیا۔

''مگر میں شاید تم سے اتنی محبت نہیں کرسکی۔ ورنہ تم میرے اتنے قریب رہے اور میرے دل کی دھڑکنیں کبھی تمہارے آس پاس ہونے کا احساس ہی نہیں کرسکیں اور نہ ہی میری سانسیں کبھی تمہارے عشق کی خوشبو کو محسوس کرسکیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر شاید اتنی نہیں جتنا تم مجھے چاہتے ہو۔'' ہانیہ کہتی رہی۔ اس کی پلکیں شرم سے بند ہوئے جارہی تھیں کیونکہ سمیر ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھے جارہا تھا۔

اس سے پہلے کہ سمیر کوئی جواب دیتا اس کے موبائل پر رنگ بجنے لگی اور وہ موبائل پر بات کرنے لگا۔

''سوری ہانی۔ بہت ضروری کام آ گیا ہے۔ مجھے ابھی جانا ہوگا۔'' فون سننے کے بعد وہ اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''ابھی مت جاؤ نا۔'' ہانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بینچ پر بٹھا دیا۔

''ہانی۔ ابھی مجھے جانے دو۔ اب تو ہم ملتے ہی رہیں گے۔'' سمیر مسکرا کر بولا۔ آج وہ بہت خوش تھا اور بھلا خوش کیوں نہ ہوتا چاند سے بھی زیادہ حسین ہانیہ اس سے اتنی محبت کررہی تھی۔ وہ اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا اور بار بار دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کررہا تھا۔

''پھر ملنے کے لیے بچھڑنا کیوں پڑتا ہے۔ میں اب تم سے ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ میں نے کہہ دیا نا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے بس۔'' ہانیہ تڑپ کر بولی۔

کسی نہ کسی طرح سمیر نے بہلا پھسلا کر ہانیہ کو اس کے گھر روانہ کیا اور خود بھی وہاں سے چل دیا۔

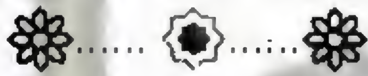
تھوڑی دیر بعد ہی ہانیہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور آج کی ملاقات کے بارے میں سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی۔ آج کا دن اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔

وہ ابھی خیالوں میں کھوئی رہتی مگر موبائل کی بیل اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ اس نے دیکھا۔ کال سمیر کے نمبر سے آرہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو۔'' وہ چہکتی ہوئی بولی۔

''ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔'' دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔

''جی ہاں میں ہانیہ بول رہی ہوں۔ مگر آپ کون۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں سمیر کی بہن بول رہی ہوں۔ سمیر بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ہم ان کو نشتر اسپتال لے کر آئے ہیں۔ سمیر بھائی آپ کو بہت یاد کررہے ہیں۔ پلیز آپ جلدی سے آجائیں۔'' سمیر کی بہن بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔



کریم خان ایک بجے سے ڈی ایس پی زاہد علی کا انتظار کررہا تھا اور اب پانچ بج چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مگر دس منٹ بعد ہی وہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ زاہد علی نے ان کا کریم خان سے تعارف کروایا وہ تینوں خفیہ ایجنسی کے آفیسرز تھے۔

''کریم خان! رئیس علی نواز کا کیس اب خفیہ ایجنسی کے سپرد کردیا گیا ہے۔'' زاہد علی نے کریم خان کی سوچ پر ایک اور حملہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے سر!'' وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ اس کے لیے یہ ایک بڑا جھٹکا تھا۔

''مگر خفیہ ایجنسی اس کیس پر کام کررہی ہے۔ یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہونی چاہئے۔'' ڈی ایس پی نے اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

''وہ کیوں سر؟''

''آج کل کے مجرم پولیس سے نہیں ڈرتے مگر ان پر خفیہ ایجنسی کا رعب ابھی بھی قائم ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ اب یہ کیس خفیہ ایجنسی کے پاس ہے تو وہ چوکنا ہوجائیں گے۔ جبکہ ہم ان کی بے فکری کا فائدہ اٹھانا

چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قیمت پر یہ بات باہر نہیں جانی چاہیے۔'' ڈی ایس پی نے ایک طرح سے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

''اوکے سر! یہ بات باہر بالکل نہیں جائے گی۔'' کریم خان نے کہا۔ اس کے علاوہ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

''اور ہاں۔ جس طرح سے تم اس کیس پر کام کر رہے تھے۔ اب نہیں کرو گے۔ لیکن تم اس کیس پر کام کرنے کا صرف دکھاوا کرتے رہو گے۔ باقی کا سارا کام خفیہ ایجنسی خود کر لے گی۔'' ڈی ایس پی سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ''اب انہیں اپنے کیبن میں لے جاؤ اور اب تک کی ساری تفصیل اور پیش رفت انہیں بتا دو۔''

کریم خان کے پاس ڈی ایس پی کی بات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ڈی ایس پی کے دیئے ہوئے جھٹکوں سے سنبھل نہیں پایا تھا۔

ڈی ایس پی کی کلائی دیکھنے والی بات تو اس کے دماغ سے پوری طرح سے نکل ہی گئی تھی۔

کریم خان ان آفیسرز کو اپنے کیبن میں لے آیا جہاں وہ چار گھنٹے تک اس کا دماغ کھاتے رہے۔

رات کے تقریباً نو بج کر بیس منٹ پر وہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا اور ابھی وہ گھر کے دروازے کا لاک کھولنے کے لیے چابی نکال ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ اس نے دیکھا کال سرفراز کی تھی۔

''ہیلو سر!'' سرفراز کی آواز میں پریشانی کی جھلک تھی۔

''ہاں سرفراز! بولو۔'' کریم خان نے بھی اس کی پریشانی کو محسوس کر لیا۔

''سر! ابھی ابھی مائی کلاچی روڈ پر ڈی ایس پی صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور انہوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا ہے۔'' سرفراز اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر اپنے کانوں میں ہونے والی سائیں سائیں کی وجہ سے وہ کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ ڈی ایس پی زاہد علی کی موت کا سن کر اس کا دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔



''نہیں۔'' ہانیہ زور سے چیخی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی ورنہ اس کے امی ابو اس کے چلانے کی وجہ ضرور پوچھتے۔

''بس تھوڑی بہت خراشیں ہی آئی ہیں۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' سمیر کی بہن نے ہانیہ کے رونے کی آواز سن کر کہا۔

''نہیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کی آواز بتا رہی ہے کہ معاملہ سیریس ہے۔'' ہانیہ روتے روتے بولی۔

''ارے یقین کریں۔ سمیر بھائی کو بہت معمولی چوٹیں آئی ہیں۔'' اس بار سمیر کی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر ہانیہ نے لائن کاٹی اور گھر لاک کر کے پاگلوں کی طرح اپنی کار کی طرف بھاگی اور طوفانی رفتار سے کار دوڑاتے ہوئے اسپتال پہنچ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کوئی بیچارہ اس کی کار کی زد میں نہیں آیا۔ کیونکہ وہ اس وقت بالکل مدہوشی کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

اپنی کار پارک کر کے اس نے سمیر کا نمبر ڈائل کیا۔ کال سمیر کی بہن نے ریسیو کی اور ہانیہ کو روم نمبر بتا دیا۔ ابھی وہ پانچ چھ قدم ہی چل پائی تھی کہ اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ اس نے اسکرین دیکھی اس کی امی کی کال تھی اور وہ اس وقت اس حالت میں نہیں تھی کہ امی کو کچھ بتا پاتی اس لیے اس نے موبائل سوئچ آف کر دیا۔ ہانیہ اس فلور پر پہنچی جہاں سمیر ایڈمٹ تھا۔ سمیر کی بہن اسے باہر ہی کھڑی مل گئی۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ روم میں آ گئی جہاں کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔

سمیر کے کہنے پر اس کی بہن اور ہانیہ کے علاوہ باقی لوگ باہر چلے گئے۔

''سمیر۔ یہ سب کیسے ہوا۔'' ہانیہ بولی۔ وہ سارے راستے روتی آئی تھی اور ابھی بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ بس خدا

نے اسی کی سزا دی ہے۔'' سمیر اپنے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''دھوکا...... کیسا دھوکا کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم۔'' سمیر کی بات سن کے وہ تڑپ کے بولی۔

''وہ خط جو میں نے تمہیں لکھے تھے۔ وہ دراصل میں نے نہیں لکھے تھے۔ وہ خط مجھے ریلوے اسٹیشن سے ملے تھے۔'' سمیر نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

''سمیر یہ کون سا موقع ہے مذاق کرنے کا۔'' ہانیہ اس کی بات سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سب سچ سچ بتاتا ہوں۔'' سمیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

سمیر کی بات سن کر ہانیہ بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر سمیر کی بہن بھی بیٹھ گئی۔ سمیر کچھ دیر تک ہانیہ کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر نظر ہٹا کر کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ لگ بھگ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک دن میں آفس کے کام سے کوٹری جا رہا تھا۔ جب میں پلیٹ فارم پر پہنچا تو ایک شخص تیزی سے بھاگتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ اس کے پیچھے چوبیس پچیس سال کا ایک لڑکا بھاگا آ رہا تھا۔ اس جیسا حسین لڑکا میں نے زندگی میں پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس لڑکے کا بیگ نیچے گر گیا۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر آگے والے آدمی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ وہ بیگ بالکل میرے پاس ہی گرا تھا۔

میں نے وہ بیگ اٹھایا اور اس لڑکے کے پیچھے گیا مگر وہ بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ میں مایوس ہو کر وہیں کھڑا اس لڑکے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب بہت دیر بعد بھی وہ لڑکا واپس نہیں آیا تو میں نے یہ سوچ کر وہ بیگ اپنے پاس رکھ لیا کہ اس میں اس کا پتہ ہوا تو کوٹری سے واپس آ کر اس تک پہنچا دوں گا۔ مگر جب گھر آ کر میں نے اس بیگ کو کھولا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔'' اتنا کہہ کر سمیر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور چھت سے نظر ہٹا کر ہانیہ کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''اس بیگ میں وہ دو خط تھے جو میں نے تمہیں بھیجے تھے اور تمہارے اسکول کے زمانے کی بہت ساری تصویریں تھیں۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارا ایڈریس بدل جانے کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے خط تم تک نہیں پہنچا سکا تھا۔ ان خطوط کے ذریعے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اس لڑکے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ میں تمہیں کالج کے زمانے سے بہت چاہتا تھا۔ مگر کبھی اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ کالج میں جس طرح تم گم صم رہتی تھیں اور کسی کو لفٹ نہیں کرواتی تھیں مجھے لگتا تھا کہ تم کسی کو چاہتی ہو اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ ان خطوط کو پڑھ کے مجھے معلوم ہوا کہ تم کسے چاہتی ہو۔ ایک بار تو میں نے سوچا کہ وہ بیگ تم تک پہنچا دوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سمیر بن کر تو میں تمہیں نہیں پا سکتا۔ کیوں نہ وہ اجنبی بن کر ہی قسمت آزمائی جائے۔ میں نے وہ خط جو اس لڑکے نے نو سال پہلے لکھے تھے۔ نئے لفافے میں رکھ کر تمہیں بھیج دیے۔ اور ایسا میں نے اس لیے کیا کیونکہ نو سال پہلے اس نے تمہیں ایک خط بھیجا تھا' اس لیے تم اس کی رائٹنگ کو پہچانتی ہوگی۔ پھر میں نے اجنبی بن کر تمہیں کال کی اور میری امید کے مطابق تم میرے جال میں پھنس گئیں۔ مگر کوئی طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے سے بار بار روک رہی تھی۔ پہلے میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ مگر اس ایکسیڈنٹ کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ تم اور وہ لڑکا ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔

جس دن میں نے تمہیں دھوکا دینے کا پکا ارادہ کیا تھا اسی دن میرا سب سے پیارا کتا پپی مر گیا۔ جب میں نے تمہیں پہلا خط بھیجا تو بغیر کسی وجہ کے مجھے جاب سے نکال دیا گیا۔ کل میں نے تمہیں ایک خط بھیجا اور کال کی تو میری کار چوری ہو گئی۔ مگر کل تک میں کچھ نہیں سمجھا تھا کہ میرے ساتھ سب اتنا برا کیوں ہو رہا ہے۔ مگر آج جب میں تم سے ملا تو آج میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور میں نے اپنی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے کھو دی ہیں...... تب مجھے احساس

ہوا کہ قدرت بھی تم دونوں کے ساتھ ہے۔ تم دونوں ایک نہ ایک دن ضرور ملو گے۔ میں نے تمہیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔" اتنا کہہ کر سمیر نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

سمیر کی باتیں سن کر ہانیہ کا خون ابل رہا تھا وہ کرسی سے اٹھی اور پوری طاقت سے سمیر کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنی زور کا تھا کہ اس کی آواز کمرے سے باہر بھی سنی گئی۔ اس کے بعد ہانیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

کچھ ہوش نہیں رہتا۔ کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں۔ انسان نہیں رہتا

کم از کم ہانیہ کی لحہ لحہ بدلتی حالت کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے۔ شاید وہ ہوش سے کام لیتی تو دھوکہ نہ کھاتی۔ مگر وہ عشق ہی کیا جس میں انسان ہوش میں رہے۔ عشق تو کہتے ہی اسے ہیں جو انسان کو بے خود اور بے بس بنائے رکھے۔ عشق انسان کو احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ کیوں کر رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے سیٹ سے پشت ٹکالی اور گہری گہری سانسیں لے کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

ہانیہ کو اس وقت سمیر پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ سمیر نے تو ایک ماہر شکاری کی طرح دوسروں کے دانے پر ایک جال بچھایا تھا۔ بے وقوف تو وہ خود تھی کہ بغیر کسی چھان پھٹک کیے اس نے مان لیا کہ اسے بلانے والا اس کا محبوب ہے' کوئی شکاری نہیں۔ وہ خود ہی دانہ چگنے چلی گئی تھی اب اسے پھنسنا تو تھا ہی۔

وہ تو قدرت نے اس کا ساتھ دیا کہ سمیر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اسے پوری سچائی معلوم ہو گئی۔ ورنہ جانے کتنے دنوں تک' اس کے جھوٹے عاشق کے خول میں چھپا ہوا سانپ سمیر اسے ڈستا رہتا۔

ہانیہ یہی سمجھتی تھی کہ اس خط اور اس کی محبت کے بارے میں اس کے اور اس کے محبوب کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے جیسے ہی اسے دوسرا خط ملا اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کہ اسے خط بھیجنے والا اس کا وہی محبوب ہے' جس کے لیے وہ تڑپ رہی ہے۔

اور ویسے بھی اگر کوئی شخص پورے نو سال تک پانی کی ایک ایک بوند کے لیے تڑپ رہا ہو اور پھر کوئی اسے ڈھیر سارا پانی دے تو وہ اس بات پر بالکل غور نہیں کرے گا کہ پانی دینے والا اس کا دوست ہے یا دشمن۔ وہ تو سیدھا پانی سے منہ لگائے گا اور پیتا جائے گا۔ اس لیے اگر ہانیہ نے کوئی غلطی کی تھی تو یہ ماننا بھی غلط ہو گا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہی غلطی کرتی۔

حالانکہ وہ سمیر کی زبانی یہ جان کر بہت خوش ہوئی تھی کہ اس کا محبوب اسی شہر میں ہے اور جس طرح قدرت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے پوری امید ہونے لگی تھی کہ اس کا محبوب بہت جلد اس سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔ اس نے سب کچھ قدرت پر چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا تھا۔ اب قسمت اسے جس طرف لے جا رہی تھی وہ جانے کو تیار تھی۔

ہانیہ گھر پہنچی تو اس کے امی ابو بھی گھر پہنچ چکے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ابو کے پاس ڈپلیکیٹ چابیاں تھیں اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ اب تک گھر کے باہر کھڑے ہانیہ کا انتظار کر رہے ہوتے۔

گھر میں گھستے ہی اس کی امی نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ایک سہیلی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ اسپتال گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ لگ بھگ ایک گھنٹے تک شاور کے نیچے بیٹھی رہی۔ اب وہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تولیے سے اپنے بال سکھا رہی تھی کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اس کی سب سے پیاری سہیلی ثوبیہ کی کال تھی۔ ہانیہ نے مسکراتے ہوئے موبائل اپنے کان سے لگا لیا۔ "ہیلو۔ ثوبی۔ کیسی ہو تم۔"

"تمہیں کیا میں جیوں یا مروں۔ میں تمہارے شہر میں

آئی ہوئی ہوں اور تم اپنا حسین وجمیل چہرہ دکھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہی ہو۔ میں تو ہمت کر کے ایک بار جیسے تیسے تمہارے گھر آ بھی گئی تھی مگر تم نے تو دوستی کو ایک دم ردی سمجھ رکھا ہے۔'' ثوبیہ بولی تو غصے میں بولتی ہی چلی گئی۔

ثوبیہ واقعی میں ہانیہ سے بہت ناراض تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنے میکے یعنی ہانیہ کے شہر ملتان آئی ہوئی تھی۔ مگر ہانیہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ جبکہ ثوبیہ پانچ دن پہلے اس کے گھر اس سے ملنے آئی تھی۔

''ارے میری ماں۔ تم ناراض مت ہو۔ کل میں تمہارے گھر آ رہی ہوں نا۔'' ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں آئی نا تو دیکھنا تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ پتہ ہے میں کتنا بور ہو رہی ہوں۔ مگر تمہیں میری کیا فکر ہوگی۔ تم تو اپنی ہی زندگی جی رہی ہو۔'' ثوبیہ ابھی تک غصے میں تھی۔

''ابے یار۔ تیری فکر کرنے کے لیے کریم بھائی ہیں نا۔'' ہانیہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

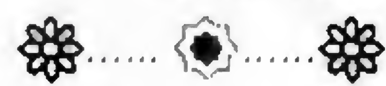
''انہیں بھی اپنی جاب سے فرصت ہو تو میری خبر لیں۔ میرے ماں باپ نے بھی نہ جانے میرے ساتھ کون سے جنم کی دشمنی نکالی ہے جو میری شادی ایک پولیس انسپکٹر سے کروادی ہے۔''

''تو بھی یار۔ کیا چیز ہے۔ کسی بھی طرح خوش نہیں ہوتی۔''

''اگر تم کل آ گئیں تو میں بھی خوش میرا دل بھی خوش اور نہ آئیں تو پہلے ہی بتائے دیتی ہوں اپنے دل کو تو خوش ہی رکھوں گی مگر اپنے ہاتھ پیروں کو کھلا چھوڑ دوں گی۔'' ثوبیہ نے پیار بھری دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''یار وعدہ کرتی ہوں کل ضرور آؤں گی۔'' ہانیہ بولی۔

''اوکے تو پھر باقی باتیں کل ہی کریں گے۔ کال پر زیادہ پیسے خرچ کرنے کا کیا فائدہ۔'' اور ہانیہ کا جواب سنے بغیر ہی ثوبیہ نے لائن کاٹ دی۔



انسان بیچارہ بھی ہواؤں میں جلتے اس چراغ کی مانند ہوتا ہے جسے ہوا کا ایک جھونکا کبھی بھی بجھا سکتا ہے۔ آج ڈی ایس پی زاہد علی کی زندگی کا چراغ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہوا کے تیز جھونکے نے بجھا دیا تھا۔

کریم خان اپنے باس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ مگر آج صبح جب سے جنگل والے کاٹیج کے سامنے کھڑی کار سے ڈی ایس پی کی تصویریں ملی تھیں وہ اس سے ایک عجیب طرح کی نفرت سی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ڈی ایس پی یا تو وہ انفارمر ہے جو بڑی بے رحمی سے لوگوں کو مارتا پھر رہا ہے یا پھر وہ سیون اسٹار گینگ کا کوئی ممبر ہے۔ مگر سرفراز کی زبانی ڈی ایس پی زاہد کی موت کی خبر سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے دوبارہ اپنی گاڑی میں آیا اور اسٹارٹ کر کے مائی کلاچی روڈ کی طرف بڑھا دی۔

وہ جب مائی کلاچی روڈ پر پہنچا تو ٹریفک دور تک جام نظر آ رہا تھا اس لیے اسے اپنی گاڑی کافی پیچھے روکنا پڑی۔ وہ اتر کر گاڑیوں کے بیچ میں پیدل نکلتا ہوا وہاں پہنچا جہاں لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ کسی طرح لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہ سب سے آگے آیا تو سامنے دل دہلا دینے والے منظر پر اس کی نظر پڑی۔

روڈ پر کافی دور تک خون کے دھبے جمے ہوئے تھے اور بہت دور تک ڈی ایس پی زاہد کا پسا ہوا جسم روڈ سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی جو حالت ہوئی تھی اسے لاش بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لاش تھی ہی کہاں۔ بس بہت دور تک روڈ پر گوشت لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید روڈ پر ملنے والی اس کی ذاتی اسپورٹس بائیک' پھٹے ہوئے کپڑوں اور ایسی ہی چیزوں سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ مرنے والا ڈی ایس پی زاہد علی ہے ورنہ تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ مرنے والا کون تھا۔ کیونکہ وہاں جسم کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جو پسنے سے بچ گیا ہو۔

عینی شاہدوں نے بتایا کہ ڈی ایس پی نیٹی جیٹی کی جانب سے بہت تیزی سے اسپورٹس بائیک چلاتا ہوا آ رہا تھا اور یہ تو ڈپارٹمنٹ کے سارے ہی لوگ جانتے تھے کہ زاہد علی کو اسپورٹس بائیک کا کتنا جنون تھا۔ بتانے والوں

کے مطابق مائی کلاچی اور ایم ٹی خان روڈ کے سنگم پر موڑ کاٹتے ہوئے بھی اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور دوسری جانب سے آنے والی کار کی زد میں آ گیا۔ اس کی بائیک ایک طرف جا گری وہ خود بیچ سڑک پر گر گیا اور پیچھے سے آنے والے ٹرالر کے پہیوں کے نیچے آ گیا اور ٹرالر اسے بہت دور تک کھینچتا چلا گیا اور صحیح معنوں میں ڈی ایس پی صاحب اسٹیکر کی طرح سڑک پر چپک کر رہ گئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر کریم خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے وہ منظر دیکھا نہیں گیا' وہ واپس مڑا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا اور ثوبیہ کو یہ بتانے کے لیے موبائل پر نمبر ڈائل کیا کہ کل اعیان اسے لینے آ رہا ہے۔

''ہیلو بے بی۔ کیسے ہو تم۔'' دوسری طرف سے کال پک کرتے ہی ثوبیہ کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

''ایک دم مست اور میری جان کیسی ہے۔'' اس نے زبردستی اپنی آواز کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ اگر ثوبیہ اس کی آواز میں پریشانی محسوس کر لیتی تو پھر پوچھ پوچھ کر اس کا دماغ کھا جاتی۔

''اوہ میرے خدا۔ میرے بے بی کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ آج کل مجھ سے جھوٹ ہی بولتا ہے۔ چلو زیادہ ناٹک مت کرو اور یہ بتاؤ کہ اتنے پریشان کیوں ہو۔'' ثوبیہ آخر اس کی بیوی تھی۔ نہ بتانے کے باوجود وہ جانے کس طرح اس کی طبیعت کو پہچان جاتی تھی۔

''یار پولیس کی تو جاب ہی ایسی ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ عجیب ہوتا ہی رہتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ تمہیں لینے کے لیے کل اعیان پہنچ جائے گا۔'' اس بار اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ اس بار اس نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی ناکام کوشش نہیں کی تھی۔

''آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔''

''پوچھو۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''اعیان کی پیدائش بھی وقت سے پہلے ہو گئی تھی کیا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ثوبیہ کے اس بے تکے سوال سے جھلا کر بولا۔

''کیونکہ اعیان صاحب جو آپ کے مطابق کل آنے والے تھے۔ آج ہی یہاں وارد ہو چکے ہیں۔'' ثوبیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی۔ پھر تو یہ پیدائش والا سوال تم اسی سے پوچھ لو۔'' اعیان کے پہنچنے کی خبر سن کر جیسے ایک اطمینان سا ہو گیا تھا۔

''کیا آپ نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں اعیان سے پوچھوں۔ وہ تو مجھے کچا ہی چبا جائے گا۔'' ثوبیہ کھلکھلاتی ہوئی بولی۔

کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور پھر فون بند کر کے وہ سو گیا۔



کراچی کے علاقے ڈیفنس فیز 17 کے ایک خوبصورت بنگلے میں ایک تیس پینتیس سال کا آدمی۔ جس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ اور جسم پتھر کی طرح مضبوط لگ رہا تھا۔ اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا رہا تھا۔

اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا کر وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ مگر اس نے کوئی بٹن آن کرنے کی بجائے بورڈ کی ایک خالی جگہ پر اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی لگائی۔ انگوٹھی لگاتے ہی ایک ہلکی سی آواز ہوئی اور کمرے کے ایک کونے کا فرش اپنی جگہ چھوڑنے لگا اور نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔

وہ نقاب پوش سیڑھیاں اترنے لگا اور جیسے ہی اس نے ساتویں زینے پر قدم رکھا اوپر کا فرش آٹومیٹک طریقے سے بند ہو گیا اور وہ سیڑھیاں جو اب تک اندھیرے میں تھیں روشنی میں چمکنے لگیں۔ نیچے ایک طویل کوریڈور تھا جس میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔

کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ نقاب پوش ایک ایسے کمرے میں آیا جہاں ایک شخص لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بس کھڑا تھا۔ یہ بندھا ہوا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ڈی ایس پی زاہد علی تھا۔

نقاب پوش اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ ''کیا حال ہیں ڈی ایس پی زاہد علی صاحب۔''

''کون ہو تم۔'' زاہد علی نے اس سے پوچھا۔

زاہد علی کا اتنا بولنا بھی جیسے جرم بن گیا۔ نقاب پوش کا ہاتھ اٹھا اور ایک زناٹے سے اس کے گال پر پڑا۔ جس سے زاہد علی کو دن میں بھی تارے نظر آنے لگے۔

''تمہاری یہ ہمت کہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال کر رہا ہے۔'' نقاب پوش نے غصے سے کہا۔

''تم چاہتے کیا ہو۔'' زاہد علی نے پھر پوچھا۔

یہ سنتے ہی نقاب پوش نے ایک زوردار لات زاہد علی کے پیٹ پر ماری اور تکلیف کے مارے زاہد علی کی چیخیں نکل گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی آنتیں اور دوسرے اعضا نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہو۔

''پھر سوال کرتے ہو۔ ایک بار کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیا۔'' وہ غصے سے چلا رہا تھا۔

زاہد علی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ مزید بولا تو نقاب پوش پھر اس پر تشدد کرے گا۔ مگر اس کا یہ سمجھنا بھی غلط تھا۔ نقاب پوش کچھ دیر تک تو اسے دیکھتا رہا۔ جب زاہد علی کچھ نہیں بولا تو اس نے ایک مکہ اس کی کنپٹی پر مارتے ہوئے کہا۔ ''اب خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ بھونکتے کیوں نہیں۔''

نقاب پوش کی بات سن کر زاہد علی کا دماغ چکرا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ نقاب پوش پاگل اور سنکی ہے۔ کیونکہ اگر وہ کچھ بولتا ہے تب بھی مار کھاتا ہے اور خاموش رہتا ہے تب بھی بخشا نہیں جاتا۔

وہ چپ ہی رہا اور کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے چپ دیکھ کر نقاب پوش بولا۔ ''چلو چپ ہی رہو۔ ویسے بھی مردے بولا نہیں کرتے۔''

اس کی بات سن کر زاہد علی چونک کر بولنے کی خطا کر بیٹھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

اس کے اتنا کہتے ہی نقاب پوش کی ایک اور زوردار لات اسے پیٹ پر کھانی پڑی۔ ''سالے جب تجھے کچھ بولنے کو کہتا ہوں تو چپ رہتا ہے اور چپ رہنے کو کہتا ہوں تو بولنے لگتا ہے۔ مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے کیا۔''

اتنا کہنے کے بعد نقاب پوش نے جیب سے ریموٹ کنٹرول نکالا اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی ایل سی ڈی آن کر دی، جس پر ڈی ایس پی زاہد علی کے ایکسیڈنٹ کی نیوز چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر زاہد علی نے چلا کر کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔''

''کتے کمینے۔ مجھ پر چلاتا ہے۔'' یہ کہہ کر نقاب پوش نے زاہد علی پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی اور تب تک مارتا رہا جب تک وہ چیخ چیخ کر بے ہوش نہ ہو گیا۔

زاہد علی تقریباً آدھے گھنٹے تک بے ہوش رہا۔ پھر اسے دھیرے دھیرے ہوش آنے لگا اور تھوڑی دیر میں وہ پوری طرح ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اسے اپنے بدن میں ناقابل برداشت تکلیف محسوس ہوئی۔ اس کے منہ سے آہ نکلنے والی تھی جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے بھینچ کر اندر ہی روک لیا اور اپنی بند آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھا۔ سامنے ہی وہ نقاب پوش ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے اس کے ہوش میں آنے کا منتظر کھڑا نظر آیا۔ نقاب پوش کو دیکھ کر ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ہوتے ہوئے بھی اس کے پورے بدن میں خوف کی ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ عہدہ اپنی جگہ۔ انسان تو پھر انسان ہوتا ہے اور اتنا تشدد کون برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور بے ہوشی ظاہر کرنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس پاگل نقاب پوش کو معلوم ہو گیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں تو مار مار کر میری ہڈیاں توڑ ڈالے گا۔ مگر اس کی یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دور ہو گئی کہ نقاب پوش کو اس کے ہوش میں آنے کا علم نہیں ہے۔

''ابے او ناجائز اولاد۔ یہ نوٹنکی بند کرو ورنہ یہ آنکھیں جو

تُو بند کر کے کھڑا ہے۔ نکال کر تیرے ہاتھ پہ رکھ دوں گا۔"

نقاب پوش کی دھمکی سن کر اس نے ایک دم گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"ٹریلر تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب میں یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ اپنے بدن کی کتنی ہڈیاں تڑوا کر تم سچ بتاتے ہو۔" نقاب پوش نے غرا کر کہا۔

زاہد علی کچھ نہ بول اور نہ ہی اپنے جسم میں پھیلی کپکپی پر قابو پا سکا۔

"یہ بتاؤ۔ وہ انفارمر کون ہے۔"

"کک...... کو۔ کون سا...... ان۔ انفا۔ انفارمر۔" زاہد علی ہکلاتے ہوئے بولا۔ خوف کی وجہ سے وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہا تھا۔

"وہی انفارمر جس کی کالیں آج کل انسپکٹر کریم خان کے پاس زیادہ ہی آ رہی ہیں۔" نقاب پوش کھا جانے والے لہجے میں بولا۔

"مم...... مگر...... آپ کو کک کیسے...... معلو...... معلوم ہوا۔ یہ...... یہ سب۔" زاہد علی کی حالت نازک ہو رہی تھی۔

زاہد علی یہ سوچ رہا تھا کہ کریم خان نے طارق محمود کے قتل کے علاوہ کوئی بات باہر جانے نہیں دی تھی۔ پھر انفارمر کے بارے میں اس نقاب پوش کو کیسے معلوم ہوا۔

"پولیس میں صرف چند لوگ وطن کے لیے کام کرتے ہیں۔ باقی سب ہمارے لیے۔" نقاب پوش نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ وہ انفارمر کون ہے۔" اس بار زاہد علی نے ہکلائے بغیر جواب دیا۔ اب تک نقاب پوش نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا' اس لیے شاید اس کا ڈر کچھ کم ہو رہا تھا۔

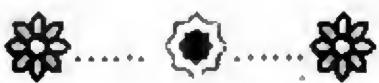
زاہد علی کی بات سنتے ہی نقاب پوش حرکت میں آیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا پوری طاقت سے زاہد کی پنڈلیوں سے ٹکرایا۔ اور پھر وہ غصے سے چلا کر بولا۔ "مگر مجھے کیوں لگتا ہے کہ وہ پولیس کا ہی کوئی آدمی ہے اور تم اسے جانتے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون ہے۔ اور ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پولیس کے زیادہ تر لوگ تمہارے لیے کام کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں ان سے معلوم ہو چکا ہوتا۔" زاہد علی نے غصے سے چلا کر کہا۔ مگر جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر چکا ہے۔ اس نے گھبرا کر نقاب پوش کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر زاہد علی کو اتنا ڈر لگا کہ اس جیسے اعلیٰ عہدیدار کا پیشاب خطا ہو گیا۔

اس کی حالت دیکھ کر نقاب پوش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کافی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد نقاب پوش بولا۔ "میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ وطن کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اور کریم خان اور اس کی ٹیم کا شمار بھی انہیں وطن پرستوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ "اس لیے تمہیں دنیا کی نظروں میں مردہ بنا کر زندہ یہاں منگوا لیا۔ تاکہ تمہاری مدد سے اس انفارمر تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ تم بھی انفارمر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ خیر اب اپنی دنیا تو تم واپس جا ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کے لیے تو تم مر چکے ہو۔ اب اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے لیے کام کرو گے۔ ورنہ۔" نقاب پوش نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور وہاں سے واپس چلا گیا۔

اس ورنہ کا مطلب زاہد علی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہ ورنہ نہیں تھی جو اکثر شہر کی دیواروں پر لکھی ہوتی ہے کہ ہمارے لیڈر کو رہا کرو۔ ورنہ۔ ورنہ ہم دوسرا لیڈر ڈھونڈ لیں گے۔



صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب ہانیہ کے ابو اسے ثوبیہ کے گھر کے آگے اتار کر آفس چلے گئے تھے۔ ہانیہ گیٹ کے پاس آئی اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ اتفاق

سے گیٹ اعیان نے کھولا اور سامنے ہانیہ کو دیکھ کر چونک گیا۔ دوسری طرف ہانیہ کی نظر اعیان پر پڑی تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

ہانیہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ''کیا کوئی مرد بھی اتنا حسین ہوسکتا ہے۔'' ہانیہ کو جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اعیان کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ایک بار نہیں۔ بار بار دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

اعیان بھی پلکیں جھپکائے بنا ہانیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ ہانیہ کے علاوہ اسے نہ تو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ یہی حالت ہانیہ کی بھی تھی۔ جانے کتنے پل ایسے ہی گزر گئے۔

سب سے پہلے اعیان ہی ہوش میں آیا اور ہانیہ کی کیفیت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اور اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ارے تو اس طرح لائن کیوں مار رہی ہو۔ یہ لو دس روپے اور یہاں سے نکل لو۔''

اعیان کی آواز سن کر ہانیہ خواب کی سی کیفیت سے باہر نکلی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر شرمائی اور گردن جھکا لی۔ اعیان کی بات تو وہ ٹھیک طرح سے سن ہی نہیں پائی تھی۔ اس لیے چپ کھڑی رہی اور کچھ نہیں بولی۔

''اے لڑکی۔ کیا تم بہری ہو۔'' اعیان ذرا تیز آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر بھی ہلکا غصہ نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں شرارت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''جی......جی...... میں ہانیہ ہوں۔'' وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ اس کا دل بار بار اعیان کو دیکھنے کی ضد کر رہا تھا۔ جسے رد کرتے ہوئے وہ اپنی نظریں زمین پر ٹکائے ہوئے تھی۔ وہ عجیب سی الجھنوں کا شکار ہو رہی تھی۔

''ہانیہ ہو تو کیا نام کے الگ سے پیسے لوگی۔'' اعیان بولا اور پرس سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ثوبیہ کی فرینڈ ہوں۔'' ہانیہ اس نوٹ پر ایک نظر ڈال کر اعیان کی نیلی نیلی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا اور یہ اس کی غلطی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں اعیان کی نظروں سے ملیں۔ اس کا دل کچھ اتنی زور سے دھڑکا کہ ایک لمحے کو تو اسے ایسا لگا جیسے وہ پسلیوں کو توڑتا ہوا باہر آ جائے گا۔ ہانیہ نے گھبرا کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

''ثوبیہ کی دوست ہو تو کیا میں اس خوشی میں ڈانس کردں۔'' اعیان باقاعدہ اپنے کولہے مٹکاتا ہوا بولا۔

یہ دیکھ کر ہانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ میں ثوبیہ سے ملنے آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

ہانیہ کو کھلکھلا کر ہنستا دیکھ کر اعیان کے چہرے پر ایک سکون سا پھیل گیا۔

''میں بھابھی سے پوچھتا ہوں۔ تم باہر ہی رہنا۔ اندر آنے کی کوشش مت کرنا۔ سنا ہے آج کل بھکاری لوگ دن میں گھر کی لوکیشن دیکھ کر جاتے ہیں اور رات کو چوری کرنے آ جاتے ہیں۔ اعیان بولا۔

اعیان کی بات سن کر ہانیہ کی ہنسی کو بریک لگ گئے اور وہ منہ پھلا کر اعیان کو دیکھنے لگی۔

''پتہ نہیں بھابھی کو بھی کیا ہو گیا ہے کہ اب بھکارنوں سے دوستی کرنے لگی ہیں۔ یہ کہتا ہوا اعیان اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا کچن کی طرف بڑھا کیونکہ اس وقت ثوبیہ کچن میں ہی تھی اور اب تک اعیان کا چہرہ جو نارمل لگ رہا تھا اس پر ایک دلکش مسکراہٹ آ کر بیٹھ گئی۔ شاید برسوں بعد اعیان کے لبوں پر اتنی شاندار مسکراہٹ پھیلی تھی۔

دوسری طرف ہانیہ کو اب سمجھ میں آیا کہ اعیان اس کی طرف پیسے کیوں بڑھا رہا تھا۔ اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ بلیک جینز اور بلیو ٹاپ میں وہ کسی بھی زاویے سے بھکارن نظر نہیں آ رہی تھی۔

''بھابی! آپ سے ملنے آپ کی کوئی فرینڈ ہانیہ آئی ہیں۔'' اعیان کچن کے پاس پہنچتے ہی چلایا۔

''کہاں ہے وہ۔'' ثوبیہ کچن سے باہر آ کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔

''باہر کھڑی ہے۔'' اعیان مسکراتے ہوئے بولا۔

اعیان کی بات سن کر ثوبیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر کچھ سوچ کر بنا کچھ کہے باہر کی طرف لپکی اور ہانیہ کو لے کر اندر آ گئی اور دونوں ڈرائنگ میں آ گئیں۔ اعیان بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

''ہانیہ! ان سے ملو یہ ہے کریم کا جان سے بھی پیارا دوست اعیان۔ اور اعیان بھائی یہ میری بیسٹ فرینڈ ہانیہ۔'' ثوبیہ نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''ہانیہ تم تو بھابی سے ملنے آئی تھیں نا اور کمال ہے ابھی تک نہیں ملیں۔ اوہ! شاید تم کو ملنا نہیں آتا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں سکھاتا ہوں۔'' اعیان نے کہا اور ہانیہ کی طرف بڑھنے لگا۔

ثوبیہ اور ہانیہ دونوں ہی اعیان کی بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ سمجھ پاتیں۔ اعیان نے قریب پہنچ کر ہانیہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اعیان کی بانہوں میں آتے ہی ہانیہ کو اپنے اندر ایک سکون سا اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنا سر اعیان کے چوڑے اور مضبوط سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور خود بخود ہی اس کے ہاتھ اعیان کی کمر کے نزدیک اور نزدیک آتے گئے۔ اس سے پہلے کہ ہانیہ اسے خود سے چپکا لیتی' اعیان نے اسے خود سے الگ کیا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

ہانیہ جو اعیان کی بانہوں میں بے انتہا خوشی محسوس کر رہی تھی اور خدا سے دعا کر رہی تھی کہ اعیان اب پوری زندگی اسی طرح اسے اپنی بانہوں میں بھر کر کھڑا رہے اور وہ اسی طرح اپنا سر اس کے سینے سے ٹکائے اور اپنی آنکھیں بند کیے پوری ایسی ہی گزار دے۔ اسے اعیان کا اپنی بانہوں سے آزاد کرنا بہت برا لگا۔ اسے بہت تیز غصہ آنے لگا اور ذرا ہی دیر میں غصے کی لالی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

اعیان کی اس حرکت پر ثوبیہ بھی بوکھلا گئی تھی اور ہانیہ کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ جلدی سے بات کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ارے اعیان بھائی کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔ تم برا مت ماننا۔''

ثوبیہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اعیان کی اس حرکت پر ہانیہ کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ہانیہ کو غصہ پکڑنے پر نہیں بلکہ چھوڑنے پر آ رہا تھا۔ ثوبیہ آگے بڑھی اور ہانیہ کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ بولتے ہوئے ثوبیہ کچن میں چلی گئی۔

''ایک بات تو ہے۔ غصے میں تم اور زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔ بالکل کشمیری سیب جیسی۔ دل کرتا ہے کھا جاؤں۔'' اعیان نے ہانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے رومانوی لہجے میں کہا۔

ابھی وہ اعیان کی بات کا جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے سامنے سے آنٹی آتی ہوئی نظر آئی۔ اور اس نے کوئی جواب دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور آنٹی سے بولی۔ ''سلام آنٹی۔ کیسی ہیں آپ۔''

پھر بہت دیر تک ہانیہ اور آنٹی آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ اس دوران اعیان صوفے سے سر ٹکائے یوں آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا جیسے ان دونوں کی بور باتوں سے اسے نیند آنے لگی ہو۔

ہانیہ آنٹی سے باتیں کرتے ہوئے بار بار ان سے نظریں بچا کر اعیان کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک بار آنٹی کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے اعیان پر نظر ڈالی۔ اتفاق سے اعیان نے بھی اسی لمحے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کی نظریں ایک پل کے لیے آپس میں ملیں۔ ہانیہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گھبرائی اور جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہانیہ کی اس حرکت پر اعیان مسکراتا رہا پھر بولا۔ ''ہانیہ آپ کیا کرتی ہیں۔''

"میں ایک سوفٹ ویئر انجینئر ہوں۔ مگر پچھلے مہینے اپنی جاب چھوڑ چکی ہوں اور آپ کیا کرتے ہیں۔" ہانیہ نے اعیان کی بات کا جواب دے کر اپنا سوال کر دیا۔

ہانیہ حیران تھی کہ کبھی وہ اس سے تُو تڑاک سے بات کر رہا ہے تو کبھی آپ جناب سے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ گرگٹ کی طرح پل پل رنگ بدلتا یہ بے انتہا خوبصورت شخص ہانیہ کو قدم قدم پر حیرت میں ڈال رہا تھا۔

"میں بھی فی الحال آپ کی طرح جاب لیس ہی ہوں۔" اعیان نے بڑے ہی شائستہ لہجے میں کہا۔

ثوبیہ اپنے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ پھر سب نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا اور کافی دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہانیہ اور ثوبیہ کچن میں چلی گئیں اور اعیان وہیں بیٹھا آنٹی سے باتیں کرتا رہا۔

باتوں ہی باتوں میں کب لنچ کا وقت ہو گیا' پتہ ہی نہیں چلا۔ آج کا لنچ ہانیہ اور ثوبیہ نے مل کر بنایا تھا۔ شام کے وقت ثوبیہ کے کہنے پر اعیان نے کار نکالی اور ہانیہ کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے راضی ہو گیا۔ وہ چپ چاپ ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ ہانیہ بے چینی سے بار بار اعیان کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اعیان کو خاموش دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک اعیان نے اپنی کار ایک اسکول کے آگے روکی اور کار سے اتر کر اسکول میں جانے لگا۔ ہانیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اندر آ کر اعیان اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ہانیہ باہر ہی کھڑی ہو گئی۔ اعیان نے پرنسپل سے کچھ باتیں کیں اور پرنسپل نے ان دونوں کو ویٹنگ روم میں بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک بہت پیارا سا بچہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر اعیان کرسی سے اٹھا اور گھٹنے زمین پر ٹکا کر بانہیں پھیلا دیں۔ وہ بچہ "پاپا" کہہ کر اعیان سے لپٹ گیا۔ اعیان نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھاما اور بڑی محبت سے اس کے ماتھے اور گالوں کو چومنے لگا۔

اس بچے کے منہ سے پاپا سن کر ہانیہ کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں اور سانس بھی بہت ہلکے ہلکے چل رہی تھی۔ ایک ہی پل میں اسے ایسا لگنے لگا جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو اور بہت تھک چکی ہو۔ اس کی آنکھیں رونے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں جسے اس نے بڑی مشکل سے روکا۔

اب وہ کس کی شکایت کر سکتی تھی اور کرتی بھی تو کیا کرتی۔ شکایت تو اسے اپنی قسمت سے تھی۔ جس میں قدرت نے صرف غم ہی غم لکھے تھے۔ کوئی خوشی ملتی بھی تو پل بھر کے لیے اور پھر اسے رو رو کر ان خوشیوں کا قرض اتارنا پڑتا تھا۔

ہانیہ نے آج پہلی بار اعیان کو دیکھا تھا۔ وہ ثوبیہ کی شادی میں نہیں جا سکی تھی۔ کیونکہ شادی سے ٹھیک ایک دن پہلے اس کی نانی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ورنہ شاید چھ مہینے پہلے ہی وہ شادی میں اعیان سے مل چکی ہوتی۔

اعیان کو دیکھتے ہی اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتی ہے۔ اسے اعیان کا مذاق' اس کا چھیڑ چھاڑ کرنے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ اگر کوئی اور اس سے ایسی باتیں کرتا تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتی۔ صبح جب سے اس نے اعیان کو دیکھا تھا وہ اپنے اس محبوب کو بھی بھول گئی تھی جس کے انتظار میں اس نے نو سال تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔

شاید اعیان کی خوبصورتی اسے اعیان کا دیوانہ بنا رہی تھی۔ مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اعیان نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ وہ بچہ بالکل اعیان کی کاپی تھا۔ اعیان کی جیسی ہی نیلی نیلی آنکھیں۔ ہوبہو اعیان جیسا چہرہ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے میں ایک نہیں دو اعیان موجود ہوں۔ ایک چھوٹا اعیان اور ایک بڑا۔ مگر وہ بچہ خوبصورتی میں اعیان سے کہیں کم تھا۔ اعیان ابھی تک

بچے کے گالوں کو چوم رہا تھا۔
"پاپا۔ممی نہیں آئیں۔" بچے نے اعیان سے کہا۔
"بیٹا ممی ابھی بزی ہیں۔ اگلی بار آئیں گی۔" اعیان نے پیار سے بچے کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"پاپا مجھے ممی کی بہت یاد آتی ہے۔"
"اور پاپا کی یاد نہیں آتی آپ کو۔" اعیان اس معصوم کے معصوم سے گالوں کو چومتا ہوا بولا۔
"پاپا آپ کی یاد تو ممی سے بھی زیادہ آتی ہے۔" بچہ معصومیت سے بولا۔
"آؤ آپ کو نئی آنٹی سے ملواتا ہوں۔" اعیان بچے کا ہاتھ پکڑ کر ہانیہ کی طرف بڑھا۔
"بیٹا یہ ہے آپ کی نئی آنٹی ہانیہ اور ہانیہ یہ ہے میرا بیٹا فیضان۔ پیار سے ہم اسے فیضی کہہ کر بلاتے ہیں۔"
"سلام آنٹی۔" فیضی نے ہانیہ کو سلام کرتے ہوئے کہا۔
ہانیہ نے فیضی کو گود میں اٹھایا اور اس کا ماتھا چوم کر نیچے اتار دیا۔
"او کے فیضی۔ اب ہم چلتے ہیں۔" اعیان نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہانیہ نے اعیان کی آنکھوں میں آنے والے آنسو دیکھ لیے تھے۔ مگر وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ رو کیوں رہا تھا۔ وہ بھی اعیان کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔
دونوں چپ چاپ آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ اعیان نے ہانیہ سے آگے کا راستہ معلوم کیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اس وقت اعیان کے چہرے پر ایک درد سا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔
ہانیہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ کچھ دیر بعد اعیان نے کار ہانیہ کے گھر کے باہر روک دی۔ کار کے رکتے ہی ہانیہ بنا کچھ کہے اتری اور اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔
"گھر لا کر مہمان کو اندر آنے کا نہیں کہو گی۔" اعیان نے ہانیہ کو چپ چاپ گھر کے اندر جاتے دیکھ کر چلا کے کہا۔ اس وقت اس کے لبوں پر ایک شرارتی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی۔ چند لمحے پہلے جو درد اس کے چہرے پر تھا اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
"تم میرے کون ہو جو میں تمہیں اندر بلاؤں۔" ہانیہ پیچھے مڑتے ہوئے غصے سے بولی۔
"ارے اتنی جلدی بھول گئیں سب کچھ۔"
"میں تم جیسوں کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔" ہانیہ نفرت سے بولی۔
"اوہ۔ خود اپنے منہ پہ تھوکنا پسند کرتی ہو۔ اچھا ہے۔ ویسے میں تو تمہارے ان رسیلے ہونٹوں کو چوسنا پسند کروں گا۔" اعیان نے ہانیہ کی بات کا برا نہ مناتے ہوئے کہا۔
اعیان کی بات سن کر ہانیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے چلائی۔ "تم جیسے ہزاروں کتے رال ٹپکاتے میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔"
"کتے۔ اوہ۔ اچھا تو یوں کہو نا کہ تم کتیا ہو۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں تو انسان سمجھ کر تمہارے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا۔" اعیان نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنی کار آگے بڑھا دی۔
ہانیہ غصے سے زمین پر پاؤں پٹختی رہ گئی۔ مگر جیسے ہی اعیان کی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ چہرے سے غصہ ایکدم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک پیاس اور تڑپ نے لے لی۔
ہانیہ نے اعیان کے ساتھ اتنی بدتمیزی اس لیے برتی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اعیان آئندہ کبھی اس سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش کرے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اعیان کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی اس لیے اب وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ جو راستہ منزل تک نہ جاتا ہو اس پر چلنے کا کیا فائدہ۔



"اعیان بھائی اتنے سویرے سویرے تیار ہو کر کہاں جا رہے ہو۔" ثوبیہ نے اعیان کو تیار ہوتے دیکھا کر کہا۔

جو اپنی انگلی میں کار کی چابی گھماتا ہوا باہر جا رہا تھا۔
''ہانیہ نے ڈیٹ پر بلایا ہے۔'' اعیان یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا اور ثوبیہ یہ سن کر حیرت میں رہ گئی۔
کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کار ہانیہ کے گھر کے سامنے روک کر نیچے اتر رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے پہلے بیل بجانے کے بارے میں سوچا مگر پھر گیٹ کو نیم وا دیکھ کر بغیر کسی حیل وحجت کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ہانیہ کی امی کچن سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔ اعیان کو یوں بلا اجازت گھر میں آتا دیکھ کر چونک کے رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔
''السلام علیکم امی جی۔ کیسی ہیں آپ۔'' اعیان نے ان کے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔
''میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر تم کون ہو۔'' امی حیران ہو کر بولی۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اعیان کے امی جی بولنے پر ہو رہی تھی۔
''امی جی میں ہانیہ کی دوست ثوبیہ کا دیور ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔
اوہ تو بیٹا کھڑے کیوں ہو۔ آؤ اندر آ جاؤ۔'' امی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔
''جی شکریہ امی جی۔ بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ بھابھی نے ہانیہ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔ ان کا روم کہاں ہے۔ میں انہیں تیار ہونے کا کہہ دیتا ہوں۔''
''اس کا کمرہ اوپر والے پورشن میں ہے۔'' امی نے اپنے ہاتھ سے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اعیان بے دھڑک اوپر جانے لگا اور امی اس کے لیے کچھ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔
اعیان جب ہانیہ کے کمرے میں پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔
''آ...... آپ...... یہاں۔'' ہڑبڑا کر اٹھتے ہی ہانیہ کی نظر اعیان پر پڑی تو وہ گھبرا کر بولی۔
''بھابی نے بھیجا ہے۔ تمہیں لینے کے لیے۔ تم پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ ورنہ اسی حالت میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔'' اعیان نے ہانیہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ آپ نیچے انتظار کریں میں ابھی آتی ہوں۔'' ہانیہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔
اعیان نیچے آیا اور کچن کے دروازے سے لگ کر ہانیہ کی امی کو دیکھنے لگا جو کچھ بنا رہی تھیں۔ امی کی نظر اس پر پڑی تو جلدی سے بولی۔ ''ارے بیٹا آپ یہاں کیا کر رہے ہو۔ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔''
''امی جی۔ صرف پانچ منٹ ہی تو رکنا ہے یہاں۔ اس لیے میں نے سوچا اکیلا بیٹھنے کی بجائے آپ سے ہی باتیں کر لوں۔''
''بیٹا ایک بات پوچھوں۔''
''جی پوچھیئے۔''
''آپ مجھے امی جی کیوں کہہ رہے ہو؟''
''میری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی امی یاد آ گئیں۔ بس بے دھڑک آپ کو امی کہہ دیا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا کیا۔''
''ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔ تم مجھے امی کہہ سکتے ہو۔'' اعیان کی بات سن کر امی کے دل میں ممتا ابھر آئی۔ ہانیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور انہیں ایک بیٹے کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔ اعیان کی اس بات سے وہ تڑپ اٹھیں اور آگے بڑھ کر اعیان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کے سر کو نیچے جھکایا اور اس کے ماتھے کو چومنے لگی۔
ہانیہ جو اس وقت اوپر سے اتر کر آ رہی تھی یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اعیان کی پیٹھ ہانیہ کی طرف تھی اور امی جس والہانہ پن سے چوم رہی تھی اس نے اسے شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے دیکھنے والا اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی امی اعیان کے ہونٹ چوم رہی ہے۔ شاید اسی لیے بزرگوں نے کیا خوب کہا ہے کہ کبھی کبھی آنکھوں

دیکھا بھی غلط ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت ایک پاکیزہ جذبے کو ہانیہ ہوس بھرا ایک لمحہ سمجھ رہی تھی۔ ہانیہ نے عجیب سی نظروں سے اپنی امی اور اعیان کو دیکھا اور اندر چلی گئی تاکہ اس کی امی کو بیٹی کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تھوڑی دیر بعد اعیان کی کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور ہانیہ اس کے برابر میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر کچن والا منظر گھوم رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی امی اتنی گری ہوئی عورت ہو سکتی ہے کہ ایک حسین مرد کو دیکھ کر اس کے لب چومنے لگ جائے گی۔ وہ اس بات کو کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ اس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے اپنی ماں سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

سڑک تقریباً سنسان تھی۔ اکا دکا کاریں ہی ادھر ادھر جاتے نظر آ رہی تھیں۔ اچانک اعیان نے تیزی سے بریک لگایا اور کار سے اتر کر دوسری طرف کو بھاگا جہاں دو آدمی سگریٹ پیتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پاس پہنچتے ہی اعیان نے ان میں سے ایک آدمی کی کنپٹی پر زوردار گھونسا دے مارا۔

''اوئے۔'' وہ آدمی زور سے چلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا۔ اعیان کی لات اس کی پیٹھ پر پڑی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اعیان کا ایک اور مکا اس کے چہرے پر پڑا جس سے اس کے دو دانت ٹوٹ کر نیچے گر گئے۔

اتنے میں دوسرے والے آدمی نے پیچھے سے اعیان کے کندھے پر چاقو سے حملہ کیا۔ اعیان بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک گیا اور اس کا چاقو اسی کے ساتھی کے سینے میں دائیں طرف دھنستا چلا گیا۔ اور چاقو مارنے والا حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اعیان نے اس کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں لگاتار کئی مکے جھڑ دیئے اور ہر مکے پر وہ بیل کی طرح ڈکرا رہا تھا۔

تب ہی اعیان کو اپنے پیچھے غراہٹ سنائی دی۔ وہ آدمی جس کے سینے میں چاقو لگا تھا وہ اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا۔ ''اب تم نہیں بچو گے۔'' اور اتنا کہتے ہی اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ جتنی تیزی سے گولی اعیان کی طرف بڑھی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ ایک طرف کو جھک گیا اور گولی دوسرے ساتھی کے سینے میں جا لگی اور وہ آدمی ایک دل خراش چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو اس کی جگہ اعیان زمین پر پڑا ہوتا۔ مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ اعیان خود حفاظتی کا اتنا ماہر ہے کہ وہ چاہے چھ کی چھ گولیاں اس پر فائر کر دیتا تب بھی شاید ہی کوئی گولی اسے چھو پاتی۔

اگر پانچ چھ آدمی ایک ساتھ بھی اس پر حملہ کرتے تو مجال ہے کہ وہ اسے زچ کر پاتے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے گولی سے بچنے۔ دشمن کے حملے کو ناکام بنانے۔ نشانہ بازی۔ جوڈو اور دیگر مارشل آرٹ میں بھرپور مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اتنا ماہر نشانے باز تھا کہ آنکھیں بند کر کے اڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

اور رہی بات دماغ کی تو اس کا دماغ ایسے حالات میں اتنی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب تک مخالف کسی پینترے کے بارے میں سوچ ہی رہا ہوتا تھا اور اعیان ایکشن بھی لے چکا ہوتا تھا۔

جس کے ہاتھوں اس کے ساتھی کو گولی لگی تھی وہ پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ اعیان کا ایک پیر ہوا میں لہرایا اور دوسرے ہی پل اس آدمی کے ہاتھ سے ریوالور نکلتا چلا گیا وہ ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا اور اعیان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ریوالور تک پہنچتا اعیان کا سر اس سے ٹکرایا اور وہ پیچھے جا گرا۔ اعیان بھی نیچے گرا اور نیچے گرتے ہی اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس ریوالور کو رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ابھی اعیان اٹھا ہی تھا کہ وہ آدمی چاقو لے کر خونی انداز میں اس کی طرف لپکا۔ اعیان نے جھکائی دے کر اس کا وار خالی جانے دیا۔ اس نے دوسرا وار کیا مگر اس بار

بھی ناکام رہا۔ پھر وہ ایک جنونی انداز میں لگاتار اعیان پر حملے کرتا رہا اور اعیان ہر بار بڑی خوبصورتی سے اِدھر اُدھر ہو کر بچتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اعیان اس آدمی کو حملہ کرنے کی پریکٹس کروا رہا ہو۔ اس کے ہر حملے سے بچنے کے بعد اعیان کے چہرے پر مسکراہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور ہر ناکام حملے کے بعد اس آدمی کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ہر لڑائی کا پہلا سبق ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر حال میں اپنے غصے پر قابو رکھو اور مخالف کی اگلی چال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو مخالف تم کو کھا جائے گا۔

وہ اب کھڑا ہو کر ہانپ رہا تھا۔ اچانک اعیان اس کی طرف بڑھنے لگا۔ حیرت سے اعیان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس آدمی نے حملہ کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا اور اعیان کے سینے پر حملہ کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ چاقو اعیان کے سینے پر کوئی زخم پہنچاتا اعیان پیچھے کی جانب ایسے گرا جیسے کوئی لاش گری ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ اعیان کی کمر زمین سے لگتی اس نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا دیئے اور ایک زوردار لات اس آدمی کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں پڑی۔ وہ چیخ کر درد سے دوہرا ہو گیا اور زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

اعیان کی دوسری لات اس جگہ پڑی جہاں اس کے اپنے ساتھی نے غلطی سے چاقو مارا تھا۔ وہ کراہ کر پیچھے گر گیا۔ اعیان آگے بڑھا اور اس کے پیٹ میں لات مارتے ہوئے بولا۔ ''بولو تم۔''

مگر اس سے پہلے کہ اعیان اپنی بات پوری کرتا دور سے پولیس سائرن کی آواز اس کی کانوں میں پڑی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کی جگہ جھنجلاہٹ نے لے لی۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس آدمی کو سیدھا کر کے اس کی فوٹو لی۔ پھر وہ لاش کی طرف بھاگا اور جلدی سے اس کی بھی فوٹو لے کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔

ہانیہ کار کے باہر کھڑی پریشان نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے یا اعیان کیوں ان انجان لوگوں سے جھگڑا کر رہا ہے۔ ہانیہ کو کار کے باہر دیکھ کر اعیان دور ہی سے چیخا۔ ''کار میں بیٹھو۔ جلدی۔''

اعیان کی آواز اور اس کے چہرے پر اتنا غصہ دیکھ کر ہانیہ سہم گئی اور ایک دم سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اعیان نے کار میں بیٹھتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ اس بار وہ کار کو نارمل اسپیڈ سے دوڑا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر چھائے غصے کے بادل چھٹنے لگے اور اس کی جگہ اسی پہلے وہی والی دل کش مسکراہٹ نے لے لی۔

یہ سب کچھ صرف دو منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ ہانیہ پاگل سی اعیان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اعیان ان دونوں آدمیوں کو مارنے کیوں گیا تھا۔ پھر وہ پولیس سائرن کی آواز سن کر وہاں سے بھاگا تھا تو اب نارمل انداز سے کار کیوں چلا رہا ہے۔

جب اعیان کے چہرے پر مسکراہٹ پوری طرح پھیل گئی تو ہانیہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ ان دونوں کو مارنے کیوں گئے تھے؟''

''کیونکہ وہ پبلک پلیس پر اسموکنگ کر رہے تھے اور آپ کو شاید پتہ نہیں ہے کہ عوامی مقامات پر سگریٹ نوشی جرم ہے اور انہیں اس جرم کی سزا تو ملنی ہی چاہئے نا۔'' اعیان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔

''کیا۔'' وہ زور سے چلائی۔ ''صرف اتنی سی بات پر..... آپ سچ میں پاگل ہیں۔''



کریم خان کا کل کا دن نارمل انداز سے گزرا تھا۔ کل ڈی ایس پی زاہد علی کی تدفین میں جانے کے علاوہ اس نے اور کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔

کل رات ہی اسے سرفراز سے معلوم ہو گیا تھا کہ نئی ڈی ایس پی انیتا اعوان نام کی کوئی لڑکی ہے۔ وہ اپنے کیبن

میں بیٹھا نئی ڈی ایس پی صاحبہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے کیبن میں طلب کر لیا۔
ڈی ایس پی کے کمرے کے باہر پہنچ کر کریم خان نے دستک دی۔ ''یس کم ان۔'' اندر سے ایک میٹھی سی آواز آئی۔
کریم خان اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کرسی پر دودھ جیسی گوری اور بہت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔
اب چونکہ کریم خان اور سابقہ ڈی ایس پی زاہد علی آپس میں بہت فری تھے۔ اس لیے وہ جب بھی زاہد علی کے کمرے میں آتا تھا تو نہ سلیوٹ کرتا تھا اور نہ ہی بیٹھنے کے لیے زاہد علی کی اجازت کا انتظار کرتا تھا۔ اپنی اسی عادت سے مجبور کریم خان نے آج بھی یہی کیا اور نہ تو اس نے نئی ڈی ایس پی کو سلیوٹ کیا اور ان کی اجازت کے بغیر ہی سیدھا جا کر کرسی پر براجمان ہو گیا۔
نئی ڈی ایس پی ڈسپلن کی بہت پابند تھی۔ وہ خود بھی ڈسپلن میں رہتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے بہت غصہ آ جاتا تھا۔ اور غصے میں وہ کیا کچھ کہہ دیتی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔
جب انیتا نے اس طرح کریم خان کو آ کر کرسی پر بیٹھتے دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا۔ ''تمہیں انسپکٹر کس نے بنا دیا۔ تمہیں تو اپنے سینئر آفیسرز کی ریسپیکٹ کرنی بھی نہیں آتی۔''
جب کریم خان کے کانوں میں انیتا کی آواز پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر چکا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ شرمندہ سا کرسی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''سوری میم۔''
کریم خان کے سوری کہنے سے انیتا کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے کریم خان کو دیکھ رہی تھی۔ ''انسپکٹر کریم خان۔ کیا تم ہی رئیس علی نواز والے کیس کو ہینڈل کر رہے ہو۔''
''نو میم۔''
''یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا اوپر سے مجھے غلط انفارمیشن دی گئی ہے۔'' اس بار انیتا نے چلاتے ہوئے کہا۔
انیتا کو اتنا بھڑکتا دیکھ کر کریم خان بھی گھبرا گیا تھا۔ اس کے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ زاہد علی تو اس کے ساتھ نہایت ہی دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتا تھا۔
''کچھ دنوں سے رئیس علی نواز والا کیس خفیہ ایجنسی کے پاس ہے۔''
''ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر آفیشلی تمہیں بھی اس کیس سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔''
''آفیشلی یہ کیس ابھی بھی میرے پاس ہے۔ مگر مجھے آرڈر دیئے گئے ہیں کہ میں اپنے طور پر اس کیس پر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بس نام کے طور پر ہی یہ کیس میرے پاس ہے۔'' کریم خان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
''اور تم نے مان لیا۔ تمہارے اندر عقل نام کی کوئی چیز بھی ہے یا نہیں۔'' انیتا غراتے ہوئے بولی۔
''زاہد علی صاحب نے مجھے ایسا آرڈر دیا تھا تو میں ماننے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔''
''تم اور تمہارا باس زاہد علی ایک نمبر کے بے وقوف ہو۔ اب اگر خفیہ ایجنسی والے اس کیس کو سلجھا لیتے ہیں تو ان کا نام ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بے عزت ہونے کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ تو ہے ہی۔'' انیتا دانت پیس کر بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔
کریم خان اس صورت حال میں خود کو بالکل بے بس تصور کر رہا تھا۔ انیتا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی' اس پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا رہا۔
''اب سب سے پہلے تم مجھے اس کیس کی وہ باتیں بتاؤ جو تمہیں سمجھ میں آ چکی ہیں۔ اس کے بعد ہم ان باتوں پر ڈسکس کریں گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔''
''میم اس کیس میں مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔'' وہ مری مری سی آواز میں بولا۔
''تم بالکل نالائق ہو۔ اپنی کام چوری کی وجہ سے ہی تم نے خوشی خوشی زاہد کی بات مان لی تھی۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ پولیس کو حرام کھانے کی عادت پڑ گئی ہے اور یہ بھی

سچ کہتے ہیں کہ ہڈی کھانے اور کتوں کی طرح بھونکنے کے علاوہ ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی۔" کریم خان کی بات نے انیتا کا غصہ مزید فزوں کر دیا تھا۔ اور وہ غصے میں جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔ آج تک کریم خان کی ایسی بے عزتی کسی نے نہیں کی تھی۔ شرمندگی کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ انیتا کی ڈانٹ سنتا رہا۔

"اب چپ کیوں ہو۔ جلدی بکنا شروع کرو۔ ویسے تو میں سب کچھ فائل میں پڑھ چکی ہوں مگر میں وہ سب کچھ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" انیتا ایک بار پھر غصے سے چلا کر بولی۔

"میم۔ رئیس علی نواز کی پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے تھے۔ ان سب کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی۔ سب کی لاشیں مل چکی تھیں سوائے ایک آدمی کے۔ اس کا نام طارق محمود تھا۔ پھر سمندر کی طرف جانے والی سڑک پر حادثے کا شکار ہونے والی ایک کار سے اس کی لاش ملی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک سے نہیں بلکہ سر میں گولی مارنے سے ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہمیں پتہ چلا کہ اس کی موت شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ یعنی کہ رئیس علی نواز کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اور اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوئی ہے کہ پارٹی میں اس کے کوئی فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے۔ وہاں سے ملنے والے فنگر پرنٹس میں تین ایسے تھے جنہیں اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔

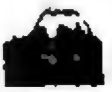
پہلے فنگر پرنٹ خود رئیس علی نواز کے جو ایک دن پہلے سے آغا خان اسپتال میں ایڈمٹ ہو چکے تھے۔ جس کے گواہ اس کے گھر کے ملازمین ہیں۔ اور میں نے خود اسپتال کی ویڈیو فوٹیج دیکھی تو پتہ چلا کہ وہ تو اپنے بیڈ سے ہلا تک نہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم اس سے کچھ پوچھ تاچھ کر پاتے برین ہیمرج کی وجہ سے ان کی بھی موت واقع ہو گئی۔ یہ سب پہلے دن کی بات ہے۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ جو دوسرے فنگر پرنٹ پائے گئے تھے وہ کمال نامی کسی شخص کے تھے جو سات سال پہلے چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا تھا۔ مگر تیسرے فنگر پرنٹ کس کے ہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ پھر اسی صبح پی سی او سے کسی کی کال آئی جس میں بتایا گیا کہ کھنڈر میں ایک لاش ملے گی۔ اور وہاں سے واقعی ایک لاش ملی جو کمال کی تھی جس کی کلائی پر سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ پھر اسی رات تقریباً ساڑھے دس بجے کمال کے نمبر سے کسی نے مجھے کال کر کے بتایا کہ ڈیفینس فیز فائیو کے ایک بنگلے میں کمال کے چار ساتھی جمع ہو رہے ہیں۔

اس رات ہم نے کارروائی کر کے چاروں کو گرفتار کر لیا۔ مگر جب ان سے تفتیش کی گئی تو کہانی بالکل الٹ نکلی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چاروں الگ الگ گینگ کے ممبر ہیں۔ مگر کمال کی طرح ان چاروں کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ تھرڈ ڈگری استعمال کرنے پر بھی انہوں نے کوئی یقینی جواب نہیں دیا۔

اور پھر اگلی صبح کسی انجان نمبر سے اس انفارمر نے مجھے دوبارہ کال کر کے بتایا کہ نیشنل ہائی وے پر واقع ایک کاٹیج میں کمال کے پاس شفقت چینا عرف ریڈ 001 کی لاش ملے گی جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نمبر جس سے انفارمر نے کال کی تھی وہ اسی شفقت چینا کا تھا۔ اور وہ موبائل اسی پولیس اسٹیشن کے میدان سے برآمد کیا گیا۔ اور وہاں کاٹیج میں شفقت چینا کی جیب سے کمال کا موبائل ملا۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)



ڈبیک نار

شہناز نسیم

نشے میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا' لیکن اکثر کچھ باتیں نشے کو توڑ دیتی ہیں۔
ایک ایسے ہی شخص کا واقعہ' جو نشے میں گناہ کی طرف بڑھ رہا تھا' لیکن اس کی بیوی کی آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

مارجوری اپنے فلیٹ کے لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹی وی سیٹ کی آواز بند کر رکھی تھی اس لیے خبریں پڑھنے والے اناؤنسر کے ہونٹوں کی حرکات بڑی دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔

مارجوری ہمیشہ سے کم گو واقع ہوئی تھی۔ گپ شپ کرنا اس کی طبع کے خلاف تھا اس لیے وہ پارٹیز وغیرہ میں شرکت کرنے سے عموماً گریز ہی کرتی تھی۔ جارج نے درست ہی کہا تھا کہ اس رات جو آفس پارٹی ہو رہی ہے وہاں جا کر وہ اکتاہٹ محسوس کرے گی۔

"دیکھو ڈارلنگ تم کسی کو جانتی ہی نہیں ہو وہاں سب اجنبی چہرے ہوں گے۔" مارجوری نے بھی اس کی تردید نہیں کی اور راضی بہ رضا ہو گئی۔

جب جارج، پارٹی میں جانے کے لیے لباس بدل رہا تھا تو مارجوری اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ عہد شباب گزر جانے کے باوجود جارج کی جسمانی کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کے جسم پر ادھیڑ عمری اپنا وار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی خوش لباسی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اس نے شوخ رنگ کی شرٹ پہنی، پھولدار ٹائی لگائی، کوٹ کی بریسٹ پاکٹ میں رومال سجایا اور پھر اپنے لمبے لمبے گھونگھریالے بالوں میں کنگھی پھیرنے لگا۔

"پارٹی میں تمہیں اپنی آواز کا فن دکھانے کے لیے تو ضرور کہا جائے گا۔" مارجوری نے کہا۔

جارج نے آئینے کے قریب تر ہو کر اکا دکا سفید بالوں کو سیاہ بالوں کے نیچے چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیشہ مجھ سے یہی فرمائش کی جاتی ہے کہ آج فلاں کی آواز نکال کر دکھاؤ تو آج فلاں کی نقل اتار کر دکھاؤ۔"

مارجوری کی جارج سے پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی اور وہ جارج کی اس انوکھی خوبی سے بے حد متاثر ہوگئی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر مشہور لوگوں کی آواز اور لہجے کی ہو بہو نقلیں اتار سکتا تھا۔ اس کی یہ صفت اپنے اردگرد اچھا خاصا مجمع لگانے کے کام آتی تھی اور کئی سیاست دانوں، اداکاروں اور اس طرح کے نامور لہجے میں ہو بہو بات کر کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔

جارج نے اپنی تیاری کا آخری پچ دیتے ہوئے کوٹ پر برش پھیرا آئینے میں اپنے سراپا پر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر اپنی کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

"ڈارلنگ میری واپسی تو شاید بارہ بجے کے بعد ہی ہوگی اس لیے میرے انتظار میں جاگتی نہ رہنا، بے فکر ہو کر سو جانا۔" پھر اس نے مارجوری کے گال پر پیار بھری چپت لگائی اور کہا۔

"ڈارلنگ کوئی ایسا کام نہ کرنا جو تمہارے شوہر نامدار کو ناپسند ہو۔" پھر وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

مارجوری کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آخر جارج اتنے بااعتماد لہجے میں اسے کوئی ایسا ویسا کام نہ کرنے کی ہدایات کیوں دیتا رہتا ہے؟ اسے یہ یقین کیوں ہوتا ہے کہ میں واقعی کوئی ایسا کام نہیں کروں گی؟

وہ صوفے کی پشت پر سر ٹیک کر سوچتی رہی۔ چشم تصور سے وہ اس پارٹی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جس میں شریک ہونے کے لیے جارج اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ جارج تو محفل کی جان بنا ہوگا۔ چھیل چھبیلا، اسمارٹ، خوش رو، خوش گفتار، خوش پوش اور پھر وہ اضافی کشش، وہی ہر شخصیت کے لب و لہجے کی کامیاب نقل، لڑکیاں تو اس پر ٹوٹ ہی پڑتی ہوں گی۔ پکے ہوئے پھل کی مانند۔ وہ اس وقت ضرور کسی نہ کسی حسین لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہا ہوگا بلکہ شاید بوسے بازی بھی، لیکن مارجوری کو یہ بھی یقین تھا کہ اس کا شوہر اس حد سے تجاوز نہیں کرے گا وہ

اس سے بے وفائی کا مرتکب تو ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ پارٹی میں خوش گپیاں اور خوش فعلیاں کرنا تو خیر کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن کسی لڑکی کو لے کر پارٹی سے غائب ہوجانا یہ ممکن نہیں، جارج ایسا ہرگز نہیں کرسکتا مارجوری نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

جارج اس وقت واقعی رقص کررہا تھا اس نے کئی لڑکیوں کے ساتھ رقص کیا تھا اس سے قبل حسب معمول اس بے مختلف شخصیات کی آوازیں بھی سنی گئی تھیں اور بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ پھر جب رقص کا آغاز ہوا تو اسے اپنا پارٹنر تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ وہ دفتر کی تین چار ٹائپسٹ لڑکیوں کے ساتھ رقص کرچکا تھا اور اب اس کے بازوؤں کے حالے میں مس ولسن تھی ڈسپیچ کے شعبے کی نگراں مس ولسن کا جسم بے حد گداز اور گرم تھا مس ولسن کی جنسی کشش تو ناقابل برداشت تھی اور اس وقت وہ ذرا مدہوش بھی تھی اس لیے جارج کے ساتھ چمٹی ہی جارہی تھیں۔

اب پارٹی میں پہلے کی سی گہما گہمی بھی نہیں رہی تھی۔ زیادہ تر شادی شدہ جوڑے، شاید رگ و پے کی سنسناہٹ دور کرنے کے لیے گھروں کا رخ کرچکے تھے۔ باس جوزف بلیک برن بھی کب کا جاچکا تھا اور دوسرے بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے تھے لیکن مس ولسن جارج کو چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتی تھیں۔ شاید جارج بھی اس سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کررہا تھا۔ شراب کے نشے میں جسم کی مہک نے اس پر بے خودی سی طاری کردی تھی۔ مس ولسن موقع پاتے ہی اسے کھینچ کر نسبتاً ایک ویران گوشے میں لے گئیں جہاں روشنیوں کی پہنچ نہیں تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ انتہائی بے تکلفی سے جارج کے گلے کا ہار بن گئی۔ اس کی شدت نے جارج کو بالکل ہی بے قابو کردیا تھا۔

مس ولسن نے مخمور آواز میں کہا۔

"سنو، ڈارلنگ کیوں نہ اس پارٹی کا اختتام میرے فلیٹ پر چل کر ہو وہاں صرف تم ہوں گے اور میں۔" جارج نے اثبات میں سر ہلانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ بارہ بج کر پچیس منٹ ہوچکے تھے اور جارج جانتا تھا کہ اس کی تاکید کے باوجود مارجوری سوئی نہیں ہوگی اس کا انتظار کررہی ہوگی۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

"میں خود بھی چاہتا تھا لیکن اگر میں اور زیادہ لیٹ ہوگیا تو میری بیوی اسے پسند نہیں کرے گی تم جانتی ہی ہو بیویاں اپنے شوہروں کو نکیل ڈال کر رکھتی ہیں۔"

مس ولسن نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"ڈارلنگ، تمہارے پاس تو اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کا بہترین ذریعہ موجود ہے۔ تم مسٹر بلیک برن کے لہجے کی انتہائی کامیاب نقل اتار سکتے ہو ان کی آواز میں تم اپنی بیوی کو فون کرکے کہو کہ پارٹی ابھی دیر تک جاری رہے گی اور چونکہ پارٹی کی کامیابی کے لیے جارج جیسے دلچسپ شخص کی یہاں موجودگی ضروری ہے اس لیے اسے گھر لوٹنے میں زیادہ دیر ہوجائے تو اس کی بیوی مائنڈ نہ کرے۔ مجھے یقین ہے تمہاری بیوی مسٹر بلیک برن کی سفارش کے بعد بے فکر ہوکر سوجائے گی اور ہم مزے سے......!" اس نے آنکھ مار کر بات مکمل کردی۔

جارج کو تسلیم کرنا پڑا کہ مس ولسن کی ترکیب بہت عمدہ ہے واقعی اگر مارجوری کو معلوم ہوجائے کہ اس کا شوہر باس کے اصرار پر مجبور ہوگیا ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح راضی بہ رضا ہوجائے گی اور اس کی واپسی پر خفگی کا اظہار نہیں کرے گی۔ آخر باس کو خوش رکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔

مس ولسن جارج کو اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے ایک ٹیلیفون کی طرف لے گئی اور جب جارج نے اپنی بیوی کو فون کیا تو مارجوری نے فوراً ہی ریسیور اٹھالیا جارج کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا مارجوری ابھی تک سوئی نہیں تھی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

جارج نے اپنے باس مسٹر جوزف بلیک برن کے لب و لہجے میں انتہائی کامیاب نقل اتارتے ہوئے مارجوری سے وہی کچھ کہا جو مس ولسن نے بتایا تھا۔

پھر جارج نے مارجوری کی آواز سنی جس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

"جوزف ڈارلنگ، میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ مجھے میرے فلیٹ کے نمبر پر فون نہ کیا کرو، تم سمجھتے کیوں نہیں، کیا تم چاہتے ہو کہ جارج سب کچھ جان جائے۔"



ضربِ پلس

فیاض الرحمان قادری

فطرت کے ساتھ ایک طویل عرصے سے انسان کی جنگ جاری ہے۔انسان مستقبل کی تسخیر چاہتا ہے۔ بلکہ مستقبل تک پہنچنے کا آرزو مند ہے
ایک سائنسداں کی جدوجہد کا حیرت انگیز احوال

اسپیشل برانچ کے انسپکٹر ٹریوس نے اپنے گنجے سر کو پریشانی کے عالم میں تیزی سے کھجایا۔اس نے چادر سے ڈھکی ہوئی لاش پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی۔ یہ لاش لیبارٹری کے وسط میں بنے ہوئے پیتل کے کیبنٹ کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ لیبارٹری کی دیواروں پر لگے ہوئے برقی آلات سے نکلنے والی تیز بھنبھناہٹ پوری لیبارٹری میں پھیلی ہوئی تھی۔

انسپکٹر ٹریوس پاس ہی کھڑے ہوئے سفید کوٹ میں ملبوس شخص کی طرف مڑا۔

"وائی! یہ بات میری سمجھ سے بالا تر ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تم مجھ سے یہ توقع بھی نہ کرنا کہ میں اس بات پر یقین کرلوں گا کہ بے ضرر سے دو پالتو جانوروں کی وجہ سے پروفیسر برونسکی کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔"

پنجرے کے اندر بند دو خرگوش باہر آنے کو بے تاب تھے اور ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

وائی غصے کے عالم میں لیبارٹری میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

"یہ خودکشی ہے سراسر خودکشی۔" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

"یقین کرو اس کی موت خودکشی کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ محض غلط اندازوں کی وجہ سے مرا ہے۔"

"خودکشی۔" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ چکے رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں غور وفکر کا پہلو نمایاں تھا۔

"پلیز مسٹر وائی، آپ یہ تمام کہانی ایک مرتبہ پھر سنادیں لیکن اس مرتبہ ذرا آہستہ آہستہ سنائیں۔" وائی نے جو کہانی سنا سنا کر پہلے ہی تنگ آچکا تھا۔ احتجاجی انداز میں ہاتھ بلند کیے مگر انسپکٹر ٹریوس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم مجھے یہ کہانی پہلے بھی سنا چکے ہو لیکن تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ پروفیسر برونسکی ہمارے ملک کے الیکٹرانکس کے مایہ ناز سائنسداں تھے۔ تم ان کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ اس حیثیت سے تمہیں اس بات کا مجھ سے بہتر علم ہوگا کہ آیا وہ کسی نہایت اہم منصوبے پر کام کررہے تھے یا نہیں۔ وفاقی وزیر نے اس حادثے کی مفصل رپورٹ طلب کی ہے۔"

وائی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

"پروفیسر برونسکی ان دنوں ایک ٹائم مشین پر کام کر رہے تھے۔ اس کا آخری ایڈجسٹمنٹ آج صبح ہی ہم نے کیا تھا۔"

"کس قسم کی مشین تھی یہ؟" ٹریوس نے پوچھا۔

"اس مشین کا مقصد کرۂ ارض کی زندہ مخلوق کو وقت کی قید سے آزاد کرنا تھا۔

وائی نے تشریح کی۔" آپ صرف ان باتوں کا تصور کرسکتے ہیں جو اس مشین کی بنا پر ممکن ہوسکتی ہیں اس مشین کے ذریعے یہ پتا چلایا جاسکتا ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا چند سالوں میں دوسری حکومتیں کس قسم کے اقدام

کرنے والی ہیں۔"

"ٹھیک، یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"اب مجھے اس بات کا شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پروفیسر کو دشمن کے ایجنٹوں نے موت کے گھاٹ نہ اتارا ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وائنی نے اپنی بات جاری رکھی۔

"پروفیسر کا اصرار تھا کہ مشین کو فوراً ٹیسٹ کرلیا جائے میں نے انہیں اس عجلت کی بنا پر پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا ان کی بے تابی کا عالم تو یہ تھا کہ وہ اس پہلے ٹیسٹ کے لیے خود ہی اس کیبنٹ میں داخل ہونے لگے لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے بڑی مشکل سے باز رکھا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ پہلے ٹیسٹ کے لیے خرگوش کے جوڑے کو استعمال کریں۔"

"ایک منٹ وائنی۔" انسپکٹر ٹریوس نے کچھ سوچتے ہوئے اور بایاں گال کھجاتے ہوئے کہا۔

اگر تم دونوں ہی اس وقت کیبنٹ سے باہر تھے تو پھر تم کیسے بچ گئے؟"

وائنی نے دیوار پر لگے ہوئے کنٹرول پینل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ وہ مقام ہے جہاں میں کھڑا ہوا تھا اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ جگہ شیشے کے ایک پارٹیشن کے پیچھے ہے۔"

"ٹھیک ٹھیک اپنی بات جاری رکھو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"پروفیسر نے کیبنٹ کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا کہ میں 1983ء کے لیے کنٹرول سیٹ کردوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ یہ پہلا تجربہ ہے لہٰذا کم مدت کے لیے کنٹرول سیٹ کیا جائے لیکن پروفیسر اس تجربے کے سلسلے میں اتنے پرجوش تھے کہ میری بات نہیں مانی۔ مجبوراً میں نے سوئچ آن کردیے لوڈ کے نتیجے میں روشنی مدھم ہوگئی اور پھر......اور پھر......!"

انسپکٹر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے یہ بات معلوم ہونی چاہیے وائنی۔" انسپکٹر نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"اپنی بات جاری رکھو۔"

"ٹھیک ہے انسپکٹر میں بتاتا ہوں۔" وائنی نے کہا۔

"تھوڑی دیر میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اس کے ساتھ ہی کیبنٹ کا دروازہ کھل گیا خرگوش اچھل کر باہر آگئے جنہوں نے پروفیسر کو نیچے گرادیا جونہی مجھے محسوس ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے میں نے مشین ریورس میں چلادی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی بے چارہ پروفیسر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔"

انسپکٹر ٹریوس تمسخرانہ انداز میں کھنکارا۔

"میری بات سنو، وائنی۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں ذرا ڈھنگ کی بات کرنی چاہیے۔" اس نے دونوں خرگوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اب بھی اس بات پر مصر ہو کہ ان دو معصوم ننھے جانوروں کی وجہ سے ایک جواب اور طویل القامت شخص دم گھٹ کر ہلاک ہوگیا۔"

"بے وقوفی کی بات تو آپ کررہے ہیں انسپکٹر، میں صرف ان دونوں کی بات نہیں کررہا ہوں۔" وائنی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اب بھی نہیں سمجھ سکے؟ ٹائم مشین کو چار سال آگے کی طرف سیٹ کیا گیا تھا۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ فرش سے لے کر چھت تک صرف خرگوش ہی خرگوش نظر آرہے تھے اور اسی سلسلے میں ہم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔"



غلط فہمی

راحیلہ ناز

بعض اوقات نامساعد حالات انسان کو ایسے مقام لاکھڑا کرتے ہیں کہ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ہونے والے اپنے ہر فعل کو وقت کی ضرورت اور بالکل صحیح گردانتا ہے۔
فرانس کے دور افتاد پہاڑی سلسلے میں ایک سیاح کو پیش آنے والے ایک دلچسپ حادثے کی روداد' جس کا انجام پڑھ کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

فرانس کے جنوبی حصے میں واقع ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو ٹاژدان کہلاتا ہے۔ ٹاژدان کی پہاڑیاں، سیاحوں میں اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں کہ وہاں بڑے بڑے پتھر، تلے اوپر جمع ہو کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور آدمی ان کے درمیان کھڑا ہو کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے ان گنت خوفناک اور مہیب جانوروں کے غول میں گھر گیا ہو اور وہ خوفناک جانور بتدریج اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے ہوں۔
ان پہاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بوڑھی عورت چھتری سمیت ان پر چڑھ جائے تو ان بھاری چٹانوں کو چھتری سے باآسانی لڑھکا سکتی ہے۔ یوں جیسے بچے بلے سے گیند لڑھکا دیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری خصوصدیت یہ ہے کہ ان میں لاتعداد غار اور بے حساب کھائیاں بھی ہیں۔ فرانس جانے والا کوئی بھی سیاح ان پہاڑیوں کو دیکھے بغیر، واپس نہیں لوٹتا۔ سیاحوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جس نے ٹاژدان کی پہاڑیوں کو نہیں دیکھا' اس نے دراصل فرانس ہی نہیں دیکھا۔
مجھے بھی سیاحوں میں پھیلا یہ مقولہ ان پہاڑیوں کی طرف کھینچ لایا تھا۔ اس روز وہاں چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چمکیلی، جگمگاتی دھوپ اور خود رو جھاڑیوں میں سے نکلنے والے پھولوں پر تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے گرد و پیش میں بکھرے مناظر سے لطف اندوز ہوتا وہاں گھوم رہا تھا۔ دھوپ نے میرا پورا جسم پسینے میں بھگو دیا تھا۔
ایک جگہ میں پسینہ پونچھنے کے لیے رکا تو اچانک میرا پاؤں رپٹ گیا۔ میں نے گرنے سے بچنے کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا۔ توازن بگڑنے کی وجہ سے میں ایک گہرے گڑھے میں جا گرا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں اپنے حواس بحال نہ رکھ سکا اور بے ہوش ہو گیا میرے گرد و پیش میں کیا ہوا تھا؟ اس کا مجھے احساس بھی نہ ہو پایا۔
پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا حواس بحال ہونے پر میں نے اٹھنا چاہا تو دائیں پاؤں میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گہرے گڑھے میں سے آسمان نظر آ رہا تھا مگر بہت کم جس سوراخ سے میں گرا تھا اس کے دہانے سے بہت ہلکی سی روشنی آ رہی تھی گڑھا کسی بھی طور پندرہ سولہ

فٹ سے کم گہرا نہ تھا۔

یہ انکشاف میرے لیے خاصا پرہول تھا۔ میرا سر چکرا گیا یہ پندرہ سولہ فٹ گہرے گڑھے میں سے نکلنا آسان نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میرے ایک پاؤں میں موچ بھی آ گئی تھی۔ میرے جسم پر پتھروں کی رگڑ سے پڑنے والی خراشیں تھیں اور اس اچانک حادثے پر میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

میری کار وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں جیسے تیسے کر کے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس گڑھے سے نکل جاتا گڑھا نیچے سے چوڑا مگر اوپر سے تنگ تھا اور اس میں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

میں نے ایک ہلکی سی کراہ بھری اور اپنے دائیں پاؤں کی دونوں ہاتھوں سے خوب اچھی طرح مالش کر ڈالی۔ مالش سے خاصا افاقہ محسوس ہوا اب میں اپنا پاؤں زمین پر ٹیک سکتا تھا اور اس پر اپنے جسم کا وزن بھی ڈال سکا تھا۔ میں نے اس گڑھے سے نکلنے کا ہر صورت میں تہیہ کر لیا میں باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ میری نظر غار میں ابھرے ہوئے ایک بڑے پتھر پر جم گئی جو غار کی دیوار میں خاصا آگے کی جانب نکلا ہوا تھا۔

میں نے چھلانگ لگا کر اس بڑے پتھر کر پکڑا اور اس پر پاؤں جما کر اس پتھر کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جو میرے ہاتھوں کی پہنچ سے صرف چند انچ دور تھا۔ میں نے وہ پتھر پکڑنے کے لیے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر کی جانب چھلانگ لگائی ہی تھی کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا جس پر میں کھڑا ہوا تھا اور تیزی سے نیچے گرتے ہوئے گڑھے کے فرش پر جا کر ٹک گیا۔

بروقت دوسری جانب چھلانگ لگا کر میں نے خود کو اس پتھر تلے آنے سے بچایا۔ بڑے پتھر کے ہٹتے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے پتھر، کنکریاں اور بہت سی مٹی بھی نیچے آ گری جس سے میں کسی طرح نہ بچ پایا جب ملبے کی بارش تھمی تو میں نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اب پتھروں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف تھا۔

میں دیوانہ وار گڑھے میں چکر لگانے لگا اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں باہر گھوم رہا تھا تو مجھے دور دور تک اس علاقے میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں نے چیخ پکار کی تب بھی بیرونی امداد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

میری چشم تصور میں اخبارات میں چھپنے والی خبروں کی سرخیاں ابھر آئیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک انگریز انجینئر جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے فرانس آیا تھا۔ اچانک ہی لاپتا ہو گیا تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

اس دہشت انگیز خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ میرے حواس دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ میں حیران پریشان اور گم صم اپنی جگہ کھڑا تھا کہ میری سماعت سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ ٹکرائی، میں چوکنا ہو گیا۔ میں نے سر اٹھایا تو وہ مکھیاں خلا سے نیچے آ کر بائیں جانب چلی گئیں ان مکھیوں کے پیچھے ایک غول کی صورت میں لاتعداد مکھیاں تھیں۔ پہلی دو شاید ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

میں نے اس جانب قدم بڑھائے، جدھر مکھیاں جا رہی تھیں میں چند ہی قدم چلا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ مجھے

ہلکی روشنی میں ایک انسانی لاش دکھائی دی میں سرتا پا کانپ اٹھا، پتا نہیں وہ کون بدنصیب تھا جو اس طرح دیار غیر میں مارا گیا تھا۔ پھر مجھے اپنا خیال آ گیا کیا میرا بھی یہی حشر ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ ہی میرے جسم میں تھرتھری چھوٹ گئی اور پسینہ بدن کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ شاید میں بھی کسی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور لاش کے قریب چلا گیا۔ یہ خیال میرے لیے تقویت کا باعث تھا کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اس سے ڈرنا کیا۔ لاش کے جسم پر براؤن پتلون اور سیاہ چمڑے کا جیکٹ تھا جبکہ سر پر ایک گہرا زخم تھا جس میں سے خاصی مقدار میں خون نکل کر اس کے چہرے پر جم گیا تھا اس طرح کہ اس کی صورت میں پہچانی نہ جاتی تھی۔

میں نے بغور زخم کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے سر پر کسی نوکدار وزنی چیز سے وار کیا گیا تھا لاش کے معائنے کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لاش سے بدبو نہیں اٹھ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے میرے گڑھے میں گرنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ مکھیوں کی تعداد اور ان کی بھنبھناہٹ میں اضافہ ہونے لگا تو مجھ پر الجھن سوار ہوگئی۔ موت کا خوف اب میرے اعصاب پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر لاش کی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک چرمی بٹوا اور شناختی کارڈ ملا۔ شناختی کارڈ کے مندرجات کے مطابق وہ ڈی میگارڈ تھا۔ میری ہی طرح ایک انگریز جو ایک بینک آفیسر تھا جبکہ میں ایک دندان ساز تھا۔ میں نے بٹوے کو مزید الٹ پلٹ

> **سب ٹھیک ہوجائے گا**
>
> لڑکی کے باپ نے شادی کے ایک امیدوار سے کہا۔
>
> ''میری بیٹی میرے گھر میں جس طرح پلی بڑھی ہے کیا تم اسے اس طرح رکھ سکو گے؟''
>
> ''جی نہیں۔'' امیدوار بولا۔ ''لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''
>
> ''یعنی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' باپ نے حیرت سے پوچھا۔
>
> ''یہ ہی کہ میں جس طرح اس کو رکھنا چاہوں گا اسے اس کی عادت ڈلوادوں گا۔''

کر دیکھا تو تھوڑی سی فرانسیسی کرنسی، چند ٹریولز چیک اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرچہ ملا جس پر ٹائپ میں چند سطری عبارت درج تھی۔ اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اس لیے گڑھے میں روشنی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ میں بہ مشکل اس تحریر کو پڑھنے میں کامیاب ہوسکا پرچے پر لکھا تھا۔

''ڈی میگارڈو، تم نے ہماری تنظیم سے غداری کی ہے لہٰذا تمہارے لیے موت کی سزا تجویز کردی گئی ہے تم چاہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں پہنچ جاؤ میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور تمہیں مجوزہ سزا دیں گے پھر تمہاری زبان کاٹ کر ''کالی دیوی'' کے حضور پیش کردی جائے گی۔''

پرچے کے اختتام پر نام کی جگہ بین الاقوامی تنظیم ''ساحران'' کے سربراہ اعلیٰ کے دستخط تھے جو کسی انسانی کھوپڑی سے مشابہہ تھے۔ اس پرچے کو پڑھ کر میرے جسم پر ایک بار پھر لرزہ طاری ہوگیا جو لوگ اس تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے لیے یہ پرچہ بے معنی اور قطعی غیر

اہم تھا مگر میں جانتا تھا کہ ''بین الاقوامی تنظیم ساحران'' کیا بلا تھی اس تنظیم کا چرچا برطانوی اخبارات میں بہت عرصے سے ہو رہا تھا۔

یہ ایسے افراد کا ٹولہ تھا جو کالے علم پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں غیر قانونی اور زیر زمین تھیں۔ اس لیے پولیس کو ہمیشہ ان کی تلاش رہتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ڈی میگارڈو یقیناً پولیس کا مخبر ہوگا اور اس نے تنظیم کے بارے میں کوئی خفیہ بات پولیس کو بتادی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ کچھ ماہ پہلے برطانیہ میں اس تنظیم کے بیشتر افراد کی گرفتاری اس کی خبریں بھی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں جو یقیناً ڈی میگارڈو کی جانب سے ملنے والی اطلاعات ہی کی مرہون منت تھیں۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ ڈی میگارڈو تنظیم کے ہرکاروں کے خوف سے فرانس بھاگ آیا ہوگا مگر اسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی موت اس کا مقسوم بن گئی تھی۔ تنظیم کے ارکان نے اسے ڈھونڈ نکالا اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں لاش کے قریب سے ہٹ گیا اور گڑھے کی ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ جو بتدریج میری جانب بڑھ رہی تھی اور جس سے فرار ممکن نہیں رہا تھا۔ رفتہ رفتہ غار میں گھٹن بڑھنے لگی اور لاش سے تعفن اٹھنے لگا۔ مکھیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی میری وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر لاش کے قریب گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تنظیم کے افراد نے اس کی زبان کاٹی تھی یا نہیں، ایک دندان ساز کی حیثیت سے میں ان گنت افراد کے جبڑے اور منہ ان کی مرضی کے خلاف کھلوا چکا تھا مگر وہ ایک لاش تھی۔ اس کا جبڑا کھولنے میں مجھے پسینہ آ گیا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ منہ کھلنے پر میں حیران رہ گیا۔ مجھے ڈی میگارڈو کے حلق میں موجود اس کی زبان صاف دکھائی دے رہی تھی جو اپنی جگہ موجود تھی۔

میں الجھن اور حیرت کا شکار ہو گیا میں سوچ رہا تھا کہ آخر تنظیم کے لوگوں نے اپنا عمل پورا کیوں نہیں کیا انہیں یقیناً اپنے سربراہ اعلیٰ کا حکم پورا کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ خود ان کی خیر نہ ہوتی وہ بھی کسی نادیدہ عذاب کا شکار ہو سکتے تھے۔ اسی لمحے ایک اور خیال میرے ذہن میں در آیا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کسی وجہ سے انہیں ڈی میگارڈو کی زبان کاٹنے کا وقت ہی نہ ملا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ڈی میگارڈو کی زبان کاٹ کر اپنے باس کے سامنے لے جا کر پیش کر دے گا تاکہ وہ اسے ''کالی دیوی'' کے حضور پیش کر سکے۔

یہ خیال میرے لیے خاصا دہشت ناک اور لرزہ خیز تھا۔ میں نے غار میں چاروں طرف دیکھا۔ غار کی دائیں جانب ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ میں فوراً ہی اس کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا تاکہ آنے والے کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ سکے۔ مجھے جب تنظیم کے ہرکاروں کا خیال آتا میں کانپ اٹھتا میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کوسا جب میں نے فرانس آنے اور ٹاڑدان کی پہاڑیاں دیکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کر بیٹھا تھا۔

مجھے پتھر کے پیچھے چھپے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے غار میں جھانک کر دیکھا ہو ہلکی سی آہٹ بھی ہوئی تھی میں آنے والوں کے خوف سے مزید دبک گیا۔ چند ثانیے بعد ہی غار کے دہانے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور دو

آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا گویا تنظیم کے ہرکارے ڈی میگارڈو کی زبان کاٹنے کے لیے آ پہنچے تھے اور اب نیچے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سر اٹھا کر غار کا روشن حصہ دیکھتا رہا ان میں سے ایک نے غار میں رسی لٹکائی جو بل کھاتے ہوئے نیچے آ کر غار کے فرش سے ٹک گئی پھر ان میں سے کسی ایک نے رسی کو جھٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

میں نے اپنا سانس روک لیا جونہی اس کے پاؤں زمین سے ٹکرائے وہ گہرے سانس لیتا ہوا لاش کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا اسی اثنا میں دوسرا آدمی بھی نیچے اتر آیا میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ ڈی میگارڈو کی زبان بعد میں کاٹتے پہلے میری خبر لیتے اور مجھے بھی ڈی میگارڈو کے پیچھے ایک لمبے سفر پر روانہ کر دیتے تھے۔

وہ دونوں لاش پر جھکے بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے قریب پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اس شخص کی کھوپڑی پر دے مارا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پتھر لگتے ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا دوسرے آدمی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک اور وزنی پتھر اٹھایا اور اس کی کھوپڑی کی طرف اچھال دیا اس بار بھی میرا نشانہ خطا نہیں گیا اس آدمی کی بھی کھوپڑی کھل گئی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں مرجاؤں گی

ٹرین کے ایک ڈبے میں دو عورتیں کھڑکی کے پاس بیٹھیں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ گارڈ کے آنے پر ایک عورت نے شکایت کی۔

''یہ خاتون کھڑکی کھلی رکھنا چاہتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے سخت سردی لگتی ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں بخار میں میں مر نہ جاؤں۔''

دوسری عورت نے کہا ''لیکن اگر کھڑکی بند رکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میرا دم گھٹ جائے گا اور میں مرجاؤں گی۔''

دونوں عورتوں کی فریاد سن کر گارڈ گھبرا گیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے ڈبے میں بیٹھے مسافروں میں سے ایک مسافر سے درخواست کی کہ وہ ایک خاتون کی سیٹ سے اپنی سیٹ بدل لے۔ یہ سن کر اس مسافر نے کہا۔

''جناب! سیٹ بدلنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ پہلے آپ کھڑکی بند کر دیں اس سے پہلی خاتون دم گھٹ کر مر جائے گی پھر آپ کھڑکی کھول دیں تاکہ دوسری خاتون سردی سے مر جائے گی اور اس طرح ہم سب آرام اور سکون سے سفر کر سکیں گے۔''

میرے لبوں سے بے ساختہ ایک طمانیت بھری سانس نکل گئی اب میں آزاد تھا اور آسانی سے اوپر جا سکتا تھا اوپر پہنچتے ہی مجھے مقامی پولیس کو اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ دینی تھی۔ لیکن غار سے نکلنے کا عمل اتنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ جتنا کہ میں نے سمجھا تھا کیونکہ میری ٹانگ کی تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی تھی اور کمزوری کا احساس مجھ پر غالب آ چکا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اسی رسی کے سہارے غار سے نکل آیا۔ اس وقت میں خود کو دندان ساز کی بجائے ایک ہیرو تصور کر رہا تھا جس نے ایک غیر قانونی تنظیم کے دو افراد کو جہنم رسید کر دیا تھا اور

معاشرے کے دو ناسوروں کو کاٹ پھینکا تھا۔

غار سے باہر آنے کے بعد میں نے اس سمت چلنا شروع کر دیا جہاں میری کار کھڑی تھی لیکن میں بہ مشکل چند ہی قدم طے کر پایا تھا کہ مجھے چکر آ گیا اور میں بے ہوش ہو گیا بے ہوشی سے قبل مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں پتھروں پر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد مجھے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اسپتال کے بستر پر پایا میری تیمارداری پر متعین نرس نے مجھے بتایا کہ چند سیاح اتفاق سے اس پہاڑی سلسلے پر جا نکلے تھے۔ انہوں نے مجھے بے ہوش پڑے پایا تو اٹھا کر شہر لے آئے۔ میری کار ان لوگوں کو کہیں نظر نہ آئی تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی کار کے بارے میں مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی وہ بعد میں بھی آ سکتی تھی اسی دن مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا میں پورے دو دن بے ہوش رہا تھا۔

دوسرے روز جب کہ میں اپنے ہوٹل کے بستر پر بیٹھا سوپ پی رہا تھا اور اپنے اس پیر کو دیکھ رہا تھا جس پر پلستر چڑھا دیا گیا فرانس کی پولیس کا چیف مجھ سے ملاقات کرنے آیا اس کا چہرے گھوڑے کی طرح سخت اور آنکھیں سانپ جیسی چمکیلی تھیں۔

اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ مجھے کیا واقعہ پیش آیا تو میں نے جواب میں اسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا وہ خاموشی سے سنتا رہا میں خاموش ہوا تو اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے موسیو، اپنے اس کارنامے پر تم خود کو ہیرو سمجھ رہے ہو گے۔''

''ہاں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے دندان سازی کا پیشہ اختیار کر کے غلطی کی مجھے پولیس کے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔''

''ضرور۔'' اس نے سرد مہری سے کہا اس کا لہجہ کچھ اس انداز کا تھا میں چونک کر اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔

''تمہیں یہ جان کر دکھ ہو گا کہ موسیو میگارڈو کا قاتل پہلے ہی گرفتار ہو چکا ہے۔'' اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میں نے لاش حاصل کرنے کے لیے دو آدمی روانہ کیے تھے وہی دونوں جنہیں تم نے پتھر مار کر شدید زخمی کر دیا۔ ان دونوں کا شمار فرانس کی پولیس کے بہترین آدمیوں میں ہوتا ہے، لیکن اب وہ اسپتال میں پڑے ہیں۔''

''مگر......مگر......وہ......تو......!'' میں ہکلا کر رہ گیا اور اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ ساری بات غلط فہمی کی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ فرانس کی پولیس کے آدمی ہیں میں تو انہیں بین الاقوامی تنظیم ساحران کے ایجنٹ سمجھا تھا جو اپنے باس کے حکم کے مطابق ڈی میگارڈو کی زبان کاٹنے کے لیے گڑھے میں اترے تھے۔

پولیس چیف نے مجھے درشتی سے گھورا اور پھر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں دل ہی دل میں ان دونوں کی جلد صحت یابی کی دعا کرنے لگا۔ اگر وہ مرجاتے تو مجھ پر فرانس کی پولیس کے دو بہترین آدمیوں کو قتل کر دینے کے الزام میں مقدمہ بھی چل سکتا تھا۔ پہلے میں جیل جاتا پھر سوئے دار۔

قسط نمبر 24

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

میں نے بجتے ہوئے سیل فون کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر جگمگا رہے تھے۔ پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی۔ وہ لوگ اندر آرہے تھے۔ میں نے بانیتا کور کی طرف دیکھ کر فون ریسو کرلیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں کسی اجنبی نے کہا۔

"اسمارٹ مین، میرے بندے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ امید ہے تم زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہیں کروگے اور چپ چاپ ان کے ساتھ آجاؤ گے۔"

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تفصیل میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا، جب تم میرے سامنے اپنی موت کے لیے بھیک مانگ رہے ہو گے۔ میں....." وہ کہہ رہا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، کیا چاہ رہا ہے۔ میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور تیزی سے اٹھا۔ بانیتا کور مجھے دیکھ رہی تھی، اس لیے مجھ سے پہلے ہی وہ اٹھ گئی۔

"یہ لوگ ہمارے لیے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سامنے کے واش روم میں گھس گئی۔ یہ چند قدم چلتے رہنے کے دوران اس نے اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ میں دوسری طرف بنے ہوئے ستون کے ساتھ لگ گیا۔ وہاں سے سیڑھیوں کا سرا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں پوری طرح الرٹ ہوگیا۔ قدموں کی چاپ نہیں آرہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھی تربیت یافتہ ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا، بانیتا کور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بتادیا کہ وہ آرہے ہیں۔ اس نے دروازے کی آڑ لے لی۔ اس نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور وہ فائرنگ کے لیے پوری طرح تیار ہوچکی تھی۔

ایک دو منٹ کے اندر ہی وہ اوپر آگئے۔ وہ چار تھے۔ ایک نے آتے ہی کسی سے کہا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ نہ جمال اور....."

"یہیں ہوں گے، دیکھو۔" دوسرے نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اسی لمحے وہ آگے آکر پھیلنے لگے۔ اس طرح وہ مجھے دیکھ لیتے، میں جب تک ایک دو کو فائر مارتا، تب تک وہ مجھے نشانہ بنالیتے۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے بانیتا کور نے فائر کردیا۔ اس لمحے انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ میں نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور تبھی میں نے ایک کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ پسٹل سمیت اس کا ہاتھ اڑ گیا تو اس کے منہ سے بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد موقعہ نہیں تھا۔ ان کی طرف سے گولی چلی اور بانیتا کور بھی اگلا فائر کرچکی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے فائر کردیا۔ وہ واپس مڑنا چاہتے تھے یا نہیں، البتہ میں سامنے نکل کر ان پر فائر کرتا چلا گیا۔ وہ چاروں

فرش پر پڑے چیخ رہے تھے۔ بلاشبہ نیچے والوں نے اوپر آنا تھا یا پھر بھاگ جانا تھا۔ میں انہیں بھاگنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پسٹل کا میگزین بدلا اور سیڑھیوں کے سرے پر دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے بانیتا کور کو دیکھا۔ وہ پاؤں کی ٹھوکر سے ان کا اسلحہ ان سے الگ کر رہی تھی۔ وہ ایسا کر چکی تو میں نے اسے سیڑھیوں کے سرے پر نظر رکھنے کو کہا۔ وہ میری جگہ آ گئی تو میں تیزی سے شیشے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک الماری کی کنڈی نہیں تھی۔ میں نے اسے کھولا اور نیچے قدم رکھا اور ایک ہاتھ سے جھول گیا۔ اسی لمحے مجھے اندر کا منظر دکھائی دیا۔ وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ ان دونوں حملہ آوروں نے دو عورتوں اور چند بچوں کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ بچوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اگر ایک ہوتا تو میں چشم زدن میں اس کا صفایا کر چکا ہوتا۔ وہ دو تھے۔ اگر ایک مرتا تو دوسرا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں نیچے بڑی آسانی کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اوپر جانا بہت مشکل تھا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ بانیتا کور دوسری طرف نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ میں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بہت مشکل سے کھڑا ہونا چاہا لیکن میری حرکت سے آواز پیدا ہوئی۔ میں کوئی ایسی آواز بھی نہیں نکالنا چاہتا تھا، جس سے نیچے کھڑے حملہ آور متوجہ ہو جاتے۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بانیتا کور کو فون کر دیا۔ اس نے بجائے فون سننے کے چند ثانئے کے بعد کھڑکی میں آ کر دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا، تو میں نے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوبارہ کال کر کے نیچے کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔ پھر اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے۔ اس وقت دو عورتوں اور بچوں کی زندگی کا سوال تھا۔ بانیتا کور پیچھے ہٹ گئی تو میں نے بڑی احتیاط سے خود کو اس طرح ٹیرس پر لٹا لیا کہ آواز تک پیدا نہیں ہونے دی۔ اس بار جب میں نے ان حملہ آوروں کے چہروں پر کافی حد تک تشویش دیکھی تھی۔

میں نے بانیتا کور کو یہ سمجھایا تھا کہ وہ ایک دم سے سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے ایسے نیچے گرتی چلی جائے جیسے کہ وہ بے ہوش ہے یا مر چکی ہے۔ ایک آدھ ثانئے کو ان حملہ آوروں کی توجہ ہٹانی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا پسٹل میری طرف پھینک دے۔ وہ وہاں پر ان چاروں میں سے کسی کا بھی اسلحہ استعمال کر سکتی تھی۔ چند لمحوں ہی میں اس نے پردے کے ایک کپڑے میں پسٹل باندھ کر بالکل میرے اوپر تک پہنچا دیا۔ میں نے لیٹے لیٹے وہ کھولا، اس کا میگزین دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے ایکشن کے لیے کہہ دیا۔

میں غور سے شست باندھے ان پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ جونہی اُن کی توجہ ہٹی، انہوں نے گھوم کر دیکھا، تبھی میں نے دونوں ہاتھوں سے پوری توجہ کے ساتھ دو فائر کیے۔ ان کے ہاتھوں سے پسٹل نجانے کدھر گئے، اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے اگلا لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ جس وقت تک ان کی چیخیں کم ہوتیں، میں ٹیرس سے کود گیا تھا۔ بلاشبہ بانیتا کور بھی اٹھ گئی ہوگی۔ میرے قدم جونہی زمین پر لگے۔ وہ دونوں باہر کی جانب بھاگ کر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

میں اسپرنگ کی مانند اچھلا اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ میں ان پر وار کروں گا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں ایک دم سے جھک گیا وہ میرے اوپر سے الٹ کر باہر فرش پر جا گرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک بانیتا کور بھی آ گئی۔ اس نے آتے ہی ایک بندے کے منہ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ اُدخ کی کریہہ آواز نکال کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

خطرہ ٹل جانے کا احساس کر کے لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ یہ ایسی صورت حال تھی، جس میں

ہمارے لیے خطرہ بڑھ جاتا۔ پولیس کو جواب دینا، وقت ضائع ہونا اور خواہ مخواہ تفتیش سے گزرنا، کئی ایسے مرحلے تھے۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ ان دونوں کے لیے کر یہاں سے نکل جائیں۔ میں نے فوری طور پر ان کی تلاشی لیتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو کہا کہ فوراً رسی لائیں۔ جب تک ہم نے ان دونوں نے تلاشی لی تب تک ہمیں رسی دستیاب ہوگئی۔ میں نے دونوں کو باندھتے ہوئے بانیتا کور کو سمجھا دیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ وہ تیار ہوگئی۔ جیسے ہی میں نے دوسرے کو باندھا، وہ کار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے کار قریب لائی۔ اس کا دروازہ کھولا۔ تبھی ایک آدمی تیزی سے بولا۔

''ارے کیا کر رہے ہو بھائی، پولیس آتی ہی ہوگی۔''

ہم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان دونوں کو اٹھا کر، کار کی پچھلی سیٹ کے درمیان رکھا۔ بانیتا کور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم وہاں سے چل دیئے۔

''کدھر جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال چلتے چلو۔ بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سیل فون نکال لیا۔ میں نے طارق نذیر کے نمبر پش کیے۔ میرے خیال میں اس نے بیل بھی نہیں بجنے دی تھی کہ فون پک کرلیا۔

''سر میں آپ ہی کو فون کر رہا تھا۔'' اس نے تیزی سے پرجوش لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بندے کا پتہ چل گیا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ وہی منیجر تھا، وہ ہمارے پاس ہے اسی نے بتایا۔'' وہ بولا۔

''اچھا میں یہ تفصیل تمہارے پاس آ کر سنتا ہوں۔ مجھے کوئی سیف ہاؤس بتاؤ، یا پھر ایسی جگہ جہاں دو غلط قسم کے بندوں کے ساتھ ہم بھی کچھ وقت گزار سکیں۔'' میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولا۔

''اوہ! ایسا کیا ہوگیا سر؟''

''یار، آ کر بتاتا ہوں نا، جلدی بولو۔'' میں نے کافی حد تک تلخی سے کہا تو وہ میری لوکیشن پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا تو وہ بولا۔

''آپ سیدھے اسی روڈ پر آتے چلے جائیں۔ پھر دائیں جانب آئیں گے تو نہر آ جائے گی۔ تب تک میں پہنچ جاتا ہوں، میں کار میں سوار ہو گیا ہوں، میں قریب ہی ہوں۔'' اس نے روانی سے کہا۔ میں اگلے چوک کو دیکھنے لگا جہاں سے مڑنا تھا۔ ہم نہر پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے طارق کھڑا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہم کون سی کار میں ہیں۔ میں نے کال کر کے اسے بتایا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک بنگلہ نما گھر میں آ گئے۔

''وہ منیجر بھی ادھر ہی ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں۔'' طارق نے بتایا

''ان دونوں کو اُتارو، یہ ذرا خاص مہمان ہیں، ان کی خاطر داری کرو، ان کے ہاتھوں پر زخم ہیں، انہیں فرسٹ ایڈ دو پھر ان سے بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ننگے فرش پر ایک ادھیڑ عمر فربہ مائل شخص اَدھ موا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

''یہی ہے وہ منیجر۔'' طارق نے بتایا تو میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ آواز سن کر اس نے بہ مشکل پپوٹے کھولے، میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ میری جانب خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر یوں سر گرا دیا جیسے وہ مایوس ہو کر ہر طرح کی صورت حال کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ میں نے اس کے بال پکڑے اور اس کا سر اٹھا کر پوچھا۔

''کیسے ہوا سب؟''

''جس وقت فیضان بٹ کی گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے پھٹی تھی، اس وقت تمہارے دو بندے فیکٹری میں موجود تھے اور الطاف گجر بھی وہیں تھا۔ یاد ہے آپ کو؟'' اس نے یوں کہہ کر یاد دلانے کی کوشش کی جیسے یہ

بہت پرانی بات ہو۔ میں سمجھ گیا تھا۔

''آگے کہو۔'' میں بولا۔

''اس وقت مجھے فون کال ملی کہ میرے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، انہوں نے میرے بیٹے کی آواز تک مجھے سنائی۔ میری بات کروائی اس سے۔''

''تمہارے بیٹے کا اغوا؟'' میں نے یوں پوچھا جیسے مجھے بہت حیرت ہوئی ہو۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک نئی کہانی گھڑے گا۔

''جی، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے تاوان مانگے گا، جیسے آج کل اغوا برائے تاوان کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تو پھر......؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے مجھ سے کوئی رقم نہیں مانگی، بلکہ انہوں نے مجھ سے کام لینے کے بارے میں کہا اور جب انہوں نے مجھے کام بتایا تو میں نے سوچ لیا کہ اب نوکری تو چھوڑنا پڑے گی۔ اپنے بیٹے کی خاطر میں نے نوکری چھوڑنے کا سوچ لیا تھا۔ دوسرا انہوں نے میرے بیٹے کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہاں رات سے کس طرح کے بندے کو رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تصدیق کی تو میں نے بتا دیا کہ بندہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔ انہوں نے مجھے ان سب پر نگاہ رکھنے کو کہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ جب تک وہ آئے آپ لوگوں کے بندے الطاف گجر کو نکال کر لے جا چکے تھے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ میں اپنے مالک کو یہاں بلواؤں، میں نے اسے بلا لیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ۔ میرا بیٹا ابھی تک ان کے پاس ہے۔'' وہ یوں بولا جیسے ابھی مر جائے گا۔

''انہوں نے تم سے کام کیا لیا؟'' میں نے تحمل سے پوچھا تو وہ بولا۔

''جب تک وہ پہنچے آپ کے بندے تو جا چکے تھے۔ انہوں نے یہی کہا کہ میں وہ بندے پہچان کر اسے دوں کہ وہ کون ہیں۔ میں نے اپنے ایک بندے کو ان کے پیچھے لگا دیا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں نے وہ بندے نہ پکڑوائے تو میرا بیٹا بازیاب نہیں ہوگا۔ میرا آدمی ان دو بندوں کا گھر دیکھ آیا۔ بعد میں انہیں گھر کا بھی پتہ چل گیا۔''

''کیا ملا تجھے، نہ بیٹا اور نہ نوکری، اب کہو گے کہ ان کے بارے میں بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں، کہاں کے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جی بالکل، میں نہیں جانتا۔ مگر میرے بیٹے کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میری اس سے بات ہوتی ہے، اب شاید وہ اپنی ماں سے بات کرتا ہوگا۔''

''مطلب، تم نے اپنے بندوں کے ذریعے ہمارے گھر کی نشاندہی کروائی اور انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر ہماری قسمت اچھی نہ ہوتی تو اب تک ہم منوں مٹی کے نیچے پڑے ہوتے۔ خیر۔! اب تم ہمارے مہمان ہو۔ دیکھتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں، جو ہم تک پہنچے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اب کیا کرنا ہے اس کا؟'' طارق نے پوچھا۔

''یہ مہمان ہے۔ اسے کھانا دو، اب کچھ نہیں کہنا اسے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور چل دیا۔ جیسے ہی کمرے میں آئے تب میں نے طارق سے کہا۔ ''اس کا بیٹا اگر واقعی ہی اغوا ہوا ہے تو، الگ بات ہے اور اگر نہیں، تب پھر معاملہ دوسرا ہوگا۔ اب پتہ یہی کرنا ہے کہ اس کا بیٹا اغوا ہوا تھا؟۔ اس کے بیٹے کا پتہ کرو۔ اس کے گھر کی اور گھر والوں کی خفیہ نگرانی ہو۔''

''جی ہو جائے گا۔'' طارق نے کہا تو بانیتا کور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

''اوئے۔ بھوکا ہی مار دینا ہے تو نے، کوئی روٹی کا بھی بندوبست ہے یا نری تفتیش ہی چلنی ہے۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' میں نے یوں کہا جیسے اس کی بات سمجھ میں آ ہی گئی ہے تو اس نے بیڈ کے سرے پر رکھا تکیہ اٹھایا اور میرے دے مارا۔

''بس دس منٹ دے دیں مجھے۔'' طارق نے کہا اور جلدی سے مڑ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کے لیے نہایت پر تکلف کھانا چُن دیا گیا۔ بانیتا کور نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر چائے کا مگ لے کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

''اب تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ سکون سے سو جانے کو من کر رہا ہے۔ آؤ، کچھ دیر سکون سے سو جائیں۔'' اس نے خمار آلود آواز میں کہا تو میں ہنس دیا

''وہ جو ساتھ لائے ہیں ان......''

''انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ صبح تک وہ باتیں کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''اگر سونا ہی ہے تو ٹاؤن چلتے ہیں۔'' میں نے رائے دی

''اب تو ہلنے کو بھی جی نہیں کر رہا اور تم ظالم ہو پھر سفر کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔'' وہ نشیلی آواز میں بولی تو میں ہنس دیا۔

''ویسے تمہیں اداکار ہونا چاہئے تھا۔ اسکرین پر دھمال ڈال دو، سچی۔''

''میرا تو ابھی دھمال ڈالنے کو بڑا دل کر رہا ہے، آؤ نا۔'' اس نے باقاعدہ بانہیں پھیلا کر کہا تو میں اپنا قہقہہ نہ روک سکا تو وہ بھی کھل کر ہنس دی۔

ہم چائے پی چکے تو میں اٹھا اور نیچے والے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑے تھے اور ان کی آنکھوں میں نفرت اُبل رہی تھی۔ مجرم چاہے کتنا بڑا ہو، اس کی آنکھ میں خوف دَر آتا ہے۔ لیکن وہ جو کسی مقصد کے لیے نکلا ہو، اس کی آنکھ کچھ اور ہی بول رہی ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں ویسی ہی تھیں جو کسی مقصد کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مقصد انسانیت کے لیے قابل قبول بھی ہے یا وہ حیوانیت اور شیطانیت کے نرغے میں پھنس کر اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر کافی دیر دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھوں پر سفید پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں دوا وغیرہ بھی دے دی گئی ہو گی۔ میں ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نرمی سے پوچھا۔

''کون ہو تم لوگ؟''

''ہم کوئی بھی ہیں، تم اپنا کام کرو، ہمیں مار دو، ہماری بوٹی بوٹی کرو، دکھاؤ اپنی درندگی۔ مادر......'' اس نے انتہائی نفرت سے مجھے گالی دی۔ ایک دم سے میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اندر سے ایک لہر اٹھی لیکن جس طرح یہ لہر اٹھی تھی۔ اسی طرح میں نے اس پر خود قابو پالیا۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ تم دونوں مجرم نہیں ہو اور نہ وہ تھے، جو تم لوگوں کے ساتھی تھے۔ تھے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چونکہ اب وہ مر چکے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں ان کی آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کر دی جائیں۔ باقی تم لوگوں سے باتیں تو میں بعد میں بھی کر لوں گا۔'' میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو میرے یوں کہنے پر ایک نے سر اٹھا کر اسی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''وہ نہیں رہا تو کوئی بات نہیں، اب اس کا جسم ہے، چاہے جلا دو یا دفنا دو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''یہ تو پکی بات ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ وہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، میں......'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرا اُکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

''جو مرضی کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

''لیکن ہمیں تو ہے۔'' میری پشت سے بانیتا کور کی آواز آئی۔ انہوں نے سامنے کھڑی بانیتا کور کو دیکھا پھر استہزائیہ انداز میں مسکرا دیئے۔ میرے لیے یہ کافی حیرت والی بات تھی کہ یہ لوگ اتنے نڈر ہیں۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ نڈر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی غیرت مند آدمی بچوں اور عورتوں کو یرغمال نہیں بناتا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑی تھی، جیسے ابھی ان پر برس پڑے گی۔

''تو کرتے رہو، ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔'' پہلے نے

بھی اسی طرح اکتائے ہوئے انداز میں کہا جیسے ہم ان کے آرام میں خلل ڈال رہے ہوں۔

''تم لوگوں سے تو بہت کچھ پوچھنا ہے، دیکھو، ہم کتنے اچھے ہیں کہ تم دونوں سے یہ پوچھ رہے کہ کیسے بتاؤ گے، آرام سے یا ذلیل ہوکر۔'' بانیتا کور نے دانت پیستے ہوئے کہاتو دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا

''بندھے ہوئے......'' دوسرے نے کہنا چاہا تو وہ آگے بڑھی اور اس نے قریب کھڑے ایک بندے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے کھول دو۔''

وہ بندہ آگے بڑھا اور اس نے دوسرے کو کھول دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی کھڑا ہوگیا۔ مجھے لگا کہ وہ بانیتا کور سے زیادہ بھاری ہے۔ مگر میں بھی اس کا اعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سامنے کھڑے اس بندے کو وار کرنے کی دعوت دی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا۔ اور اس نے جھکائی دے کر پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا مگر اس کی کوشش رائیگاں گئی۔ بانیتا کور نے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا اور تو وہ بے ساختہ آگے جھک گیا، بانیتا نے اس کی گردن پر زوردار کلائی رسید کی، جس سے وہ اپنی ہی جونک میں لڑکھڑاتا ہوا آگے دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ بانیتا کور نے اسے اٹھنے نہیں دیا، پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکر اس کے سر پر دے ماری اس کا سر دیوار سے لگا۔ وہ چکرا گیا۔ وہ رُکی نہیں، اس نے اس کا سر پکڑا اور دوبارہ اسے دیوار پر دے مارا۔ خون کا فوارا اس کے سر سے نکل پڑا۔ بانیتا کور نے اسے کالر سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے کے درمیان میں لے آئی۔ پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند ثانئے میں وہ ادھ موا ہو گیا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی۔

''اب اسے کھول دو، اور اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔''

''ٹھہرو۔'' میں نے کہا اور پھر بندھے ہوئے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا خیال ہے؟''

وہ چند ثانئے سوچتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا

''پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔''

بانیتا کور ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کون لوگ ہو تم؟''

میرے یوں پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''ہم بھارتی ہیں اور اپنے مشن پر ہیں۔''

''ہمارے پیچھے کیوں تھے؟''

''تم دونوں کو اغوا کر کے لے جانا تھا؟'' وہ بولا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں، جہاں ہمارا باس کہتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔'' وہ بولا۔

''کب سے یہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سال ہو گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میرے پیچھے ہی کیوں؟''

''کہانا باس نے حکم دیا ہے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ تم ہی الطاف گجر کو پکڑ کر لائے ہو۔ تم ہمارا نیٹ ورک تباہ کر دینا چاہتے ہو۔'' وہ نفرت سے بولا تو میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یقین جانو، تمہیں جانے دوں گا۔ کیونکہ تم ایک مقصد کے لیے لڑ رہے ہو۔ تم کوئی مجرم نہیں ہو۔'' میں نے کہا تو اس نے پہلی بار نرم انداز میں میری طرف دیکھا، پھر مایوسی سے بولا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتہ نہیں، میرا باس کہاں ہے، مجھے بس میرے ساتھی سے حکم ملا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔''

''ٹھیک ہے پڑے رہو، جب تجھے اپنے باس سے رابطہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے بتا دینا۔'' میں نے کہا اور باہر چل دیا۔ دوسرا بے ہوش ہو چکا تھا۔ قریب کھڑے بندے نے اسے دوبارہ باندھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر ابھی ختم نہیں ہوا تھا جب جسپال اوگی پنڈ پہنچ گیا۔ پھوپھو جیت کور کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائننگ روم داخل ہوتے ہی فتح بلائی تو پھوپھو نے جواب دے کہا۔

''تو پتر جلدی سے کھانے پر آجا، میں تیرا انتظار کر رہی ہوں اور باقی سب کو بھی بلاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ آواز دینے لگی۔ جسپال وہیں بیٹھ گیا۔ چند منٹوں میں سارے وہاں آگئے۔ خوشگوار ماحول بن گیا۔ وہ وہاں بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ جسپال نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ رتن دیپ سنگھ نے الیکشن ہی کے لیے بلایا تھا۔ پارٹی میں ہر پل اوپر نیچے تو ہو رہی ہے۔ ایسی ہی کچھ باتیں کر کے اس نے سب کو مطمئن کر دیا کہ وہ بہت اہم کام سے گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایسا ہونا ناممکن تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہو اور ہرپریت اس کے آس پاس نہ ہو۔ وہ ایزی ہو کر بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ ہرپریت آگئی۔ وہ حسب معمول اس کے پاس بیڈ پر نہیں بیٹھی، بلکہ قریب پڑی ایزی چیئر پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ جسپال نے پہلے تو محسوس نہ کیا، پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''خیر تو ہے پریتو، یوں اجنبی ہو رہی ہو؟''

''کہاں تھے تم، اتنی رات کو اچانک نکلے؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

''بتایا نا کہ میں رتن دیپ سنگھ کے پاس گیا تھا۔ کیوں تم شک کیوں کر رہی ہو؟'' اس نے ہرپریت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے شک نہیں یقین ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''مطلب میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' اس نے ناراضگی سے کہا۔

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی

''کوئی وجہ تو ہو، میرے جھوٹ بولنے، نہ بولنے کی، کیا بچوں کی طرح کر رہی ہو۔'' وہ اکتاتے ہوئے بولا۔

''میں نے کہا نا کہ تمہاری باتوں پر میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ اور اب اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''اچھا، میرا مغز نہ کھاؤ، صبح وہ نوتن کور آجائے گی ادھر، اس سے پوچھ لینا تفصیل کہ میں کہاں تھا۔ اگر چاہو تو ابھی پوچھ لو کہ میں کہاں تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اچھا، غصے کیوں ہوتے ہو، بس تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔

''تو پھر، یوں اجنبی کیوں لگ رہی ہو؟'' جسپال نے پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے لیے چائے لانا بھول گئی، وہ لے آؤں۔ یا پھر جوتی کو بھیج دوں؟''

''ہرپریت۔ ادھر بیٹھو، میرے پاس اور بتاؤ بات کیا ہے؟'' جسپال نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا۔ ''بولو کیا بات ہے؟''

''میں بہت ڈسٹرب ہوں جسی، میری سوچیں مجھے پاگل کر رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔'' اس نے بے چینی کے سے انداز میں کہا۔

''کیسی سوچیں ہیں؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''یہی کہ یہ جو ہم الیکشن لڑنے جا رہے ہیں، کیا ہوگا اس سے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم اسمبلی کی سیٹ جیت جائیں گے اور مجھے سو فیصد امید ہے کہ ہم جیت بھی جائیں گے لیکن اس کے بعد ہوگا کیا؟ پورے علاقے میں جہاں صرف چند لوگ ہمارے دوست ہوں گے، وہاں اس سے کہیں زیادہ دشمن پیدا ہو جائیں گے۔ ایک خوشامدی ٹولہ بن جائے گا جو ہمیں گھیرے میں لے لے گا۔ اگر ان کے کام ہوتے رہے تو وہ دوست دکھائی دیں گے اور اگر کام نہ ہوئے تو یہی لوگ سازش کریں گے۔ منافقت کریں گے اور دشمنوں کا ساتھ دیں گے، ان

پر اعتماد کیا ہی نہیں جاسکتا، ہم ہر طرح کے لوگوں کی نگاہوں میں آجائیں گے۔ وہ سکون وہ اطمینان، جو تھوڑا بہت ہمیں میسر ہے، وہ بھی نہیں رہے گا۔'' وہ یوں کہتی چلی گئی، جیسے وہ پھٹ پڑی ہو۔

''کیا چاہتی ہو تم؟'' جسپال نے نرمی سے پوچھا۔

''یہ سب چھوڑو، میں انوجیت کو تو یہ نہیں کہہ سکتی، تمہیں تو کہہ سکتی ہوں۔'' وہ پھر یوں بولی جیسے اسے سمجھ نہ آرہی ہو کہ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ جسپال نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑا اور پھر اسے قریب کرلیا۔ وہ ساری کی ساری اس کی طرف ہوگئی۔ جسپال نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''پریتو! سچ بتانا، بات کیا ہے؟''

وہ اس کے چہرے پر دیکھتی رہی، جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو پھر کچھ لمحوں بعد بولی۔

''جسپال! ہم کب تک بھاگتے دوڑتے رہیں گے، کالج لائف میں اک جوش تھا، عقل نہیں تھی، بہت کچھ کیا کیونکہ ہمیں لگتا تھا کہ اب کچھ دن ہی ہیں، جب ہم اپنی قوم کو آزاد کرالیں گے، لیکن اب سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ اب ناممکن ہے، آزادی ہم سے بہت دور ہوگئی ہے، ہم لڑتے ہوئے مر جائیں گے اور شاید اگلی نسل ایسا کچھ کر پائے۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تیر رہی تھی۔

''پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کہ زندگی کو زندگی سمجھ لیں اور جو ہو رہا ہے اسے قبول کرلیں۔ خود سے ایسا کچھ نہ کریں جو زندگی کو ختم کرنے والا ہو، سکون بھی تو چاہیے نا زندگی میں۔'' اس نے اپنی آنکھوں میں اُمید کے نجانے کتنے دیئے جلائے کہا تو جسپال آہستہ سے بولا۔

''پریتو! جیسا تو چاہے گی نا، ویسا ہی ہوگا۔ ہم ابھی اور اسی وقت الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کرسکتے ہیں لیکن اس سے ہوگا کیا؟ ہم پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، بہت ساری جگہوں پر یہ طے کرلیا گیا ہے، اب واپسی ناممکن ہے۔'' جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابھی تو اتنی مشکل نہیں ہے، بعد میں تو......''

اس نے کہنا چاہا تو جسپال اس کے ہاتھ کو دبا کر بولا۔

''زندگی یہ نہیں ہے جو تم چاہ رہی ہو۔ زندگی کا مقصد کچھ دوسرا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتانے والا نہیں بلکہ تمہیں دکھاؤں گا زندگی ہوتی کیا ہے اور آزادی ایک دن میں نہیں مل جاتی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم نے آزادی کی اس وقت قدر نہیں کی جب وہ ہمارے سامنے دھری ہوئی تھی۔ اگر ایک بار آزادی چھن جائے تو پھر بہت دیر بعد ملتی ہے۔ اب یہ آزادی بہت وقت بعد ملے گی اور بڑا خون بہانا پڑے گا۔ ہم جس سے آزادی مانگ رہے ہیں وہ کمینہ دشمن ہے۔ اور آخری بات، تم اتنی مایوس کیوں ہوگئی ہو، کب سے تم نے عقل کی باتیں سوچنا شروع کردی ہیں؟'' اس نے بڑے پیار سے کہا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے جسپال، ہماری قربانی ہمارا لہو کہیں رائیگاں نہ چلا جائے۔'' وہ دکھ سے بولی۔

''ہمیشہ وہ لہو رائیگاں جاتا ہے، جس میں انسانیت سے محبت نہ ہو۔ ہم کسی کو نیچا دکھانے یا اپنی انا کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں، ہمیں طاقت سے بھی غرض نہیں لیکن! اگر کوئی ہماری حرمت کو نقصان پہنچائے گا تو اس کے لیے معافی نہیں ہے۔ بتاؤ کیا ہونی چاہیے معافی؟'' اس بار جسپال بات کرتے ہوئے کافی حد تک جذباتی ہوگیا۔ اس پر وہ سوچتے ہوئے بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''پریتو، میں سمجھتا ہوں کہ تم اکیلی ہوتی ہو اور اوٹ پٹانگ سوچتی رہتی ہو۔ خیر، اب تم مجھے ایک اچھی سی چائے پلاؤ، پھر میں تمہیں ایک مزیدار بات بتاتا ہوں۔'' جسپال نے یونہی کہہ دیا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ٹرے لیے واپس آگئی۔

''وہ تو تی لے کر آرہی تھی۔ اب سناؤ مزیدار بات۔'' اس نے ٹرے اپنے سامنے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''مزیدار بات یہ ہے کہ بانیتا کور اس وقت جمال کے

پاس لاہور میں ہے۔'' اس نے ایک دم سے کہا۔
''ارے واہ، وہ کیسے؟'' وہ کافی حد تک حیرت ملے جوش سے بولی۔
''بس چلی گئی اس کے پاس۔'' جسپال نے کہا۔
''کاش ہم بھی وہاں جاتے۔'' ہرپریت نے آہ بھرتے ہوئے کہا تو جسپال بولا۔
''بس یہ الیکشن سے فارغ ہو جائیں، پھر شری ننکانہ صاحب چلیں گے درشن کے لیے۔'' اس نے کہا اور چائے بنائی ہرپریت کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی اس نے موضوع بدل دیا۔ وہ الیکشن کے بارے میں بتانے لگی۔ یونہی ارد گرد کے گاؤں جانے کی باتیں۔
رات گئے وہ دونوں باتوں میں الجھے رہے۔ یہاں تک کہ انوجیت بھی ان کے پاس آ گیا۔ وہ الیکشن ہی کی باتیں کرنے لگا۔ رات کے دوسرے پہر تک باتیں کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے چلے گئے۔
صبح کی روشنی بہت حد تک پھیل گئی تھی جب جسپال کی آنکھ کھلی۔ اس کے پاس سوائے نوتن کور کا انتظار کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے تیار ہوا۔ اور پھر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کلجیت کور وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہیں اسے پتہ چلا کے رات پنڈ کے ایک گھر سے لڑکی اغوا ہو گئی ہے۔ بھائی کی آنکھ کھلی تو اس نے مزاحمت کی، جس پر انہوں نے بھائی کو فائر مار دیا۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔ اب نہ لڑکی کا پتہ ہے اور نہ لڑکی لے جانے والوں کا۔ انوجیت انہی کے گھر گیا ہوا ہے۔
''پھوپھو، یہ تو بہت برا ہوا، میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے اپنا سیل فون نکال کر کہا اور انوجیت کے نمبر ملانے لگا۔ جلد ہی اس نے فون رسیو کر لیا۔
''کچھ پتہ چلا؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، کوئی سراغ نہیں ملا، پولیس آئی تھی اور قانونی کارروائی کر کے چلی گئی ہے۔ لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے ہیں۔ اب دیکھیں۔'' وہ جواب میں بولا۔
''اچھا، میں آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ اٹھنے لگا تو کلجیت کور بولی۔
''ناشتہ کر کے جانا، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ جائے۔''
''جی پھوپھو، جیسا آپ کہیں'' اس نے کہا تو کلجیت کور اٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔
تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ بلبیر سنگھ پنچ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اپنے گھر ہی تھا اور پنچائت گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ جسپال کے جاتے ہی وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھا اور ادھر چل دیا۔
''پنچ جی، آپ کو کوئی اندازہ ہے یہ جو اغوا ہوئی ہے لڑکی، یہ کون کر سکتا ہے؟'' جسپال نے اپنا کام شروع کر دیا
''ابھی دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔ اصل میں یہ جو لڑکیوں کے اغوا والے معاملات ہیں نا، ان میں آدھے سے زیادہ وہ ہوتے ہیں، جن میں لڑکیاں خود شامل ہوتی ہیں۔ بس لوگوں میں یہ بات مشہور نہ ہو کہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی آپس کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جرم ہو، مجھے نہیں لگتا کہ کسی کی اتنی جرات ہو گئی ہے کہ وہ ایسا جرم کرے، وہ اب پہلے والا ماحول نہیں رہا۔'' بلبیر سنگھ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''آپ کیسے یہ معلوم کر پائیں گے؟'' جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔
''دیکھو بیٹا! سیانوں کی ایک کہاوت ہے کہ جہاں جرم ہوتا ہے، سراغ بھی وہیں سے ملتا ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے دشمن کو شک کی زد میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے یہاں۔ سبھی ایسا کرتے ہیں۔ وہ یا اپنی صفائی دیتے ہیں یا پھر ایسا کوئی سراغ یا سمت دے دیتے ہیں، جس سے بات آگے چلائی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی صفائی دے دی، تو بہت حد تک یہ معاملہ صاف ہو گیا۔ اگر لڑکی کہیں دوسرے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو بھی وہیں بات کھل جاتی ہے۔ کیونکہ خود کو الزام سے بری کرنا ہوتا ہے نا ملزموں نے۔'' پنچ نے

تفصیل بتائی
''اور اگر جرم ہو تو......'' جسپال سے پوچھا۔
''تو پھر لوگ پولیس کی مدد لیتے ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو انصاف ملتا ہے۔ ایسا جرم کرنے والا اکثر ہمیشہ طاقتور بندہ ہی نکلتا ہے اور طاقت در ہاتھ نہیں آتا۔'' وہ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
اسی خاموشی میں وہ پنچائت گھر جا پہنچے۔ وہاں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر صرف کوئی قتل ہو گیا ہوتا تو شاید ایسے وقت میں یہ پنچائت نہ ہوتی بلکہ آخری رسومات کے بعد یہ سب ہوتا، لیکن چونکہ ایک لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اس لیے پنچائت بلانا لازمی تھا۔ وہاں کیا فیصلہ ہوتا، یہی سننے کے لیے جسپال بھی وہیں بیٹھ گیا۔
تقریباً ایک گھنٹہ باتیں سنتے رہنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کسی باہر ہی کے بندے کا کام ہے۔ گاؤں میں ان کے رشتے داروں ہی سے ان کی چپقلش تھی۔ انہوں نے نہ صرف صفائی دے دی تھی، بلکہ آئندہ بھی اگر ان کا کوئی جرم ثابت ہو جائے تو وہ ہر طرح کی سزا کے لیے تیار تھے۔ سبھی لوگوں کا اس پر اتفاق تھا کہ لڑکی بہت اچھی تھی، کسی نے اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی شک بھی کیا جا سکے۔ طے یہی پایا کہ پولیس سے مدد لی جائے اور خود بھی کوشش کی جائے۔
جسپال وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے بلبیر سنگھ پنچ سے بڑے مایوسانہ لہجے میں کہا۔
''یہ تو کچھ بھی نہ ہوا پنچ جی، جب تک پولیس اس لڑکی تک پہنچے گی، اس کا پتہ نہیں کیا حشر ہو جائے گا۔ وہاں ان کی دسترس ہی میں نہ رہے۔''
''اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی سراغ تو ملے جہاں کوشش کی جائے، اب جیسے ہی ملے گا، کچھ کرتے ہیں۔''
وہ دونوں اس گھر میں گئے جہاں کی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔ ادھیڑ عمر ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہن اغوا ہو گئی اور بھائی بہن کو بچاتا ہوا مارا گیا تھا۔ ان پر تو قیامت گذر گئی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ لڑکی کی ایک جگہ بات چل رہی تھی لیکن ابھی کچھ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ساتھ والے گاؤں تلونڈی بھارو میں رہتے تھے اور لڑکا اپنے کام کی غرض سے نکودر شہر میں رہتا تھا اور وہیں کسی کے پاس ملازم تھا۔ ابھی تک ان دو خاندانوں میں بات اس لیے طے نہیں ہو پائی تھی کہ لڑکے والے جہیز کا کچھ زیادہ ہی مطالبہ کر رہے تھے۔ جبکہ لڑکی اس لیے نہیں مان رہی تھی کہ اتنے لالچی لوگوں کے ہاں وہ شادی نہیں کرے گی۔ والدین کا خیال تھا کہ وہ لوگ اگر کچھ کم جہیز پر راضی ہوئے تو یہیں ہاں کر دیں گے۔ وہ کچھ دیر ان کے گھر رہے اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔
جسپال نے بلبیر سنگھ پنچ کو اس کے گھر چھوڑا ہی تھا کہ ایسے میں نوتن کور کی کال آ گئی کہ وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ جسپال کا من بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اسی دکھی من کے ساتھ گھر آ گیا۔
نوتن کور ڈرائنگ روم میں ہی تھی اس کے پاس ہرپریت بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کے سامنے کھانے پینے کو کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ جسپال ان کے پاس جا بیٹھا۔ تو نوتن کور نے ہی غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''خیر تو ہے نا جسپال، ایسے منہ کیوں بنا رکھا ہے؟''
''یار، بات ہی ایسی ہے، بہت دکھ ہو رہا ہے۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولا۔
''ایسی کیا بات ہو گئی، وہی تو پوچھ رہی ہوں؟'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو جسپال نے سارا احوال کہہ دیا۔ تو وہ بھی افسردہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت برا ہوا۔''
''وہ غریب لوگ ہیں، اگر قاتل مل بھی گئے نا، تو وہ ان کا کچھ نہیں کر پائیں گے۔'' ہرپریت نے کہا تو جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر تلخ لہجے میں پوچھا۔
''ہرپریت۔! ان قاتلوں کا پتہ تو چلے تم تو ایسے کہہ رہی ہو، جیسے تمہیں پتہ ہے کہ اس کے قاتل کون ہیں، اور کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔''
''میں مانتی ہوں کہ مجھے نہیں پتہ لیکن تم جانتے ہو کہ

ایسے جرم کون لوگ کرتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر پولیس کی بجائے ہم ان قاتلوں کی تلاش کریں تو جلدی ان تک پہنچ جائیں گے۔'' وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

''ہرپریت یہی ہے وہ ضرورت، جس کی وجہ سے ہمیں طاقت اپنے ہاتھ میں لینی ہے۔ بے شک دشمن پیدا ہوتے ہیں، لیکن طاقت کے آگے، بہت کم لوگ سر مارتے ہیں، سو دفعہ سوچتے ہیں۔ یوں بے بس نہیں ہونا پڑتا۔ بتاؤ، یہی معاملہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔ یہ جنگل ہے ہرپریت، اس میں کیسے رہنا ہے یہ اب ہمیں جانوروں ہی سے سیکھنا ہوگا۔ انسان اب مہذب نہیں رہا۔ درندہ بھی بھوک لگنے پر شکار کو نکلتا ہے، جبکہ انسانوں کی ان بستیوں میں ہر وقت صیاد گھات لگائے بیٹھا ہے، شاید ان کی بھوک مٹتی ہی نہیں۔'' جسپال جیسے ایک دم ہی سے پھٹ پڑا تھا۔

''جسپال! تم پرسکون رہو، ربّ مہراں کرے گا، تم پریشانی مت لو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر اس سے پوچھا۔ ''کیا پولیس سے تم ذاتی طور پر ملے ہو؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں ملا۔'' اس نے جواب دیا۔

''دیکھتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں۔'' نوتن نے کچھ ایسے کہا کہ جسپال کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں نے بانیتا کور کے ساتھ بڑے سکون سے ناشتہ کر کے فہیم کو فون کیا۔ میں نے یہاں آتے ہی اس اجنبی ''باس'' کا نمبر اسے دے دیا تھا کہ جس نے مجھے دھمکی لگائی تھی۔ یہ سب اسی کے لوگ تھے۔ وہ چاروں تو مر گئے۔ پولیس انہیں اٹھا کر لے گئی تھی۔ باقی دو ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میڈیا پر بہت کچھ ہوتا رہا تھا۔ جسے میں نے تھوڑا بہت سنا، پھر دھیان ہی نہیں دیا۔ فہیم سے کہا تھا کہ وہ پتہ کرے یہ کس کا نمبر ہے؟ لیکن باوجود رات گزر جانے کے وہ ابھی تک بتا نہیں پایا تھا۔ دوسری بیل پر کال

سوال

ایک سفید پوش آدمی ایک مالدار کے پاس پہنچا اور بولا ''جناب بے روزگار ہوں، روزگار دلوا دیجیے۔''

مالدار آدمی بگڑ کر بولا۔ ''ابے میں نے لوگوں کو روزگار دلانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟'' اس شخص نے نہایت عجز وانکساری سے کہا۔

''جناب میں تین روز سے بھوکا ہوں روزگار نہیں دلوا سکتے تو روٹی کے لیے ہی کچھ پیسے دیجیے۔''

مالدار آدمی اور بھی غصہ اور طیش میں آ کر کہنے لگا۔

''کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے، ہر روز تم جیسے کئی فراڈیے آتے رہتے ہیں یہاں۔'' یہ سن کر سائل نے جیب سے پستول نکالا اور کہنے لگا

''اب تو غالباً میری مالی مدد کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا......؟

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

ریسیو کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا۔

''ابھی تک اس کے بارے میں پتہ نہیں چلا، میں نے اروند اور رونیت سے بھی مدد لی، مگر پتہ نہیں چلا۔''

''کہیں ان کے پاس تو وہی کچھ نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دنیا بہت آگے چلی گئی ہوئی ہے۔ اگر یہ ٹیکنالوجی ہمارے پاس ہے تو کسی دوسرے کے پاس بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے اس کا توڑ بھی مل سکتا ہے میں نے سلمان سے بات کی ہے، وہ بھی مصروف ہے، اس نے رابطہ نہیں کیا۔ اروند بھی اسی تلاش میں ہے۔'' اس

نے مجھے پوری تفصیل بتادی۔

"اب اسے تلاش تو کرنا ہے، کیسے ہوگا، یہ تو وہی جانتے ہیں نا جو اس کے ماہر ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے امید ہے، ہم کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔" وہ اعتماد سے بولا تو میں نے اس سے کہا۔

"اوکے، میں انتظار کررہا ہوں۔"

میں نے سیل فون بند کرکے جیب میں رکھا اور اٹھ گیا۔ پھر مختصر انداز میں بانیتا کور کو بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ اس وقت منیجر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اسے بعد میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ان دو بندوں سے دلچسپی تھی۔

وہ دونوں فرش پر بندھے ہوئے چت پڑے تھے۔ میں ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ویسی ہی نفرت تھی جو میں نے رات کے وقت دیکھی تھی۔ جس نے بانیتا کور سے مار کھائی تھی، وہ ذرا بھی نادم نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا میری جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں اسی سے بات کروں گا۔ میں نے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔

"دیکھو بھئی، تمہارے باس نے مجھ سے تو رابطہ نہیں کیا اب تک، اگر تم لوگوں کو کوئی طریقہ آتا ہو تو بتاؤ؟" میرے اس سوال پر ان میں سے کوئی بھی نہیں بولا تو میں نے پھر سے اپنا سوال دہرادیا۔

"اوئے بولو۔" بانیتا کور نے ان کے پاس آکر پوچھا۔

"چلو یہ بتادو، کہ وہ کون ہے کہاں ہے، میں خود مل لیتا ہوں جاکر؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہاں اس ملک میں ہے یا کہیں دوسرے ملک میں موجود ہے۔ ہمیں تو حکم ملتا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔" دوسرے نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

"کیسے ملتا ہے حکم؟" میں نے پوچھا۔

"فون پر، وہ بھی ہمارے لیڈر کو ملتا تھا، وہ ہمیں ساری تفصیل بتاتا تھا۔" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا

"کون تھا لیڈر؟" میں نے سوال کیا

"وہ شاید مرگیا ہے۔ وہ ان چاروں میں سے ایک تھا جو اوپر تم دونوں کے پاس گئے تھے۔" دوسرے نے کہا ہی تھا اور میں مزید کہنے لگا تھا کہ میرا سیل فون بج گیا۔ میں اسکرین پر دیکھا تو ایک دم سے مسکرادیا، پھر کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کردیا، اس کی ہیلو کمرے میں گونج گئی تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ، ابھی تمہارے بندوں کے ساتھ، تمہارا ہی ذکر کررہا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہاں گیا وہ چوہا، کس بل میں ہے، دھمکی دے کر غائب ہوگیا ہے۔"

میرے کہنے پر وہ مجھ سے بھی اونچا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"میں کہیں بھی نہیں ہوں اور تمہارے بالکل قریب ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی تمہیں ابھی کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ بہت لمبا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں جمال، تو ابھی سے مجھے تلاش کرنے لگ گئے ہو۔ ابھی تو میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم، اگر تم اتنے ہی طاقتور ہو تو میرے سامنے آؤ، پھر چاہے جتنی مرضی لمبی اننگز چلے، میں کھیلوں گا۔ ورنہ میں نے تمہیں تلاش کرلیا تو تمہارا کھیل ختم کردوں گا۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

"نہیں ایسے نہیں جمال...... جب میں کھیلنے کا کہہ رہا ہوں تو آؤ...... کھیلو۔ جیت ہار کے بغیر کھیل کیسے ختم ہوسکتا ہے اور ہاں...... اگر میں ہار گیا تو خود اپنا آپ تیرے حوالے کردوں گا اور...... اگر جیت گیا تو تجھے مرنا ہوگا۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم کھیلنا چاہتے ہو تو کھیلو، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا، پھر فیصلہ میں کروں گا اور ہاں دھوکے سے اور چھپ کر وار مرد نہیں کرتا۔" میں نے اس سے تضحیک آمیز لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"یہ فلسفے چھوڑ دو اور آج کی حقیقت والی بات کرو۔"

"اب ملے ہیں تو باتیں ہوتی رہیں گی۔ خیر ہمت ہے تو اپنے دو بندے لے جاؤ، میرے پاس بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ بے چاروں نے بہت مار کھائی ہے۔ وہی بندے جنہیں تو نے میرے لیے بھیجا تھا تاکہ وہ مجھے پکڑ کر تیرے پاس لے آئیں، بے چارے۔" میں نے افسوس ناک انداز میں کہا۔

"او چھوڑو جمال، ایسے کیڑے مکوڑے پتہ نہیں کتنے روزانہ کاکروچ کی طرح مرتے ہیں، دو بلٹ ان کے دماغ میں اُتارو، وہ بھی میری طرف سے، کیونکہ ایسے لوگوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، وعدہ رہا کہ ان کے مرنے کے عوض میں تمہارے چار بندوں کی جان بخش دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔

"چلو انتظار کرو میرا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون واپس جیب میں رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ فطری طور پر ان کے چہرے مایوسانہ حد تک مسخ ہو گئے تھے۔

"تمہارا باس بہت چالاک ہے، کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کو مار دوں۔ اس کی بات مانوں گا تو بھی اسی کا فائدہ اور زندہ چھوڑ دوں گا تو بھی وہی فائدے میں رہے گا، کیسا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جو تمہارا دل چاہے۔" دوسرا مردہ لہجے میں بولا اور اس نے اپنا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ میں اٹھا اور بانیتا کو باہر جانے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ سامنے ہی طارق نذیر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ چھپاتے اور تھوڑا بتاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے انہیں کسی جیل میں رکھوا دیا جائے۔ بعد میں دیکھیں گے۔"

"اور وہ منیجر، اس کا کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اگر آج کوئی بات بتاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ اسے بھی ان کی طرح جیل میں رکھوا دو اور یہ پتہ کرو کہ اس کا بیٹا واقعی ہی اغوا ہوا تھا یا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"میں نے پتہ کیا تھا۔ وہ اغوا تو ہوا تھا، اور اب بھی ......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رکا، پھر بولا۔ "نہیں، میں پھر سے دیکھتا ہوں۔"

"گڈ بوائے، اچھی طرح دیکھنا، مجھے کچھ اور ہی دکھائی دے رہا ہے فی الحال۔" میں نے کہا اور بانیتا کور کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔

میں ٹاؤن والے نئے گھر میں جب پہنچا تو وہاں سکوت تھا۔ وہ باس میرے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ مجھے جانتا بھی تھا، میرے قریب بھی تھا، میری انتہائی احتیاط کے باوجود مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ تجسس ہی بہت زیادہ تھا کہ وہ کون تھا؟ اس پردہ میرے اتنے قریب تھا کہ میرے بارے میں جان لیتا تھا۔ یہ کیسے؟

اس وقت بانیتا کور نیچے فہیم اور مہوش کے پاس چلی گئی تھی۔ باقی سب بھی یہیں موجود تھے۔ میں کمرے میں تنہا تھا۔ میں اس باس کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، میرا ذہن اسی قدر بکھر جاتا۔ میں اس بارے میں سب سے بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس وقت وہ سارے ہی باس کا نمبر اور اس کی لوکیشن تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس طرح مجھے کارخانے کے مالک زوہیب کے بارے میں پتہ چلا تھا، ویسی ہی توجہ لگا کر دیکھوں۔

میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بیڈ سے نیچے قالین پر آ بیٹھا۔ میں نے پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ وہ کون ہے اور میرے بارے میں کیسے جان لیتا ہے۔ چند لمحوں ہی میں میرے دماغ سے ساری سوچیں ہٹ گئیں۔ میں نے خود کو خلا میں محسوس کیا۔ میری بند آنکھوں کے سامنے بننے والے دائرے ختم ہو گئے اور وہاں پر اس طرح رنگ پھیلنے لگے، جیسے کئی لوگ ان رنگوں کو اُڑا رہے ہوں۔ وہ لوگ تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن مختلف رنگ اُڑتے اور فضا میں جا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے۔ وہ رنگ مختلف بادلوں کی صورت اختیار کر

جاتے۔ جب بھی وہ بادل ہٹتے تو ان میں سے مجھے ایک شہر کا منظر نظر آتا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں فضا میں ہوں یا ہوائی جہاز میں بیٹھا نیچے کسی شہر کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ایک سڑک پر جا گرا۔ میرے اردگرد بہت سارے لوگ آجا رہے تھے۔ ہر بندے کا اپنا رنگ تھا۔ میں نے اپنے رنگ پر غور کیا تو میرا رنگ بھی مختلف تھا۔ مجھے وہ نیلا اور ارغوانی کا ملا جلا لگا۔ وہ مجھے دھواں کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جو اوپر کی جانب اٹھ جاتا تھا۔ میں جس بندے کو بھی دیکھتا، وہ بھی دھوئیں کی مانند تھا۔ وہ دھواں بھی اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔ اچانک وہ منظر ہٹ گیا۔ ایک معمول کی زندگی میرے سامنے تھی اور پھر وہ منظر بھی ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ میں آگیا۔ دروازے میں گیت کھڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے، تم ایسے قالین پر کیا کر رہے ہو؟''

''میں بہت تھک گیا تھا، یہ جسم کو سکون دینے کی ایک مشق ہے، وہ کر رہا تھا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر سکون سے کہا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر آگئی۔ میں اُٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے ان سب کی کوششوں کے بارے میں بتاتی رہی اور میرا ذہن ان مناظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، جو میں کچھ لمحے پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کیا تھا، مجھے اس کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں نے ان مناظر کو سمجھنا کچھ دیر کے لیے موقوف کیا اور گیت کی بات سمجھنے لگا

''میں نہیں سمجھتی کہ اب میں اس جگہ پر اپنا پروڈکشن ہاؤس چلا پاؤں گی۔ وہ جگہ اب غیر محفوظ ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو کیا خیال ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں واپس کراچی چلی جاتی ہوں۔ وہیں پر کام کرتی ہوں۔'' اس نے اپنا خیال بتایا

''تو اس کا مطلب ہے، باقی کچھ لوگ بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، مجھے ان کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ ان کے بغیر تو کام نہیں چلے گا، لیکن سارے تو نہیں جائیں گے۔ ہاں جنید اور علی نواز کو تم اپنے پاس رکھ لو۔'' اس نے مشورہ دیا

''نہیں، تم انہیں بھی لے جاؤ۔ اپنا سیٹ اپ بنا لو۔ پھر اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، اس وقت پتہ نہیں کیا صورت حال ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اپنا سیٹ اپ دوبئی میں بنانا ہے۔ یہ سب تو نہیں جاسکیں گے نا وہاں پر۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''لیکن تم دوبئی میں تو نہیں رہو گی نا، کراچی تو آنا ہوگا، ان لوگوں کی تمہیں وہاں ضرورت ہوگی اور پھر تم سب سے میرا رابطہ رہے گا۔ جب بھی اور جس کی مجھے ضرورت ہوگی، میں بلا لوں گا۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیں، یہاں پر آپ کا کام چل جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔ تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں، بلکہ میں اب کہوں گا کہ تم سب لوگ جاؤ، ممکن ہے میں بھی وہیں کراچی آجاؤں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تیرے پیچھے پیچھے دوبئی چلا آؤں۔''

میری اس بات وہ مسکرا دی۔ پھر خوشگوار لہجے میں بولی۔

''چلیں، یہ تو اچھا ہوگا کہ تم وہاں آجاؤ، کچھ دن سکون سے کٹ جائیں گے۔ پھر پوری پوری پلاننگ کے ساتھ نیا کام شروع کریں گے۔''

''اوکے، جیسا تم چاہو۔'' میں نے اطمینان سے کہہ دیا۔ میں اس سے مزید بحث نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد وہ جانے کو تیار ہوگئی۔

دوپہر تک وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ انہیں ایک نجی کمپنی کی فلائیٹ سے سیٹیں مل گئیں۔ وہ بھی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ دارے نے ان سب کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ وہ سب نے مل کر کھایا اور پھر وہ سب نکل گئے۔

اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں اور بانیتا کورلان

میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان سب کے جانے پر ہلکا سا جدائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں انہی کی باتیں یاد کرتے ہوئے اس بتا رہا تھا کہ کتنا اچھا وقت ان سب کے ساتھ گذرا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اداس ہو رہے ہو۔'' بانیتا کور نے پرشوق نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ساتھ چاہے چند دن کا ہو، احساس تو ہوتا ہے نا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سچی، بتانا، مجھے اسی طرح یاد کیا تھا۔ جب تم پہلی بار امرتسر سے آئے تھے؟'' اس نے اسی طرح پرشوق نگاہوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ ایمانداری سے بتاؤں گا۔ تم مجھے بہت عرصہ تک یاد آتی رہی ہو۔ تب تک ہم دوبارہ نہیں مل گئے۔'' میں نے پوری سچائی سے بتایا تو اس کی آنکھیں تک مسکرا دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میرے سیل فون پر چوہدری اشفاق کے نمبر جگمگانے لگے۔ میں نے کال رسیو کی تو وہ سکون سے بولا۔

''یار۔! کوئی نورنگر آنے کا ارادہ ہے؟''

''کیا ہوا، کوئی خاص کام؟'' میں نے پوچھا۔

''خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ جو ملنگ اور جوگی رام لعل تم یہاں چھوڑ گئے تھے، وہ اب بھی یہیں ہیں۔ میں نے ان میں تو کوئی خاص بات نہیں دیکھی، لیکن چند دنوں سے ان کے پاس کچھ لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ بندے مجھے مشکوک لگتے ہیں۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور دوسری ہلچل تو نہیں ہے علاقے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن میرا دماغ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں میں کوئی گڑ بڑ ہے۔'' اس نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کر لیا۔

''ٹھیک ہے، میں چکر لگاتا ہوں۔ تم ان لوگوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے رکھو۔ دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ فون رکھ کر میں نے بانیتا کور کو اس جوگی اور ملنگ کا قصہ سنانے لگا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ پھر ایک دم سے بولی۔

''چل یار۔! اُدھر تیرے نورنگر ہی چلتے ہیں۔ ایک دو دن ادھر گذار کے آتے ہیں۔ تب تک کوئی بات سمجھ میں آ جائے گی، اس باس کے حوالے سے۔'' بانیتا کور نے یاد دلایا تو مجھے کچھ گھنٹے پہلے کا منظر یاد آ گیا جو میں نے مراقبہ کی سی کیفیت میں دیکھا تھا۔ ایک بار تو میرا دل کیا کہ میں وہ منظر بانیتا کور کے ساتھ شیئر کروں، پھر ایک دم سے ارادہ بدل دیا۔ جب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تو پھر اس کے ساتھ دماغ ہی کھپانا ہے۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چل اٹھ پھر تیار ہو جا، چلیں۔''

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ گئی۔

میں نے اپنے ساتھ دارے کو بھی تیار کر لیا۔ نجانے کب کا وہ نورنگر نہیں گیا تھا۔ میں نے دارے کو چلنے کا کہہ دیا تو وہ دوسرے ملازم بھی مچل گئے، وہ میاں بیوی، کب کے یہاں آئے ہوئے تھے۔

''اچھا، پھر تم لوگ ایسا کرو۔ ان دونوں بزرگوں کو بھی ساتھ لے لو، انہیں بھی اپنے ساتھ نورنگر لے جاؤ۔ جتنے دن رہنا ہوگا، رہو۔ ان بزرگوں کو چاہے حویلی میں چھوڑ دینا۔ ایک ہفتہ تک تم لوگ خوب گھوم پھر لو۔ ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو سبھی خوش ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ایک دو دن نورنگر رہ آؤں گا پھر اماں کے ساتھ وقت گذاروں گا۔ بانیتا کور بھی ساتھ آ جائے گی۔

''ٹھیک ہے، ہم پھر وہ فور وہیل گاڑی لے جاتے ہیں۔'' دارے نے تیزی سے اجازت چاہی۔

''چل لے جا۔ ہم آ جائیں گے۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر واپس آیا تو بانیتا کور بالکل بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور بالکل کوئی پنجاب کی مٹیار دکھائی دے رہی تھی

''یہ کپڑے کہاں سے لیے؟''

"میں نے اور گیت نے خریدے تھے۔ باقی میں نے کافی کپڑے رکھ لیے ہیں۔ کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے میری طرف دیکھ کر مصنوعی شرماہٹ سے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔

"اچھا چلو، نکلو، مجھے چوہدری اشفاق کے لیے کچھ چیزیں بھی خریدنی ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے قریب پڑے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو! میں تیار ہوں، چلو" اس نے کہا تو میں نکل پڑا۔ میرا اُرخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

"کیا خریدنا ہے اس کے لیے؟" بانیتا کور نے یونہی پوچھ لیا تو میں نے ہنستے ہوئے بتایا

"پچھلی بار جب میں نور نگر گیا تھا تو چوہدری اشفاق نے بڑے مان سے ایک بات کہی تھی۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"کہنے لگا کہ چھاکے سے مجھے چوہدری اشفاق تو بنا دیا ہے۔ اب میرا رکھ رکھاؤ بھی ایسا ہونا چاہئے۔ اب آؤ تو شہر سے کپڑے، پرفیوم، اور وہ ساری چیزیں لے کر آنا جس سے بندے کی ٹہور ٹہور بنے۔ بس اس کی ٹہور ٹہور کا سامان لینا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا۔ تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یار یہ تعلق، یہ رشتے یہ ناتے، جن پر مان ہوتا ہے، جنہیں ہم اپنا کہہ سکتے ہیں، ان کے لیے کچھ کرتے وقت کتنا اچھا لگتا ہے۔" وہ بڑی ادا سے بولی۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا تو ہم ایسے ہی باتیں کرتے ہوئے مارکیٹ جا پہنچے۔

تقریباً دو گھنٹے تک یونہی جو سمجھ میں آیا اس کے لیے خریدتے رہے۔ ہمیں شاپنگ کرتے ہوئے کوئی دیکھتا تو بلاشبہ ہمیں اناڑی کہتا۔ اسی دوران گیت کا فون آ گیا کہ وہ لوگ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ ابھی ائیر پورٹ سے نکل رہے ہیں۔ ہم شاپنگ بیگز سے لدے واپس گاڑی تک آئے۔ میں نے اپنا سامان بانیتا کور کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سامان کے اوپر رکھ دیا اور چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بانیتا کور نے وہ سارا سامان جلدی سے پچھلی سیٹ پر رکھا، جو رکھتے ہی بکھر گیا۔ سب سے اوپر کچھ پرفیوم کی بوتلیں تھیں۔ وہ جو گریں تو ان میں سے دو ٹوٹ گئیں۔ کار میں تیز مہک پھیل گئی۔

"اوہ۔ ! یہ کیا ہوا یار۔" وہ جھنجلاتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں ہوا، پرفیوم ضائع ہو گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ پلٹتے ہوئے بولی۔

"میں نئے لیکر آتی ہوں، بس ایک منٹ ٹھہرو۔"

"چلو آ جاؤ، کچھ اور بھی ہیں۔" میں نے کہا تو میری بات سنی ان سنی کرتی ہوئی وہ دکان میں گھس گئی۔ میں نے وہ دونوں بوتلیں اٹھائیں تاکہ انہیں باہر پھینک دوں اور ان کی تیز مہک سے نجات ملے۔ میں نے جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی بوتلیں اٹھائیں، ان میں پڑا ہوا پرفیوم میری کپڑوں پر گر گیا۔ میں نے وہ بوتلیں باہر پھینک دیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے دروازے کھول دیئے تاکہ وہ مہک ختم ہو جائے۔ پانچ منٹ کے دوران بانیتا کور پلٹ آئی۔ اس نے دو کی بجائے چار بوتلیں خرید لی تھیں، وہ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیں اور ہم چل پڑے۔

"ہم جدھر سے گزرتے جائیں، ادھر سے خوشبو بکھرتی چلی جائے گی۔" بانیتا کور نے کہا اور بچوں کی طرح ہنس دی۔ جبکہ مجھے وہ مہک اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس وقت ہم شہر ہی میں تھے۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے کہا۔

"یار کھانا نہ کھا لیں۔ یہاں سے نور نگر کا فاصلہ چار اور پانچ گھنٹوں کا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا، رستے میں کچھ دیکھ لیں گے یا وہیں چل کر کھائیں گے۔"

اس نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد میں پیٹرول لینے کے لیے ایک فلنگ اسٹیشن پر رکا۔ وہیں ایک ہوٹل بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی بانیتا کور نے کہا۔

"ارے یہاں تو ڈھابہ بھی ہے، یہیں سے کچھ کھا لی

نا لیں؟"

"یہاں سے کھا لیتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ اتر گئی۔ میں نے پیٹرول لیا اور ایک جانب کار پارک کر کے اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہاں رش خاصا کم تھا۔ شاید رات کا پہلا پہر تھا۔ اس لیے ٹرک اور دوسری گاڑیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ہم نے بڑے سکون سے کھانا کھایا۔ اس وقت چائے پیتے ہوئے بانیتا کور خاموش تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ کی۔ اسی باس کا فون تھا۔ میں کال رسیو کر لی۔

"ہیلو۔!" میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"کہاں ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو مجھے اچانک اس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ اس کا تو یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہر وقت میرے قریب ہے، یہ اب کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے ایک لمحہ میں سوچا اور جواب دیا

"اپنے گھر میں ہوں۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے پوری طرح یہ احساس کر لیا کہ اس کے لہجے میں وہ پہلے والی خوشگواریت نہیں تھی۔

"تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔" میں نے گول مول جواب دیا

"میں اس لیے یقین نہیں کر سکتا کہ ابھی چند منٹ پہلے میرے لوگوں نے تمہارے ٹاؤن والے گھر کو لانچروں سے اڑایا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم وہاں ہو اور بچ گئے ہو۔" وہ تیزی سے بولا تو میں نے مزید اسے تپاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نے بموں سے گھر کو اڑا دیا ہو گا لیکن میں تو گھر میں ہوں۔ اور تم سے بات کر رہا ہوں اور پھر میرے مرنے کی خبر مجھے سنا رہے ہو، حیرت ہے۔ ابھی تو ہم نے کافی لمبی اننگز کھیلنی تھی۔ اپنے دعدے سے بھی مکر گئے ہو۔ مجھے مار کر۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔

"تم اپنے گھر میں نہیں ہو۔" اس نے غصے میں کہا تو اس کے لہجے میں بے بسی صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔

"میں اپنے گھر میں ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ جاؤ اور پھر تمہارا دعویٰ کدھر گیا کہ تم ہر وقت مجھ تک پہنچ سکتے ہو، میرے قریب ہو اور......" میں نے اسے مزید غصہ دلاتے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ بانیتا کور میری باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے انتہائی اختصار سے اسے بتایا تو وہ بولی۔

"پہلے پتہ تو کر لو، گھر کا؟"

ارد گرد کے کسی بندے کا فون میرے پاس نہیں تھا۔ میرے پاس اس سیکورٹی گارڈ کا نمبر بھی نہیں تھا۔ وہ دارے کے پاس تھا۔ میں نے دارے کو فون کرنے کا سوچا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

"او جمال، جس گھر سے ہم آئے ہیں، کسی نے وہاں راکٹ لانچر اور بم مار کر پورے گھر کو اڑا دیا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے پولیس والوں نے۔" اس نے تیزی سے بتایا

"سیکورٹی گارڈ کہاں تھا؟ وہ وہاں پر اس لیے کھڑا رہا کہ لوگ آئیں اور بم مار کر چلے جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے بھی پوچھا تھا پولیس والوں سے، انہوں نے بتایا کہ وہ شدید زخمی ہے اور اسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے، انہوں نے آتے ہی اسے گولیاں ماری تھیں۔" اس نے تیزی سے بتایا

"تم کہاں پر ہو؟ اور پولیس والوں کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی نور نگر پہنچا ہی ہوں اور انہیں بھی یہی بتایا ہے۔" اس نے بتایا

"ٹھیک ہے میں کرتا ہوں کچھ۔" میں نے کہا اور چند لمحے سوچ کر طارق نذیر کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورت حال بتا کر کہا۔

"اسے دیکھ لینا، اب ہم نے وہاں واپس نہیں جانا،

سیکورٹی گارڈ کا ہر ممکن خیال کرنا۔"
"آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔" اس نے کہا تو مجھے خیال آیا۔
"اور ہاں۔ وہ منیجر کے بیٹے کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"
"آپ نے درست ٹریک دیا تھا۔ مجھے تھوڑا پتہ چلا ہے، تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"او کے۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ ہم نے کپ وہیں رکھے۔ بل دیا اور کار میں آبیٹھے۔
میرے سامنے سوالیہ نشان تھا۔ اس باس کا دعویٰ بالکل غلط تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اصل میں وہ مجھ تک نہیں پہنچ پاتا تھا صرف اپنی ذہانت سے مجھے چکر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اگر وہ درست تھا تو اس بار وہ دھوکا کیسے کھا گیا؟ میں اور بانیتا اسی بارے میں باتیں کرتے ہوئے سفر کرتے چلے گئے۔ یہ معمہ حل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ نور نگر آ گیا۔
ہم نور نگر پہنچ گئے۔ تمام راستے میرا طارق سے رابطہ رہا۔ وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتا رہا۔ بانیتا کور پہلی بار یہاں آئی تھی۔ جیسے ہی ہم حویلی کے گیٹ پر آئے، چوہدری اشفاق سامنے آ گیا۔ گیٹ کھل گیا۔ میں نے جب تک کار پورچ میں روکی تب تک چوہدری اشفاق ہمارے قریب آ گیا۔
"جی آیاں نوں بانیتا۔" اس نے پورے خلوص سے کہا۔
"بہت مہربانی چوہدری اشفاق، لو میں تمہارے لیے کچھ لائی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کار سے شاپنگ بیگ نکالنے لگی۔ تبھی چوہدری اشفاق نے پوچھا۔
"یار اتنا تیز پرفیوم، تو نے پہلے کبھی نہیں لگایا تھا، یہ کیوں؟"
"یہ تیرے لیے لائی ہوئی ایک پرفیوم کی شیشی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ مجھ پر گر گئی۔ ابھی کپڑے بدلتا ہوں۔ یہ مہک چلی جائے گی۔" میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔

تبھی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، اب یہاں نہ ماں تھی اور نہ سوہنی۔ مجھے یوں لگا جیسے ساری حویلی ہی ویران ہو۔ میں چلتے ہوئے ڈرائینگ روم میں جا بیٹھا پیچھے ہی وہ دونوں آ گئے۔ حویلی کے ملازمین کو پتہ چل گیا تھا کہ میں آ گیا ہوں۔ وہ آنے لگے۔ چوہدری اشفاق نے کھانا لگانے کا کہا تو بانیتا کور نے بتایا کہ ہم ایک ڈھابہ ہوٹل سے کھا آئے ہیں، چائے وغیرہ پی جا سکتی ہے۔ وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ باس کی کال آ گئی۔
"تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے ہو، ورنہ آج تمہارا کام ختم ہو جانے والا تھا۔" اس نے غصے اور مایوسی ملے لہجے میں یوں کہا جیسے اسے بری شکست ہو چکی ہو۔
"دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، اپنی بات پر قائم رہنے والے نہیں ہو۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو کافی بے غیرت قسم کے ہوں۔ چھپ کر وار کرنے والا بے غیرت ہی تو ہوتا ہے، جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، لہٰذا، اگر مجھ سے دشمنی لینی ہی ہے تو مردانگی دکھاؤ، ہیجڑوں سے میں نہیں لڑتا۔" میں نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔
"تم مجھے ایسے اشتعال نہیں دلا سکتے ہو، میں چاہوں تو ابھی تمہیں ختم کر سکتا ہوں، لیکن میں تم سے کھیل......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔
"بکواس بند کرو، اور اگر ہمت ہے تو میں لاہور کے مال روڈ پر، ایک ریستوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں۔ ایک گھنٹے کی تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ مجھے تلاش کر لو، میرا وعدہ ہے میں خود کو تیرے حوالے کر دوں گا اور نہ تلاش کر سکے، تو تم اپنی شکست مانتے ہوئے خود اپنے آپ کو میرے حوالے کر دینا، کیسا ہے یہ کھیل؟ آؤ، اب میں تمہارے ساتھ کھیلتا ہوں۔"
"میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو، تم زیادہ دیر تک میری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے ہو۔" اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں چونک گیا۔ کیا اس وقت میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوں؟ جیسے ہی مجھے یہ

خیال آیا تو میں چونک گیا۔

"اب بھاگو مت، آؤ، مجھے پکڑو، تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کس جگہ پر ہوں؟" میں نے کہا تو وہ خاموش رہا تب میں بولا۔ "حملہ کر کے بھاگ جانے والوں کے باپ کا پتہ نہیں ہوتا، دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، بے غیرت اور منافق اور یہ اپنے باپ کے نہیں ہوتے، ہار جانے کا اعلان کرو اور خود کو میرے حوالے کرو، یا پھر مجھے آ کر پکڑ لو، مزاحمت نہیں کروں گا۔ کہو منظور ہے؟"

اس نے جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے تھوڑا بہت سمجھ آنے لگی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک خاص دوست کو فون کیا اور اسے سمجھاتے ہوئے اس ریستوران کے بارے میں بتایا اور اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں بعد رابطہ کروں گا۔

☆......☆......☆

دو پہر کے بعد ہی کا وقت تھا جب نوتن کور اور جسپال کھیتوں کی طرف نکل گئے تھے۔ سامنے سر سبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صاف اور شفاف ہوا، جسے سینے میں اتارتے ہوئے بھی سکون ملتا تھا۔ اصل میں وہ اسی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔

"نوتن کور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ جرم کس نے کیا ہے؟" اس نے بات بڑھائی

"جہاں تک میں نے اب تک سنی ہوئی بات پر تجزیہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فقط لڑکی ہی اغوا کرنے آئے تھے۔ درمیان میں بھائی آیا تو وہ قتل ہو گیا۔ اگر ہم دونوں جرائم کو ساتھ ملا کر سوچیں گے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ صرف لڑکی کے اغوا کو سامنے رکھیں گے تو کوئی سراغ ہاتھ لگنے کا امکان ہو سکتا ہے۔" نوتن نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی رائے دی تو اس نے پوچھا۔

"تمہاری اس رائے دینے کی وجہ یا بنیاد کیا ہے؟"

"کیونکہ اغوا ایک سنگین جرم تو ہے ہی، اس پر قتل ہو جانا سنگین تر ہو گیا۔ اب مجرموں کے لیے اغوا کا معاملہ بہت چھوٹا ہو گیا۔ وہ اصل میں قتل کو چھپائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکی کو بھی......" یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ پھر دکھی لہجے میں بولی۔ "سوان وجوہات پر نگاہ رکھی جائے، جن کی وجہ سے وہ لڑکی اغوا ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے، قاتل خود بخود واضح ہو جائیں گے۔" اس نے اپنی بات کہہ دی۔

"تو یہ ابتدا کہاں سے کریں؟" جسپال نے پوچھا

"دو جگہیں ہیں، ایک تھانہ اور دوسرا اسی لڑکی کی کوئی سہیلی، ان سے بات آگے بڑھے گی۔"

"جہاں تک تھانے کا معاملہ ہے اگر انسپکٹر نے بات چھپانا چاہی تو وہ کبھی بھی ہمیں اصل بات نہیں بتائے گا اور اگر......" جسپال نے کہنا چاہا تو نوتن بولی۔

"پریشان مت ہو، ابھی کچھ دیر میں پتہ چل جائے گا۔ میں نے گرلین کور سے کہا ہے۔ وہ اسی انسپکٹر کے سیل فون کو ٹریس کر رہی ہے۔ ان دو دنوں میں اس کا جس سے سب سے زیادہ رابطہ ہوا ہے، وہ سامنے آ جائے گا، اسے دیکھ لیتے ہیں۔"

"اور وہ سہیلی والا معاملہ؟" جسپال نے پوچھا۔

"وہ دوسرا آپشن ہے، وہ میں اور ہرپریت دیکھ لیں گے۔" اس نے سکون سے کہا اور دور کہیں دیکھنے لگی۔

"میں کروں اس سے بات؟" جسپال نے بے تابی سے کہا۔

"کر لو، مگر وہ ذمہ دار لڑکی ہے، اپنا کام کر رہی ہوگی، مطمئن ہو کر ہی فون کرے گی۔" نوتن نے کہا۔

"ویسے یہ سلمان نے ہمیں جو سیل فون دے دیئے ہیں نا، یہ بھی کمال کی چیز ہے، کہیں ٹریس نہیں ہوتا۔ ورنہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہوتے۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہیں تو سہی، لیکن کب تک، میں سوچ رہی تھی جس دن اس سے بھی بڑھ کر کوئی ٹیکنالوجی آ گئی، یا سوفٹ ویئر مارکیٹ میں آ گیا، تب کیا ہوگا، ہمیں شاید پتہ بھی نہ چلے۔" نوتن کور نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور تھوڑے سے فاصلے پر موجود ٹیوب ویل کی جانب بڑھ گئی۔ جسپال بھی

اس کے ساتھ چل دیا۔

انہیں وہاں کھڑے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گرلین کور کا فون آ گیا۔ اس نے بات کی تو اس نے فون جسپال کی جانب بڑھا دیا۔ جسپال نے فون پکڑا اور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں گرلین کور! کیا بنا پھر؟"

"جسپال ویرے ایک ہی نمبر ہے، وہ بھی نکودر سے ہے۔ ان پر باتیں ہوئی ہیں۔ اس بارے میں جتنی بھی تفصیلات مجھے ملی ہے، وہ میں نے میل کر دی ہے۔ وہ دیکھ لیں، اگر وہ آپ کے کام کی ہوئی تو۔" وہ چہکی۔

"ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔" جسپال نے کہا اور چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ کھیتوں میں نہ ٹھہر سکے فوراً ہی واپس گھر پلٹ آئے۔ اس نے راستے ہی میں ہرپریت سے کہہ دیا تھا کہ لیپ ٹاپ کھول لے۔ دس منٹ میں جب وہ ڈرائنگ روم میں آئے تو وہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ جسپال نے اپنا ای میل بکس کھولا اور گرلین کی میل دیکھی۔ اس میں دیئے گئے نمبر کے آگے گجندر سنگھ لکھا ہوا تھا۔ کس وقت کتنی دیر کی کال ہوئی، یہ بھی درج تھا۔

"وہ لڑکی کتنے بجے اغوا ہوئی تھی؟" نوتن نے پوچھا تو ہرپریت تیزی سے بولی۔ "یہی کوئی رات کے دو بجے ہوں گے، یہی وقت بتایا تھا انہوں نے۔"

اور یہ دیکھو جسپال۔" نوتن نے ایک وقت کے دورانیہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ، ایک گھنٹے بعد کال ہوئی ہے اور پھر مسلسل صبح تک وقفے وقفے سے کال ہوتی رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ گجندر سنگھ کون ہے؟ یہ ساتھ میں اس کا پتہ بھی ہے۔"

"نام تو سنا سنا لگ رہا ہے۔" ہرپریت نے کہا پھر ایک دم چونک کر بولی۔ "ارے یہ وہی تو نہیں ہماری مخالف پارٹی کا سیاست دان۔ میرا خیال ہے یہ الیکشن بھی لڑ رہا ہے؟"

"اگر وہی ہے تو، بہت مشکل درپیش ہو سکتی ہے۔" نوتن کور نے مایوسی سے کہا اور اٹھ کر دوسرے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیا مشکل ہو گی؟" جسپال نے پوچھا۔

"اب اس میں پارٹیاں آ جائیں گی، جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں رہے گی، میں کہتی ہوں کہ یہ نہ ہو۔" وہ پھر مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" جسپال نے کہا اور انوجیت کا فون ملانے لگا، کچھ ہی دیر بعد مل گیا تو اس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہو؟"

"میں ادھر ہوں میلان پور میں، ادھر ایک جلسہ ہے اور کچھ لوگوں سے ملنا بھی ہے۔" اس نے تفصیل بتا دی

"مجھے یہ بتاؤ، نکودر میں گجندر سنگھ کون ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"وہی، جو ہمارے مخالف الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا ہے، وہ ہماری تیسری بڑی مخالف پارٹی ہے۔ اگر ہم نہ ہوں تو وہ الیکشن جیت سکتا ہے۔"

"کیسا بندہ ہے وہ؟" اس نے پوچھا۔

"اچھا نہیں ہے، جرائم پیشہ ہے، لوگ اس کے شر سے اس کی عزت کرتے ہیں، کیوں کیا ہوا؟" انوجیت نے پوچھا تو اس نے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ وہ اغوا ہونے والی لڑکی، اس ہی کی کارستانی ہے۔"

"ممکن ہے، لیکن اسے ثابت کرنا اور ثابت ہو جانے پر لڑکی کا برآمد کرنا بہت ہی مشکل ہے، یوں کہہ لیں شیر کے منہ سے نوالا کھینچنا، کیونکہ وہ ایک قتل بھی اس کے ساتھ کروا چکا ہے۔ اگر یہ سب ہو بھی جائے تو وہ کون سا اس نے کیا ہو گا۔ ایسے....." اس نے مزید کہنا چاہا تو جسپال نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھ لوں گا، تم اپنا کام جاری رکھو۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ہرپریت کی طرف دیکھ کر بولا۔ "جوتی سے کہو، چائے ہی پلا دے۔"

’’میں کہتی ہوں۔‘‘ ہرپریت نے کہا اور اٹھ گئی۔
وہ چند قدم دور گئی ہوگی کہ نوتن نے جسپال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
’’کیا ہرپریت کور کو اپنے نئے گروپ کے بارے میں نہیں پتہ یا......؟‘‘
’’نہیں اور اس کے بارے میں ابھی اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، راز جس قدر اپنے درمیان میں رہے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اسی لیے محتاط تھا۔‘‘ جسپال نے اسے سمجھایا۔
’’تو پھر تمہیں کسی طور بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتی ہوں سب، شام تک اس بارے پتہ چل جائے گا کہ وہ لڑکی اس گجندر کے پاس ہے کہ نہیں۔‘‘ نوتن نے حوصلہ افزاء لہجے میں کہا۔
’’کیا کرو گی، انہیں بتاؤ گی۔ کیا وہ سب اتنی جلدی آ جائیں گے؟‘‘ جسپال نے پوچھا۔
’’ادئے میں نے اسی وقت ان سب کو بتا دیا تھا، جب یہاں میں نے یہ بات سنی تھی۔ دراصل رات میری بلدیو سنگھ سے بات ہوئی تھی۔ بچن کور تو بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔‘‘
’’بچن کور، وہ کیوں...... مطلب؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’یہ تو ان کے پاس جا کر پتہ چلے گا نا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر کہتی چلی گئی، ’’میں نے انوجیت کے الیکشن کے بارے میں بلدیو سنگھ بتایا تو وہ بہت زیادہ پرجوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہے، ہمارا کوئی بندہ تو ہوگا پارلیمنٹ میں۔ وہ یہی پلان کر رہا تھا کہ اسے جتوانا کیسے ہے۔ اسی لیے وہ آج دوپہر سے پہلے ہی نکودر میں آ گئے ہوئے ہیں۔ ابھی میں انہی کے پاس چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں اب تک وہ کوئی نہ کوئی کام تو کر ہی چکے ہوں گے۔‘‘ نوتن نے بتایا تو جسپال نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
’’وہ کیا کریں گے یہاں؟‘‘
’’تجھے یہاں بھارت میں الیکشن اور سیاست دانوں کا نہیں پتہ۔ یہاں جمہوریت کم اور ڈرامے بازی زیادہ ہے۔ ساری پارلیمنٹ کو دیکھ لو، اس میں کتنے لوگ ہیں جو صاف ستھرے ہوں گے، ان میں زیادہ تر لوگ اپنے اپنے علاقے کے غنڈے اور بدمعاش ہیں۔ جرائم پیشہ ہیں، اپنے کالے دھندوں کو تحفظ دینے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے الیکشن جیتنا اور ہر حال میں جیتنا زندگی اور موت سے بڑھ کر کھیل ہوتا ہے۔ جس طرح انوجیت نے بتایا ہے کہ گجندر کون ہے؟ اس سے لگتا نہیں کہ وہ کیسا بندہ ہوگا۔ اور تمہارا دوسرا مخالف بندہ، ان سیاست دانوں میں کتنے ایسے ہیں، جو صاف ستھرے ہیں۔ سو یہاں الیکشن جیتا تو دوٹوں سے جاتا ہے لیکن وہ ووٹ حاصل کیسے کیے جاتے ہیں، یہ ایک آرٹ ہے، ہنر ہے میری جان، جسے ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ آخری لفظ ہرپریت نے سن لیے تھے۔ اس لیے بیٹھتے ہوئے بولی۔
’’ٹھیک کہہ رہی ہے نوتن، یہاں الیکشن جیتنا ایک آرٹ ہی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ ان کی امیدوں کے ساتھ کھیلتے ہیں یہ لوگ۔‘‘
’’اچھا چلو یہ ختم کرو، اب یہ سوچو، کیا کرنا ہے۔ نوتن تمہارا کیا پروگرام ہے؟‘‘ جسپال نے جان بوجھ کر پوچھا۔
’’میں تو ابھی واپس جالندھر جاؤں گی وہاں کچھ کام ہیں، کل اگر وقت ملا تو آؤں گی، آخر ہم بھی تو ملازم ہیں رتن دیپ سنگھ جی کے۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولی۔
’’یار نوتن، ابھی تو اتنا کام نہیں، لیکن الیکشن کے دنوں میں تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ تم وہ چند دن ہمارے ساتھ آ جاؤ۔‘‘ ہرپریت نے اس سے کہا۔
’’میں رتن دیپ سنگھ سے اجازت لے کر آ جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ......‘‘ اس نے کہنا چاہا تو ہرپریت تیزی سے بولی۔
’’تم نوکری چھوڑ دینا، انوجیت اگر ممبر بن گیا تو بہت کام ہوگا، وہ تمہیں سنبھال لینا۔‘‘
’’دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں چائے پی کر نکل رہی

ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

چائے پینے کے بعد نوتن کور اپنی کار میں نکل گئی اور ہرپریت کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایسے میں جسپال نے صوفے پر بیٹھ کر بلدیو سنگھ کو فون ملایا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

"نوتن نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام اسی گجندر سنگھ ہی کا ہے۔ اسی کی ایک کڑی مجھے ملی ہے۔"

"وہ کیا؟" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"میرے ایک بندے نے بتایا ہے کہ وہ لڑکا، جس کے ساتھ لڑکی کی بات طے ہو رہی تھی، وہ گجندر سنگھ کے ہاں کام کر رہا ہے۔ اس کا ذاتی ملازم ہے۔" بلدیو نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کہیں یہ کام......" جسپال نے یہ کہنا چاہا تھا کہ بلدیو نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"وجہ کچھ بھی رہی ہو، یہ ایک کڑی بنتی ہے، رستہ ہے، ممکن ہے، اسی لڑکے نے گجندر سنگھ سے کہہ کر پولیس آفیسر سے سفارش کروائی ہو لیکن ایک بات طے ہے، اتنی رات کو، اتنی جلدی یہ ہوتا نہیں۔ خیر، تم پتہ کراؤ کہ لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان کوئی اختلافی بات تو نہیں چل رہی تھی۔"

"تھا یہی جہیز کم زیادہ کا چکر تھا۔ تم ایسے کرو، سیدھا اسی لڑکے کو......" جسپال نے غصے میں کہا۔

"نہیں پھر بھی تم پتہ کرو، کوئی بڑا معاملہ تو نہیں چل رہا تھا۔" بلدیو نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"اوکے۔" جسپال نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ہرپریت کے ذمے لگائے گا۔ وہ ہی کسی بات کا پتہ لگا پائے گی اگر کوئی ہوئی تو۔ اس نے کچن میں جا کر ہرپریت کو سمجھایا اور اوپر چھت پر جا پہنچا۔

اس نے وہاں جاتے ہی خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود نکودر جائے اور صبح ہونے سے پہلے لڑکی کو واپس لے آئے۔ وہ چھت پر کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا کہ بلدیو سنگھ کا فون آ گیا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جسپال، ابھی نوتن کور نے مجھے بتایا ہے۔ تم جاؤ، لوگوں میں گھلو ملو، دس بجے تک تم نے وہیں رہنا ہے، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے سمجھ آ گئی ہے میں نے کیا کرنا ہے۔"

"کوئی کسی قسم کی مدد؟" جسپال نے پوچھا۔

"ہوگی تو بتا دوں گا۔ یہ کنفرم ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی انہی کے پاس ہے۔ اسے وہیں کہیں رکھا ہوا ہے۔ مل جائے گی۔ میں پھر فون کرتا ہوں۔" بلدیو سنگھ نے کہا تو وہ بہت حد تک پرسکون ہو گیا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ ہرپریت ابھی نکلی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ اب وہ مختلف لوگوں کے گھروں میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ہرپریت کو سمجھا دی۔ لیکن اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس وقت کی آوارہ گردی کیوں ضروری ہے؟

وہ دونوں ہی مختلف گھروں میں جاتے رہے۔ ان کے پاس انوجیت کے لیے ووٹ مانگنے کا، ایک معقول بہانہ تھا۔ ہر جگہ سے یہی کہا گیا کہ وہ لوگ ووٹ انہی کو دیں گے۔ جسپال اور ہرپریت دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ ووٹر بڑا سیانا ہو گیا ہے۔ کوئی ایک فیصد لوگ ہی انکار کرتے ہیں اور وہ لوگ نظریاتی قسم کے ہوتے ہیں جو بہت کٹر قسم کے ہوں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں کہتا۔ جسپال نے وقت گزارنا تھا۔ وہ گزار لیا۔ دس بج گئے تھے۔ اسے بلدیو سنگھ کے فون کا انتظار تھا۔

اس وقت وہ ایک گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، جب بلدیو کا فون آ گیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس دوران وہ اس سے عام سی باتیں کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ اکیلا ہوا تو بولا۔

"اب بتاؤ، کیا بنا؟"

"تم نے کبھی کہانی سنی ہے کہ کسی جن کی کسی طوطے میں جان ہوتی ہے۔"

"ہاں سنی ہے؟" اس نے سمجھتے ہوئے جواب دیا

"تو بس پھر، وہ طوطا ہمارے پاس ہے۔ صبح تک سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"او کے، پھر صبح ہی دیکھیں گے۔" جسپال نے جواب دیا تو بلدیو سنگھ نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہرپریت کے ساتھ واپس گھر آ گیا۔

انہیں گھر آئے کچھ ہی وقت گذرا ہوگا۔ کہ اوگی پنڈ سے کچھ لوگ ان کے ہاں آ گئے۔ وہ لوگ ان کے ساتھ تھے، جن کی لڑکی اغوا ہوئی تھی اور ان کا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ وہ سبھی باہر لان میں بٹھا دیئے گئے۔ وہ ابھی بیٹھ ہی رہے تھے کہ جسپال کے ساتھ ہرپریت بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ تبھی ان میں سے ایک بزرگ نے بات کی۔

"جسپال پتر! ہم سب تیرے پاس آئے ہیں تاکہ تو ہماری مدد کرے۔ ہماری تو کوئی بھی بات نہیں سنتا۔"

"بزرگو بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے بڑے سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمیں اب تک یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کون تھے۔ کس نے کیا ہے سب۔ لیکن یہ کیسا ظلم ہے کہ تھانیدار بھی ہماری کوئی بات نہیں سنتا ہے۔ اس نے ایک درخواست لکھ لی ہے اور ایف آئی آر کاٹ کر ہمارے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ دو دن ہو گئے، وہ ہمیں ملتا ہی نہیں ہے، چند بار فون کیا ہے، اب تو وہ گالیاں دینے لگا ہے کہ فون کیوں کرتے ہو۔ کہاں جائیں، کس کے پاس فریاد کریں۔" لڑکی کا باپ یہ کہتے ہوئے رو دیا

"چلیں بات کرتے ہیں اس سے۔" جسپال نے کہا۔

"رب تمہارا بھلا کرے، اگر تمہاری وجہ سے ہمیں اپنی بیٹی مل جائے۔" لڑکی کا باپ بولا۔

"اس کا فون نمبر دو، میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔" جسپال نے کہا تو ایک نوجوان نے تھانیدار کا نمبر دے دیا۔ جسپال نے کال ملائی تو کچھ دیر بعد اس نے فون رسیو کر لیا۔ جسپال نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا۔

"جی، حکم۔" اس کے لہجے میں طنز آ گیا تھا۔

"وہ لڑکی، جو اغوا ہوئی اور اس کے بھائی کے قاتل

کھٹے میٹھے ٹوٹکے

❖ اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر ہنستے ہیں نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز چینل باقاعدگی سے دیکھیں امید ہے وزن کم ہوگا۔

❖ اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور ڈر لگتا ہے تو سونے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھیں کبھی ڈر نہیں لگے گا۔

امجد علی ...... میرپور خاص

کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟ کوئی تفتیش میں پیش رفت، کوئی شک میں پکڑا؟"

"او کہاں کی تفتیش جی، آج کل تو آپ سیاست دانوں کے معاملات ہی نہیں سانس لینے دیتے، کبھی کسی کی سیکورٹی، کبھی کسی وی آئی پی کا استقبال، پروٹوکول، یہ الیکشن بھی تو بھگتانے ہیں۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا

"اور اگر وہ لڑکی قتل ہو گئی تو کیا ہوگا؟ وہ کس کے ذمے ہوگی؟" جسپال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ تو جی، قتل کرنے والے جانیں، یا پھر آپ محکمے کے کسی بڑے سے کہیں، اب مجھے جو حکم ملتا ہے، میں تو وہی کروں گا نا۔" اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔

"یہ حکم آتے کہاں سے ہیں، جن کی وجہ سے بے چارے عوام کو انصاف نہیں ملتا؟" وہ طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے بحث نہیں کرنی، مجھ سے تو جو ہو سکتا ہے کر رہا ہوں، دن رات عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن ان لوگوں کا قصور، انہیں کچھ نہ کچھ تو......" جسپال نے کہنا چاہا مگر وہ تیزی سے بات کاٹتا ہوا بولا۔

"او جی، اب میں کیا کروں، اندھی تفتیش ہے، کوئی سرا پتہ وہ دیں تو میں اسے ابھی اٹھوا لیتا ہوں۔ پھر بعد میں

آپ لوگوں نے ہی ان کی سفارش کرنی ہے کہ یہ بے گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دیں۔"

"چلو، ٹھیک ہے، ہم بھی کوشش کرتے ہیں، آپ بھی کرو، جیسے ہی کوئی سرا پتہ ملا، بتاتے ہیں۔" جسپال نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

سبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے فون جیب میں رکھا اور تھانیدار سے ہونے والی بات انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری بات سن کے وہی بزرگ بولا۔

"سردار جی، یہ تو اس کی کچھ بھی نہ کرنے والی باتیں ہیں نا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اب یہ تو بات پکی ہوگئی ہے کہ اس واردات میں کوئی ایسا بندہ ملوث ہے، جو اس تھانیدار پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے۔" اس بزرگ نے کہا۔ تو جسپال نے اس لڑکی کے باپ سے پوچھا۔

"وہ جو لڑکا ہے، جس سے لڑکی کی بات چل رہی تھی، ان سے کوئی اختلاف ہوا، یا کوئی بات؟"

"ہماری تو ان سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، یہی جہیز کی بات تھی، اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بس طے ہو رہی تھی بات۔" باپ نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ نکودر شہر میں جا کر بڑے آفیسر سے ملا جائے۔ کل صبح جانے کا فیصلہ ہوا۔ جسپال نے ان کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی اور انہیں یہ حوصلہ دیا کہ اب یہ ان کا مسئلہ نہیں اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہ لڑکی بازیاب کروانے میں پوری طرح ساتھ دے گا اور جو انہوں نے قتل کیا ہے، اس کا حساب بھی لیں گے۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو کر چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ نوتن کور کا فون آ گیا۔ وہ اسی فون سے کال کر رہی تھی، جو ٹریس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا۔

"لڑکی اسی گجندر سنگھ کی شہہ پر اغوا ہوئی ہے، یہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس کے قریبی دو بندے پکڑ لیے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی اٹھا لی ہے۔"

"کیا، اس کی بیٹی۔ مطلب......" جسپال نے حیرت سے کہا تو نوتن کور بولی۔

"بلدیو سنگھ اس معاملے میں بڑا سخت ہے۔ وہ لڑکی بھی تو کسی کی بیٹی ہے، کیا کسی امیر اور طاقت ور کی بیٹی میں سرخاب کے پَر لگے ہیں کہ وہ اغوا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بلدیو سنگھ نے تو اس لڑکی کو بتا دیا کہ تمہارے باپ کے گناہ کے بدلے اسے اغوا کیا گیا ہے۔"

"تو کیا بنا، گجندر کو پتہ چلا؟" اس نے پوچھا۔

"بتا دیا اُسے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑکی واپس گاؤں نہ پہنچی تو وہ اس لڑکی کو کہیں دور لے جائیں گے۔" نوتن نے بتایا

"اغوا کرنے کی وجہ کیا تھی؟"

"وہی لڑکا، جن سے لڑکی والوں کی بات چل رہی تھی۔ اسے پکڑ لیا ہے، اسی نے بتایا۔ اب اصل بات کیا ہے، یہ ابھی پوری طرح پتہ نہیں چلی۔ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔" نوتن کور نے بتایا تو جسپال اندر سے کھول اٹھا۔

"یار میں آتا ہوں وہاں، دیکھی جائے گی، اسے تو میں سبق......"

"سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ صبح تک انتظار کرو، پھر تم ہی اس سے سیدھے ہو جانا۔ یہ لوگ درمیان سے نکل جائیں گے۔" نوتن نے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔" جسپال نے کہا۔

"تم آرام کرو، یہ دیکھ لیں گے سب۔" نوتن کور نے اعتماد سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

جسپال کا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں، بانیتا کور اور اشفاق چوہدری، بہت دیر تک اسی موضوع پر سوچتے رہے کہ باس یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ میں

اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں اور یہ دعویٰ کسی حد تک تسلیم بھی کیا جا سکتا تھا کہ اس نے دو بار مجھ پر حملہ کیا اور دونوں بار محض خوش قسمتی کے ساتھ رب کی رضا کے باعث بچ گیا تھا۔ پہلی بار ریستوران میں اس نے حملہ کروایا، اسے کیسے پتہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہاں مجھے ایک شک تھا کہ جو لوگ حملہ کرنے والے تھے، انہیں میرے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ مطلب انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ٹریک پر چلتے ہوئے سیدھے ہمارے سر پر آن پہنچے۔

دوسری بار بھی ایسا ہوا تھا۔ میں نے ٹاؤن میں جو گھر لیا تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے لیے میں بہت راز داری برتی تھی لیکن اس نے وہاں بھی حملہ کروا دیا۔

یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا، جب وہاں کوئی بھی نہیں تھا، کیا اس نے اسی تاک میں وہاں حملہ کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا صرف ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے، یا پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہاں پر کوئی نہیں ہے، اور سب خوش قسمتی سے بچ گئے؟ باس میرے لیے ایک معمہ بنتا چلا جا رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ خود مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا یا قسمت مجھ پر مہربان تھی؟ میں یہی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

یہ ساری باتیں ہمارے درمیان زیر بحث آ چکی تھیں، لیکن کوئی سرا پتہ ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اشفاق چوہدری نے کہا۔

''یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں تو چلتی رہیں گی، ان دونوں کا کیا کرنا ہے، میری بہت زیادہ توجہ ان کی طرف رہتی ہے۔''

''کیا تم نے ان کی کوئی ایسی سرگرمی دیکھی ہے یا معمول سے ہٹ کچھ ہوا ہے، جس کی وجہ سے تمہیں کوئی شک محسوس ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان دونوں کو کچھ اجنبیوں کے ساتھ ملتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ ایسے لوگ تھے، جو نہ تو اس علاقے کے ہیں اور نہ ہی دوبارہ دیکھے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ باہر کے لوگ تھے۔'' اشفاق چوہدری نے تفصیل سے بتایا

''اس کے بعد انہوں نے کچھ کیا، کوئی مشکوک......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کیا، ان کا ایک اپنا معمول ہے اور وہ اس طرح اپنے دن گذار رہے ہیں۔ تائی جب تھی، وہ سیکورٹی کی لگامیں کھینچے رکھتی تھی، علاقے میں کوئی پرندہ بھی سر مارتا تھا تو اس کے بارے میں بھی پوچھ تاچھ کرتی تھی۔ وہ باخبر رہتی تھی۔ مجھے علاقے میں پھرنا پڑتا ہے۔ اس طرف زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا۔''

''تم چاہتے کیا ہو۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا؟'' میں نے اس کی بات سننا چاہی۔

''میں چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، دشمن پھر دشمن ہوتا ہے، اس کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں چلتا کر دیا ان کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے وہ کرو کیونکہ دو دن سے ان کے پاس ایک شخص آیا ہوا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ کب آیا، کہاں سے آیا، اس بارے میں وہ مطمئن نہیں کر سکا۔ میں نے جب سے اسے دیکھا ہے، وہ میرے دماغ کو کھٹک رہا ہے۔'' اس نے اپنا خیال واضح کر دیا۔

''تو ابھی چلو، ان کے پاس چلتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے یہی خیال آیا تھا کہ اس کا ایک ہی بیٹا اس سے دور تھا جو ممبئی میں رہتا تھا۔ اگر وہی ہے تو اسے ممبئی میں تلاش نہیں کرنا پڑا، وہ یہیں آ گیا ہے۔ میں اسے فوری طور پر ملنا چاہتا تھا۔ کبھی میں نے پلان کیا تھا کہ اسے ممبئی میں تلاش کیا جائے۔ اب وہ ویسے ہی یہیں آ گیا تھا۔

''چلو'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔

''بانیتا! اگر تم چاہو تو آرام کرو۔'' میں نے کہا تو وہ بنا کوئی بات کیے اٹھ کر باہر چل دی۔ اسے میرا یوں کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ پورچ میں کھڑی کار کی پچھلی نشست پر جا بیٹھی تھی۔ اسے مزید کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ سو میں

خاموشی سے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشفاق چوہدری نے اسٹیرنگ سنبھالا اور چل دیا۔

ہم مسافر شاہ کے ٹھڑے کے پاس پہنچے تو اس کے ساتھ بنے ہوئے کمروں میں گھپ اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی ذرا سی بھی روشنی نہیں تھی۔ اماوس کی اس رات میں بس تارے چمک رہے تھے۔ ٹھڑے کے ارد گرد صرف وہی منظر دکھائی دے رہا تھا، جہاں ہیڈ لائیٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ان کمروں کے پاس کار جا رکی۔ کار رکتے ہی ایک نوجوان جوگی کمرے سے باہر آیا۔ اسے شاید ہم دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے پوری طرح سامنے آ گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا اور اونچی آواز میں کہا۔

''رام لعل کو بلاؤ۔''

وہ میری آواز سن کر چونکا اور پھر مجھے پہچان کر ٹھٹک گیا۔ پھر فوراً اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جوگی رام لعل باہر آ گیا اور سیدھا میری جانب بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میرے اور جوگی رال لعل کے درمیان بانیتا کور آ گئی۔

''ہو گیا۔'' بانیتا کور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ رُک گیا۔ اس نے اپنی چندھیائی آنکھوں سے، ہماری جانب دیکھا اور بولا۔

''مہاراج۔! اس سمے، کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟''

''او نہیں رام لعل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

''آئیں آ جائیں اندر۔'' وہ اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو بانیتا کور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اشفاق چوہدری اس کے پیچھے بڑھا، پھر رام لعل اور میں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر دیواروں کے ساتھ تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لگے بستر پر ایک سنجیدہ سا جوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ باقی دو بستر خالی تھے۔ میں ایک بستر پر بیٹھ گیا تو وہ جوان میری جانب بڑھ آیا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

''یہ میرا بیٹا ہے۔ جی سندر لعل۔ ممبئی میں رہتا ہے، مجھے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے۔''

''یہی ہے وہ، جو زہر کے بارے میں اتھارٹی رکھتا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرا دیا

''جی، یہی ہے۔'' رام لعل نے کہا۔

''یہاں کیسے آیا، قانونی طریقے سے یا غیر قانونی؟''

''قانونی لوگوں نے غیر قانونی طور پر بھیجا ہے۔'' رام لعل کی بجائے وہ بولا۔

''کیسے؟'' میں نے سکون سے پوچھا۔

''انہی لوگوں نے، جنہوں نے میرے باپو کو یہاں بھیجا ہوا ہے۔''

''تمہیں ہی کیوں بھیجا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کچھ عرصہ سے یہاں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات نہیں ملی۔ وہ مجھ تک پہنچے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں یہاں آؤں اور پتہ کروں کہ بات کیا ہے۔ کیونکہ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ باپو زندہ ہیں اور آزاد زندگی گزار رہے ہیں، لیکن وجہ کیا بنی کہ وہ جو معلومات درکار تھیں وہ نہیں مل رہی ہیں۔'' سندر لعل نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''اب تم رام لعل کو لینے آئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو باپو کی مرضی ہے، یہ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے جوگی کی طرف دیکھ کر کہا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں بولو رام لعل، کیا چاہتے ہو؟''

''میں سچی اور دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں، اسی جگہ، میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ نہ واپس اپنے گاؤں منا سکر اور نہ کہیں دوسری جگہ۔ میرا پریوار جاتا ہے تو جائے۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی پورے دل سے۔'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی لجالت سے کہا۔

"اور وہ ملنگ، کیا بنا اس کا، نشہ چھوڑا کہ نہیں اس نے؟" میں نے جان بوجھ اس کے بارے میں پوچھا۔

"بس ایک ہفتہ لگا اسے خود پر قابو پانے میں۔ اب ٹھیک ہے، روزانہ صبح تھڑے پر جھاڑو لگاتا ہے۔ اور اسی طرح شام کو بھی وہ اپنی ڈیوٹی دیتا ہے جو آپ اس کے ذمے لگا گئے ہیں۔" وہ اسی لہجے میں بولا، ہاتھ اس کے جڑے رہے۔

"دیکھو بھئی رام لعل، مجھے یا میرے کسی بندے کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اس دوران میرا سلوک بھی تم نے دیکھ لیا، تمہیں تنگ نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تم یہاں رہنا چاہتے ہو، اب پتہ نہیں تم رہ پاتے ہو یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے، لیکن اگر تم واپس جاتے ہو تو وہ لوگ ساری زندگی تمہیں مشکوک سمجھتے رہیں گے۔ وہ تم پر یقین نہیں کریں گے، کیا کہتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہے، وہ مجھے مشکوک ہی سمجھیں گے۔" جوگی نے جواب دیا تو سندر لعل نے تیزی سے بولا۔

"نہیں باپو جی، میں ان سے بات کر کے آیا ہوں، وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ مجبوری میں کہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تو کوئی بھی کہانی انہیں سنائی جا سکتی ہے۔ میں تب سے یہی پوچھ رہا ہوں، اور ابھی یہ مہاراج آ بھی گئے ہیں، ان کے سامنے بھی پوچھتا ہوں کہ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھ بیٹا۔! میں ساری زندگی اس دشت کی سیاحی میں رہا ہوں، صحرا کی خاک چھانی ہے، ہر طرح کے بندے سے ملا ہوں، لیکن جو شانتی یہاں ہے، مجھے کہیں سے نہیں ملی۔ یہاں کہیں زیادہ گیان ہے، جو میں نے نہیں دیکھا، پر نہیں عمر کتنی ہے۔ تم آ گئے ہو، اپنے سارے پریوار کو لے جاؤ۔ میں شانتی سے یہاں مرنا چاہتا ہوں۔" رام لعل نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس بار تو چلو نا، پھر چاہے ادھر آ جانا۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے۔" اس کے بیٹے نے کہا تب میں نے پوچھا۔

"جن لوگوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے، کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ تم یہاں پکڑے جا سکتے ہو؟"

"مجھے یہ کہانی سنانے کو کہی گئی ہے کہ میں اندرون سندھ سے یہاں آیا ہوں۔ وہی جو کہانی باپو سناتے ہیں۔ یہ تو باپو جی نے مجھے یہاں کے بارے میں بتا دیا ورنہ تو میں یہی کہانی سنانے والا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آپ سے بات کروں کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔"

"ظاہر ہے اب اگر تم رام لعل کو نہ لے کر گئے تو تم بھی ممبئی میں چین سے نہیں رہ پاؤ گے۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اپنے باپ کو اور اس ملنگ کو بھی اور انہیں یہ باور کرا دینا کہ اب کوئی بندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔" میں نے ایک دم سے فیصلہ سنا دیا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

"بہت دھنے واد مہاراج۔" سندر لعل نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو رام لعل کا چہرہ مرجھا گیا تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں تمہیں مناسکر سے واپس منگوا لوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔"

"سچی مہاراج۔" وہ ایک دم سے کھل گیا۔

"ابھی جاؤ گے یا......" میں نے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جی ابھی، آج رات ہی، یہاں بھی بندے ہیں، جن کی نگاہ مجھ پر ہے، آپ یہاں ہوئے اور......" اس نے بھی اپنی بات روک کر کہا تو میں ساری بات سمجھ گیا۔

"اس کا مطلب ہے یہاں پر کام ہو رہا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"جاتے سمے سب کے بارے میں بتا جاؤں گا اور ایک تحفہ بھی دے جاؤں گا۔" وہ خوشی سے بولا۔

"تحفہ، وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں بنیادی طور پر ایک کیمسٹ ہوں، میں نے زہر پر بہت تجربات کیے ہیں۔ جس طرح قدرتی شہد کے اپنے اثرات ہوتے ہیں اور ان جیسے اثرات انسانی کوشش پیدا نہیں کر سکتی، اسی طرح سانپ کے منہ میں بنا ہوا زہر

بھی اپنی خاصیت رکھتا ہے۔اس طرح کے خواص کیمیکل سے نہیں بنائے جا سکتے۔اگر کسی شے میں مہلک اثرات ہیں تو اسی میں زندگی بخش اثرات بھی ہیں۔ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہے۔سانپ کے زہر کے انسانی بدن پر جو اثرات ہو سکتے ہیں، میں نے ان پر بہت کام کیا ہے۔اب تک میرے دو تجربے بہت کامیاب ہوئے ہیں۔''اس نے بتایا

کون سے؟''میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ایک دوا ایسی تیار کی ہے، جو کسی انسان کو ایک خاص مقدار میں دی جائے تو اس کی سوچوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔کسی دور میں حشیش سے کام لیا جاتا تھا، وہ سب وقتی نشے ہیں، لیکن یہ ایسا ہے کہ چند دن تک ایک خاص مقدار بدن میں اتار دی جائے تو انسان کی سوچوں کو تبدیل کر دیا جائے۔تب اس سے جو چاہے نتیجہ لے سکتے ہیں اور یہ وقتی نہیں ہوتا۔''اس نے تفصیل سے کہا۔

''اس کے اثر کو ختم کرنے کے لیے۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کا توڑ ہے، لیکن میں یہی بتاتا ہوں کہ اس دوا کا اثر ختم نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ انہی لوگوں کو دی جاتی ہے، جنہیں صرف مرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔اسی لیے یہ دوا عام استعمال میں نہیں لائی جاتی اور ایک خاص اہمیت اختیار کر گئی ہے۔میں اگر توڑ دے دوں، تب میری اہمیت تو ختم ہو گئی نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

مجھے وہ بہت ہی تیز اور سمجھدار لگا تھا۔اپنا بچاؤ پہلے سوچ کر رکھنے والا اکثر کامیاب ٹھہرتا ہے۔

''اور دوسرا؟''میں نے پوچھا۔

''وہ تو عام سا ہے، وہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ چونکہ بہت تیز خوشبو لگانے کے عادی ہیں، اس لیے میں وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔''اس نے کہا تو میں چونک گیا، کیا اسے بھی یہ بہت بری لگ رہی ہے؟ لیکن میں خاموش رہا تاکہ اس کی بات سن سکوں، وہ کہہ رہا تھا، باتھ ٹب میں فقط ایک قطرہ ڈال دیا جائے، اس میں نہائیں، آپ کے بدن سے ایسی بھینی بھینی خوشبو پھوٹنے لگے گی کہ دوسری صنف مدہوش ہو جائے گی۔یہ چھوٹا سا چمتکار میں نے پیسے بنانے کے لیے کیا ہوا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا یہ چیزیں تم ساتھ میں اٹھائے پھر رہے ہو؟'' بانیتا کور نے پہلی بار بات کی

''بھیس جو بدل کر آنا تھا یہاں اور بھی بہت کچھ ہے جوگی کی پوٹلی میں۔'' یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

''پہلی والی کا تو ٹھیک ہے، دوسری والی کا کوئی سائیڈ ایفیکٹ؟''میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں، یہ میرے امیر ترین کلائنٹس کے لیے ہے، لوگ ان سے پوچھتے ہیں یہ پرفیوم دنیا کے کس مقام سے ملتا ہے، مگر وہ نہیں بتاتے۔'' اس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی

''اس کا تجربہ کروانے کے لیے تمہیں ایک دن رکنا پڑے گا۔'' میں نے اسے کہا تو وہ بولا۔

''جیسے آپ کی مرضی، میں ایک ہفتہ بھی رک جاؤں گا، پہلے دوا کا تجربہ کر لیں۔''

''ٹھیک ہے، تم ابھی رہو یہاں پر، بلکہ پورا پریوار رہے، صبح سے تجربات کریں گے اور دوسری اگر کوئی چیز ہوئی تو اس پر بھی بات ہو جائے گی۔''میں نے کہا۔

''اور اگر تمہاری باتیں غلط اور تمہارے دعوے جھوٹے ہیں تو ابھی راتوں رات نکل جانا، یہ نہ ہو کہ صبح میرا ارادہ بدل جائے۔'' بانیتا کور نے کہا تو اس پر سندر لعل کیمسٹ نے گھوم کر اسے دیکھا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔وہ آہستہ آہستہ اپنے سر کو ہلانے لگا تھا۔میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ گیا۔میں ملنگ کو دیکھنا چاہتا تھا۔میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا۔

''اب کیسے ہو؟''

''آپ نے ڈیوٹی لگا دی، جو مزہ اس ڈیوٹی میں ہے شاید ہی کسی اور شے میں ہو۔'' وہ تشکر بھرے لہجے

میں بولا۔

"چلو باقی باتیں صبح ہوں گی۔" میں نے کہا اور کار میں جا بیٹھا۔ اتنے میں وہی سندر لعل تیزی سے میری طرف آیا۔اس نے ایک کاغذ میری جانب بڑھا کر کہا۔

"یہ میں نے وہ دوسری دوا کا پورا فارمولا لکھ دیا ہے۔ یہ کسی بھی ماہر کیمسٹ کو دکھا دیں، وہ یہ دوا تیار کر دے گا۔ اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ انسانی بدن پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اور یہ دوا، اس کا تجزیہ کروالیں۔"

میں نے کاغذ کا وہ پرچہ اور دوا پکڑلی۔ مجھے لگا کہ بانیتا کور کی بات اسے کھا گئی تھی۔ یہ ایک فطری سی بات ہے، کسی کی ذات اور کام کو جب نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا ردعمل ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سندر لعل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ورنہ اس کی موت اس کے سامنے تھی۔ اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو ختم کر کے ہمیں مار دینا چاہتا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔

حویلی واپس ہوئے آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ راستے میں اشفاق چوہدری یہی کہتا رہا کہ انہیں جس قدر جلدی ہو سکے یہاں سے روانہ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ ہم بھی اس کی وجہ سے لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں صبح فیصلہ کرنے کا کہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں بیڈ پر آن لیٹا۔ تبھی مجھے خیال آیا، میں نے اپنے دوست کو فون کیا اور حالات پوچھے۔ اس نے کہا۔

"وہاں کوئی بندہ نہیں آیا، جسے مشکوک کہا جا سکے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ بانیتا کور میرے ساتھ بیڈ پر تھی وہ بھی لیٹتے ہی سو گئی۔ رات کافی ہو گئی تھی۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو سورج مشرقی افق سے نہیں نکلا تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لیتا ہوا حویلی کی چھت پر جانے لگا تو حویلی ہی کے ایک ملازم نے مجھے کہا۔

"باہر ایک جوگی آیا کھڑا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے، سندر لعل نام بتایا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"میں نے لان میں بٹھایا ہے۔" اس نے جواب دیا

"اچھا، میں آتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔ میں تھوڑی دیر کاریڈور میں ٹہلتا رہا پھر نیچے چلا گیا۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیسے آئے صبح صبح، خیریت؟ میں نے پوچھا۔

"جی، رات وہ آپ کی سیکورٹی گارڈ نے جو بات کہی وہ مجھے بہت کھلی ہے۔ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ خود اپنے سامنے تجربہ کروا سکوں۔ اگر کچھ ہو تو مجھے وہ فوراً شوٹ کر دے۔" اس کے لہجے میں دکھ سے زیادہ انا بول رہی تھی۔

"وہ میری دوست ہے یار۔ تم اس کی بات کا برا نہ مناؤ۔ اس نے جو کہا....." میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے

"آپ نے جو میرے باپو پر دیا کی ہے، میں اس کا احسان بھی نہیں دے سکتا۔ آپ چاہتے تو انہیں قتل کر سکتے تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، وہ آپ کے دشمن تھے۔ میں یہ ثابت کر کے جانا چاہتا ہوں کہ میں دشمنی نہیں کر رہا، میں یہاں سے جاؤں گا تو آپ کا احسان مند ہو کر۔ اور جب یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ میرے احسان مند ہوں گے۔ میں آئندہ بھی دوست ہی ثابت ہوں گا۔ آپ نہائیں اس سے، میں ہوں ادھر۔" اس نے ضدی سے لہجے میں کہا تو میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ وہاں کا مانا ہوا کیمسٹ اپنے باپ کو بچانے اور 'را' کے کہنے پر یہاں آیا تھا۔ اپنی انا پر ہلکی سی ضرب بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔

"اچھا، ٹھیک ہے، آؤ اندر بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ اندر آ گیا۔

بانیتا کور مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس کے سامنے ایک قطرہ ٹب میں ڈالا تو خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ وہ باہر انتظار کرنے لگا۔

میں خوب نہایا۔ یہاں تک کہ میں پرسکون ہو گیا۔ وہ جو تیز خوشبو، میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔ ایک بھینی بھینی خوشبو نے مجھے حصار میں لے لیا۔ جو بہر حال مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

"واقعی مست کر دینے والی خوشبو ہے۔" بانیتا کور نے خمار آلود آواز میں کہا تو سندر لعل ایک دم سے خوش ہو گیا۔ میں نے ناشتہ لگوانے کا کہہ دیا۔

ناشتے کے دوران وہ بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ جن میں سے کچھ کی مجھے سمجھ آئی اور کچھ کی نہیں۔ جس وقت وہ جانے لگا تو اس نے دو چھوٹی چھوٹی بوتلیں میری جانب بڑھائیں۔ وہ دو مختلف رنگ کی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ بعد میں سکون سے بیٹھ کر سمجھیں۔ میں نے اس کے ساتھ سب کچھ لکھ کر اس لفافے میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے آگیا دیں۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چلا گیا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ جب میں بانیتا کور حویلی سے نکل پڑے۔ اشفاق چوہدری نے وہاں کے ایک ایک معاملے کے بارے میں مجھے بتایا۔ الیکشن کے لیے ماحول تیار ہو رہا تھا۔ علاقے میں سیاسی پارٹیوں کے کارندے اپنے اپنے طور پر سرگرم تھے۔ ہم نے ہر موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اشفاق چوہدری کے پاس ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ اس کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹی کہ انہیں یہاں سے بھیج دیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی بھی ادارے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہاں ہم نے رکھا ہے تو خواہ مخواہ کی مصیبت آ جائے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اور کچھ دیر بعد مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف چل دیئے تھے۔ تاکہ ان کے پاس جا کر انہیں وہاں سے چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ ابھی تک میرے بدن سے جو بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی، اس نے مجھے مدہوش سا کر دیا تھا۔

اشفاق چوہدری دوسری کار میں تھا۔ اس کے ساتھ دو لوگ تھے۔ ہم وہاں جا کر رکے تو دیکھا، جوگی رام لعل، سندر لعل اور ملنگ باہر ہی زمین پر گدڑی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور کچھ دیر باتوں کے بعد انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔

"دیکھیں۔ میں یہاں نہیں رہا اور نہ ہی مجھے رہنا ہے لیکن آپ لوگوں کے باعث ہمارے دوست کو پریشانی ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ آپ سے رابطہ رہے گا۔" جوگی رام لعل نے کہا تو میں نے اسے سمجھایا

"ہمیں آپ لوگوں کے بارے میں بالکل پتہ نہیں ہے کہ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو، یہاں کس لیے تھے۔ ہم نے آپ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک صرف اس لیے کیا کہ آپ فقیر لوگ ہیں۔ یہی بیان ہر جگہ دینا، ہم آپ کو یہاں سے اب بھی نہیں جانے دینا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود یہاں سے چلے گئے۔"

"جی میں سمجھ گیا مجھے کیا کرنا ہے۔" اس نے کہا تو میں وہاں سے اٹھ گیا۔ پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ اشفاق چوہدری ہمیں نور نگر سے بہت دور تک چھوڑنے آیا تھا۔

☆......☆......☆

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گذر گیا تھا۔ جسپال اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا، یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب تک بلدیو سنگھ کا فون نہیں آیا اور نہ ہی نوتن کور نے اطلاع دی۔ وہ یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ انہوں نے مجھے باندھ کر رکھ دیا ہے۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک بہت کچھ کر چکا ہوتا۔ اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی اس نے نوتن کور کو کال کر دی۔ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

"اب تک کیا......؟"

"گجندر سنگھ سے بات چل رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی دے دی جائے اور وہ لڑکی لے لی جائے۔"

"اور جو اس کا بھائی قتل ہو گیا، وہ کس کھاتے

میں جائے گا، ان کی جو گاؤں میں بے عزتی ہوئی، وہ کدھر جائے گی۔ نہیں کوئی ایسا......'' جسپال نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو نوتن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم سنو گے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر کہتی چلی گئی۔'' بلدیو سنگھ بالکل نہیں مان رہا ہے۔ وہ اسی بات پر اڑا ہوا ہے کہ لڑکی کو لو اور سیدھے تھانے چلے جاؤ، وہاں جا کر اپنے جرائم کا اعتراف کرو، جیسے ہی تم یہ کرو گے لڑکی گھر بھیج دی جائے گی۔ اگر پھر بھی نہیں مانے تو وہ لڑکی لینے خود اس کے ہاں آ رہے ہیں۔ جتنی سیکورٹی لگانی ہے لگا لے۔''

''تو پھر میری ضرورت ہوگی، میں آ رہا ہوں۔'' جسپال نے تیزی سے کہا۔

''لڑکی، ہم نے بازیاب کر لی ہے۔ وہ بھی ہمارے پاس ہے۔'' اس نے بتایا تو جسپال بولا۔

''پھر وہ لڑکی کیسے لائے گا۔ یہ عجیب بات کی؟''

''دراصل اس نے لڑکی جہاں رکھی ہوئی تھی، وہیں پر ان کے بندے قابو کیے ہوئے ہیں۔ اسے یہی پتہ ہے کہ لڑکی اس کے قبضے میں ہے۔ گجندر اب تک اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ معاملہ کچھ دوسرا ہے، وہ میں صبح آ کر بتاتی ہوں۔ وہ لڑکی نہ لائے تو اچھا ہے، اس کی بیٹی بھی تو ہمارے پاس ہے۔ بلدیو سنگھ صرف اس سے قتل کا اعتراف کرانا چاہتا ہے۔'' نوتن کور نے کہا۔

''او کے لڑکی مل گئی۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب مجھے کچھ سکون ہوا ہے۔ اب میں سونے لگا ہوں، صبح ہی ملاقات ہوگی۔'' اس نے کہا اور فون بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر وہ یہی معاملہ سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی سے فریش ہو کر تیار ہوا اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اسے ہرپریت تیار ملی۔ دونوں نے ناشتہ کیا اور وہ نکودر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جسپال لاشعوری طور پر نوتن کور کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہ پہنچ پائی تھی۔ ہرپریت کو الوداع کہہ کر اس نے پورچ میں جا کر فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے نوتن کور سے پوچھا۔

''ابھی تک پہنچی کیوں نہیں ہو؟''

''بس یہاں معاملہ قریب ترین پہنچنے والا ہے۔'' اس نے تیزی سے بتایا

''مگر مجھے تو یہاں کے لوگوں کے ساتھ اے سی پی کے پاس آنا ہے اور میں آ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''لوگوں کے ساتھ ہی آ رہے ہو نا تو آ جاؤ، یہ تو بہت اچھا ہے۔ یہی تو انتظار ہے۔ باقی باتیں یہاں آؤ گے تو ہو جائیں گی۔'' نوتن نے کہا۔

''او کے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر اس نے سردار بلبیر سنگھ پنچ کو اپنے ساتھ لیا اور پنچائت گھر آ گیا۔ وہاں نکودر کے لیے جانے والے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ انہیں لیتے ہوئے نکودر کے لیے چل پڑے۔

پنجاب کا یہ المیہ ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انصاف کے لیے بھی ان لوگوں کو ''بڑے لوگوں'' کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ عوام ان بیورو کریٹس کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو کہنے کو عوام کے خادم ہیں۔ اور یہی عوام کے خادم خواص کی خدمت میں دن رات صرف کر کے عوام ہی کو محکوم بنائے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اور صرف تعلیم کی کمی کے باعث ہے۔ جو انہیں یہ شعور ہی نہیں دیتی کہ وہ ایک ہو جائیں اور ان خواص اور بیورو کریٹس کو اپنا خادم بنا لیں۔ اس طرح قافلے بنا بنا انصاف کی بھیک مانگنے نہ جانا پڑے۔

وہ نکودر شہر میں اے سی پی آفس کے سامنے جا رکے۔ جسپال کا دماغ اس وقت بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ پرسکون تھا۔ اسے ان مراحل سے بھی الجھن نہیں ہوئی، جو اس عوام کے خادم تک پہنچنے کے رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ تین لوگوں کا اذن باریابی ملا کہ وہ اندر آ کر بات کریں۔ جسپال، بلبیر سنگھ اور لڑکی کا باپ اندر چلے گئے۔ اے سی پی اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے تینوں کو دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو بلبیر سنگھ نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اور اوگی کے تھانیدار کے بارے میں بتا دیا کہ وہ تعاون کرنے

کی بجائے بہانے بنا رہا ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں بلواتا ہوں اس تھانیدار کو۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر بولا۔ ''اور کوئی حکم ہے میرے لیے۔''

ان آخری لفظوں کے کہنے کا مطلب اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ تبھی جسپال نے سکون سے پوچھا۔

''یہ آپ کا دیکھنا، کتنے دنوں تک چلے گا؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اے سی پی نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اس کی بدتمیزی پر اسے غصہ آ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں، ہمارے پاس کوئی ایسا چمتکار تو نہیں کہ ایک دم سے ڈھونڈ نکالیں۔ کرتے ہیں اس پر کام۔ آپ دھیرج رکھیں۔''

''دیکھیں، یہ ہمارے علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کا مسئلہ دنوں میں نہیں گھنٹوں میں ہونا چاہئے۔'' جسپال نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا۔

''یہ آپ جیسے عوامی نمائندوں کو ہر جگہ اپنے نمبر بنانے کی کیوں پڑی رہتی ہے۔ کہا نا دیکھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں۔ اب تم لوگ جاؤ۔'' اس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو لڑکی کا باپ پہلے ہی اٹھ گیا۔ بلبیر سنگھ پیچ اٹھا اور پھر جسپال اٹھ گیا۔ اسے اے سی پی کی سرد مہری بہت بری لگی تھی۔ وہ باہر آ گئے۔

تبھی سامنے کافی ساری کاریں آ کر رکیں۔ اس میں سے کئی سارے لوگ باہر آئے۔ ان کے درمیان ایک لمبے قد کا آدمی نمایاں تھا۔ جسپال کو اس کا چہرہ کافی حد تک جانا پہچانا لگا تھا۔ وہ ایک جتھے کی صورت میں آئے۔ ان کے آگے ایک بندہ سامنے کھڑے لوگوں کی جانب بڑھا اور ان سے پوچھا۔

''یہ اوگی سے کون لوگ یہاں آئے ہیں؟''

''ہم ہیں۔'' ایک شخص نے جواب دیا تو وہی شخص بولا

''سردار گجندر سنگھ جی آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ وہاں سے آئے ہو یہاں، تو یہ تم لوگوں کی سہاتا (ہمدردی) میں آ گئے ہیں۔''

اتنی دیر تک وہ ان کے قریب آ گئے۔ سردار دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے قریب آ گیا اور آتے ہی زوردار انداز میں فتح بلائی

''ست سری اکال۔'' لوگوں نے اس کی فتح کا جواب دیا۔ تو وہ بولا۔ ''مجھے بہت دکھ ہوا ہے، میں نے ساری جانکاری لے لی ہے۔ اور آؤ کرتے ہیں اے سی پی سے ذرا بات۔'' اس نے سب کو لے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لوگوں نے جسپال کی طرف دیکھا۔ تب بلبیر سنگھ بولا۔

''ہم ان کے پاس سے ہو آئے ہیں۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی دلاسہ دیا کہ کرتے ہیں کچھ؟'' بلبیر سنگھ نے جواب دیا تو بہت دھونس سے بولا۔

''میں کرتا ہوں بات۔'' یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جسپال نے سرد سے لہجے میں کہا۔

''گجندر سنگھ۔! اس اے سی پی کو یہاں بلاؤ۔''

اس کا بولنا گجندر ہی کو نہیں وہاں ہر بندے نے محسوس کیا۔ تبھی اس نے چونک کر پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''جو کہا ہے وہ کرو۔''

جسپال نے اسی لہجے میں کہا تو ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا پھر بولا۔

''ہم اندر جا کر بات کرتے ہیں۔ آؤ تم بھی آؤ؟'' اس نے کہا تو جسپال نے ضدی لہجے میں کہا۔

''اسے یہاں بلاؤ۔''

''اے تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ سردار جی کیا کہہ رہے ہیں۔'' اس کے ایک مصاحب نے تیزی سے کہا تو جسپال نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دور جانے کو کہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ گجندر سنگھ کے

پاس آیا اور دھیمی سی آواز میں کہا۔
''تم وہی کرو، جس کے کرنے کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔اب میں آ گیا ہوں یہاں، تمہاری بیٹی بھی بچ جائے گی۔جسپال سنگھ ہے میرا نام۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ گجندر سنگھ نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔
''اس اے سی پی کو ادھر ہی بلاؤ، سب کے سامنے بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے جسپال کا ہاتھ تھاما اور ایک جانب لے جا کر بولا۔''تم کیا جانتے ہو کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔''
''اگر میں تمہاری بیٹی کے بارے میں جان سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جانتا کہ تمہیں یہاں کیا کرنے بھیجا گیا ہے؟''
''وہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔اب میں طریقے سے سب ٹھیک کر رہا ہوں۔میں نے الیکشن......'' اس نے کہنا چاہا تو جسپال بولا۔
''او نہیں، جو کہا گیا ہے وہی کرو۔'' یہ کہہ کر جسپال وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی اندر گیا ہوا تھا کہ اس دوران پریس کی کئی گاڑیاں وہاں آن رکیں۔ گجندر سنگھ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہاں سہتا کرتے کرتے وہ خود پھنس گیا ہے۔تبھی اے سی پی باہر آ گیا۔ان سب کو دیکھ کر بولا۔
''جی سردار جی آپ، یہاں کیسے؟''
اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، جسپال نے انتہائی غصے میں کہا۔
''اصل میں تم جیسے کرپٹ بیورو کریٹس نے ان عوامی نمائندوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔تم لوگ خوشامد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔اتنے لوگ آئے ،مگر تم نے ان کی ایک نہیں سنی اور محض دلاسہ دے کر انہیں اس آفس سے نکال باہر کیا، جو اسی عوام کے پیسے سے بنا ہے اور اس کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔اس گجندر سنگھ نے بھی وہی کہنا ہے جو ہم تمہیں کہہ کر آئے ہیں۔اب تم باہر کیا سننے آئے ہو؟''
اے سی پی نے باہر کھڑے تمام لوگوں کی طرف دیکھا، اس نے اپنی بے عزتی قطعاً محسوس نہ کی اور جسپال کو نظر انداز کرتے ہوئے گجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر سکون سے بولا۔
''آئیں اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''
اس پر گجندر سنگھ نے جسپال کی طرف دیکھا۔صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، جس طرح وہ سوچ کر آیا تھا۔ جب جسپال نے ذرا سا بھی ریسپانس نہیں دیا تو وہ بڑھ کر جسپال کے پاس آیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔
''تم اگر چاہو تو ہم ابھی سکون سے کوئی معاملہ طے کر لیتے ہیں۔''
''لڑکی تو واپس کرنی ہے وہ بات تو ہو گئی۔میں صرف اس شرط پر تم سے سارا معاملہ طے کر لیتا ہوں۔'' جسپال نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔
''کہو، کیا کہتے ہو؟''
''اس کے بیٹے کو تو تم واپس نہیں کر سکتے ہو، ہاں اس کے بدلے اپنی بیٹی دے دو۔'' جسپال نے سکون سے کہا تو گجندر کا چہرہ یک بارگی سرخ ہو گیا جیسے کسی اسے گالی دے دی ہو۔
''جسپال۔!میں اگر سکون سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی کمزور ہوں۔میں معاملے کو حل کرنا چاہتا ہوں، وہ کر لو۔'' اس نے غصے میں کہا۔
''تو پھر کیا کرو گے؟'' جسپال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''میں، تم سب کو دیکھ لوں ابھی اور اسی وقت؟'' اس نے غصے میں کہا تو اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی۔جو وہاں کھڑے لوگوں اور پریس تک جا پہنچی۔
''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔اب تمہیں ختم ہونا ہے۔'' جسپال نے کہا اور اس کی کوئی بات سنے بغیر بلبیر سنگھ کے پاس آ گیا۔
''چلیں۔'' بلبیر سنگھ نے پوچھا تو جسپال نے اے سی

پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں، اب کچھ اور ہی کرنا ہوگا۔ یہاں کے لوگ بھی کرپٹ نکلے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی کو کس نے اغوا کرایا ہے۔ چلو۔'' یہ کہہ کر جسپال جانے لگا تو اے سی پی نے پریس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''اُو نوجوان۔! رکو، یوں بیان دے کر نہیں جا سکتے ہو، بتاؤ کون ہے وہ؟ رکو۔''

''تم مجھے روک بھی نہیں سکتے ہو۔'' جسپال نے کہا۔

''میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔'' اے سی پی نے کہا۔

''تم مجھے گرفتار بھی نہیں کر سکتے، کیوں گجندر سنگھ بولتے کیوں نہیں ہو؟'' وہ نخوت سے بولا تو سبھی گجندر سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ جسپال آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ ابھی گرفتاری دینے لگا ہو۔ وہاں کھڑا ہر بندہ حیران تھا کہ گجندر سنگھ جیسا شخص اس کے سامنے خاموش کیوں ہے؟ کافی دیر تک جب کوئی نہیں بولا تو گجندر سنگھ آگے بڑھا اور اس نے اے سی پی سے کہا۔

''جسپال ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ اغوا اور قتل میرے ایک بندے سے ہوا۔ میں اسے آج ہی پیش کر دیتا ہوں۔'' یہ کہنا ہی تھا کہ وہاں موجود ہر بندہ چونک گیا۔ پریس نے جلدی سے تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اے سی پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''لڑکی لاؤ کہاں ہے؟'' اس بار بلبیر سنگھ پنچ نے تیزی سے کہا۔

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں پیش کر دوں گا۔'' اس نے کہا تو جسپال نے اے سی پی سے کہا۔

''اب اگر تم نے کچھ نہ کیا تو تیرے لیے بہت برا ہوگا۔ میں تمہیں صرف دو گھنٹے دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنے لوگوں کو چلنے کا اشارہ کر کے کار کی جانب بڑھا تو اے سی پی نے کہا۔

''رکو جسپال،'' یہ کہہ کر وہ گجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں۔! مجھے پتہ ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرو۔ وہ بندہ بھی یہیں ہے، وہ بھی گرفتاری دے گا۔'' اس نے کہا تو پیچھے سے ایک شخص آگے آ گیا۔

اسی وقت اردگرد کھڑے پولیس والوں نے اسے ہتھ کڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ پریس کے سامنے ہوا۔ تصویریں بن گئیں۔ ایسے میں گجندر سنگھ کا فون بج اٹھا۔ اس کا ایک مصاحب آگے بڑھا اور فون اسے دے دیا۔

ایسے میں جسپال کا بھی فون بج اٹھا۔ نوتن کور نے بتایا کہ اس وقت لڑکی گجندر کی ہی اک فیکٹری میں موجود ہے۔ پولیس سے کہا جائے کہ وہ اسے وہاں سے بازیاب کرے۔ پورے پریس کے ساتھ۔ جسپال نے یہی بات اے سی پی سے کہی تو پریس سن رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس جانب بھاگے۔ پولیس کو بھی وہاں جانا پڑا۔ جسپال بھی وہاں جا پہنچا۔ سہمی ہوئی لڑکی کو وہاں سے بازیاب کرایا گیا۔ وہیں سے جس وقت سب واپس نکودر تھانے آئے تب لڑکی کا بیان لکھا گیا۔ جس وقت وہ اوگی واپس آ رہے تھے، اس وقت نوتن نے بتایا کہ گجندر سنگھ کی بیٹی کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔

راستے میں لڑکی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی بات چل رہی تھی۔ اس نے ملنے کو کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ جس پر اس لڑکے نے ضد بنا لی کہ وہ اسے اٹھا لے گا۔ وہ لڑکا گجندر سنگھ کے پاس کام کرتا تھا اور اسی دھندے میں ملوث تھا۔ دراصل وہ لڑکیوں کو آگے اسمگل کرتے تھے۔ یہی اس کا بڑا دھندہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے اور اپنے باس سے بات کی۔ اس نے لڑکی اٹھانے کو کہہ دیا کہ چند دن اسے اپنے پاس رکھنا، پھر اسے آگے بھیج دینا۔ اس دوران لڑکی کا بھائی قتل ہو گیا۔ یہی سر دردی بن گئی۔

وہ اس لڑکی کی آگے بات نہیں کر پائے۔ لڑکا اسے رام کرتا رہا، لیکن جس کا بھائی اس کے لیے قتل ہو چکا ہو، اسے کہاں ہوش تھا۔ وہ تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ گجندر اور اس کے لوگ لڑکی کا قتل بھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس کی بیٹی اغوا ہو گئی۔ گجندر کے گمان میں

بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا سر پھرا بھی ہوگا جو اس کے گھر تک جا پہنچے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات بہت بڑھ جائے گی، وہ اس معاملے کو اپنے طریقے ہی سے حل کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پولیس کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ حالات ہی ایسے بن گئے۔ اس کے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔

جس طرح یہ سب ہوگیا تھا، جسپال کا دماغ نہیں مان رہا تھا کہ بات ابھی ختم ہوئی ہے۔ یہ اتنا سادہ اور سیدھا معاملہ نہیں تھا کہ وہ ختم ہو جاتا، وہ بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال تھا کہ کاش اس کے دوست بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

وہ لوگ اوگی پنڈ پہنچ گئے۔ وہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سہ پہر تک وہ اوگی پنڈ ہی میں رہا۔ وہیں لوگوں کے درمیان اس کا سارا وقت گزر گیا۔ بہت سارے سوال اٹھے، جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے والدین ہی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ سہ پہر کے بعد جس وقت جسپال اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ رستے میں نوتن کا فون آ گیا۔

''وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جگندر سنگھ نے بیٹی کے گھر پہنچتے ہی اپنا بیان بدل دیا ہے۔ اس نے پریس کو یہی بیان دیا کہ یہ سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ اس کے وکیلوں نے اس کی ضمانت کروالی ہے اور اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ پریس کانفرنس اس نے اپنے گھر کی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہی کرے گا۔ اس نے جگندر سے کہا بھی تھا۔ وہ......'' نوتن کور نے کہنا چاہا تو جسپال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بلدیو اتنا ہی ناسمجھ ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اب اسے میں دیکھوں گا، ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب تک اسے شوٹ ہو جانا چاہیے تھا۔'' جسپال نے غصے اور مایوسی میں کہا۔

''وہ شوٹ ہو گیا ہے۔'' نوتن نے کہا۔

''کیا......؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''اس کے دو خاص بندے ہم نے پکڑے ہیں۔ انہیں لے کر جالندھر فارم ہاؤس پر جا رہے ہیں۔ رات تک وہیں آ جانا۔ میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جسپال کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا، لیکن ایک بے چینی اس کے اندر بڑھ گئی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ رات ہی کو پتہ چلنا تھا، جب وہ ان لوگوں کو ملتا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور گھر کی جانب جانے کے لیے رفتار تیز کر دی۔

اس وقت سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا، جب وہ اوگی پنڈ سے نکل کر جالندھر کی جانب رواں تھا۔ اس کے ذہن پر وہ ٹی وی رپورٹ چھائی ہوئی تھی، جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی۔ وہ اسے بہت بڑا سوشل ورکر قرار دے رہے تھے۔ وہ یہ واقعہ تخریب کاری اور سیاسی مخاصمت سے بھی سے جوڑ رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اسے سیاسی رنگ دے کر وہ انوجیت یا خود جسپال کی راہ کو روکا جاتا۔ سیاست کے اس کھیل میں اس بندے کا زیادہ فائدہ ہونے والا تھا، جو اس کی جگہ پارٹی ٹکٹ لے کر الیکشن کے میدان میں اترتا۔ اس کا پہلا ہدف انوجیت سنگھ ہوتا۔ وہ اس سارے کھیل کو سمجھ رہا تھا اور اس کا توڑ بھی کرنا چاہتا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھا وہ فارم ہاؤس جا پہنچا۔ وہاں سب آ چکے تھے۔ وہ ان سے بڑے بھرپور انداز میں ملا

''بلدیو، تم نے تو اس کا قصہ ہی ختم کر دیا۔ کہو کیسے ہوا یہ سب'' جسپال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں جس وقت ہمیں پتہ چلا تو کچھ ہی دیر بعد بجن کور نے مجھے بتایا کہ یہ اغوا وغیرہ کی واردات کیسے ہو رہی ہے، اس کی تفصیل تمہیں یہ بجن کور ہی بتا سکے گی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا،''خیر ہم وہاں سب نکودر پہنچے۔ ہمارے وہاں پہلے ہی کافی سارے سورس تھے۔ ایک گھنٹے میں ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ کس کا کام ہے اور وہ کیوں کر رہا ہے۔ پھر اس کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔ جیسے ہی کنفرم ہوا میں نے سوچ لیا کہ اس کا علاج کیا ہونا ہے۔ اور وہ ہو گیا۔''

''وہ تو وہاں بڑا طاقت ور سمجھا جا رہا تھا۔'' جسپال نے

پوچھا تو کرم سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ان کی اولاد اتنی ہی سرپھری ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کو پتہ ہے کہاں سے اٹھایا، ایک کلب سے جہاں وہ ناچ گانے میں مصروف تھی۔ ان لوگوں کو خواہ مخواہ کا وہم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر پر راج کر رہے ہیں۔"
"ہمیں پتہ تھا کہ اس نے پھر جانا ہے، اسی لیے اس کے بارے میں پوری طرح جان لیا۔ یہ اپنی کرن کور اور سرجیت بڑے سکون سے گئے، وہ پریس کانفرنس کے بعد آرام کرنے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ انہوں نے وہیں اس کا کام کیا اور سکون سے باہر آ گئے۔ اس وقت وہاں رش لگا ہوا تھا، کون کس کو جانتا تھا۔ یہ جس وقت وہاں سے آ گئے تو انہیں پتہ چلا، ہم اس وقت تیرے پنڈ کے قریب تھے۔ سوچا ادھر چلیں، پھر جالندھر کی طرف نکل گئے۔" بلدیو نے سکون سے کہا۔
"یہ سب ہوا کیوں، وہ اغوا کیوں کرتا تھا؟"
"اسی بات کا تو تمہیں پتہ نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔" بچن کور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ کہتی رہی اور وہ سنتا رہا۔
بچن کور کی ایک بچپن کی سہیلی اس کے ساتھ کالج تک پڑھتی رہی۔ دونوں کی آپس میں بہت محبت تھی۔ گہری سہیلی ہونے کے باعث ان کا آپس میں کوئی راز راز نہ رہا تھا۔ وہ کالج ہی میں تھی کہ اس کی ایک لڑکے سے کافی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ یہ تعلق پروان چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لڑکے والوں نے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ رشتہ کسی وجہ سے آگے نہ چل پایا۔ پھر ایک دن وہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ فطری طور پر پہلا شک اسی لڑکے پر گیا۔ وہ دسوہہ ہی میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر والے۔ لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بچن کور بھی مزید پڑھنے کے لیے امرتسر آ چکی تھی۔
یہ کوئی دو ماہ پہلے کی بات تھی۔ وہیں ایک دن اس کا آمنا سامنا اس لڑکی سے ہو گیا۔ وہ بہت با اعتماد تھی اور خوش تھی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے بچن کور کو بتایا کہ اس نے فورس جوائن کر لی ہے۔ اور ٹریننگ سے گزرنے کے بعد اس کی پوسٹنگ ہونے والی ہے۔ یہ پوسٹنگ کسی بارڈر پر ہو گی۔ بچن کور نے اسی وقت پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور واپس کیوں نہیں گئی وغیرہ۔ لڑکی نے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا اور اس کا فون نمبر لے لیا کہ وہ اس کال کرے گی۔ چند دن بعد اس لڑکی نے بچن کور کو کال کی اور اسے اپنے انسٹیٹیوٹ میں بلا لیا۔ جہاں وہ لڑکی ٹریننگ لے رہی تھی۔
"تمہاری اس کہانی کا ہمارے گاؤں کی لڑکی سے کیا تعلق؟" جسپال نے اکتاتے ہوئے کہا۔
"ہے، بہت گہرا تعلق ہے، تم صبر سے سنو۔" بچن کور نے بختی سے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگا۔ "میں ایک ماہ اس کے پاس جاتی رہی۔ اس سے ملتی رہی۔ میری سہیلی وہ نہیں رہی تھی۔ وہ معصومیت ختم ہو چکی تھی اس میں، اس کی جگہ ایک پختہ کار ایجنٹ بن گئی تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اندازہ نہ کر پاتا۔ مگر میں بھانپ گئی۔ وہاں بہت ہی خاص قسم کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ میں نے اس میں دل چسپی لی اور پتہ چلا کہ یہ کوئی معمولی تربیت نہیں ہے۔"
"کیا ہے وہ، کیا اب بھی جاری ہے؟" جسپال نے پوچھا تو وہ بولی۔
"ہاں اب بھی جاری ہے اور اس کی پہلی کھیپ، جس میں میری سہیلی شامل ہے وہ مختلف ملکوں میں پہنچا دی گئی ہیں۔ اگلی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر تیزی سے بولی۔ "اس تربیت کے لیے لڑکی کا خوبصورت ہونا لازمی ہے، باقی کمی وہ پوری کر لیتے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی لڑکی کچھ نہیں بہت خوبصورت ہے۔ پنجاب میں بہت سارے ایسے دلال ہیں جو ایسی لڑکیاں اس ادارے کے لیے تلاش کرتے ہیں۔ شادی کا بہانہ بنا کر یا بھگا کر یہاں پہنچا دیتے اور وہ یہاں باہر کے ملکوں کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ ان دلالوں میں یہ ایک جگندر سنگھ بھی تھا۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا

تو میں نے بلدیو کو ساری بات بتادی۔ میں نے ایسے ہی دو دلال پہلے ہی پھڑکا دیئے ہوئے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے یہ بھی اسی ادارے میں جانے والی تھی؟" جسپال نے پوچھا۔

"ہاں یہ وہیں جانے والی تھی۔ اگر اس کا بھائی قتل نہ ہوتا تو یہ اب تک وہاں جا چکی ہوتی۔" بچن کور نے بتایا

"کیا وہ کوئی ذہنی تبدیلی کرتے ہیں جس سے......" جسپال نے پوچھنا چاہا تو بچن کور بولی۔

"وہ کچھ بھی کرتے ہیں، لیکن لڑکی پوری کی پوری بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں یہ تو وہی لڑکی بتا سکتی ہے، جس نے تربیت لی ہو یا پھر وہ تربیت دینے والے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا پلان ہے۔ اب وہ ادارہ، گجندر کے معاملے میں ذرا بھی دل چسپی نہیں لے گا۔ پہلے دو کے بارے میں بھی نہیں لی۔ لیکن جس ادارے کے تحت یہ سب چل رہا ہے، وہ دلچسپی ضرور لے گا۔"

"چلو، وہ جو ہوگا سو ہوگا۔ اب کیا کرنا ہے۔" جسپال نے پوچھا تو بلدیو نے کہا۔

"کوئی نہیں، ادھر ہی ہیں۔ جو بھی سر اٹھائے گا، اسے دیکھ لیں گے۔ اور ہاں، تیرے پنڈ والا تھانیدار، اسے کچھ سبق دیں گے۔ تاکہ وہ تمہیں ہی پرڈو کول دے۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر باتیں کرنے لگے۔ تب جسپال سنگھ نے ایسے ہی بچن کور سے پوچھا۔

"تمہاری وہ سہیلی کہاں ہے اس وقت؟"

"پاکستان میں، شاید لاہور میں۔" بچن کور نے بتایا تو نوتن کور نے کہا۔

"اس کے بارے میں تفصیل معلوم ہو تو بتاؤ، پتہ کر لیں گے۔" اس پر بچن کور نے سر ہلاتے ہوئے کہنا چاہا تو جسپال نے پوچھا۔

"نکودر و بندے لائے ہو یا ابھی وہیں ہیں؟"

"ہیں، ادھر سرونٹ کوارٹر میں، ان سے بہت کچھ اگلوانا ہے، وہ ذرا ٹھیک ہو جائیں بتانے کے لیے۔"

کرن کور بولی تو نوتن نے پھر یاد دلایا

"بچن، تم اس لڑکی کے بارے میں بتا رہی تھی، میرا مطلب سندیپ کے بارے میں۔"

تبھی وہ اس کے بارے میں بتانے لگی۔

☆......☆......☆

وہ ایک ٹھنڈی شام تھی۔ جس وقت ہم لاہور پہنچے۔ اس وقت تک مجھے یہ شدت سے احساس ہوا کہ اب سارے لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اگر چہ ایسے ہی کسی وقت کے لیے میں نے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ لیکن جس طرح ایک جھٹکے سے یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، اس نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں ولید کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوگا؟ میں نے اسے فون ملایا تو اس نے رسیو کر لیا

"جی، بہت دنوں بعد آپ نے مجھے یاد کیا۔"

"کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے آبائی گاؤں۔ آپ فرمائیں، میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"کب تک پہنچو گے؟" میں نے پوچھا۔

زیادہ سے زیادہ دو، اڑھائی گھنٹے لگیں گے۔" اس نے کہا تو میں نے اسے کل آنے کے لیے کہہ دیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں جا پہنچے۔ پھر اگلے چند منٹ میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آ چکے تھے، جو چار کنال کی کوٹھی میں تھا۔ یہاں پر بھی گیت نے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانا تھا۔ وہاں پر چند لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کار گیراج میں کھڑی نہیں کی بلکہ اسے یوں پورچ میں کھڑی کی کہ اگر ایک دم سے بھی نکلنا پڑے تو نکل جائیں۔ ہم اوپر ایک لگژری قسم کے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں ہر طرح کی سہولت تھی۔ میں یہاں خود کو خاصا محفوظ سمجھ رہا تھا۔

اگر چہ بانیتا کور میرے ساتھ سارے راستے باتیں کرتی ہوئی آئی تھی۔ لیکن وہ ساری باتیں ہمارے اپنے متعلق تھیں۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں اپنے بارے میں کہتا رہا۔ وہ بیڈ پر پھیل کر لیٹ چکی تھی۔ اور میں

اس کے پاس ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تبھی اس نے گہرے لہجے میں پوچھا۔

"جمال، یہ اچانک تمہارے ہاتھ سے سب کچھ کیسے نکل رہا ہے، وہ سب لوگ جو تمہارے اردگرد تھے چلے گئے۔ اب کیا کرو گے؟"

"وہی جو میرا دل چاہے گا۔ جو میں نے سوچ لیا ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دے دی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہی، تب میں کہتا چلا گیا" وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے، بلکہ میں نے انہیں خود سے الگ کیا ہے۔ کیونکہ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ حالات بدلنے لگے ہیں۔ تعمیر کے لیے ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں شاید اب کسی دوسرے دائرے میں جا رہا ہوں۔"

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! سب لوگ جو یہاں سے چلے گئے، کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ میرا دائرہ پھیل گیا؟" میں نے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے۔"

"اور دیکھو! وہ باس جو ایک نادیدہ قوت کی طرح ہے، وہ آیا اور تو یکسر حالات بدل گئے۔ وہ نادیدہ قوت جو ہمیں ختم کرنے کے درپے تھی، وہ نہیں تو ڑپائی، بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ رب کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کر پائے۔ سبھی اپنی اپنی جگہ محفوظ ہو گئے۔ ہوتا یوں کہ انسان اپنے سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل میں آزاد ہونے کے باوجود جب رب تعالیٰ کے نظام میں داخل ہوتا ہے، اس کی منشاء اور مرضی کے خلاف جاتا ہے تو پھر بے بس ہوتا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"اس نے اتنے اٹیک کیے اور تم بچ گئے۔ اب وہ تم تک نہیں پہنچ پایا اور نہ ہی تم اس تک پہنچ سکے ہو، ایسا کیا ہے، کچھ سمجھ میں آیا؟"

"ہاں، اور کچھ ہو نہ ہو، یہ جو کل پرفیوم کی شیشی ٹوٹی ہے، اس خوشبو کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ وہ کل سے مجھے ٹریس نہیں کر پایا۔ یہ بات مجھے اُس وقت سمجھ میں آئی ہے جب سندر لعل نے اس مہک کا تحفہ دیا۔ یقین جانو، یہ بھی ربّ کی طرف سے ہے۔ میں باس کی نگاہوں سے چھپ گیا، اس کا تعلق اس خوشبو سے ضرور ہے۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟" میں نے کہا بانیتا کور ایک دم سے مسکرا دی پھر بولی۔

"یقین جانو جمال، آج صبح سے میرے دماغ میں یہ خیال کئی بار آیا ہے۔ لیکن میں تم سے اس لیے نہیں کہہ پائی کہ شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ چل اب کچھ نہیں ہوتا۔ ربّ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کیا پروا۔ اب یہ دیکھ کہ اس باس کے بچے کو تلاش کیسے کرنا ہے؟"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور اروند کو فون ملایا۔ اس نے چند بیل بعد فون رسیو کر لیا۔ تو میں نے پوچھا۔ "ہاں سنا، کچھ پتہ چلا؟"

"ہم نے سوفٹ ویئر بنا لیا ہے۔ اس کا تجربہ جاری ہے۔ یہ نمبر کبھی ایمسٹرڈم میں ملتا ہے اور کبھی دوبئی میں۔ اس کی لوکیشن مختلف جگہوں سے مل رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایک دو دن میں اسے تلاش کر لوں گا۔" اروند نے کسی حد تک شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا

"چلو کوئی بات نہیں، تم کوشش تو کر رہے ہو نا، سلمان کو کسی بلیک مارکیٹ سے بھی نہیں ملا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو بہت کوشش کر رہا ہے، لیکن نہیں ملا۔ بہر حال اگر ہم خود کوئی سوفٹ ویئر بنا لیں گے تو اس کا توڑ بہت مشکل ہوگا، یہ ہمارے ہی کام آئے گا۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوگا۔" اس نے امید افزا انداز میں کہا تو کچھ دیر یونہی گپ شپ لگانے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے فون بند ہی کیا تھا کہ اشفاق چوہدری کا فون آ گیا۔ میں نے کال رسیو کی تو اس نے بتایا

"یار وہ لوگ مسافر شاہ کے تھڑے سے چلے گئے ہیں، سارے کے سارے، وہ ملنگ بھی انہی کے ساتھ چلا گیا ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ اب ان کی طرف سے کوئی ٹینشن

نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میں نے ان کے پاس بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت تک وہیں رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ جس وقت وہ چل دیئے تھے، اس وقت سندر لعل نے ایک خط دیا ہے تمہارے نام، جاتے ہوئے انہی دو بندوں کو تھما گئے تھے۔ وہ ابھی لائے ہیں میرے پاس۔"

"تو پڑھ کے سنادو۔" میں نے کہا۔

"کاش میں اتنا پڑھا لکھا ہوتا۔ یہ انگریزی میں ہے۔ میں ایسے کرتا ہوں، اس خط کی تصویریں تمہیں ابھی بھیج دیتا ہوں، تم اسے پڑھ لو۔" اس نے کہا۔

"چلو بھیج دو۔" میں بولا تو اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے وہ خط تصویروں میں بھیج دیا۔

"کیا لکھا ہے۔" بانیتا کور اٹھ کر بیٹھ گئی تو میں پڑھا

"محترم جمال۔! میں نے کہا تھا نہ میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر میں اس احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد آپ میرے احسان مند ہوں گے تو میں ایک اہم بات بتا رہا ہوں، جس سے انسانیت کا بہت بھلا ہونے والا ہے۔ میں نے جو پہلی دوا تیار کی تھی، اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ وہ لوگ جو عادی مجرم ہیں اور انسانیت کے لیے قاتل ثابت ہو رہے ہیں، ان کا ذہن بدلنے کے لیے یہ دوا استعمال کرائی جائے۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے ذہین لوگوں کو اور زیادہ ذہین بنایا جائے۔ لیکن ہوا کیا اس کے اُلٹ۔ میری اس دوا کے بل بوتے پر ایک ایسی فورس تیار کی جا رہی ہے، جو دوسرے ملکوں میں جا کر تخریب کاری کریں۔ میرے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور اس فورس کی تیار کردہ کچھ لڑکیاں تمہارے ملک میں بھی آ چکی ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ مقامی بندہ کون ہے۔ لیکن یہ تو کر سکتا ہوں کہ تمہیں آگاہ کر دوں۔ میں نے جو دو شیشیوں کے ساتھ خط تمہیں دیا ہے، اس میں ان دواؤں کا فارمولا تمہیں لکھ کر دے دیا ہے۔ یہ فارمولا پہلی دوا کے ساتھ ہی دوسری دوا کا بھی لکھا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں تفصیل بھی درج ہے کہ یہ کیسے استعمال کرنا ہوگا۔ اگر ضرورت پڑے تو مزید بنا سکتے ہیں۔ ورنہ میں تو حاضر ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امن، صرف طاقت کے توازن ہی میں پوشیدہ ہے۔ امید ہے میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا یہ اچھا بدلہ ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ خط اس لیے دیر سے دیا ہے کہ تم مجھے اب روک نہ سکو۔ بھگوان کے لیے روکنا بھی نہیں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ رابطہ کروں گا۔"

میں خط پڑھ چکا تو کچھ دیر تک اس کے اثر میں رہا۔ پھر بانیتا کور کی آواز پر چونکا

"کافی پراسرار آدمی تھا۔"

"ہوں، دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے اب کسی کیمسٹ کو تلاش کرنا تھا جو بہت زیادہ تجربے کار ہو اور وہ اس فارمولے کے مطابق کام کر سکتا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں دور تک کوئی ایسا بندہ نہیں تھا۔ میں نے صبح اس بارے میں معلومات کا سوچا اور سونے کی تیاری کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ اسی وقت جسپال کا فون آ گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

"یار تمہارے لاہور میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ یہاں تو اس کا نام سندیپ کور تھا، اسے پکڑنا ہے، اس کے پیچھے لوگوں کو پکڑنا ہے، میں اس کا پتہ اور تصویر بھیج رہا ہوں، وہ ہماری ایک بہت اچھی دوست کی سہیلی ہے۔"

"تمہاری دوست کی سہیلی، ویسے کون ہیں وہ لوگ؟" میں نے پوچھا تو اس نے اختصار کے ساتھ وہ ساری کہانی سنا دی۔ پھر کہا۔

"یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں، اس کی آڑ میں کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون سے تصویر دیکھنے والا آپشن کھولتے ہوئے کہا۔ اس پر بانیتا کور نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کوئی کام نکل ہی آیا۔"

"ہاں لگتا تو ایسے ہی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے

اسے وہ سب بتا دیا جو جسپال سنگھ نے مجھے بتایا تھا۔اس نے بیڈ کی پشت گاہ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
"امرتسر، وہاں کہاں؟ میری نگاہ میں تو ایسا کوئی ادارہ نہیں، کہاں ہو سکتا ہے؟"
"یہ تم جانو اور تمہاری یادداشت۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"چلو دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے بے پروائی کے سے انداز میں کہا اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ سندیپ کور اچھی خاصی حسین لڑکی تھی۔ بھرا ابھرا جسم، گول چہرہ، موٹی نیلی آنکھیں، تلوار ناک اور پتلے پتلے رسیلے لب۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے طارق نذیر کو فون کیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔
"وہ ٹاؤن میں جو حادثہ ہوا، اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا؟" میں نے اس سے پوچھا
"صرف اتنا کہ چند لوگ آئے اور حملہ کر کے غائب ہو گئے۔"
"چلو، اب تم ایسا کرو، اپنے چند لوگ ساتھ لو، جب تیار ہو جاؤ تو مجھے بتانا، بہت ہی اہم مشن تمہارے ذمے لگا رہا ہوں۔"
"جی میں تیار ہوں جہاں کہیں گے پہنچ جائیں گے۔" اس نے کہا تو میں نے اسے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔
"میں وہیں تمہیں ملوں گا۔ میرے ساتھ میری ایک ساتھی بھی ہوگی، ہوگی کا مطلب ہوگی۔"
"جی میں سمجھ گیا، میں نکل رہا ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔
نہر کا پل پار کرتے ہی میں نے طارق کو فون کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ایک پوائنٹ پر اسے رُک جانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم آپس میں جا ملے۔ اس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ وہیں ساتھ میں ایک مارکیٹ تھی۔ وہاں موجود ایک ریستوران میں ہم جا بیٹھے۔ دو بندے اس گھر کی جانب بھیج دیئے تا کہ ایک چکر لگا آئیں۔ طارق بار بار بانیتا کور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس پر وہ محض ہنس کر رہ گئی۔
"میں اصل میں یہاں اس لیے رکا ہوں کہ پلان کے بارے میں بات کر کے کلیئر ہو جائیں۔" یہ کہہ کر میں ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "اس علاقے میں تم لوگ گھروں کے بارے میں جانتے ہو، سیکورٹی بھی ہوگی اور اندر سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔"
"اس کا میں نے بندوبست کیا ہے۔ پولیس فورس کی مدد لی ہے، اگر آپ کہیں تو انہیں بلوا لیں۔" طارق نے پوچھا تو میں نے کہا۔
"اگر اندر سے مزاحمت ہوئی تو، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔"
"میں کہتا ہوں، آخر اس آپریشن کے بارے میں جواب بھی تو دینا ہوگا۔" اس نے فون سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے لیکن یہ لڑکی ہر حال میں زندہ چاہئے۔" میں نے سیل فون پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سب نے تصویر دیکھ لی۔ ایسے میں ان دو بندوں کی طرف سے کال آ گئی، جنہیں گھر دیکھنے کو بھیجا تھا۔ طارق نے وہ کال سنی، پھر بتایا
"وہاں مکمل خاموشی ہے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں ممکن ہے اندر ہو۔ وہ کوٹھی صرف سامنے سے کھلی ہے، باقی تین اطراف میں گھر ہیں۔"
"چلو نکلیں۔" میں نے کہا تو ہم سب وہاں سے نکلتے چلے گئے۔
وہ سڑک مین روڈ سے دائیں جانب نکلی تھی۔ دور تک جاتی ہوئی اس سڑک پر اسٹریٹ لائیٹ کی منجگی روشنی تھی۔ وہ کوٹھی آگے جا کر دائیں جانب آٹھواں تھا۔ وہ ایک کنال پر تھی، جس کے وسط میں رہائشی عمارت تھی۔ میں نے اس کوٹھی کے عین سامنے جا کر کار روکی۔ تب تک ہم دونوں اسلحہ سے لیس ہو چکے تھے۔ ہم نے جو جیکٹیں پہنی تھیں۔ اس میں سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نکلے اور گیٹ پر

چلے گئے۔ اس دوران ایک لڑکا باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ اس نے اندر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ بانیتا کور نے اسے اشارہ کیا کہ اندر سے جا کر گیٹ کھول دے۔ وہ اندر کود گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ باقی میرے پیچھے آ گئے، دو بندے گیٹ کے پاس رک گئے۔

میں داخلی دروازے پر پہنچا اور اسے کھولا، وہ کھل گیا۔ سامنے صوفے پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت تھی، دوسرا مرد تھا جو سامنے دیوار پر لگے ٹی وی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جہاں کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ میں اور بانیتا کور دبے قدموں ان کے سر پر جا پہنچے اور پسٹل کی نال ان کے سروں پر رکھ دی۔ وہ ایک دم ہی سے سہم گئے۔ عورت کی تو گھگی بندھ گئی۔ وہ دونوں گھر کے مالک نہیں لگ رہے تھے

''جی جی، خدا کے لیے ہمیں کچھ نہ کہیں۔'' مرد ہمت کر کے بولا۔

''گھر میں اور کون کون ہیں؟'' بانیتا کور نے پوچھا۔

''کک...... کک...... کوئی نہیں، صاحب اور بیگم پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔'' مرد نے کہا۔

''کب آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں جی، کب آتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا تو میرے ساتھ کھڑے ایک بندے نے میرا اشارہ پا کر انہیں باندھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں کمرے میں لے گئے۔ طارق سمیت اب سب انفارم ہو گئے کہ اندر کیا ہوا۔ میں جلدی سے بیڈ روم میں گیا۔ وہاں سامنے دیوار پر شادی کی تصویر تھی۔ سندیپ کور عروسی جوڑے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ بانیتا کور کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں نے فوراً طارق کو بتایا اور نئی ہدایت دے دیں۔ جس سے ان کی آمد کو بالکل فطری کر دیا گیا تھا۔ جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ اندر کوئی ہے۔ یہ سب کرنے کے بعد گھر کی تلاشی لی جانے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بھرپور تلاشی کے بعد ایک کمرے سے کچھ اسلحہ ملا، اچھا خاصا زیور، بڑی تعداد میں نوٹ، ایک ڈائری، لیپ ٹاپ، اسکے علاوہ دوسرا ایسا کوئی سامان نہیں ملا جس سے وہ مشتبہ ثابت ہو سکیں۔ جہاں نوٹ تھے، وہاں سے دو پاسپورٹ بھی ملے، سندیپ کور کا نام اس پاسپورٹ پر سائرہ تھا، اور اس کے شوہر کا نام خرم اقبال تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ادھر ہی ہے۔

رات کے دو بجنے کو آ گئے لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ تقریباً سوا دو بجے کے قریب باہر سے اشارہ مل گیا کہ وہ آ گئے ہیں۔ سبھی الرٹ ہو گئے۔ گھر کے اس ملازم کو بتا دیا تھا کہ اگر اس نے ہمارے کہنے کا ذرا سا بھی انکار کیا تو موت کے حوالے ہوگا۔ اس کی بیوی ہمارے پاس تھی۔ باہر اس نے کار روکی اور ہارن دینے لگا۔ تبھی اسی ملازم نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ تو وہ اپنی گاڑی سمیت اندر آ گیا۔ اس وقت تک ہم داخلی دروازے کے پیچھے آ گئے تھے۔ وہ نشے میں تھا۔ اس لیے جلدی سے اندر آنا چاہتا تھا۔

سندیپ کور تصویر سے زیادہ حسین تھی۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا، اس میں وہ آدھی سے زیادہ برہنہ تھی۔ بلاشبہ اس نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی جھولتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ اندر آئی، ان کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیا گیا۔ ان کے لیے یہ اچانک تھا، خرم تو کوئی مزاحمت نہ کر سکا لیکن سندیپ نے اضطراری طور پر اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے وہ تربیت یافتہ تھی۔ لیکن بانیتا کور نے اسے گردن سے پکڑا اور زور سے قالین پر پھینک دیا، پھر پسٹل اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا سندیپ کور۔ ورنہ تیرا بدن چھلنی کر دوں گی۔''

اس کے یوں کہنے پر وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ تب تک دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ انہوں نے تیزی سے دونوں کو باندھا اور خرم کو باہر کھڑی ہائی ایس وین میں ڈال دیا۔ جبکہ سندیپ کور کو ہم لے گئے۔ بعد والوں نے ان دونوں ملازمین کو بھی اٹھا لیا۔ وہ اسی کارروائی میں تھے کہ ہم وہاں سے نکل پڑے۔

آدھے گھنٹے میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آ چکے تھے۔ سندیپ کور کو ایک کمرے میں لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ ہمارے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں رتی بھر خوف نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ مجھے انتہائی نفرت سے دیکھ رہی ہو۔ مجھے اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ لوگ یاد آنے لگے، جنہوں نے ریستوران میں مجھ پر حملہ کیا تھا اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''کچھ نہیں، ہم نے تو تجھے بچایا ہے۔'' بانیتا کور نے کہا تو وہ نفرت سے بولی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ سر مارتے ہوئے بولی۔

''کیوں، ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟'' بانیتا کور نے کہا۔

''پھر مجھے اس طرح باندھا کیوں ہوا ہے، اگر تم لوگ میرے ہمدرد ہو تو مجھے کھول دو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''کھول دو۔'' میں نے کہا تو بانیتا کور نے ایک نگاہ میری طرف دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر اسے کھولنے لگی۔ اسے کھولنے کی دیر تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے یوں نکلی جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ اس نے ایک ہاتھ بانیتا کور کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر رکھا اور اسے پرے دھکیل دیا۔ بانیتا لڑکھڑا گئی، اس نے اسی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور اپنا گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا، وہ دہری ہوگئی، سندیپ نے اپنی کہنی اس کے سر پر ماری اور اسے گرا دیا۔ بانیتا کور کو امید نہیں تھی کہ وہ ایسا کرے گی یا کرسکتی ہے۔ اسی لمحے سندیپ نے چھلانگ لگائی اور دروازے کی جانب بڑھنا چاہا۔ تب تک بانیتا کور اٹھ گئی تھی اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس پر جھپٹی، میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سندیپ یوں اس کی پہنچ سے نکلی کہ وہ اس چھو بھی نہ سکی۔ بانیتا کور غصے میں آ گئی تھی اور یہی غصہ ایک فائیٹر کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔ سندیپ گھومی اور اس نے بانیتا کو بڑھا ہوا بازو پکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکا دیا، وہ پھر لڑھک گئی۔ اس بار سندیپ نے حملہ نہیں کیا بلکہ مجھے نگاہ میں رکھتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے میرے اور دروازے کے فاصلے کا تعین کر لیا تھا۔ اسی مناسبت سے وہ آگے بڑھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ باہر نکل جائے گی، میں اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے مجھے دور رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو یوں بڑھایا کہ جیسے وہ مجھ پر حملہ کرے گی۔ میں جیسے ہی اس کے قریب گیا اس نے پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی میرے منہ پر مارنا چاہی، میں اسے جھکائی دے گیا۔ لیکن اس کی انگلیاں میرے چہرے کو چھو گئیں۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ پیچھے کی طرف زور لگانے لگی تو میں نے اسے چھوڑ دیا وہ لڑھک کر فرش پر گری، پھر جیسے ہی جمپ لگا کر اٹھی اور باہر کی طرف کودتے ہوئے پوری قوت سے پنچ میرے منہ پر مارا۔ تبھی میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گرفت میں لے لیا۔ یہ سب کچھ انتہائی تیزی سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ میں نے محسوس کیا جیسے سندیپ کی جان ہی نکل گئی ہو۔ اس کا جسم ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یوں میرے ساتھ لگ گئی جیسے میرے بدن میں گھس جانا چاہتی ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ یوں خمار آلود انداز میں میرے ساتھ چمٹ گئی جیسے وہ بھرپور نشے میں ہو۔ میں چونک گیا کہ اسے کیا ہوا۔ اس وقت تک بانیتا کور اٹھ گئی تھی اور تیزی سے سندیپ کی طرف آئی، اس نے آتے ہی اسے گردن سے پکڑا اور کھینچ کر پیچھے کی طرف لے گئی، سندیپ نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، بانیتا کور بھی اس کے ڈھیلے اور بے جان جسم کو محسوس کر کے حیران ہوگئی۔ اس نے سندیپ کو مارا نہیں بلکہ اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک لمحہ کو یونہی بیٹھی رہی، پھر یوں اٹھی جیسے نشے میں ہو۔ اس نے میری جانب دیکھا اور میری طرف آئی۔ میں کھڑا رہا۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ پھر اپنا چہرہ آہستہ آہستہ میرے سینے سے رگڑنے لگی۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کے منہ سے سسکاریاں نکلنے لگیں جیسے وہ بے تحاشا لذت محسوس کر رہی ہو۔ میں اس کی یہ حرکت قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اس کو دونوں کاندھوں سے پکڑا اور اسے

لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ یوں میری جانب دیکھنے لگی، جیسے کسی پیاسے کے منہ سے پانی کا پیالہ ہٹا لیا جائے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی بجائے ایسی قربان ہونے والی چاہت جھانک رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ اسے ہوا کیا ہے؟ یہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ تبھی بانیتا کور نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا تجھے؟''

''کچھ نہیں، اب جو چاہو کرو، میرا بدن حاضر ہے۔'' سندیپ نے میری طرف یوں دیکھ کر کہا جیسے اس نے اپنا آپ مجھے سونپ دیا ہو۔ بانیتا کور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس سے پھر پوچھا لیکن میری سمجھ میں سندر لعل کی بات گونج گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مہک صنف نازک کو پاگل کر دینے والی ہے۔ کیا سندیپ اس قدر پاگل ہو گئی ہے؟ بانیتا کور بھی تو صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے، اس کچھ کیوں نہیں ہوا؟ میں نے بانیتا کور کو اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔ میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے محبت پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''کوئی اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا، میرا اپنا ہی کوئی مجھے پہچان سکتا ہے۔''

''میں تو تمہارا اپنا نہیں ہوں، تم نے کیسے جان لیا کہ میں تمہارا اپنا ہوں۔'' میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ مہک دنیا میں کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ یہ صرف ہمارے ہی لوگ لگاتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں سندر لعل اور جسپال سنگھ کی باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ میں نے اسی لمحے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ بہت بڑی کمزوری ہوئی۔ کیا اتنا اثر لیتے ہو تم لوگ؟ کیا باقی لڑکیاں بھی اسی طرح مدہوش ہو جاتی ہیں؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے، شاید دوسری ایسی مدہوش نہ ہوتی ہوں لیکن میں ہو جاتی ہوں۔ یہ مہک میرے تن بدن میں رچ چکی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی مہک لگاتا ہے۔ جس نے مجھے ایک نئے جہان سے آشنا کیا۔ یہی مہک میرا بدن مہکا دیتی ہے، آگ لگ جاتی ہے مجھے، آؤ اب دیر مت کرو، مجھے جھنجھوڑ ڈالو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بدن پر پہنی ہوئی مختصری شرٹ زور سے پکڑ کر پھاڑ دی۔ وہ پورے سینے سے برہنہ ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے کہا۔

''ابھی وقت نہیں،'' پھر باہر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''میں اسے بھیج دوں، اتنے میں تم فریش ہو جاؤ۔ پھر بیڈ روم میں چلتے ہیں۔''

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مان گئی۔ وہ اٹھی اور کسی ربورٹ کی طرح باتھ روم کی جانب چل دی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ اتنے میں بانیتا کور نے جھانک کر دیکھا تو میں نے اشارے سے اسے بلایا اور اس کی جانب اشارہ کر کے چپ چاپ نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پورا لباس پہنے آ گئی۔ وہ کافی حد تک ہوش میں تھی۔ میں نے اسے خود سے پرے رکھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو کچھ کھانے کے لیے کہا۔ تھا، وہ کافی کچھ پھل، بسکٹ اور کیک کے ساتھ چائے دے گئے۔ ہم ڈائننگ ٹیبل کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھا اور شرمندہ سے انداز میں کہا۔

''سوری، میں پاگل ہو گئی تھی۔''

''دیکھو! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دوست ہیں۔ ہم تمہیں قطعاً نقصان نہیں پہنچانے والے بلکہ ہم تو پجن کور کے......''

''پجن کور، تم جانتے ہو اسے؟'' اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں اور اسی کے کہنے پر یہاں آئے ہیں، اور اب تمہیں واپس لے کر جانا ہے، تم غلط ہاتھوں میں پھنس چکی ہو، یہی تمہیں بتانا تھا، ٹھہرو، میں تمہاری

بچن کور سے بات کراتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سیل فون پر بچن کور کے نمبر ملائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہیلو۔

کیا ہوا، وہ ٹھیک تو ہے۔''

''اب قدرے نارمل ہے۔ بچن کور سے بات کرنا چاہتی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''یہ ساتھ ہی بیٹھی ہے۔'' اس نے کہا تو بلاشبہ اس نے فون بچن کی جانب بڑھا دیا۔ تبھی اس نے ہیلو کہا تو میں نے فون سندیپ کور کی جانب بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ سندیپ کور رونے لگی۔ آخر میں اس نے یہی کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے تم کہو، میں وہی کروں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے یہی بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور اسے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے لگی اور اس دوران روتی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ پھر یکلخت بولی۔

''پوچھیں، کیا پوچھنا ہے آپ لوگوں نے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ تم کھانا کھاؤ بس۔''

وہ سکون سے کھانے لگی۔ پھر خود ہی بتانے لگی۔

''میں امرتسر سے ہوں۔ اور وہیں سے آئی ہوں۔

مجھے بتاؤ تمہارا وہ انسٹیٹیوٹ کہاں ہے امرتسر میں؟'' بانیتا کور نے پوچھا تو وہ بتانے لگی۔ سندیپ کور ہر وہ بات بتاتی چلی گئی جو بھی اس سے پوچھا گیا۔ میں نے پہلی بار کسی کو ایسے دیکھا تھا، جس نے اتنی نفرت دکھائی اور پھر اس قدر تابعداری سے سب کچھ بتائے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ جب بانیتا کور اسے ایک کمرے میں چھوڑ آئی۔

میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں یا نہ کروں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خوشبو نے مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کا آپس میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ اور وہ باس بھی اس سے کہیں الگ نہیں تھا۔ یہ راز کب کھلے گا، مجھے اسی کا انتظار تھا۔ میں جلد از جلد باس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں سویا نہیں، بلکہ میں نے سب سے پہلے اروند سے رابطہ کیا۔ اسے ایسے ہی ادارے کے بارے میں بتایا۔ اروند نے اسی وقت کراچی سے فہیم کو آن لائین لے لیا۔ وہ بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑی سی نیند لینے کے بارے میں کہا اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں بیڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ مجھے سندر لعل کے خط کا خیال آیا۔ میں اٹھا اور اپنے سامان کی طرف گیا۔ وہاں سے وہ پیکٹ لیا جس میں دوائیاں اور لفافہ تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دو پرچے تھے۔ ایک پر فارمولے کی زبان تھی اور دوسرے میں ان دونوں دوائیوں کے بارے میں درج تھا۔ وہ دوا جو پہلی دوائی کا اثر توڑنے والی تھی۔ سندیپ کور کے بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے درج ہدایات کے مطابق وہ دوا لی اور سندیپ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ایک گلاس پانی میں ایک قطرہ دینا تھا۔ وہ میں پانی کے گلاس میں ڈالا اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سونے کی کوشش میں تھی۔ میں وہ پانی اسے دے کر پینے کو کہا۔ وہ پانی پی گئی۔ میں وہاں سے آ گیا۔ سونے سے پہلے میں اس سیف ہاؤس کے ہیڈ کو الرٹ کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر نیند لے لوں۔

☆......☆......☆

جسپال اس وقت واپس اوگی کی جانب چل پڑا تھا، باقی سب میں سے آدھے جالندھر کی جانب چلے گئے اور آدھے واپس نکودر چلے گئے۔ نوتن کور کو فارم ہاؤس پر ہی رہنے کو کہا گیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ دن تک اس انسٹیٹیوٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے، پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔ اس دوران الیکشن مہم میں کسی کو بھی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں مدد کی جائے گی۔ جسپال کو مہم تیز کرنے کے بارے میں کہہ دیا گیا

تھا۔اسی لیے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑا تھا۔
جسپال اس وقت اوگی پنڈ سے تھوڑی ہی فاصلے پر تھا جب اسے ہرپریت کی کال ملی۔
''وہ کہاں ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔لیکن لہجہ کسی پریشانی کی چغلی کھا رہا تھا۔
''خیریت تو ہے نا پریتو؟'' اس نے خوشگوار انداز میں کہا، جس پر وہ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
''اوگی تھانے سے پولیس آئی ہے،ان کے ساتھ نکودر کی بھی پولیس ہے۔ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔اور.....'' اس کے ساتھ ہی ہرپریت کی آواز آنا بند ہوگئی لیکن فون کال نہیں کٹی تھی، اگلے ہی لمحے کسی بھاری آواز والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''اور اگر تم نہیں آئے تو ظاہر ہے ہمیں یہیں سے کسی کو لے کر جانا ہوگا۔تم کب تک پہنچ رہے ہو۔''
''دیکھو۔! گھر کی کسی عورت سے بدتمیزی نہ ہو۔اور تم لوگ گھر سے باہر نکل کر میرا انتظار کرو، میں دس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔میں گھر کے قریب ہی ہوں۔''
''ارے،تم بھاگ کیوں نہیں جاتے، ہم تمہیں ہار پہنانے نہیں، گرفتار کرنے آئے ہیں، اور ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔دس منٹ ہی ہیں تمہارے پاس۔'' یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔
جسپال نے وقت دیکھا اور سب سے پہلے نوتن کور کو فون کر کے انتہائی اختصار سے ساری بات بتا دی، پھر فون بند کر کے انوجیت سے رابطہ کیا، اس نے فون ریسیو کیا تو پتہ چلا کہ اسے ابھی پتہ چلا ہے اور وہ گھر کی طرف آ رہا ہے۔جسپال نے بلبیر سنگھ پنچ کو فون کرنے کا کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھنے کی بجائے ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔پھر اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ رکھا ہوا پسٹل نکال کر وہیں رکھ دیا۔وہ انتہائی تیز رفتاری سے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔
اس نے دور سے ہی دیکھ لیا۔اس کے گھر کے سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔جسپال کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ یونہی نہیں آئے ہیں، بلکہ کوئی پکا کاغذ لے کر ہی آئے ہوں گے۔اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔اس لیے اس نے کار لے جا کر گیٹ پر روک دی۔پھر بڑے سکون سے اتر کر اندر چل دیا۔راستے میں جا بجا پولیس والے کھڑے تھے۔تبھی پورچ میں وہی اے سی پی دکھائی دیا۔جسپال چلتا ہوا اس کے پاس جا ٹھہرا۔
''ویل کم، جسپال سنگھ ویل کم، دیکھو، میں تمہیں تمہارے گھر پر ہی تمہیں ویل کم کہہ رہا ہوں۔خیر۔! میں تمہیں گجندر سنگھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''
''بالکل بھی نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک ذمہ دار آفیسر ہیں، بنا کسی گیدڑ بھبکی کے آپ نہیں آئے ہوں گے۔دکھائیں گے مجھے وہ گیدڑ بھبکی؟'' جسپال نے کہا تو اے سی پی نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔اور طنزیہ لہجے میں کہا۔
''یہ لو۔''
جسپال نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔اسے شک میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔اس نے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھا اور اسے کہا۔
''میں نے کہا تھا کہ گھر سے باہر رہنا، مگر تم پھر بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔کس کی اجازت سے؟''
''بہت ہوگئی اخلاقی گفتگو، اب چلو۔'' پھر اپنے کسی ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا۔''گرفتار کر لو اسے؟''
اگلے ہی لمحے ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس کے ہتھ کڑی لگا دی گئی۔جسپال نے دیکھا، دروازے کی اوٹ میں سے ہرپریت اسے دیکھ رہی تھی۔اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور پلٹ پڑا۔انہی لمحات میں انوجیت کی کار اندر داخل ہوئی۔وہ جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے بولا۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ.....''
تبھی اے سی پی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''تم اگر الیکشن میں امیدوار ہو تو صرف امیدوار ہی

رہو، قانون کے راستے میں مت آؤ۔ ہم نے اسے ہر قیمت پر لے کر جانا ہے سمجھے، اس لیے خاموش ہو جاؤ۔"

"تم غلط کر رہے ہو، میں جانتا ہوں......"

"تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو۔ پرے ہٹ جاؤ۔" اے سی پی نے حقارت سے کہا تو جسپال نے سرد لہجے میں کہا۔

"اے سی پی، اپنی بکواس بند رکھو، اور کتے کی طرح بھونکنا بند کرو۔"

اس پر اے سی پی نے حیرت اور غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا۔ "شٹ اپ۔ اجب میں تیرے ساتھ جا رہا ہوں تو جا رہا ہوں، کسی بھول میں مت رہنا کہ تم مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے ہو۔ میں چاہوں تو اب بھی تیرے ساتھ جانے سے انکار کر سکتا ہوں۔ جانا ہے یا ادھر ہی رہنا ہے۔"

غصے میں اے سی پی سے بولا نہیں گیا۔ اس نے گھور کر دیکھا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ اسے لے کر چل دیئے۔ جسپال چلتا ہوا پولیس وین میں جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وین چل دی۔

☆......☆......☆

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں نہایا تو وہی بھینی بھینی مہک پھر سے تازہ ہو گئی۔ بھوک کا احساس ہونے کے باوجود میرا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں لان میں چلا گیا۔ وہیں مجھے چائے دے دی گئی۔ میرا ذہن باس میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی فون کال نہیں آئی تھی۔ اروند اور فہیم بھی اسے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ تھوڑا بہت اگر کامیابی ملی بھی تھی تو پھر بھی کنفرم نہیں کر پائے تھے۔ میرا اضطرب بڑھنے لگا۔ میں اب اروند یا فہیم کو بار بار فون کر کے تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چائے پی رہا تھا کہ ولید کی کال آ گئی۔ میں نے رسیو کرتے ہوئے کہا۔

"سوری۔ میں دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا، میں......"

"سر، آپ مصروف ہوں گے، بھی رابطہ نہیں کیا، میں اب بھی نہ کرتا اگر مجھے آپ سے ایک اہم کام نہ ہوتا۔" اس نے کافی الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ولید! خیر تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"خیر ہی ہے، آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو بتاتا ہوں نا جی میں۔" وہ اسی لہجے میں ہی بولا۔

"کہاں ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"میں کل سے یہیں لاہور ہی میں ہوں۔ آپ کی فون کال کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا

"ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں نے ایک دم ہی اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں فون بند کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس وقت سندیپ کور اپنے کمرے میں تھی اور بانیتا کور جاگ گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر باہر جانے کے لیے کہا اور کار لے کر نکل گیا۔ میرا رخ علامہ اقبال ٹاؤن کی جانب تھا، جہاں ولید میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں جس وقت نہر کے پل پر پہنچا اس وقت مغرب ہو چکی تھی۔ میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسی وقت میرے من میں نجانے کیوں شاہ جمال کے مزار پر ملنے والے وہی سفید ریش بزرگ مجھے یاد آنے لگے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد یونہی نہیں ہے۔ اس لیے جیسے میں فیروز پور روڈ پر چڑھا تو پھر چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ بابا شاہ جمال کے مزار تک جا پہنچا۔ میں نے کار پارک کی اور اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا وہی بزرگ انہی قبروں کے درمیان سفید کپڑا بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں مسکراتے ہوئے ان کے پاس چلا گیا، انہوں نے میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔"

میں ان کے سامنے جا بیٹھا۔

"کیا میں نے تمہیں دیا نہیں دکھایا تھا، اس کے بارے میں بتایا نہیں، کیا تم اسے نہیں سمجھے ہو؟"

"حضور، اگر میں نہیں سمجھا تو آپ پھر سے مجھے سمجھا دیں۔" میں نے عاجزی سے کہا تو چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کثرت جو ہے یہ

وحدت سے ہے اور وحدت ہی سے ساری کثرت ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی تم سے جڑا ہے تو کیوں نہیں تم اس سے جڑ جاتے ہو۔ بس ذرا سا دھیان دو۔"

"کیسے؟ کیسے دھیان دوں بابا جی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اچھا تمہیں پھر ایک اور بات بتاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔" تمہارے خیال میں دیئے کی حقیقت کیا ہے؟"

"حضور آپ بہتر سمجھتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"دیئے کی حقیقت روشنی ہے۔ روشنی نہ ہو تو دیا بھی نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں کھول کر ہی بیان کردوں، دیئے کو روشنی نے وجود دیا ہوا ہے۔ دیئے کو جسم سمجھ لو اور جسم میں روشنی نہ ہو تو کسی کی بھی پہچان ممکن نہیں ہے۔ روشنی کی حقیقت سمجھ میں آ گئی تو سمجھ لو کوئی بھی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"روشنی کی حقیقت کیا ہے؟" میں نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔ تو بولے۔

"جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے زمان و مکاں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دن، رات اور دن رات کے اندر انقلابات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور جو حقیقی زمانہ ہے وہ اس کے اندر ہے اور یہ اس کی ایک جھلک ہے۔ یہ سلسلہ روز و شب ہی ہے جس میں زندگی اور موت دیکھی جا رہی ہے مطلب پیدا ہونا اور مر جانا۔ یہ تغیرات کی نشانی ہے۔ تغیرات اور انقلابات اسی زمانہ کی تسلسل حرکت سے پیدا ہو رہا ہے۔ چونکہ ذات تغیرات اور انقلابات سے منزہ ہے، اس لیے وہ زماں و مکاں سے بالاتر ہے۔ یہ سلسلہ روز و شب اس کی تخلیق ہے، سمجھو کن فیکون کا تسلسل ہے۔ ازل کے ساز سے ایک نغمہ نکل رہا ہے یعنی زمانہ ذات کی تخلیقی فعالیت کا مظہر ہے اور بقید زمان و مکان میں عالمِ وجود میں چلی آ رہی ہیں۔ زمانہ بلاشبہ کائنات میں سب سے بڑا کھرا کھوٹے کا پرکھنے والا ہے، چنانچہ جو افراد اور معاملات ناقص ہوتے ہیں۔ زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔ سلسلہ روز و شب کی اصل حقیقت یا اصل زمانہ جس میں نہ دن ہے نہ رات محض حال ہی حال ہے، نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل۔ یہ زمان خالص ایک رُو ہے، جس میں مسلسل حرکت ہے۔ زمانہ زندگی ہے اور زندگی زمانہ ہے۔ اگر زمانے کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دل میں غوطہ لگاؤ، عشق اختیار کرو کہ عشق اصل حیات ہے اور زمانے کی دستبرد سے بالاتر ہے۔ عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام......"

"عشق کا زماں کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے؟" میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

"عشق، مومن کے اعمال میں رنگِ دوام پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ عشق اصل حیات ہے۔ اس پر فنا طاری نہیں ہوتی۔ اگرچہ زمانہ تیز تر، تند اور انتہائی رفتار رکھتا ہے۔ لیکن عشق اس سے بھی بڑھ کر سبک رفتار ہے۔ اس لیے وہ زمانے پر غالب آ جاتا ہے اور اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ عشق بڑی کامیابی سے زمانے کا مقابلہ کرتا ہے۔ زمانہ ہر شے کو فنا کر دیتا ہے مگر عشق کو فنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ عشق کے سامنے بے بس ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب بابا جی یہ بھی فرما دیں کہ روشنی اور عشق میں کیا تعلق ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وحدت کی روشنی عشق ہے۔ دیئے کی مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ظاہری روشنی کے بغیر کچھ بھی دیکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح عشق کی باطنی روشنی کے بغیر کسی بھی شے کی حقیقت کو دیکھنا اور جاننا ممکن نہیں ہے۔ اور جان لو کہ روشنی روشنی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔" انہوں نے خود لطف لیتے ہوئے کہا تو میں نے تجسس سے پوچھا۔

"بابا جی یہ کیسے، اس بات کو کھولیں؟"

میرے پوچھنے پر وہ بے ساختہ بولے۔

"اتباع...... اتباع محبوب۔" یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرائے پھر جھوم کر بولے۔ "اللہ کا رنگ کیا ہے، صبغت اللہ۔ اللہ کا رنگ، اتباع ہی سے چڑھتا ہے۔ یہ رنگ وہیں سے ملتا ہے۔ اب سنو! یہ کیسے چڑھتا ہے۔"

"حضور فرمائیں۔" میں نے شوق سے کہا۔

"قطرہ آب نیساں جو صدف کی آغوش میں چھپ جاتا ہے۔ جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے، پردہ میں چلا جاتا ہے خلوت میں گوہر بن کر جلوت یعنی عالم ظاہر میں ظہور پا جاتا ہے۔ جب پانی کی بوند خودی کا حرف یاد کر لیتی ہے، اس میں خودی کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتی ہے۔"

"واہ، سبحان اللہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور وہ جذب میں کہہ رہے تھے۔

"عشق و مستی سے، سچی بے خودی سے، جسم و جان، موت و حیات، مکان و زمان سے گذر کر، دل میں ڈوب کر، خلوت میں، حق سے محکم ہو کر، اپنی خودی کو پا کر پھر کائنات میں ظاہر ہو کر، اپنے جان و جسم کو تسخیر کر کے کائنات کو مسخر کر لو۔"

"عشق کی اس منزل خودی تک فوری طور پر رسائی کیسے ممکن ہے۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"خودی ایک آنکھ سے اپنی خلوت کا مشاہدہ کرتی ہے اور دوسری آنکھ سے جلوت یعنی کائنات کا تماشہ کرتی ہے۔ اگر ایک بند ہو جائے تو گناہ ہے اگر دونوں آنکھوں سے دیکھتی ہے تو عین راہِ سلوک ہے، یہی طریقِ قلندر ہے۔"

"کیسے بابا جی۔" میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

"وہی...... جیسے دیے کو روشن ہونے کے لیے اپنے وجود یعنی تیل کو جلانا پڑتا ہے ویسے ہی قلندر اپنے محبوب سے عشق کی آگ میں جلتا ہے تو خودی کی روشنی حاصل کرتا ہے۔ یہ وہی روشنی ہے جو ربِ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو دی اور انہوں پوری کائنات میں تقسیم فرما دی۔ سن لو! خودی کیا ہے، غلامیِ محبوب ﷺ اور عشق رسول ﷺ ہے۔"

انہوں نے کہا۔ اور جذب سے شعر پڑھنے لگے۔

مقامِ مصطفیٰ ؐ در دلِ مسلماں است
آ بروئے ما از نام مصطفیٰ ؐ است
موت و حیات نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
پسند رُوح و بدن کی ہے وَا نمود اس کو
کہ نہایتِ مومن ہے خودی کی عریانی
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کی پیچھے نہ حد سامنے
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی ﷺ
زمین و آسمانوں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ساری خدائی

"واہ۔! قلندر لاہوری نے خودی کو کیسے بیان کیا۔" میں نے جذب میں کہا۔

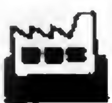
"بس اتنا سمجھ لو، اتنا، جب حضرت اقبالؒ کے ہاتھوں میں آئی تو خودی بنی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اٹھے، سفید کپڑا اسمیٹا اور ایک جانب چل دیئے۔

میں نے غور کیا، میرے سامنے سب کچھ کھل گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور خودی کا جوہر میرے ہاتھ میں ہوگا۔ مجھے خود پر رشک اور اپنے دشمنوں پر پیار آ رہا تھا۔ جن کی کوششوں سے آج میں اس عالی قدر راز تک رسائی حاصل کر گیا تھا۔

میں اٹھا اور چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں یہ کائنات تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میرے سامنے ایک نئی دنیا طلوع ہو رہی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



اللہ بخش

انور گریوال

کبھی کبھی انسان کے ساتھ ایسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں جنہیں وہ تاحیات فراموش نہیں کرسکتا۔ قیام پاکستان کے وقت بھارت سے ہجرت کرنے والوں کے ساتھ بھی ایسی ہی کچھ ناقابل فراموش واقعات پیش آئے جو انہوں تازندگی یاد رہیں گے۔

بھارت سے ہجرت کرنے والے ایک شخص کا احوال' وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی پڑھا لکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے بتاتے ہوئے صراط مستقیم کی پہچان عطا فرما دی تھی۔

گوجرہ سے مغرب کی جانب کوئی گیارہ کلومیٹر دور ایک گاؤں کا ایک ویران سا چھوٹا سا قبرستان ہے، جس نے پہاڑی کیکروں، سرکنڈوں اور جھاڑیوں وغیرہ کی بھرمار کی وجہ سے خوفناک سی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ قریبی کھالوں میں مسلسل نہری پانی چلنے کی وجہ سے بھل کے بہت بڑے بڑے ٹیلے بھی ماحول کی ویرانی اور افسردگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے قرب وجوار میں کوئی آبادی بھی نہیں۔ کئی برس قبل اس قبرستان میں تیس سے زیادہ قبریں تھیں، مگر اب وہ حالات کے بے رحم تھپیڑوں کی نذر ہوچکی ہیں۔ اب وہاں صرف تین قبریں باقی ہیں، سال میں ایک دو مرتبہ اس قبرستان کی صفائی کردی جاتی ہے، مگر چند ہی ماہ بعد ماحول جنگل کا روپ دھار لیتا ہے۔ زمین شور زدہ اور کلراٹھی ہونے کی وجہ سے قبریں بھی بکھرنے لگتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی مرمت بھی کردی جاتی ہے۔ بچی ہوئی ان تین قبروں میں دو پہلو بہ پہلو ہیں، ایک میں ماں انچاس برس سے اور دوسری میں بیٹا باون سال سے محوِ خواب ہے۔ تیسری قبر ماں کے قدموں کی طرف ہے، اس میں بیٹے کی زوجہ اور ماں کی بہو چوبیس نومبر ۲۰۰۲ء سے تہہ خاک محو استراحت ہے۔

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی پڑھا لکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے بتائے ہوئے صراط مستقیم کی پہچان عطا فرمادی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی ابتدائی چوبیس بہاریں بھارت (لدھیانہ) میں گزاریں۔ اور اُسی سال وہ اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے کے لیے حاصل کیے گئے ملک پاکستان اپنے خاندان سمیت چلا آیا۔ ہجرت کی سختیوں سے یوں آگاہی اس کے حصے میں آئی کہ راستے میں اس کی طبیعت خراب ہوگئی، خاندان کے باقی افراد چلے آئے، مگر وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا کئی ماہ بعد اپنے خاندان سے آکر ملا۔ پاکستان میں مختلف شہروں میں قیام کرتے ہوئے آخر گوجرہ (فیصل آباد) میں مستقل قیام پذیر ہوگیا۔ اس نے اپنی اصول پرستی اور فطرتِ سلیم کی بنا پر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ وہ فلاح و بہبود کے کاموں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ وہ اپنی محدودی دنیا کا اہم رکن بن گیا۔ اس کی دوستی کا معیار دینداری تھا۔ اللہ کی قدرت ہے کہ ایک نظریہ کے لوگ اکٹھے ہوجایا کرتے ہیں، خواہ وہ بنیاد اچھی ہو یا بری، طبیعت ایک سی ہو تو قربتیں فطری بات ہیں۔ اس نے دیکھا کہ شہر میں بہت سے لوگ اسی نظریے کے حامی ہیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہوگیا اور ان کے شانہ بشانہ چلنے لگا۔ ان لوگوں کا طریقہ تھا کہ وہ اپنی تربیت کے لیے کچھ عرصہ بعد اکٹھے ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ اس نے بھی پروگرام بنایا کہ وہ بھی اس اجتماع میں شریک ہو، جہاں دعوتِ حق کے علمبردار اشاعتِ دین کے لیے پورے ملک سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس غرض کے لیے اس نے رختِ سفر باندھا، اپنی بچی کو ساتھ لیا اور اجتماع میں شرکت کرنے کے لیے لاہور پہنچ گیا۔

ان لوگوں کے لیڈر کا قول تھا کہ ''اگر تم لوگوں کے راستے میں رکاوٹ نہ آئے، تو سمجھ لو کہ تمہارا راستہ مشکوک ہے۔''

بہر حال اب کے ایسی رکاوٹ آئی کہ ان کے راستے کے درست ہونے کا واضح ثبوت مل گیا۔ یہ قصہ ۱۹۶۳ء کا ہے، ملک پر ایوب خان کی حکومت تھی، آمریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ تاریخ پچیس اکتوبر اور دن جمعۃ المبارک کا تھا۔ حکومت نے اجتماع کو ناکام بنانے کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کا متبادل بندوبست یہ کیا گیا کہ ایک طرف سٹیج تھا، تو کچھ کچھ فاصلے پر میز رکھے گئے، جن پر افراد نے کھڑے ہو کر اپنے لیڈر کی آواز کو آگے پہنچایا۔ ان کا لیڈر ایک یا دو جملے بولتا تھا، وہی جملے ایک میز پر کھڑا مکبّر ادا کرتا تھا اور اسی طرح دوسرا اور آگے سے آگے۔ یوں آخر تک قائد کا پیغام پہنچتا تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو ایک طرف سے شور سا بلند ہوا، ہنگامہ بڑھا تو تشویش بڑھی۔ کتابوں کے اسٹال الٹنے لگے، قناتوں کی رسیاں کٹنے لگیں، خواتین کے کیمپ میں بوتلیں برسنے لگیں۔ ایک طرف لاؤڈ اسپیکر نہیں کہ اس قسم کی صورت حال کا مائیک پر اعلان کیا جائے، دوسری طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ کرائے کے حکومتی غنڈے تھے، جنہیں ہر قسم کے سرکاری تحفظ کا یقین دلا کر اجتماع الٹانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہنگامہ آرائی اور ہوائی فائرنگ کے دوران ایک گولی خواتین کے خیمے پر تعینات اسی دیہاتی کے سینے پر لگی اور چند ہی لمحوں میں وہ اپنا فرض زندگی چکا گیا۔ پاکیزہ صفت، سفید پوش، سیاہ ریش دیہاتی خون سے لت پت ہو کر سڑک پر گرا، تڑپا اور اس فانی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت تک اس نے عمرِ عزیز کی چالیس بہاریں دیکھی تھیں۔ لوگوں نے شہید کی میت کو ساتھ والے کیمپ میں رکھ دیا، اجتماع کی کارروائی معمولی تعطل کے بعد جاری ہو گئی۔

قاتل آزاد تھا، پکڑنے والا قانون خاموشی کی بُکل میں منہ چھپائے کسی کونے میں بیٹھا تھا۔ ایک کارکن نے قاتل کو پکڑ لیا، اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا، پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بعد میں پولیس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اجتماع میں آئے ہوئے صوبہ خیبر پختونخوا (تب سرحد) کے کارکنوں نے اپنے قائد سے قاتلوں سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی، انہیں جواب ملا کہ یہی تو حکومت چاہتی ہے کہ ہم جذباتی ہو کر بدلہ لیں او ر حالات خراب ہوں اور حکومت کو ایکشن کرنے کا موقع ملے۔ فائرنگ کے دوران یہی وہ موقع تھا جب قائدین نے سید مودودی کو بیٹھ جانے کے لیے کہا، اس موقع پر انہوں نے تاریخی الفاظ کہے، ''اگر میں بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا؟'' وہ مقتول جب گاؤں سے گیا تھا تو عام دیہاتی تھا، مگر جب لوٹا تو اللہ بخش شہید تھا، اس کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی (جو کہ اس کے ساتھ تھی) ایک عام دیہاتی بچے تھے، مگر اپنے باپ کی واپسی پر وہ یتیم تو ہو چکے تھے، مگر ایک شہید کی اولاد قرار پائے۔ ترپن برس قبل آبادی بہت کم تھی، اس وقت تیز رفتار ٹریفک تھی اور نہ ہی برق رفتار میڈیا۔ اس کے گاؤں میں بجلی کا گزر بھی نہ ہوا تھا، ٹیلی فون کا تو تصور بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے لوگ بہت جلد سو جایا کرتے تھے۔ گاؤں میں کھیتوں میں کام تو مغرب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، لوگ گھر پہنچ کر کھانا کھاتے اور عشاء کی نماز کے بعد تو بہت ہی کم لوگ جاگتے تھے۔ جب گاؤں کو مکمل خاموشی نے اپنے دامن میں ڈھانپ رکھا تھا، جب سارا عالم محوِ خواب تھا، فضا میں خنکی اتر آئی تھی، ایسی خنکی جس سے پلکیں بوجھل ہو جایا کرتی ہیں۔ جب دن بھر کے تھکے ماندے کسان نیند کے ہاتھوں بے بس ہو چکے تھے۔ ایسے میں لوگوں نے گھرر گھرر کی آوازیں سنیں، بہت سے لوگ ہڑ بڑا کر اٹھے، چھوٹا سا گاؤں ایک ہی خاندان کی صورت رہتا تھا، بڑے دیکھنے کو لپکے، خواتین بھی آنچل سنبھالے دروازوں کے پاس آ گئیں، لڑکے بالے بھی جاگ گئے، یہ کیسی آواز ہے، یہ کیا منظر ہے؟ ان کے گاؤں میں ایک ٹرک آیا تھا، انہوں نے اس سے قبل اپنے گاؤں میں ٹرک نہ دیکھا تھا، ان کے لیے یہ نہایت اہم واقعہ تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس ٹرک پر انہی کے گاؤں کا سب سے نمایاں شخص اللہ بخش سوار ہے، مگر اب وہ شہادت کے تمغے کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔

گاؤں کا سویا ہوا ماحول جاگ اٹھا، صبح علاقے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیہاتیوں کے لیے یہ ایک انوکھا واقعہ تھا، بعض لوگوں نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا، ''...اس کام میں کیا رکھا تھا، وہاں نہ جاتے نہ یہ حادثہ ہوتا... وغیرہ وغیرہ۔'' وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ

دل کی لگی کا کوئی اچانک یا بے اختیاری میں پیش آنے والا واقعہ نہ تھا۔ وہ شخص دعوتِ حق کی وادی پُر خار میں گھسیٹ کر نہ لایا گیا تھا، بلکہ وہ پورے شعور، سوچ بچار، یکسوئی اور صدقِ دل کے ساتھ اس میدان میں اترا تھا۔ تمام گھر والوں اور جماعت اسلامی کے احباب کا رویہ دیکھ کر بھی وہ لوگ حیران و پریشان تھے کہ اتنے بڑے حادثے اور صدمے کے بعد کہ جس میں ایک بوڑھی ماں، ایک بیوی اور چھ کمسن بچوں کا واحد کفیل انہیں بے سہارا چھوڑ گیا، ان کا کیا بنے گا، کون ان کی سرپرستی کرے گا، کون ان کی دلجوئی کرے گا، کون ان بچوں کے جوان ہونے تک ان کا سہارا بنے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے گھر والوں کو اطمینانِ قلب نصیب فرمایا، صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائی، یقیناً وہی سب سے بہتر وارث ہے۔

اللہ بخش اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے ایک مربعہ زمین کے واحد مالک تھے۔ اس علاقے میں ایک مربعہ زمین کافی سمجھی جاتی تھی، وہاں عموماً دو، چار، چھ ایکڑ والے کسان ہی تھے۔ اس لیے مربع کا مالک چوہدری کہلاتا تھا۔ انہیں بھارت سے آئے ہوئے دو ایک سال ہی ہوئے تھے کہ اپنے ایک عزیز کے توجہ دلانے سے جماعت اسلامی کی دعوت کی طرف رجوع کرلیا۔ پھر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں دینیات، خطبات وغیرہ ان کے زیرِ مطالعہ آگئیں۔ ایشیا اور ترجمان القرآن بھی باقاعدہ ان کے پاس آنے لگے۔ وہ جماعتی مصروفیات میں روزانہ گاؤں سے شہر (گوجرہ) جاتے۔ کسی پروگرام سے ناغہ نہ کرتے۔ لائل پور سے پروگراموں کے لیے لوگ آتے تو یہ اس میں لازمی شرکت کرتے۔ مقامی سطح پر جماعت کو جتنے فنڈز کی ضرورت ہوتی، اس سے بڑھ کر دیتے۔ بعض اوقات اگر ہنگامی طور پر فنڈز کی ضرورت پڑی یا کسی معاملے میں پیسے کی کمی ہوجاتی، تو وہ اللہ بخش پوری کردیتے تھے، کیونکہ وہ اس وقت کے دیگر ساتھیوں سے مالی طور پر مستحکم تھے۔ عجب بات تھی، لاہور کے اجتماع میں ملک بھر سے لوگ جمع تھے، مگر یہ شہادت کا اعزاز دور دراز کے اس دیہاتی کے نام لکھا تھا۔

اللہ بخش شہید کی ایک ہی بیٹی تھیں، جو اس سفر میں اپنے والد کے ساتھ تھیں، نے بتایا کہ "... جب اجتماع پر جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں، تو حالات کی تلخی کی خبریں بھی گرم تھیں، ہر طرف وسواس تھے، حالات کشیدہ تھے، کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ہوگا؟ والدہ محترمہ نے پوچھا کہ اگر وہاں گولی چل گئی تو....؟ کہنے لگے وہاں اتنے لوگ ہوں گے، عام لوگوں کو کس نے پوچھنا ہے۔ انہی دنوں میں وہ شہادت کو زیادہ یاد کرنے لگ گئے تھے، وہ صحابہ کی شہادتوں کے واقعات پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ کوئی دیہاتی لاہور اجتماع میں گیا، ہنگامہ ہوا، فائرنگ ہوئی تو اچانک ایک گولی اسے لگ گئی، تو یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں ہوگیا۔ وہ ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ طہارت و پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کرتے ہوئے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی شہادت دراصل ان کے ارمانوں کی تکمیل تھی۔ وہ شہادت کی رو رو کر آرزو کرتے تھے...." ان کی بیٹی اجتماع میں ان کے ساتھ گئی تھیں، مگر انہیں اس واقعہ کی خبر نہ ہوئی۔ اجتماع کے آغاز میں ہی ہنگامہ شروع ہوگیا تھا، غنڈے خواتین کے کیمپ میں بوتلیں پھینک کر بھگدڑ مچانا چاہتے تھے۔ خواتین کے خیمے میں یہ خبر بھی پہنچی کہ لائل پور کا ایک شخص شہید ہوگیا ہے، وہ نوعمر تھیں، اس ہنگامہ خیز صورت حال سے دل گھبرا رہا تھا، مگر یہ خیال نہیں تھا کہ وہ یتیم ہوچکی ہیں۔ اگلے ہی روز اجتماع ادھورا چھوڑ کر چند عزیز رشتہ دار خواتین شہید کی بیٹی کو لے کر واپس روانہ ہوگئیں، راستے میں ہزار وسوسوں نے گھیرا ڈالے رکھا، ہم واپس کیوں جارہے ہیں؟ یہ خواتین ساتھ کیوں جارہی ہیں؟ اگلے روز گاؤں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم ہوچکی ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں"... اس زمانے میں اخلاقی اقدار بہت تھیں۔ والد صاحب اپنے گاؤں کے غیر اعلانیہ سربراہ تھے، مگر وہ گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں نماز بھی پڑھاتے اور بچیوں کو قرآن پاک بھی۔ خواتین کو سر ڈھانپنے کی تلقین کرتے۔ ان معاملات میں حکمت سے گپ شپ کے انداز میں اور مذاق مذاق میں اصلاح کرتے، پھر وہ وقت آیا کہ جب خواتین دور سے ہی والد صاحب کو آتا دیکھتیں تو احتراماً سر ڈھانپ لیتی تھیں۔

اپنے اہلِ خانہ جن میں ہماری دادی، والدہ شامل تھیں، کے علاوہ عزیز و اقارب کی خواتین کو بھی نماز کی تلقین کرتے۔ انہوں نے گاؤں کی بہت سی بچیوں کو قرآن پاک مع ترجمہ پڑھایا۔ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے پر بہت زور دیتے تھے، وہ مجھے کتابوں میں سے عنوانات چُن چُن کر بتاتے تھے، یہ پڑھو، یہ پڑھو۔''

قدرت کا کرشمہ تھا کہ اللہ بخش اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کی زوجہ کی بھی صرف ایک بہن تھیں، جو کہ ہندوستان میں ہی انتقال کر گئی تھیں، جن کا ایک بیٹا تھا، جسے انہوں نے ہی پالا، پڑھایا اور اس کی شادی بھی انہوں نے ہی کی۔ وہ چونکہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے، اس لیے انہیں اللہ بخش کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی براہِ راست تربیت کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہی کو ملا۔ انہوں نے بتایا کہ ''...مرحوم سے کبھی تہجد بھی قضا نہ ہوئی تھی۔ وہ سب سے زیادہ توجہ اور زور نماز پر دیا کرتے تھے، وہ چونکہ خود نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتے تھے، اس لیے جب وہ کسی دوسرے کو نماز کی تلقین کرتے تو اس پر مثبت اثرات مرتب ہوتے تھے۔ انہوں نے جھنگ سے باقاعدہ ایک مولوی صاحب کا انتظام کیا تھا، اس سے قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ مولوی صاحب کی بہت خدمت کیا کرتے تھے، ان کی ہر ضرورت اور خوشی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنا کوئی لمحہ بغیر تعمیری اور ضروری گفتگو کے ضائع نہ کرتے تھے۔ وہ عشر اور زکوٰۃ کی نہایت سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد شہر جانے کی تیاری کرنے لگے تو میں نے اتنی تاخیر سے شہر جانے کی وجہ دریافت کی، کیونکہ آبادی کم اور راستے خراب ہونے کی بنا پر لوگ سرِ شام ہی دیہات کو لوٹ جاتے تھے، سائیکل پر گوجرہ آنے جانے پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ خالو نے بتایا کہ جس آڑھت پر ہم زرعی اجناس وغیرہ بھیجتے ہیں، وہ آڑھتی سخت خسارے سے دوچار ہو گیا ہے، اور اب سخت بیمار بھی ہے، میں نے اس سے چھ ہزار روپے لینے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں اسے چھ ہزار روپے معاف کرا آؤں، ایسا ہی ہوا، وہ اپنا کام کر کے واپس آئے تو رات کے اندھیرے گہرے ہو چکے تھے۔ اگلے ہی روز انہیں اطلاع ملی کہ رات اس آڑھتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ترپن برس قبل چھ ہزار کتنے کے برابر ہوں گے...؟''

اللہ بخش چالیس برس کی عمر میں چھ بچوں کو اللہ کے حوالے چھوڑ کر خود اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ گئے۔ جب ان کے شہید ہونے کی خبر جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تک پہنچی تو انہوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر روکی، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور اعلان کیا کہ ''ہم یہ مقدمہ کسی عدالت میں درج نہیں کروائیں گے، میں نے یہ مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں درج کروا دیا ہے، وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے''۔ انہوں نے حکمت اور تحمل سے ماحول کو ایک بڑے ہنگامے اور سانحے سے بچا لیا تھا، جو ٹکراؤ کی صورت میں رونما ہو سکتا تھا۔ حکمران اپنے چند روزہ اقتدار کے نشے میں کیسے کیسے کام کر جاتے ہیں، بے قصور اور بے گناہ لوگوں کا قتل اپنے سر لے جاتے ہیں۔ گناہِ کبیرہ بھی کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی ان کو نہیں ہوتا۔ یہ قتلِ ناحق کس کی گردن پر ہوگا، اس کا ذمہ دار کون تھا، تب کا فوجی سربراہِ مملکت یا تب کا گورنر مغربی پاکستان یا صرف وہ قاتل جس نے گولی چلائی تھی۔ اگر پاکستان کی کسی عدالت میں اس کا مقدمہ درج نہیں ہوا، تو کیا، فیصلے کے دن تو اس مقدمے کی سماعت ہو کر ہی رہے گی، کیونکہ ہر انسان کو اپنے کیے کا حساب دینا ہے، جس کے اعمال میں نیکی کا ذرہ بھی ہوگا اس کے سامنے آ جائے گا اور جس نے ذرہ بھر بھی برائی کی ہوگی سامنے آ جائے گی۔ تب نہ کسی قاتل کو اس کی دنیاوی حکمرانی بچا پائے گی، نہ کالا باغ کی جاگیریں کسی کے کام آئیں گی۔



ننگِ وطن

عمر فاروق ارشد

سیاست دان چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو ہوتا وہ سیاست دان ہی ہے۔ نئے افق قارئین کے لیے سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص مصر اور اسرائیل کی جنگ کے پس منظر میں لکھی تحریر۔
ایک ہوائی جہاز کے اغوا کی داستان جب اغوا کاروں نے قاہرہ کی سینٹرل جیل اپنے ایک ساتھی کی رہائی کی خاطر جہاز کے مسافروں اور عملے کے افراد کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

قاہرہ ایئر لائنز کا طیارہ ایس کیو 117 ترکی کے استنبول ایئر پورٹ سے اڑان بھر کر فضا میں بلند ہوا اور چند جھٹکوں کے بعد اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی روانگی کی اطلاع قاہرہ ایئر پورٹ پر موصول ہوگئی تھی یہ معمول کی اطلاع تھی جو ایک ہوائی اڈے کا عملہ دوسرے ہوائی اڈے کے عملے کو دیتا ہے۔ طیارے کو اڑے ہوئے ابھی پچیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک طیارے کی عقبی نشستوں سے چار نوجوان تیزی سے اٹھے اور آگے بڑھتے نظر آئے۔ تین نوجوانوں کے چہروں پر نقاب تھے اور چوتھے نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا' چوتھا نوجوان سیدھا کاک پٹ میں داخل ہوگیا۔ باقی تین نوجوانوں نے جہاز کے مختلف حصوں میں اپنی پوزیشن سنبھال لی' انہی میں سے ایک نے زوردار آواز میں بولنا شروع کیا۔

''آپ لوگوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جہاز اغوا ہوچکا ہے اپنی اپنی سیٹوں پر موجود رہیں۔ کسی نے کوئی حرکت یا شرارت کی تو جان لیوا ثابت ہوگی اگر آپ لوگوں کی آواز بھی نکلی تو ہمارے ہاتھ اور ہتھیار چلنا شروع ہوجائیں گے۔'' ہائی جیکر نے اپنی بات کا ثبوت بھی فوراً مہیا کردیا' اس نے اپنے نزدیک بیٹھے آدمی کو زناٹے دار تھپڑ رسید کیا جس کی آواز طیارے کے عقب تک صاف سنائی دی۔ پورے طیارے میں خوف اور سراسیمگی پھیل گئی۔

مسافروں نے ایک دوسرے کی طرف بڑے کرب سے دیکھا چند ایک نے بولنے کی کوشش کی لیکن ہائی جیکر کی دہاڑ سے سب سہم گئے۔

طیارے میں موت جیسا سکوت طاری ہوگیا' کاک پٹ کی طرف جانے والا ہائی جیکر کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایئر ہوسٹس کو باہر دھکیل دیا۔ طیارے کا پائلٹ اور معاون پائلٹ ہکا بکا رہ گئے لیکن ان پر ڈیڑھ سو سے زائد مسافروں کی سلامتی کا بوجھ تھا اس لیے انہوں نے اپنے اوسان بحال رکھے' لمبے قد کے دبلے پتلے نوجوان ہائی جیکر کے ایک ہاتھ میں کوئی گرنیڈ نما چیز تھی اور دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا شکاری چاقو تھا اس نے انتہائی خوفناک نظروں سے دونوں کو گھورا چند لمحے کے لیے کیبن میں مکمل خاموشی طاری رہی۔

کیبن سے باہر کی فضا پر بھی تینوں ہائی جیکروں نے مکمل قابو پا رکھا تھا اور سکوت طاری تھا پھر دبلے پتلے ہائی جیکر نے خاموشی توڑی' اس کی آواز بھاری بھرکم اور گونجدار تھی اس نے پائلٹ اور معاون پائلٹ کو خبردار کیا۔

''طیارہ اغواء کرلیا گیا ہے اب صرف ہمارے

احکامات پر عمل کیا جائے گا۔'' دونوں نے کوئی بات کیے بغیر سر تسلیم خم کردیا' ہائی جیکر نے حکم دیا۔ ''تم معمول کی پرواز جاری رکھو' ریڈیو پر کسی کو ہائی جیکنگ کی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ پہلے بصرہ ایئر پورٹ پر لینڈنگ ہوگی اس کے بعد ہم خود کنٹرول ٹاور سے بات کریں گے۔'' رات کے سوا گیارہ بجے تک ہائی جیکرز نے طیارے میں اپنی تمام کارروائی مکمل کرلی تھی۔ بصرہ کے کنٹرول ٹاور سے بار بار رابطے کے لیے کہا جارہا تھا۔

اب رات کے بارہ بج کر بیس منٹ ہوچکے تھے' پائلٹ نے ہائی جیکر کے کہنے پر اس کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے کروایا۔ دوسری طرف سیکرٹری خارجہ کی نرم آواز سنائی دی۔

''آپ لوگ ہمیں اپنی شناخت کروائیں' اپنے نام بتائیں یہ بہت ضروری ہے۔''

طیارے سے جواب آیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں' آپ ہمارے مطالبات نوٹ کریں۔'' جواب دوٹوک اور واضح تھا۔

''ٹھیک ہے' آپ اپنے مطالبات پیش کریں' ہم کوشش کریں گے کہ کم سے کم وقت میں انہیں پورا کرسکیں۔'' اب طیارے سے ہائی جیکر نے بولنا شروع کیا۔

''قاہرہ کی سینٹرل جیل میں ہمارا ایک آدمی ولیم ڈیوڈ قید ہے' تین گھنٹے کے اندر اس کی رہائی کا بندوبست کیا جائے اس کے بعد ہم مسافروں کو رہا کردیں گے۔ ہمیں دو بجے تک بتادیا جائے کہ ہمارے مطالبات پر عمل شروع ہوا ہے یا نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی جہاز سے رابطہ منقطع ہوگیا۔



عرب اسرائیل جنگ کا یہ تیسرا روز تھا' اس جنگ میں مصر کے علاوہ باقی عرب دنیا محض قربانی کا بکرا بنائی گئی تھی۔ مصر کے ہٹ دھرم اور خود پسند صدر جمال عبدالناصر نے نہایت بے وقوفی کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات اور ضد کی خاطر عرب دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا اور اسی لیے مصر فرنٹ لائن پر اسرائیل کا مقابلہ کررہا تھا۔

دارالحکومت قاہرہ میں جنگی سرگرمیاں عروج پر تھیں' اسی دوران وزارت خارجہ کے حکام کو عراق سے مصری ہائی کمشنر نے اطلاع دی کہ قاہرہ ایئر لائنز کا ایک مسافر طیارہ جس میں ڈیڑھ سو سے زائد مسافر موجود ہیں' ہائی جیک ہوچکا ہے جب سیکرٹری خارجہ یہ خبر لے کر وزیر خارجہ کے پاس پہنچا تو اسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی' وزیر خارجہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شراب و شباب کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ ایک مہکتی ہوئی انگریز حسینہ اس کی آغوش میں دبکی پڑی تھی اس نے اطمینان کے ساتھ خبر سنی اور وہ فائل دیکھنے لگا جس میں ہائی جیکرز کے مطالبات لکھے ہوئے تھے چند لمحے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا' سرخ سرخ آنکھوں سے اپنی سیکرٹری کو گھورا۔

''ہائی جیکرز کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا' ڈیڑھ سو مسافروں کی زندگی کے لیے اگر ہمیں ایک مجرم کو چھوڑنا پڑتا ہے تو اس میں اتنے گھاٹے والی کوئی بات نہیں۔'' سیکرٹری خارجہ کے لیے یہ جواب غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اہم عہدوں پر تعینات مصری حکام جنگ کے ان دنوں میں امریکہ کی طرف سے بھیجی گئی حسیناؤں سے بھرپور استفادہ کررہے ہیں۔

ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھلے ہوئے شباب کے سامنے مفلوج ہوئی پڑی ہیں اور وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جنگ کا رسوا کن نتیجہ بڑی

تیزی سے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ سیکرٹری خارجہ نے اپنی فائل اٹھائی اور الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ دشمن کے لیے مصری فضائیہ سب سے بڑا مسئلہ تھی' زمینی جنگ میں تو ان کا پلہ کسی قدر بھاری تھا مگر ہواؤں میں مصر نے اسرائیل کو ایسا پچھاڑا کہ اس کی پشت پر موجود امریکہ چونک اٹھا اور تب ہی امریکہ نے دو محاذوں پر اسرائیل کی خاموش مدد کا سلسلہ شروع کیا' پہلے مرحلے میں ہوشربا حسن کی مالک دوشیزائیں عیاش مصری سیاستدانوں اور فوجی حکام کی خلوتوں میں پہنچائی گئیں ان کے ذریعے وہ سب ممکن ہوگیا جو عام حالات میں بڑے سے بڑا جاسوس اور سیکرٹ ایجنٹ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

دوسرے مرحلے میں مصری فضائیہ پر ایک کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا پروگرام بنایا گیا جس میں پہلے منصوبے کے تحت اس خاص اسرائیلی ایجنٹ کی ضرورت پیش آئی جو دوران جنگ مصری فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد قاہرہ کی سنٹرل جیل میں قید تھا اس کے سینے میں مصر کے ایسے فوجی راز تھے کہ اسرائیلی فوجی حکام انہیں حاصل کرنے کو بے چین تھے اور اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھے۔

قاہرہ ائر لائنز کی فلائٹ ایس کیو 117 کا اغواء اسی مقصد کو پانے کی ایک کوشش تھی' رنگین مزاج اور نشۂ زن میں مدہوش وزیر خارجہ بغیر کسی قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ انتہائی حساس معاملہ اپنی دانست میں حل کرکے پھر جام وسرور میں گم ہوگیا۔ اس کے احکامات کی تعمیل میں وزارت خارجہ کی جانب سے ہائی جیکرز سے رابطے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ ابھی انہیں یہ اطلاع دی جانی تھی کہ ناعاقبت اندیش مسلمان ان کا مطالبہ تسلیم کرچکے ہیں مگر یہ اہم خبر اقتدار کے نچلے ایوانوں میں سے کسی تتلی کی طرح اڑتی ہوئی اعلیٰ غلام گردشوں میں پہنچ گئی۔ صدر ناصر جو کہ عالم اسلام کا نام نہاد ہیرو بننے کے لیے یہ سب جتن کررہا تھا اس نے ہائی جیکرز کا مطالبہ ٹھکراتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ اسپیشل اسرائیلی ایجنٹ کی رہائی کسی بھی صورت ممکن نہیں اور اس سلسلے میں ہائی جیکرز وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ مذاکرات کے ذریعے ہائی جیکرز کو الجھا کر کوئی حل نکالا جائے چونکہ مصری صدر اسرائیل سے پھڈا لے کر پھنس چکا تھا اس لیے وہ پوری طرح جنگ میں مصروف عمل تھا مگر بے خبر تھا کہ دیگر مصری سیاسی قیادت جام پر جام لنڈھانے میں مصروف ہے اور قاہرہ کسی بازارِ حسن کا منظر پیش کررہا ہے۔



جہاز میں موجود ہائی جیکرز کی برہمی اور گالم گلوچ سے مسافروں نے اندازہ لگالیا کہ ان کا مطالبہ دوسری طرف سے مسترد کیا جاچکا ہے۔ مسافروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہائی جیکرز بُری طرح دہاڑ رہے تھے اور شدید ردعمل کی دھمکیاں دے رہے تھے چند لمحات کے بعد چاروں ہائی جیکرز جہاز کی عقبی سمت میں اکٹھے ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ بصرہ کے ہوائی اڈے پر اس وقت صبح سحری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

ایئر پورٹ کی انتظامیہ اس بات سے خفا تھی کہ مصر کی طرف سے بالکل غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا گیا تھا' اگر وہ چاہتا تو کمانڈو ایکشن کے ذریعے کامیابی کے امکانات کافی روشن تھے مگر چونکہ تقریباً تمام مسافر فلسطین اور دیگر غیر معروف عرب ریاستوں کے باشندے تھے اس لیے مصر کو کچھ خاص پریشانی نہیں تھی۔

دوسری طرف اسرائیل کے سخت انتظامات اور میڈیا پر کنٹرول کی وجہ سے دنیا اس واقعہ سے بے خبر تھی۔ آخر طویل اعصابی کشمکش کے بعد مسافروں نے دیکھا کہ ہائی جیکرز کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ گرنیڈ بردار نوجوان واپس کاک پٹ میں داخل ہو گیا جبکہ باقی تینوں نے اپنی سابقہ پوزیشن سنبھال لی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جہاز زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑان بھر چکا تھا۔ مسافروں کے چہرے زرد پڑ گئے' چھ گھنٹوں کی ذہنی جنگ سے بعض کمزور دل مسافروں کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

ایسا ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا' ہائی جیکرز نے اس پر گن تان لی۔

''اے بڈھے...... بیٹھ جاؤ۔'' مگر وہ مسافر مسلسل ہائی جیکر کو گھورتا رہا۔

''ہمارا قصور کیا ہے؟ تمہارے مطالبات پورے نہ ہونے میں ہماری کوئی غلطی نہیں' خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔''

''میں کہہ رہا ہوں' بیٹھ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' ہائی جیکر دھاڑا۔

اچانک ہی اس شخص نے اپنی سیٹ سے جست لگائی شاید وہ ہائی جیکر سے گن چھیننا چاہتا تھا مگر گن اپنی خوفناک آواز میں گرجی اور ادھیڑ عمر شخص اچھل کر ساتھ بیٹھی ہوئی ایک خاتون کے قدموں میں جا گرا وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی۔

گولیوں نے اس شخص کے سینے کو چھید دیا تھا' لہو کا جیسے فوارہ سا پھوٹ پڑا' طیارے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد اس شخص کا جھٹکے لیتا جسم ساکت ہو گیا' ہائی جیکر نے گن لہرائی۔

''کسی اور کے دل میں اگر ہیرو بننے کی خواہش ہے تو سامنے آ جاؤ۔'' خوفزدہ مسافر خاموشی کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز نے زمین کا رخ کیا تو مسافروں میں بے چینی پھیل گئی وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ ہائی جیکرز اب جہاز کو کہاں لے آئے ہیں جب جہاز نے رن وے کو چھوا تو ہوائی اڈے پر ہونے والی اناؤنسمنٹ مسافروں کو کچھ یوں سنائی دی۔

''ویلکم ٹو تل ابیب ائیر پورٹ۔'' مسافروں نے دیکھا کہ جہاز کو اسرائیلی آرمی نے گھیر رکھا ہے۔



طیارہ ہائی جیکنگ کا منصوبہ کامیاب ہونے کے باوجود اسرائیل کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا' اس کو اگر کوئی کامیابی ملی تھی تو وہ یہ تھی کہ اسرائیلی حکام مصر کے ذمہ داران کو عیاشی کی دلدل میں دھکیل چکے تھے اور یہی چیز مستقبل قریب میں اسرائیل کی فتح میں تبدیل ہونے والی تھی۔

اپنے گرفتار ایجنٹ کو رہا کروانا اس کی بقا کا مسئلہ تھا اور پھر اس مقصد کے لیے دوسرا پلان تیار کیا گیا' اس کے لیے انہوں نے قاہرہ سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا انتخاب کیا۔

''یہ جیل سپرنٹنڈنٹ تھا الفتح شناوی۔'' جو اپنی قوم کی تاریخ کا ایک سیاہ باب رقم کرنے جا رہا تھا۔ ابتدائی چند رابطوں میں ہی یہ غدار وطن چاروں شانے چت ہو گیا' اس نے یورپی عورتوں کی خود سپردگی اور جنسی میلان سے متعلق عجیب عجیب کہانیاں سن رکھی تھیں جب اسے ان کہانیوں کا کردار بننے کی پیشکش ہوئی تو وہ بھلا کیونکر رد کرتا اور جس رات وہ بدیسی حسینہ کے جسمانی نشیب و فراز ناپنے میں مصروف تھا۔ قاہرہ کی سنٹرل جیل کا دروازہ کھلا اور لمبا تڑنگا اسرائیلی ایجنٹ گردن اکڑاتے ہوئے باہر نکل گیا گویا

زبان حال سے کہہ رہا۔

"مسلمانو! تمہارے اندر سے میر جعفر و صادق کبھی ختم نہیں ہوسکتے اور جب تک یہ موجود ہیں ہمارے قدموں میں پڑا رہنا تمہارا مقدر بن چکا ہے۔"

دوسری طرف غیر ملکی حسینائیں قاہرہ کے سیاستدانوں کے لہو میں کس طرح سرائیت کرچکی تھیں اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ سنٹرل جیل سے یہودی ایجنٹ کا فرار جنگ کے خاتمے تک منظر عام پر نہیں آسکا کیونکہ نچلی سطح سے لے کر ہر اعلیٰ افسر و سیاستدان کے بستر پر رات کو ایک یورپی و امریکی حسینہ ضرور موجود ہوتی تھی۔ سرحدوں پر لڑنے والے فوجی اپنے سیاستدانوں کے یہ کارنامے مسلسل سن رہے تھے اور اپنے حوصلوں کو پست ہوتا محسوس کررہے تھے۔ دوسری طرف اسرائیل اپنی تمام چالوں کو سمیٹ کر ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کرچکا تھا مگر اس کے لیے بھی چند غداروں کی ضرورت تھی اور بالآخر وہ بھی مل گئے۔

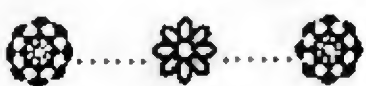


دارالحکومت قاہرہ سے بالکل باہر انصامن فوجی ائیر پورٹ واقع تھا یہ صرف فوجی ہوائی اڈہ ہی نہیں بلکہ مصری فضائیہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں فضائیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا اس کے علاوہ مایہ ناز اور اعلیٰ کارکردگی کے حامل جنگی طیارے یہیں سے اڑان بھر کے میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑا کرتے تھے۔ اس کی حد درجہ اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سیکیورٹی کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے مگر دشمن کی نظروں میں اس کو بے وقعت بنانے کے لیے یہ تمام تر انتظامات خفیہ تھے۔

اسرائیل اپنی تمام تر انٹیلی جنس استعمال کرنے کے باوجود یہ نہیں جان پایا تھا کہ مصری فضائیہ کی طاقت کا سرچشمہ کون سا ہوائی اڈہ ہے۔ یہ بات وہ ایجنٹ بخوبی جانتا تھا جو قاہرہ جیل سے فرار کے بعد تل ابیب پہنچ چکا تھا۔ اسرائیل کو مصری صفوں سے غدار خریدنے میں صرف سات گھنٹے لگے تھے اور وہ فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے تیار تھا اس ضرب کے جس کے بعد جنگ کا بجتا ہوا طبل رک جاتا اور عرب دنیا کے لیے ذلت و رسوائی کی شکست مقدر ہوتی جو ننگِ وطن اسرائیل کے ہاتھوں بکے وہ کچھ یوں تھے۔

"انصامن ہوائی اڈے کا سیکیورٹی چیف ابن الراشد آری طیاروں کے ہدف اور روٹس ترتیب دینے والی پندرہ رکنی ٹیم کا سربراہ الکبیر طاکن اور تیسرا ننگِ ملت تھا مصری ریڈار سسٹم کا انچارج نقیب الکریمی یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کو اپنا ضمیر بیچ دیا تھا انہیں جنگ کے بعد یورپی شہریت دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا پوری دنیا میں خصوصاً مسلم ممالک کا یہ المیہ رہا ہے کہ غریب قوم اپنے نمائندوں کو سب سے پہلے سیاستدان کا روپ عطا کرتی ہے اور پھر ان کو اقتدار کے ایوانوں میں بھیجتی ہے صرف اس امید پر کہ شاید ان غریبوں کی مسیحائی ہوجائے مگر تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اقتدار والے یہی لوگ بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھ کر وطن کی مٹی تک بیچ دیا کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہوجانے کے بعد وہ رات آگئی جس رات ذلت آمیز شکست کے بادل مصر کے در و دیوار پر ڈیرے ڈالنے والے تھے۔



انصامن ہوائی اڈے پر جیسے ہی تاریکی نے اپنے پنکھ پھیلائے تو خلاف معمول چھل پہل شروع ہوگئی۔ لمبی لمبی گاڑیوں میں لوگ آنے لگے ائیر

پورٹ سے کافی ہٹ کر ایک شاندار عمارت میں ان لوگوں کے استقبال کا پورا انتظام ہوچکا تھا۔ چیف سیکیورٹی کی طرف سے ارسال کیے گئے دعوت نامے میں یہ لکھا گیا تھا اور چونکہ ہماری افواج ہر محاذ پر دشمن کو نیست و نابود کررہی ہیں اور فتح قریب ہے' اس خوشی میں آج رات ایک خصوصی محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ہوائی اڈے کے مختلف حساس مقامات پر ڈیوٹی دینے والے اہلکار بھی محفل کی رنگینیوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے دوسرے لوگوں سے قبل ہی پہنچ چکے تھے۔ گوری چمڑی والی حسینائیں ایسے جلوے بکھیر رہی تھیں کہ کسی کی نظر چوکنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شراب کے جام چھلکے تو ہر حد ٹوٹ گئی' حسین زن کی سرگوشیاں اور لذت بھری سسکاریاں نشے کو دوگنا کیے جارہی تھیں۔ عالم یہ تھا کہ ایک مرد کی آغوش میں کئی کئی حسینائیں لوٹ پوٹ ہورہی تھیں۔ کہیں دور کھڑا ہوا ابلیس اپنی جیت پر مسکرا رہا تھا اور پھر فضا ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ درجنوں اسرائیلی طیارے ہوائی اڈے کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ چند لمحوں کا کھیل کھیلا گیا' طیاروں نے ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے ان گنت بموں کا مینہ برسادیا۔ بارود کی بے رحم بارش نے زمین پر کھڑے مایہ ناز مصری طیاروں کو ملبے میں تبدیل کردیا' ملبہ بننے والے ان بدقسمت ہوائی جہازوں کے رکھوالے تھوڑی دور ایک عمارت میں دادعیش دے رہے تھے۔ مصر کا سارا فضائی اور دفاعی نظام ملیامیٹ ہوچکا تھا۔

ایئر پورٹ کی بلند و بالا عمارت زمین بوس ہوچکی تھی مگر ابھی ایک کام ہونا باقی تھا جس سے ہر غدار وطن کو سبق سیکھنا چاہیے' ملک و ملت سے غداری کرنے والے اپنے بیرونی آقاؤں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اب دشمن کے جنگی طیاروں کا رخ اس عمارت کی طرف ہوا جہاں شراب و شباب یکجا ہوکر سب کچھ بھلا چکے تھے۔ ایک اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا' برہنہ جسم چیتھڑے بن کر اڑ گئے۔ ام الخبائث کی خوب صورت بوتلوں کی کھنک ایک دم سے ختم ہوگئی ذرا سی دیر میں ہولناک خاموشی چھا چکی تھی۔ طیاروں کی گڑگڑاہٹ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ قوم کی غیرت کا سودا کرنے والے اور اس کے لیے استعمال ہونے والی حسینائیں یہ بات بھول گئے کہ بازی جیت جانے کے بعد مہروں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ انعام واکرام کا لالچ دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔

اگلے دن کا سورج اپنے دامن میں لاتعداد رسوائیاں لیے مصر کے افق میں نمودار ہوا' جس وقت بدقسمت ملت کے سیاستدان ہتھیار ڈال کر عرب علاقوں کی بندر بانٹ میں مصروف تھے' عین اس وقت تل ابیب کی ایک جیل میں اغوا شدہ طیارے ایس کیو 117 کے مسافروں کو قطار میں کھڑا کرکے گولیوں سے چھلنی کیا جارہا تھا۔

آہ..... شاید کہ کسی اور نے بہایا ہو اتنا
اے سیاست تیرے دامن میں جتنا لہو ہے



قسط نمبر3

یارب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔

آشفتہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

آج پندرہ سالوں بعد میں اپنے دیس کی فضاؤں میں لوٹ رہا تھا کچھ ہی سمے میں ہم علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ کے رن وے پراترنے والے تھے۔ ہوائی جہاز کی میزبان حفاظتی بیلٹ باندھنے کے لیے اعلان کر رہی تھی۔ میں نے بائیں جانب گردن گھما کر دیکھا میرے دونوں بچے تانیا اور آیان اعلان سنتے ہی اپنے اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ رہے تھے۔ یہ تسلی ہوجانے پر کہ دونوں نے اچھے سے حفاظتی بیلٹ باندھ لیے تھے میں نے دائیں جانب میرے ساتھ بیٹھی یومنہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد پرمسرت دکھائی دے رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے اس نے میرے ایک بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کراس کے سرکو اپنے کاندھے سے لگا لیا اور وہ نگاہیں اٹھائے مسکاتے ہوئے وارفتگی سے میری جانب دیکھتی رہی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پندرہ سالوں میں، میں نے ایسا وہ سب کچھ پایا تھا جو میں نے کبھی خواب وخیال میں نہ سوچا تھا اور ایسا کچھ اتنا کھویا تھا کہ جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔آج برسوں بعد میں پھر سے عجب سیمابی کیفیت میں مبتلا ہورہا تھا جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے یہ احساس ہورہا تھا کہ مجھ سے جڑے خواب، خیال اور یادیں میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ وہی ائرپورٹ تھا جہاں میں عمیرہ کو راحت عبدالغنی سے ملوانے لایا تھا راحت میرے لیے وہ ہستی تھی جس لمحے مجھے عشق واقعتاً عشق کا مفہوم سمجھایا تھا جس ذات سے میں نے عشق کے آداب وتقاضے سیکھے اور میرا عشق فقط ایک بساط کا کھیل، دھیرے دھیرے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں اپنے ماضی میں پہنچ چکا تھا۔

اس روز گھر میں عجب تلاطم بپا تھا بڑے ابا کو میں

نے پہلے کبھی اتنا شدید غصے میں نہ دیکھا تھا انہوں نے حویلی کے وسیع صحن میں سبھی چھوٹے بڑوں اور ملازموں کو جمع کر رکھا تھا جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا کی رعب دار اونچی آواز سن کر میں بھی ایک جانب سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ میرے اتنا پیار کرنے والے بڑے ابا تھے کہ کبھی جو جوش وارفتگی سے میں عقب سے آ کر انہیں اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اٹھا لیا کرتا تو وہ پھر چھوٹتے ہی کیسے لاٹھی اٹھائے میرے تعاقب میں دوڑتے تھے اور میں جو اپنے دونوں بازوں کو ڈھال بنا کر زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا تو پھر میرے قریب پہنچ کر بجائے مجھے مارنے کے لاٹھی پھینک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا کرتے تھے۔ گویا میں آج بھی ان کے لیے وہی دو چار سال کا نٹ کھٹ ساطہٰ عالم تھا۔

آج انہی بے پناہ محبت دینے والے بڑے ابا کے سامنے مجھے نگاہیں اٹھانے کی جرأت نہیں ہو پا رہی تھی اور اب جو وہ بول رہے تھے اس نے میری ہمت اور بھی پست بنا دی تھی مجھے فقط ان کا ایک ہاتھ دکھائی دے رہا تھا جس ہاتھ سے انہوں نے لاٹھی تھام رکھی تھی جو پینڈولم کی طرح مسلسل ہل رہا تھا اور دوسرا ہاتھ جو میری جانب اٹھا تھا اسے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

''پوچھو اس سے کہ اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے جسے اپنے والدین کی عزت کا خیال تک نہیں آیا وہ اس وقت کہاں ہے؟ کہاں چھپا رکھا ہے چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کو؟ میں کہتا ہوں اسے میرے سامنے لاؤ میں اس سے خود پوچھتا ہوں کہ اسے اگر اپنے خاندان کی عزت غیرت کا پاس لحاظ باقی نہیں رہا تو ہماری عزت کو تو یوں داغ دار نہ کرتی پھرے۔'' آخری بات کہتے ہوئے بڑے ابا کی رعب دار آواز میں قدرے پستی اور ملال تھا اور میں جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس سارے معاملے سے بے خبر ہوں بڑے ابا کہ مجھ سے سوال اٹھانے پر اب سبھی کا ردعمل دیکھنے کو بڑی ہمت جتا کر میں نے اک لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر دیکھا سب سے پہلی نگاہ جو چچا مرزا پر پڑی وہ شدید غصہ میں لگ رہے تھے۔ ان کی آگ برساتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میری نظر ساتھ ہی کھڑی ماں پر پڑی وہ مجھے متعجب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں ان گنت سوال تھے۔ میرے قریب ہی میرے ابا خورشید عالم کھڑے تھے میری نگاہ جو ان سے ملی تو جیسے نخلستان میں پیاسے کو پانی مل گیا ہو۔ وہ مجھے فقط چپ رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ دو ایک قدم چل کر ذرا سا میرے قریب ہوئے وہ مجھے کاندھے سے تھامے مجھے جھنجوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

''میں یہ سب کیا سن رہا ہوں، تمہارے بڑے ابا یہ کیا بول رہے ہیں، طہٰ۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے وہاں کھڑے گھر کے سبھی لوگ اسے میرے ابا کی طرف سے سرزنش سمجھ رہے ہوں گے۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا لیکن فقط میں یہ بات جانتا تھا کہ درحقیقت انہوں نے مجھے تھپکی لگائی تھی۔

وہ چوہدری عبدالغنی جو ابا کے مقابلے میں ہر سال الیکشن جیت جایا کرتے تھے جو ابا کے سیاسی حریف تھے۔ راحت عبدالغنی انہی کی بیٹی تھی اور میرے ابا خورشید عالم جانتے تھے کہ جو مہرہ ان کے ہاتھ لگا تھا وہ سیاست کی بساط میں کسی بھی لمحے بازی پلٹنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ اسی مقصد سے مجھے تھپکی لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے ابا

کے رعب و دبدبے کے سامنے بے حد ڈرے ہوئے بھی لگ رہے تھے انہیں خوف اس بات کا تھا کہ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ واقعتاً ان کے سیاسی حریف چوہدری عبدالغنی کی دختر اور ان کے بیٹے طٰہٰ کے درمیان کوئی معاملہ ہے تو پھر آج ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہاتھ لگا موقع ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا ان کے ہاتھ ایسا تاش کا پتا لگا تھا جسے وہ موقع آنے پر ہی پھینکنا چاہتے تھے اور یہ تبھی ممکن تھا کہ اگر یہ بات دبی رہے کہ ان کا چراغ کیا گل کھلا رہا ہے۔ نجانے کس بد بخت نے بڑے ابا کے کان میں پھونک دیا تھا کہ آج چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کالا عبایا اوڑھے ان کے گھر داخل ہوئی تھی اور پھر میرے اور راحت کے درمیان چل رہے عشق کے کھیل کا بھی انہیں پتا لگ چکا تھا وہ جو دوسروں کی عزت پر سایہ کیے رہتے وہ اپنی عزت لٹتے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مجھے اچھے سے یاد ہے جب ہمارے ہمسائے ماں جائے موسیٰ بھائی کی بیٹی کو کسی نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی تو موسیٰ بھائی بڑے ابا کے پاس یہ کہنے بھی نہ آئے تھے کہ خوشی محمد میری عزت کو بچا لے تیرا تو زور بھی چلتا ہے انہیں تو فقط کہیں سے یہ بھنک لگی تھی کہ جہاں کہیں ان کی دختر کا لگن طے ہوا تھا وہ بعد میں معلوم پڑا کہ کوئی اچھے لوگ نہ تھے موسیٰ بھائی نے لگن توڑ دیا اور وہ ایسا کرتے ہی انہیں اوقات دکھانے آ گئے جس روز بڑے ابا کو اتنا معلوم پڑا' انہوں نے اسلحہ کی پٹیاں گھر میں ڈھیر لگا لی۔ اوپر چھت کا عقبی حصہ جہاں سے موسیٰ بھائی کے گھر داخل ہونے نکلنے کے سبھی راستوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی بڑے ابا وہاں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے وہ جانتے تھے کہ دن کے اجالے میں ایسی جرأت کسی میں نہ تھی کہ خوشی محمد کے محلے کی عزت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے ایسی بزدلانہ حرکت کوئی رات کی تاریکی میں ہی کر سکتا تھا بڑے ابا دن بھر سونے اور رات پہرے دار بنے مورچے میں سپاہی کی طرح چاک و چوبند حفاظت کے لیے کھڑے رہتے۔ یہ بڑے ابا کی جرأت دلیری ہی تھی کہ دشمنوں تک بھی یہ خبر جا پہنچی تھی کہ موسیٰ بھائی کی بیٹی کی طرف کوئی نگاہ اٹھانے کی بھی جرأت نہ کرے ان کی عزت کی رکھوالی خود خوشی محمد کر رہے تھے۔ کئی روز تک بڑے ابا پہرا دیتے رہے اور ایک روز موسیٰ بھائی بھیگی آنکھوں کے ساتھ بڑے ابا کے پاس آئے انہوں نے اپنی دختر کو کسی اچھے سے گھرانے میں عزت کے ساتھ رخصت کر دیا تھا وہ بڑے ابا کے بے حد مشکور تھے۔

''یہ کیا بتائے گا کبھی کسی چور نے بھی کہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے یہ ساری تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے خورشید عالم۔'' میں چچا مرزا کی بات سن کر ایک دم سے خیالوں کے دائرے سے پلٹا وہ میرے ابا سے بات کرنے کے بعد بڑے ابا سے مخاطب تھے۔

''اسے باہر ووٹ اکٹھے کرنے سے فرصت ملے تو دیکھے ناں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے ہماری اپنی بچیاں بھی تو کل کو جوان ہوں گی ان کے ذہنوں پر کیا اثر ہوگا۔'' ایسا کہتے ہوئے چچا کا غصے اور ندامت سے سر جھک گیا وہ بڑے ابا کے سامنے سر جھکائے ان کے فیصلے کے منتظر تھے لیکن فیصلہ تو تب ہونا تھا جب یہ ثابت ہو جاتا کہ واقعتاً چوہدری عبدالغنی کی بیٹی آج اس حویلی میں موجود تھی۔

راحت عبدالغنی سے میری پہلی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا

تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی۔ میں تو بس اسی جنون میں رہتا تھا کہ مجھے بھی مصطفیٰ عالم کی طرح صوبے بھر میں پوزیشن لینا تھی۔ ہم دونوں مختلف کالجز سے ایف ایس سی کر رہے تھے لیکن وہ شہر کی واحد اکیڈمی تھی جس کی فیکلٹی بہت عمدہ تھی بھی ٹاپ پوزیشن ہولڈرز اس اکیڈمی سے رخصت ہوتے تھے خود بڑے بھائی مصطفیٰ عالم بھی اسی اکیڈمی سے فارغ التحصیل تھے

اس روز معمول کے مطابق میں اکیڈمی پہنچا لیکن مجھے کچھ تاخیر ہوچکی تھی پروفیسر لیکچر کا آغاز کر چکے تھے پہلی دو قطاروں میں لڑکیاں بیٹھا کرتی تھیں اور اس کے بعد ہال کے عقبی حصے تک لڑکے بیٹھے ہوتے تھے ظاہر سی بات تھی مجھے پچھلی ہی کسی نشست میں جگہ ملا کرتی تھی لیکن آج جب مجھے اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہوچکی تھی تو وہاں ہال میں پہنچ کر میں نے نظر دوڑائی پچھلی ساری نشستیں پر ہوچکی تھیں میں نے اگلی قطاروں میں دیکھا ایک نشست خالی پڑی تھی اس سے پہلے کہ میں ہال کے عقبی حصے کی جانب بڑھتا اور آج کھڑا ہو کر لیکچر سنتا مجھے ہمارے استاد نے اشارے سے لڑکیوں کی قطار میں موجود پہلی خالی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں کچھ جھجکتا شرماتا اس خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میں نے اک نگاہ اٹھا کر اپنے بائیں جانب بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھ عین اسی لمحے اس نے بھی میری جانب ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر وہ بھی لیکچر نوٹ کرنے میں لگ گئی اور میں نے بھی جھٹ سے اپنی نوٹ بک نکالی اور لیکچر سنتے ہوئے جہاں کوئی خاص بات ہوتی اسے میں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا۔ مختصر دورانیے کا یہ پیریڈ یوں ہی اپنے اختتام کو پہنچا اور میں نے جھٹ سے نوٹ بک اپنے بیگ میں رکھی تیز تیز قدم بڑھاتا بائیک اسٹینڈ تک پہنچا اور بیٹھتے ہی کک لگا کر دوسری اکیڈمی کی جانب چل پڑا بس یہی معمول تھا میرا نہ تو کوئی لڑکا یہاں اس اکیڈمی میں میرا دوست تھا اور نہ ہی مجھے اتنی فرصت تھی کہ میں چوری چوری نگاہوں ہی نگاہوں میں کسی لڑکی سے تعلق نباہنے کی جہد کرتا۔

اگلے روز میں معمول کے مطابق وقت پر اکیڈمی پہنچا تھا لیکن اس روز میرے ساتھ ایک خلاف معمول واقعہ پیش آیا تھا اس روز راحت عبدالغنی کو اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی سبھی پہلی قطاریں پُر تھیں اور آج فقط میرے ساتھ والی نشست خالی پڑی تھی مجھے نہیں علم وہ کب میرے پاس پڑی خالی نشست پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ پیریڈ کے اختتام پر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا

''مجھے راحت عبدالغنی کہتے ہیں اور آپ۔'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا لامحالہ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''جی مجھے طٰہٰ عالم کہتے ہیں۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چلی گئی اور میں جیسے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا وہ دروازے سے باہر جا رہی تھی جب ایک بار پھر سے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

''بائے۔'' اس نے وہیں کھڑے، ہاتھ کے اشارے سے مجھے الوداع کیا اور جواباً میں نے فقط اپنا سر ہلانے سے ہی کام چلایا پھر میں بھی بائیک اسٹینڈ تک باہر آ پہنچا تب تک وہ بی ایم ڈبلیو اسے

لے کرآگے بڑھ چکی تھی۔

آج بائیک کو کک لگا کر میں اڑا ہی جا رہا تھا دل تھا کہ سینے سے پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب ہوئے جا رہا تھا۔ فروری کی سرد ہوا مجھ میں نرم گرم کوسا کوسا احساس جگا رہی تھی۔ مچلتی بہار، میٹھی میٹھی دھوپ پورب سے چلتی پروائی سبھی کچھ اتنا بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا تھا گلے میں سردی سے بچنے کے لیے لٹکے رومال کو کھول کر ہوا میں لہرانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس روز میں دوسری اکیڈمی نہیں گیا ویسے بھی دوسری اکیڈمی میں نے فقط ٹیسٹ دینے کے لیے ہی جوائن کر رکھی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور دیر تک آئینے میں کھڑا خود کو دیکھتا رہا کبھی خود کو ہی دیکھ کر مسکرانے لگتا تو کبھی بال بنانے لگتا۔

''مجھے راحت عبدالغنی کہتے ہیں۔'' مجھے اپنی جانب بڑھا اس کا ہاتھ گویا پھر سے دکھائی دے رہا تھا جی مجھے طٰہٰ عالم کہتے ہیں میں نے آئینے کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پھر اسی ہاتھ کو اپنے بالوں میں گھما کر اچھل کر بیڈ پر چھلانگ لگا دی۔

''کون ہے وہ؟ مسٹر طٰہٰ عالم۔'' میں خود سے ہی مخاطب تھا بی ایم ڈبلیو سے تو لگتا ہے کوئی بات بن سکتی ہے کسے بتاؤں اکیڈمی میں تو میں نے کوئی دوست بھی نہ بنایا تھا کبھی پڑھائی سے سر اٹھانے کی فرصت ہی نہ ملی تھی کہ دوست بناتا اور اللہ نے ذہن بھی ایسا عطا کیا تھا کہ مجھے ضرورت نہ تھی کہ میں کسی سے مدد حاصل کرنے کے لیے دوستی کرتا پھر یکا یک مجھے ضیا کا خیال آیا میرے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر تیسرا گھر اس کا تھا۔ وہ میرا قریبی ہمسایہ اور بچپن کا دوست بھی تھا بچپن میں کی بھی شرارتوں کا ماسٹر مائنڈ وہی ہوا کرتا تھا چھرے والی بندوق سے ننھی منی چڑیوں کا شکار ہو یا نہر کنارے سارا دن کانٹا ڈالے مچھلی لگنے کا انتظار بگو کے گھر سے بیر اور امرود چرانے ہوں یا سائیکل کی ریس وہ ہر کام میں مجھ سے دو ہاتھ آگے ہی رہتا تھا لیکن اب اس کے دو ہی شوق باقی تھے۔ ڈور، دھاگہ پتنگ اور ون ویلنگ اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت کہاں مل سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور سیدھا چھت پر جا پہنچا اجلے نیلے آسمان پر کہیں کہیں دودھیا سفید بادل دکھائی دے رہے تھے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی سرد ہوا سورج کی کرنوں سے دہک کر نرم گرم سی محسوس ہو رہی تھی اور میری نگاہیں آسمان کی وسعتوں پر ہی مرکوز تھیں۔ ضیا مجھے اپنی چھت پر دکھائی نہیں دیا تھا لیکن اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتا آسمان پر اڑتی پتنگ سے ہی لگایا جا سکتا تھا اور اگلے ہی پل مجھے اوپر بہت اوپر بادلوں سے بھی آگے پدی کی طرح اڑتی اس کی پتنگ دکھائی دی اور میرا من اس لمحے چاہا میں چھتیں پھلانگتا ہوا جاؤں اور ضیاء جس ڈور سے پتنگ اڑا رہا تھا اس ڈور سے جڑا میں بھی اوپر بہت اوپر بادلوں سے بھی آگے پہنچ جاؤں اور جب نیچے دیکھوں تو مجھے راحت عبدالغنی اپنے گھر کی چھت پر کھڑی دکھائی دے جائے۔ راحت کا خیال آتے ہی میں نے ہوا سے اڑتے بے ترتیب ہوتے اپنے بالوں کو ہاتھ بڑھا کر اپنی جگہ بٹھانے کی ناکام کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے گھر کی چھت پھلانگ کر میں ضیا کے گھر کی چھت پر جا پہنچا وہ چھت پر پڑی چارپائی پر لیٹا ہاتھ میں پتنگ کی ڈور تھامے میٹھی میٹھی دھوپ میں جیسے اونگھنے والا ہی تھا جب میں دبے پاؤں چپکے سے جا کر اس کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا یکا یک اس نے اپنے قریب کسی

کی موجودگی کو محسوس کرلیا تھا سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے وہ آنکھیں موندے پڑا تھا آنکھیں کھلتے ہی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ شہزادے آج میری یاد کیسے آ گئی اس نے پتنگ کی ڈور کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اگلے ہی پل اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود سے ذرا قریب کرلیا اور پھر راز دارانہ انداز میں اسے بیتے دو دنوں کی ساری روداد سنا دی۔ میری باتیں سن کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک ذرا بڑھ گئی تھی' وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سب کچھ بتانے کے پیچھے میرا کیا مقصد تھا مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ تم اسے جانتے ہو وہ کون ہے۔ کہاں رہتی ہے لاعلمی کا اظہار کرنے پر وہ مجھے بتانے لگا کہ کیسے میں پہلے یہ پتا لگاؤں کہ وہ کون ہے، خاندان کونسا ہے رہتی کہاں ہے اور جب ضیا سے یہ ساری باتیں جان کر میں گھر واپس لوٹ رہا تھا تو مجھے ضیا بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ایک ایسا دوست جسے میں اپنی ساری کہی ان کہی کہہ سکتا تھا۔

اگلے روز کلاس میں پھر ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ راحت عبدالغنی آج کسی مجبوری سے نہیں بلکہ خود اپنی منشا سے میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر لیکچر شروع ہوگیا۔ کل اکیڈمی سے لوٹ کر میں نے اپنا بیگ تک نہ کھولا تھا اسی وجہ سے مجھے لیکچر کو سمجھنے میں کچھ دشواری کا احساس ہو رہا تھا اور میں یہ بھی چاہ رہا تھا کہ لیکچر جلد سے جلد ختم ہو تو میں راحت سے کوئی بات کرسکوں اور شاید وہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ میں کہاں سے ہوں کون سے خاندان سے ہوں لیکن جیسے ہی لیکچر ختم ہوا مجھے ایک ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔

''راحت آپی جلدی آ جائیں۔'' اس آواز پر میں ہی نہیں سبھی نے گردن گھما کر ہال میں داخل ہونے والے دروازے کی جانب دیکھا جہاں ایک بہت پیارا سا بچہ اسکول یونیفارم میں کھڑا تھا وہ اس آواز پر جھٹ سے اٹھی اور پھر ہال سے باہر نکل گئی میں بھی اس کے تعاقب میں تیز تیز قدم بڑھاتا باہر کی جانب بڑھا' ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہی تھی گاڑی میں پہلے سے ایک چھوٹی بچی موجود تھی۔ مطلب وہ دو بہنیں اور ایک ہی اس کا بھائی تھا جب تک اس کا ڈرائیور گاڑی آگے بڑھاتا میں اپنی بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پہن رہا تھا میں نے پہلے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی اور کبھی ایسا واقعہ بھی تو پیش نہ آیا تھا جب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی میری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی میں نے اپنی بائیک اس کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ اب میں اس کی گاڑی کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ میری بائیک اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ نہ تو بہت کم تھا اور نہ ہی بہت زیادہ لیکن کبھی سگنل پر رکتے ہوئے مجھے یہ احساس ضرور رہتا کہ میں اس کی گاڑی سے قریب ہی رہوں۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کچھ حیرت کا احساس ہو رہا تھا کہ جس راستے سے میں گھر لوٹتا تھا یہ وہی راستہ بالآخر ایک جگہ پہنچ کر اس کی گاڑی رک گئی اور مجھے ابھی تھوڑا اور آگے جانا تھا۔ اس کی گاڑی تو رک گئی لیکن میں نے نہ تو اپنی رفتار کم کی اور نہ ہی میں نے رک کر یہ پتا کرنے کی کوشش کی کہ بالآخر وہ گاڑی کون سے گھر میں داخل ہوگئی اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا

کہ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اگلے روز اکیڈمی میں لیکچر کے اختتام پر جب سبھی کلاس سے نکل رہے تھے تو فقط میں اور راحت عبدالغنی اپنی اپنی نشست پر بیٹھے رہے مجھے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ ہم ساتھ بیٹھے تھے اور اپنی نوٹ بک قلم بیگز میں رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے کوئی بات ہی نہ کر پا رہا تھے لیکن پھر راحت کی بات پر میں ایک دم سے چونکا وہ مجھ سے ہی مخاطب تھی۔

''کمال ہے آپ اکیڈمی سے میرے گھر تک میری گاڑی کا پیچھا کرتے آئے اور جب آپ سے ملنے کے لیے میں نے ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تو جناب رکے ہی نہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر اب سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی پہلی بات پر تو جیسے میں گھبرا گیا تھا جیسے میرا اوپر نیچے کا سانس رکنے لگا تھا۔ مجھے لگا وہ یہ جاننے کے بعد کہ میں کل اکیڈمی سے نکلنے کے بعد اس کی گاڑی کے تعاقب میں رہا تھا وہ کہیں میرے بارے میں غلط رائے نہ قائم کرے اس کی اگلی ہی بات پر کہ اسے جب پتا چل گیا تھا کہ میں اس کی گاڑی کے تعاقب میں ہوں اور اس نے خود ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تھی مجھے یہ سن کر بہت اچھا لگا اور میری ہمت بندھی کہ میں اس سے بات کرسکوں وہ ابھی تک جواب کی منتظر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اسے جواب دیا۔

''آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔'' میں فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا اور میری یہ بات سنتے ہی ہال نما کمرے میں ایک مترنم سا قہقہہ گونجا اور ساتھ ہی وہ اب مجھ سے مخاطب تھی۔

''یہ تو آپ جانتے ہی ہیں بندی کو راحت عبدالغنی کہتے ہیں اور اگر آپ کچھ نہیں جانتے تو شاید وہ یہ ہے کہ میں چوہدری عبدالغنی ایم این اے ہیں کی صاحبزادی ہوں۔''

''کیا۔'' اس کی بات سن کر حیرت سے جیسے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے حیرت کے اظہار میں ''کیا'' نکل گیا۔

وہ اب متعجب سی میری جانب دیکھ رہی تھی اور پھر میرے حیرت زدہ ہونے پر چونکتے ہوئے مجھ سے دریافت کر ہی لیا۔

''کیا آپ کو یہ جان کر اچھا نہیں لگا میرے ابا کوئی ایسے ویسے ایم این اے نہیں ہیں وہ تو بالکل غیر سیاسی ہیں انہیں تو سیاست آتی ہی نہیں۔ اہل علاقہ نے انہیں کیسے اس منصب پر فائز کر دیا ہے ایسا میں نہیں جانتی اور اگر انہیں کچھ آتا ہے تو وہ ہے احساس کرنا شاید یہی وہ جذبہ ہے کہ ڈیڈی کو خدا نے آج یہ مقام دیا ہے میں آپ کو ان سے ملواؤں گی۔'' اس نے بات کرتے ہوئے ایک دم سے میرے چہرے کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ آپ کو ان سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔

''یقیناً اور آپ یہ تو جان ہی چکی ہیں کہ اس ناچیز کو طٰہٰ عالم کہتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتی ہوں گی کہ بندہ خورشید عالم کا بیٹا ہے۔'' میں نے اس کے ہی انداز میں اسے جواب دیا اور اب وہ بھی میری بات سن کر حیرت زدہ سی گم صم سی بیٹھی تھی پھر ذرا توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''طٰہٰ آپ کے دادا خوش محمد تو کسی تعارف اور تعریف کے محتاج نہیں ہمارے گھر میں اکثر ان کا تذکرہ رہتا ہے خود ڈیڈی انہیں بہت عزت کی نگاہ

سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ بھی ہمارے گھر ڈیڈی سے ملنے آجایا کرتے ہیں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ایسے انسان کے پوتے ہیں۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے میرے ابا کے بارے میں ایک بات تک بھی نہ کہی تھی نہ تو اس نے یہ کہا کہ وہ جانتی ہے کہ خورشید عالم اس کے ابا کے سیاسی حریف ہیں اور نہ ہی اس نے کوئی اچھے یا برے کلمات کہے وہ تو فقط بڑے ابا خوشی محمد کے ہی گن گاتی رہی اور مجھے اپنا موبائل نمبر دے کر رخصت ہوگئی ہمارا رشتہ تو بننے سے پہلے ہی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا مجھے اس کی یہ بات ذرا ناگوار گزری تھی کہ اس نے میرے ابا کا ذکر تک نہ کیا تھا کیا وہ اتنے ہی برے تھے۔

اس روز گھر پہنچ کر ایک اور منظر میرا منتظر تھا گھر داخل ہونے سے ذرا پہلے میں ٹھٹک کر رہ گیا گھر کے بیرونی دروازے پر لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ ایسی بھیڑ سیاستدانوں کے گھروں کے باہر ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن الیکشن گزر چکے تھے اور کوئی نئی مہم شروع ہوئی ہو ایسا بھی میرے علم میں نہ تھا پھر یہ بھیڑ کیسی تھی میں بھی گھر سے باہر کھڑی ان گنت گاڑیوں کے بیچ اپنی بائیک کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے جان کر شدید صدمہ ہوا کہ فساد تو اپنے گھر میں ہی بپا تھا۔

چچا مرزا اور میرے ابا خورشید عالم کے درمیان جائیداد کو لے کر جو جھگڑا شروع ہوا اور جس کی جھڑپیں اکثر و بیشتر چلتی رہی تھیں آج نوبت اسلحہ تک آن پہنچی تھی میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ کسی قدر رنج و غم میں سٹپٹائے لگ رہے تھے انہیں گویا ان دونوں بھائیوں میں مفاہمت کی کوئی راہ ہی نہ سجھائی دے رہی تھی اور میرے ابا کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ چچا مرزا جائیداد میں موجود اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانا چاہتے تھے اور میرے ابا کو بھنک لگ چکی تھی کہ چچا جائیداد میں ملنے والا حصہ فروخت کر کے گاؤں منتقل ہونا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد خاندان سے باہر کسی غیر کے ہاتھوں فروخت ہو اور اتنا پیسا ان کے پاس موجود نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم چچا مرزا کو ادا کر کے ان کا حصہ بھی اپنے نام کر لیتے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ الیکشن ہارے تھے اور الیکشن ہارنے کا مطلب جوا ہار جانے کے مترادف تھا انہوں نے اپنا سبھی کچھ جمع پونجی اس الیکشن پر لگا دی تھی اور وہ سبھی کچھ ہار گئے تھے۔ میں اکثر اپنے بڑے ابا کی زبانی اپنے ابا کو سرزنش کرتے سنتا تھا وہ انہیں کہا کرتے تھے۔

"خورشید عالم سود پر پیسہ نہ دیا کر یہ تیرے باقی پیسے کو بھی کھا جائے گا نہ لوگوں کی مجبوریوں سے کھیلا کر یہ وقت اور پیسہ کسی کے ساتھ سدا نہیں رہتا؟"

لیکن ابا بڑے ابا کی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے آج ہوئے فساد کو لے کر بڑے ابا بہت پریشان تھے وہ چچا مرزا کو ایک طرف لے گئے اور کئی گھنٹوں کی نشست کے بعد وہ چچا مرزا کو جائیداد فروخت نہ کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے اور اسی روز شام کو انہوں نے دونوں بھائیوں کی صلح بھی کرا دی۔

اگلے روز کالج اور اکیڈمی بند تھی۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی موجود تھا اور ضیا سے ملنے کے لیے بے تاب بھی میرے لیے یہ بات جس قدر حیران کن تھی کہ راحت چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی، ضیا بھی یہ خبر سن کر چونکنے والا تھا۔ دس بجے کے قریب اٹھتے ہی میں چھت پر جا پہنچا سورج کی

سنہری کرنوں نے مجھے خوش آمدید کہا مارچ کی ایک اجلی نکھری صبح ڈھل رہی تھی لیکن مینا، چڑیا، کوا ابھی تک خوشی کے گیت سنا رہے تھے۔ بہار سے مہکتی فضا میں پھولوں کی عجب سی باس رچی بسی ہوئی تھی لیکن ضیا چھت پر موجود نہ تھا اور نہ ہی اس کی پتنگ مجھے فلک سے بوس و کنار کرتی دکھائی دی۔

میں چند لمحوں تک یونہی کھڑا اس کی چھت پر آمد کا انتظار کرتا رہا جب وہ مجھے ہاتھوں میں ڈور اور بہت سی پتنگیں لیے چھت پر آتا دکھائی دیا اسے دیکھ کر میری خوشی دیدنی تھی میں اس کے بعد اپنے گھر کے درمیان کی چھت پھلانگ کر اس تک جا پہنچا ابھی میں نے وہاں پہنچ کر اسے سلام کیا ہی تھا کہ اس کے عقب میں موجود سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی دادی ماں بھی چھت پر آ پہنچی تھی۔ مجھے ضیا کے ساتھ کھڑا دیکھ کر وہ اپنی عینک سنبھالتی دونوں بانہیں پھیلائے یوں میری جانب بڑھی کہ مجھے اپنی جگہ سے ہلنے کا موقع ہی نہ ملا جب انہوں نے یوں میرے پاس آ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

''پتر طٰہٰ بڑے دنوں کے بعد دیکھا تجھے کہاں ہوتے ہو۔'' وہ اپنے جھریوں سے بھرے ہاتھ جن پر موٹی موٹی سہنولیوں سی رگیں ابھری ہوئی تھیں میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے بولیں۔

''دادی ماں میں تو آپ کے پاس ہی ہوتا ہوں۔'' میں نے ان کی بات کا جواب دیا میری دادی ماں اب اس دنیا میں نہ تھی۔ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس جہان فانی سے رخصت ہو چکی تھیں اور میں بچپن سے ضیا کی دادی ماں کو اپنی دادی ماں کی طرح ہی سمجھتا تھا وہ انہیں یاد بھی بہت کرتی تھیں۔ میں جب بھی ان کے پاس موجود ہوتا وہ ان کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں لیکن آج تو وہ ضیا نامہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی رکھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا تب تک ضیا پتنگ کی تلا میں ڈال کر اسے اڑانے لگا تھا اور مجھے دادی کے چنگل میں پھنسا دیکھ کر مجھ پر ہنس رہا تھا اس کے پاس یہ نعمت تھی میرے پاس نہیں تھی ناں میں ادب سے بیٹھا ان کی باتیں سننے لگا وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

''اچھا ہوا طٰہٰ جو تم مجھے مل گئے پتر اپنے دوست ضیا کو بھی سمجھایا کر دتم لوگ تو پڑھ لکھ گئے تمہاری ماں نے تم لوگوں پر بڑی محنت کی ہے۔ مصطفیٰ کو دیکھتی ہوں وہ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے بڑی خوشی ہوتی ہے پر بیٹا اپنے اس نالائق دوست کو بھی ساتھ لے کر چلو سارا دن پتنگ بازی کرتا رہے گا تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی ساتھ ہی اپنی جان کی بھی پروا نہیں اسے۔''

ایسا کہتے ہوا اچانک دادی نے ایک دھپا میرے بازو پر لگایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''وہ کیا ہوتا ہے پتر جو پہیہ اٹھاتے ہیں۔''

دادی کی اس بات پر اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے میں نے کہا۔

''جی دادی ماں ون ویلنگ۔''

''آہو، آہو پتر مجھے اس کی ماں بتاتی ہے بڑا خطرناک کھیل ہوتا ہے جان کا خطرہ ہوتا ہے سمجھایا کر اپنے دوست کو پھر یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی سے اتر کر اپنا جوتا ڈھونڈنے لگیں۔ میں نے جھٹ سے جوتا اٹھا کر ان کے آگے کر دیا وہ دعائیں دیتے ہوئے اٹھیں اور بولی۔

''پتر جی آپ نے اسے سمجھانا ہے میں ذرا تمہارے کھانے کو کچھ بھیجتی ہوں۔'' ایسا کہہ کر وہ

سیڑھیاں اترنے لگیں اور میں نے پلٹ کر ضیا سے پتنگ چھیننے کے لیے اس پر اٹیک کر دیا۔ ہم لوگ دیر تک وادی ماں کی باتوں پر قہقہے لگاتے رہے پتنگ اوپر بہت اوپر آکاش کا طواف کر رہی تھی جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال آیا آج چھٹی تھی پھر آج وہ کیا کر رہی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں ضیا سے مخاطب ہوا۔

''جانتے ہو راحت کون ہے؟'' میری یہ بات سن کر وہ جھٹ سے بولا۔

''اگر مجھے علم ہوتا تو تمہیں اس کا پتا کرنے کو کیوں کہتا۔'' اس کی بات ختم ہوتے ہی میں بھی سرعت سے بولا۔

''تو پھر سنو راحت چوہدری عبدالغنی کی بیٹی ہے۔'' میری بات سنتے ہی اس کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ گئی اور وہ اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یوں حیرت سے بولا۔

''کیا وہ چوہدری عبدالغنی ایم این اے کی بیٹی ہے۔'' ضیا نے ایم این اے لگا کر جیسے مجھ سے تصدیق چاہی۔

''جناب وہ انہی ایم این اے کی بیٹی ہے۔'' میری یہ بات سن کر اس نے میرا ایک بازو تھاما اور مجھے جیسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف کو لے گیا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا جب چھت کے پروے کے پاس پہنچ کر جہاں سے شہر بھر کی عمارتوں کا نظارہ کیا جا سکتا تھا وہ ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے انگلی کے اشارے سے بتانے لگا۔

''طٰہٰ وہ جو نیلی ٹائلوں والی کوٹھی دکھائی دے رہی ہے نا وہ ہے، چوہدری عبدالغنی کا گھر۔'' میں نے اس کی بات سن کر اس گھر کی جانب دیکھا اگر عقبی جانب سے جہاں ہم لوگ کھڑے تھے دیکھا جائے تو وہ بہت دور نہ تھا ابھی میری نگاہیں اس پرستان کا طواف ہی کر رہی تھیں کہ جب ضیا بولا۔

''یار تم نے اس سے کوئی رابطہ نمبر ہی لے لینا تھا۔'' ضیا کی بات سنتے ہی میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور راحت کے نام سے جو نمبر محفوظ کیا تھا اسے ڈائل کیا یہ دیکھ کر ضیا نے میرے کاندھے پر تھپکی لگا کر جیسے مجھے داد دی اور اب ہم دونوں ہی دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگے ہم دونوں ہی جس قدر بے تابی سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کر رہے تھے دوسری جانب سے اتنی ہی تاخیر سے کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو کون بول رہا ہے؟'' کال ریسیو کرتے ہی کسی ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔ جسے میں فوراً ہی پہچان گیا تھا اس روز اکیڈمی میں، میں یہ آواز سن چکا تھا۔

''راحت آپی جلدی آ جائیں۔'' یہ آواز سنتے ہی ساری کلاس نے جو مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا تھا تو وہاں اسکول یونیفارم میں ایک پیارا سا بچہ کھڑا تھا۔

''ہیلو کون ہے؟'' موبائل کے کھلے اسپیکر سے پھر آواز سنائی دی جب میں سوچ رہا تھا کہ میں اس بچے کو کیا جواب دوں اور ضیا مجھے مسلسل ٹھوکے لگا کر بات کرنے پر اصرار کر رہا تھا جب اسپیکر پر پھر سے ننھے بچے کی آواز ابھری۔

''انکل آپ طٰہٰ بات کر رہے ہیں۔'' اس کی بات سن کر جیسے ہم دونوں نے یوں حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور میں نے فوراً جواب دیا۔

''جی بیٹا میں طٰہٰ بات کر رہا ہوں۔'' ابھی فقط

میں نے اتنا ہی بولا تھا جب دوسری جانب سے مجھے وہی مترنم آواز سنائی دی۔

''جی السلام علیکم طٰہٰ میں راحت بول رہی ہوں۔''

''وعلیکم السلام، میں نے پہچان لیا آپ کیسی ہیں۔'' اس کی آواز سنتے ہی میں نے جھٹ سے جواب دیا اور ضیا میرے قریب کھڑا کچھ عجیب سی حرکتیں کرنے لگا جو ذرا دیر سے مجھے سمجھ میں آ گئیں کہ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اسے کہوں کہ وہ اوپر چھت پر چلی آئے جہاں اس طرح میں بھی چھت پر کھڑا تھا جب میں نے یہ بات راحت سے کہی تو وہ فون کان سے لگائے فوراً ہی چھت پر چلی آئی۔ ایک ہاتھ سے اپنے سارے بالوں کو جو میری آنکھوں تک جھک آئے تھے اٹھا کر ہاتھ کو سر کے اوپر لگاتے ہوئے میں نے اس نیلی ٹانکو والی کو بھی کی جانب دیکھا وہ اسی پرستان کی کوئی ننھی پری ہی لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اسے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارے گھروں کی چھتیں اتنا قریب تھیں پھر میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے یہ کہتے ہوئے میں نے ضیا کو پتنگ نیچے اتارنے کو کہا ضیا نے سرعت سے ڈور نیچے کھینچنا شروع کردی میں نے ضیا سے قلم مانگا وہ پتنگ میرے ہاتھ میں تھما کر قلم لینے چلا گیا جب تک ضیا قلم لے کر لوٹتا میں راحت کو بتانے لگا کہ ابھی ایک پتنگ اس کی چھت پر آ کر گرے گی اس پر کچھ تحریر ہوگا وہ یہ سب سن کر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی اور اس طرف میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی اپنی مترنم آواز سے ہنستی رہے اور میں اسے یونہی سنتا ہوں جب ضیا قلم لے کر میرے پاس پہنچا تھا میں نے قلم اس کے ہاتھ سے لیا اور پتنگ پر لکھنے لگا۔

''راحت اچھی بچی ہے اور کل دوپہر میں درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔'' میں پتنگ پر اپنے دل کی بات لکھ چکا تھا اور میرے لکھتے ہی ضیا کو مجھے کچھ سمجھانا بھی نہیں پڑا۔ جب وہ پتنگ ہوا میں تیرنے لگی تھی ہم دونوں ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر فضاؤں میں بلند ہوتی پتنگ کو دیکھ رہے تھے ہوا خاصی تیز تھی کبھی پتنگ یوں پھڑپھڑانے لگتی کہ مجھے لگتا وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی تار تار ہو کر گر نہ جائے میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ یا رب یہ پتنگ اس تک پہنچ جائے ضیا نے میری جانب اشارہ کیا۔ وہ پتنگ بازی میں جو مہارت رکھتا تھا اب اس کا کمال دکھانا چاہتا تھا پتنگ اب فضاؤں میں اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ اگر اسے نیچے جھکاؤ دیا جائے تو وہ راحت کے سر کے اوپر سے اسی کے قدموں میں جا گرے ضیا پتنگ کو اتنا جھکا رہا تھا کہ اب وہ پتنگ اس کے چھت سے عین اوپر تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر ضیا نے اسے اس کے سر کے پاس یوں جھکا کر اوپر اٹھا لیا کہ ایک بار پھر سے اس کے قہقہے مجھے فون پر سنائی دینے لگے۔ وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی کبھی چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی نگاہیں اٹھائے پتنگ کے چھت پر گرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میرا اشارہ پا کر ضیا نے پتنگ کو چھت پر گرا دیا۔ وہ پتنگ پر لکھی عبارت پڑھنے کے لیے جھکی اور میں اسے پھر سے دیکھنے کے لیے بے چینی سے اس کی چھت کی طرف دیکھنے لگا وہ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پتنگ اپنے سامنے رکھے اس پر درج عبارت کو

دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی ہوگی کہ اسے مجھ سے ملنے کے لیے درگاہ پر آنا چاہیے کہ نہیں پھر فون پر بھی مسلسل خاموشی پا کر میں نے ضیا کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اس نے مجھے اشارتاً انتظار کرنے کو کہا۔ ابھی چند لمحے ہی بیتے تھے جب ہمیں اچانک سے راحت دکھائی دی۔ پتنگ اس کے ہاتھوں میں تھی اور اب وہ ہمیں پتنگ واپس کھینچنے کا اشارہ کر رہی تھی ضیا نے اشارہ پاتے ہی ڈور کو مخصوص انداز سے کھینچا اور پتنگ راحت کے سر کے اوپر سے فضا میں تیرنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی چھت پر کھڑی ننھے بچوں کی طرح خوشی سے اچھلتے ہوئے تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے فون ابھی تک کان سے لگا رکھا تھا۔ جب ضیا کی گنگناتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میرے ننھے مجنوں دوست فون رکھ دے پیغام پتنگ پر ہواؤں میں تیرتا ہوا آ رہا ہے۔'' ضیا کی بات سن کر میں نے اس پر اٹیک کر دیا اور اب میں مسلسل اس سے پتنگ چھیننے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا ہمیں یوں لڑتا جھگڑتا دیکھ کر راحت اب واپس نیچے جا چکی تھی بلآخر اس کا پتنگ پر لکھ کر بھیجا جواب مجھ تک پہنچ ہی گیا اس نے میری عبارت کے بالکل نیچے لکھا تھا۔

''آپ بھی بہت اچھے ہیں طٰہ، میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔'' راحت کا لکھا جواب پڑھ کر اب کی بار جو ضیا نے مجھ پر اٹیک کیا تو اب اس سے بچنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جب عین اسی وقت دادی ماں چھت پر آ پہنچی اور ہمیں یوں گتھم گتھا دیکھ کر بولی۔

''میں اسی لیے کہتی تھی کچھ سمجھاؤ تو بندہ خود ہی برا بنتا ہے۔'' دادی کی بات سن کر ہم لوگوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے اس قدر قہقہے لگائے کہ دادی کھانے پینے کی چیزیں رکھ کر الٹے پیروں واپس لوٹ گئیں۔

اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور کہیں جا بیٹھی تھی۔ میں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو پھر سے ضیا کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر جا پہنچا تھا کبھی مجھے دادی ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ضیا کا کھلکھلاتا چہرہ دکھائی دیتا تو کبھی میرے فون کرنے پر راحت کے چھت پر چلے آنے کا منظر میری نگاہوں میں ٹھہر جاتا کبھی میں پھر سے پتنگ پر لکھ رہا ہوتا۔ ''راحت اچھی بچی ہے اور کل درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔'' اور کبھی مجھے اجلے نیلے آسمان پر مسکراتی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی جواب راحت کا جوابی پیغام میرے نام لائی تھی اور ضیا اور اس میں اس پتنگ کو حاصل کرنے کے لیے کیسے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے پتنگ کی ڈور کبھی میرے ہاتھ آ جاتی تو کبھی ضیا اسے چھین کر چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مجھے اپنے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر اس کا جوابی پیغام میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا تھا میری لکھی عبارت کے عین نیچے اس نے لکھا تھا۔

''آپ بھی بہت اچھے ہیں طٰہ میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔'' میں یونہی سوچتا کروٹیں بدلتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی آنکھ کھلتے ہی میں نے نیند کے گہرے اثرات کو مٹانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور پھر جیسے ہی میری نگاہ گھڑی پر پڑی میں اچھل کر اٹھ بیٹھا گیارہ بج رہے تھے اور

ابھی مجھے تیار ہوکر ضیا کو بھی ساتھ لینا تھا باتھ روم جانے سے پہلے ہی میں نے ضیا کو بھی کال کر دی تا کہ وہ وقت مقررہ پر تیار ہو جائے اور پھر میں تیاری میں لگ گیا۔

جب میری تیاری مکمل ہوئی تو پونے بارہ ہو رہے تھے پھر جھٹ سے جو کمرے سے باہر پہنچا تو سامنے ماں کھڑی تھی چھٹی والے روز میں گیارہ بارہ بجے تک ہی سو کر اٹھتا تھا اور اب وہ مجھے جگانے آئی تھیں لیکن اب اپنے سامنے مجھے خوشبو میں مہکتا سوٹ بوٹ پہنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی اور ان کے مسکراتے ہی میں نے ان کی پیشانی چوم لی۔ ویسے یہ کام وہ کرنے والی تھیں اور اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

''بیٹا جی آج ماں پر بڑا پیار آ رہا ہے۔'' ان کی بات سن کر میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''ماں پلیز آج کچھ وقت کے لیے ابا کی گاڑی کی چابی چاہیے۔'' ماں نے میری بات سن کر ہاتھ بڑھا کر میرے گال کو سہلایا اور پھر بولی۔

''بس، چلو میرے ساتھ آؤ۔'' ان کی بات ختم ہوتے ہی ایک قدم ان کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے کاندھے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ماں یہ ہوئی نا بات۔'' اپنے کمرے میں پہنچ کر ماں نے مجھے گاڑی کی چابی دی اور ایک بار پھر سے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر گاڑی لے کر ضیا کے گھر جا پہنچا پہلے ہم دونوں ہی اپنی اپنی بائیکس پر درگاہ جانے والے تھے لیکن اب میری منی پجارو اپنے گھر کے سامنے کھڑی دیکھ کر ضیا بھی میری طرح خوش دکھائی دے رہا تھا پھر ضیا کو ساتھ لیے میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ درگاہ شہر سے چند کوس مسافت پر تھی۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے نکلتے ہی ہم لوگ جلد ہی درگاہ تک پہنچ گئے تھے پہلے پہل یہ درگاہ آبادی سے کافی مسافت پر ہوتی تھی لیکن پچھلے کئی برسوں سے آبادی کے بڑھتے تناسب سے اب یہ درگاہ آبادی سے قریب ہی لگ رہی تھی۔ درگاہ سے قریب ہی درگاہ میں داخل ہونے والے راستے میں ایک نہایت بلند قامت آم کا پیڑ تھا جس کے گھنے سایے تلے ہم لوگوں نے اپنی گاڑی روک دی تھی اگرچہ اس درگاہ پر فقط جمعرات کے روز ہی میلے کا سماں دکھائی دیتا تھا لیکن آج اتوار کا دن تھا شاید تعطیل ہونے کی وجہ سے خاصے زائرین یہاں موجود تھے ضیا کو وہیں گاڑی کے قریب کھڑا کر کے میں درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر کھلے احاطے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کھلے احاطے میں بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کے عین نیچے پکی اینٹوں کا کھڑا بنا ہوا تھا۔ بہت سے بوڑھے اور بچے اس کھڑے پر بیٹھے درگاہ میں آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے برگد کی لٹکی لمبی لمبی ڈالیوں سے جھول رہے تھے مزار پر حاضری کے بعد چند لوگ ساتھ لایا تبرک بھی تقسیم کرتے دکھائی دیے میں نے وہاں کھڑے ہو کر چار سو نظر دوڑائی مگر مجھے راحت کہیں دکھائی نہ دی آگے بڑھ کر میں نے مزار کے اندرونی حصے میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ وہاں نہ ملی، مطلب ہم راحت کے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے تھے یہ سوچتے ہوئے میں ضیا کے پاس واپس چلا آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ راحت ابھی درگاہ پر نہیں پہنچی تھی اور اب ہم اسی راستے پر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے جہاں سے

زائرین کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا اور ساتھ ہی میں یقینی اور بے یقینی جیسی صورت حال کا شکار ہو رہا تھا جو وقت ہم لوگوں نے مقرر کیا تھا وہ بیت رہا تھا لیکن وہ آئے گی بھی یا نہیں یہی سوچ کر میرا یقین ڈگمگانے لگا تھا جب مجھے ضیا کی آواز سنائی دی وہ پاس سے گزرتے ایک بچی اور بچے سے مخاطب تھا جو بہن بھائی لگ رہے تھے۔

''پیارے بچوں ہمیں بھی تھوڑا تبرک کھلا دو۔''

بچی کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا تھا ضیا کی بات سن کر بچی نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے بھائی کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ شرمارہا تھا ضیا ان بچوں کے روکتے ہی میری جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے ذرا اوران کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب ہوتے ہی بچی نہایت احترام سے بولی۔

''بھائی جان یوں تو اب یہ باقی بچا تھوڑا سا تبرک ہم اپنے گھر کے لیے لے جارہے ہیں لیکن اب آپ نے روکا ہے تو آپ کو ضرور کھلائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے بچی نے ریشمی کپڑا جو تھال پر دھرا تھا اسے ہٹایا تو نیچے شکر، گھی، آٹے سے بنی روٹی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ وہ ٹکڑے اٹھا کر اس نے ضیا کی جانب بڑھا دیے۔ جب میں نے عقب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ضیاء یہ بچے تو بہت ذہین ہیں۔'' میری بات سن کر بچوں نے پلٹ کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ضیا نے پلٹ کر اک ٹکڑا مجھے دیا اور ایک اس نے خود کھالیا میں نے جو ضیا کے ہاتھ سے تبرک کا ٹکڑا لے کر اپنے منہ میں رکھا تو کیا عجب احساس تھا۔ مجھے لگا جن ہاتھوں نے اسے بنایا تھا اور پھر جو آیت مبارک پڑھی گئی تھیں وہ بھی لمس احساس مجھے کسی الگ ہی دنیا میں لے گئے تھے۔

وہاں آم کے پیڑ کی گھنی چھاؤنی تلے کھڑے ہمیں کافی وقت بیت چکا تھا لیکن راحت ابھی تک نہ آئی تھی اور اب میں ضیا سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے لیکن اسی کے اصرار پر میں مزید وہاں کھڑا موہوم سی امید کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا لیکن پھر وہ موہوم سی امید بھی ٹوٹ گئی جب وہ مزید وقت گزرنے کے باوجود نہ پہنچی تھی۔ اب کی بار جو میں نے ضیا کو واپس چلنے کو کہا تو اس نے میری بات نہ ٹالی اور ہم دونوں ہی بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

اگلے روز میں اسے اکیڈمی میں ملا تو میں اس سے سخت خفا تھا اور اسے بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کلاس ختم ہوتے ہی اب وہ معذرت پیش کررہی تھی۔

''طٰہٰ گھر پر کوئی بھی نہ تھا فقط چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ میں تنہا تھی اور انہیں تنہا چھوڑ کر میں نہیں آسکتی تھی میں جانتی ہوں تمہیں بہت برا لگا لیکن میں بھی تو کتنی مجبور تھی۔'' اس کی مجبوری والی بات سن کر میں نے جو پلٹ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہاں آنکھوں کے ساغر اس کی زبان کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی معصومیت پر مجھے پیار آنے لگا تھا اور پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ جھٹ سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے کچھ نکالنے لگی۔

''طٰہٰ میں کل آتے ہوئے آپ کے لیے یہ گفٹ لا رہی تھی اسے رکھ لیجیے۔'' اس کا میری جانب بڑھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا جب اس کے ہاتھ سے گفٹ لیتے ہوئے میں نے فوراً اسے اس

کے ہی بیگ میں رکھ دیا وہ حیرت زدہ سی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی جب میں نے اسے جواب دیا۔

''آپ کا یہ تحفہ میں تب قبول کروں گا جب آپ میرے ساتھ کھانا کھانے کسی ریسٹورنٹ چلیں گی ابھی اسی وقت۔'' وہ میری بات سن کر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو چلیں۔'' اس کے اس جواب پر میں نے بھی حیرت سے اٹھتے ہوئے ایک سوال پوچھا۔

''راحت اگر آپ میرے ساتھ ریسٹورنٹ چلی گئیں اور ڈرائیور آپ کو لینے یہاں آیا تو آپ کیا جواب دیں گی؟'' یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی تھی جسے سن کر وہ فوراً بولی کہ آج وہ ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئی اور واپس بھی وہ رکشہ پر ہی جائے گی اس کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یوں اس روز میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔

راستہ بھر وہ مجھے اپنی پسند کے ریسٹورنٹ بتاتی رہی اور میں اسے اپنی پسند بتاتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ پر ہم دونوں ہی متفق ہوگئے اب ہم اسی ریسٹورنٹ میں موجود تھے وہاں بیٹھتے ہی میں نے مینو راحت کی جانب بڑھا دیا تاکہ وہ اپنی پسند کا آرڈر دے اور جب وہ آرڈر دے چکی تو اس نے پہلے وہ تحفہ اپنے بیگ میں سے نکالا جو میں نے واپسی اسی کے بیگ میں رکھ دیا تھا میں نے وہ تحفہ راحت کے ہاتھ سے لے کر اسی کے سامنے کھولا اور اس میں ایک فرینڈ شپ بینڈ تھی اور ایک خوشبو جو مجھے بہت پسند آئے اور میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرینڈ شپ بینڈ کو یوں دو حصوں میں الگ کرلیا کہ جو چار کڑیاں ملی ہوئی تھیں اب وہ دو، دو ہوگئیں۔ یوں ایک حصہ میں نے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور دوسرا خود پہن لیا۔ وہ میری اس حرکت سے کافی محظوظ ہورہی تھی جب ویٹر کھانا لے آیا چائنیز رائس سے اڑتی بھاپ اور خوشبو نے ہماری بھوک اور بڑھا دی تھی میں نے راحت کو شروع کرنے کی دعوت دی تو کانچ کی بھاری نفیس پلیٹ جس پر ہوٹل کا لوگو بھی لگا تھا راحت اس میں رائس ڈالنے لگی اور ساتھ ہی وہ پلیٹ اس نے میری جانب بڑھا دی شکریہ کہہ کر میں نے وہ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لی اور پھر وہ اپنے لیے رائس پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ جب وہ ایسا کررہی تھی میں نے کانٹا اور چمچ ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''راحت آپ کو دیر تو نہیں ہورہی۔'' میری بات سن کر اس نے پلیٹ جس میں ابھی اس نے رائس ڈالے تھے اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''طہٰ میں نے کبھی کوئی بات اپنے ڈیڈی سے نہیں چھپائی ہماری پہلے روز ہوئی ملاقات سے آج اس ٹیبل پر کھانا کھانے تک وہ سب جانتے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور میں ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی اسی لیے میں کہوں گی کہ میں تو آپ سے ملنے آپ کے گھر بھی آسکتی ہوں۔'' آخری بات کہتے ہوئے وہ واقعی پر اعتماد لگ رہی تھی اور میں جو حیرت زدہ سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا آخری بات پر چونکتے ہوئے بولا۔

''یار ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنا میرے گھر والے ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔'' میری بات سن کر اس نے وہی مترنم سا قہقہہ لگایا اور ہم لوگ ریسٹورنٹ میں بج رہی ہلکی ہلکی موسیقی میں کھانا کھانے لگے کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ

ریسٹورنٹ سے نکلنے میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور خود بائیک پر گھر چلا آیا۔

میرے گھر پہنچنے تک دن ڈھل چکا تھا اپنے کمرے میں پہنچ کر بیگ وہاں رکھنے کے بعد اب میں ضیا سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ آج راحت سے ہوئی ملاقات ریسٹورنٹ میں کھانا، فرینڈ شپ بینڈ، خوشبو کا تحفہ میں اسے سبھی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد سے میں گھر سے نکلا اور ضیا کے گھر جا پہنچا میری دوسری ہی دستک پر چھوٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے کھڑا پا کر وہ خوشی سے بے ساختہ اپنی توتلی زبان سے بولی۔

''مما طٰہٰ بھائی آئے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر گود میں اٹھا لیتا وہ شرما کر بھاگ گئی اور اب آنٹی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم!'' میں نے سلام میں پہل کی تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے چند سیکنڈ میں مجھ سمیت میرے سارے شجرہ نسب کا حال پوچھ ڈالا۔

''آنٹی ضیا گھر پر ہی ہے۔ میں ضیا سے ملنے آیا تھا۔'' آنٹی نے مجھے بیٹھنے کو کہا جب میں نے کھڑے کھڑے ان سے ضیا کے بارے میں دریافت کیا تو آنٹی جیسے بے زاری سے بولیں۔

''ہاں بیٹا اوپر چھت پر ہے۔ آج چودھویں کی رات ہے نا آج رات بھی وہ دیر تک پتنگ ہی اڑاتا رہے گا۔'' آنٹی کی بات سن کر شکریہ ادا کرتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جا پہنچا۔ فروری کے درمیانی دنوں کی ایک صاف شفاف رات شروع ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رات کی رانی کی پراسرار مسحور کن سی خوشبو سے بھری رات، چودھویں کا چاند، ننھے منے تاروں سمیت اپنے پورے اہل وعیال کے ہمراہ آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور میرا یار ضیاء سفید رنگ کی پتنگ اپنے پاس ڈھیر لگائے آسمان پر کسی کے ساتھ پیچا پھنسائے کھڑا تھا۔ جب مجھے دیکھتے ہی وہ چلایا۔

''طٰہٰ ادھر آ دیکھ یہ میری ڈور سے تیری پتنگ بو کاٹا ہو گی۔'' اس کی بات ختم ہونے تک میں اس کے قریب جا پہنچا تھا لیکن میرے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھنے تک اس کی اپنی ہی پتنگ کٹ چکی تھی اور اب وہ برا سا منہ بناتے ہوئے ڈور کھینچ رہا تھا۔ جب میں نے راحت کی دی فرینڈ شپ بینڈ اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈور ایک طرف پھینکی اور میرے ہاتھ سے بینڈ لیتے ہوئے جھٹ سے بولا۔

''تم راحت سے ملے تھے اور آج اس نے تمہیں یہ فرینڈ شپ بینڈ دی اور تم نے لے لی اور اس دن جو اس نے ہمیں سارا دن ذلیل وخوار کیا اس کا کیا ہوا۔'' اس کی یہ ترش بات سن کر میں مسکراتا ہوا اس کا بازو تھامے اسے چارپائی تک لے گیا جہاں بیٹھے میں اسے بتانے لگا کہ وہ کیا مجبوری تھی جو اس روز ہمیں ملنے درگاہ پر نہ آ پائی تھی پھر میں نے ریسٹورنٹ میں کھائے کھانے اور اس سے ہوئی باتوں کی ساری تفصیل اسے بتائی جسے سنتے ہی وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا وہ میرا بازو تھامے مجھے نیچے لے گیا اس نے اپنی بائیک نکالی اور اب وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کا سارا پلان سمجھ گیا تھا میں بھی تیزی سے اپنے گھر داخل ہوا اور جب لوٹا تو میں اپنی بائیک کے ساتھ تھا۔ میری خوشی تو دیدنی تھی ہی ضیا آپے سے باہر لگ رہا تھا ہم لوگوں کا رخ راحت کے گھر کی طرف ہی تھا۔ جب راحت کے گھر سے ذرا پہلے ضیا نے اپنی

بائیک کی ریس بڑھائی اور ساتھ ہی اگلا وہیل اٹھا لیا اب وہ ٹریفک کے درمیان ون ویلنگ کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے بھی اپنی بائیک کی ریس بڑھائی میں اس تک پہنچ کر اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتا تھا ابھی چند روز پہلے ہی دادی ماں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ میں اسے اس خطرناک جان لیوا کھیل سے باز رہنے کو کہوں اور آج جبکہ میں اس کے ہمراہ ہی تھا وہ بے تحاشا ٹریفک کے درمیان ون ویلنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا اور اسے ایسا کرنے سے منع کرتا میرے دیکھتے ہی دیکھتے ضیا کا توازن بگڑا بائیک اس کے نیچے سے نکلی اور لڑھکتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی اور ضیا فٹ بال کی طرح اچھلتا زمین سے رگڑتا فٹ پاتھ کے پاس جا گرا اسے یوں گرتا دیکھ کر جیسے میرا دل دھک سے رہ گیا رات کی تاریکی میں جیسے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں تھیں۔ میں نے بائیک کو روکتے ہی کھڑا بھی نہ کیا اور اسے وہیں پھینک کر ٹریفک کے بیچ میں سے بچتا بچاتا فٹ پاتھ تک جا پہنچا جہاں چند لوگ مجھ سے بھی پہلے ضیا کے پاس موجود تھے۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی ضیا کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اسے ہوش میں لانے کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے اس کے سر کا معائنہ کیا اسے بظاہر کہیں چوٹ نہ آئی تھی اس کے بازو ہاتھ کہیں سے کوئی خون بہتا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن پچھلے چند سیکنڈ گزرنے کے باوجود وہ ہوش میں نہ آیا تھا کوئی میرے پاس کھڑا اس کی نبض دیکھ رہا تھا اور کوئی میری طرح سر کا معائنہ کر رہا تھا پھر کسی نے ایمبولینس کو کال کر دی

سمجھ لو

- نہ اتنا میٹھا بنوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کڑوا بنوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔
- اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔
- آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔
- گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔
- جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

زین الدین صدیقی...... کراچی

تھی یہی وجہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایمبولینس آ پہنچی تھی میں ضیا کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھا تو ایمبولینس کا عملہ ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے اسپتال کی جانب بڑھ چکا تھا راستہ بھر میں ضیا کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن اسپتال پہنچنے تک بھی اسے ہوش نہیں آیا راستے میں ہی میں نے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کو ضیا کو پیش آئے حادثے کی اطلاع کر دی تھی اور پھر ہمارے ضیا کو ایمبولینس سے ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے تک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا جو ضیا کے اماں اور ابا کے ساتھ دادی ماں نہیں آئی تھی وہ شاید یہ برداشت نہ کر پائی اس لیے وہ انہیں اپنے ہمراہ نہ لائے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں ان کے سوالوں کے جواب انہیں ہرگز دے پاتا۔ میرے ماں بڑے ابا اور مصطفیٰ عالم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ ضیا کے ماں اور ابا کو دلاسے دے رہے تھے اور میں بامشکل چھلکتی آنکھوں کے

ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دے پا رہا تھا۔
''طہٰ تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔'' ضیا کی ماں کی یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہیں دے پایا۔
''یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرما۔'' ان کے منہ سے دعا نکلی تو میں نے اپنی لرزتی زبان سے دل ہی دل میں آمین کہا۔
ضیا کے پاس زیادہ لوگوں کو رکنے کی اجازت نہ تھی اس کے پاس اندر ایمرجنسی میں اس کے اماں ابا اور مصطفیٰ عالم تھے اور میرے ماں باپ اور بڑے ابا ہم سبھی باہر وارڈ میں کھڑے تھے اور ضیا کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے پچھلے پون گھنٹے سے وہ بے ہوش پڑا تھا ڈاکٹر نے ابھی تک یہی بولا تھا کہ ہوش میں آنے تک وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر ہماری دعائیں اللہ نے سن لیں اور بھائی مصطفیٰ عالم ہمیں یہ بتانے کے لیے ایمرجنسی سے باہر آئے کہ ضیا کو ہوش آ گیا ہے۔ ہم سبھی جو اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس کے پاس پہنچے تو جہاں اس کے ہوش آنے کی بے حد خوشی تھی وہیں ایک بڑی خبر بھی ہماری منتظر تھی۔
''ماں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ابا میں کچھ نہیں دیکھ پا رہا۔'' اس کے قریب پہنچتے ہی ہمیں ضیا کی ایسی حالت دیکھ کر شدید دھچکا پہنچا چہروں پر چھائی خوشی اب زردی میں بدل گئی تھی۔ میں بے ساختہ ضیا کے سامنے جا پہنچا اور اسے آوازیں دینے لگا۔
''ضیا میں یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں وہ ہاتھ بڑھائے بے بسی سے مجھے پکارنے لگا۔
''طہٰ میں کچھ نہیں دیکھ پا رہا مجھے تم دکھائی نہیں دے رہے میں دیکھ کیوں نہیں رہا طہٰ۔'' اس کی باتوں نے وہاں موجود سبھی کو رلا دیا تھا میں نے آگے بڑھ کر ضیا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔
''تم ٹھیک ہو جاؤ گے ضیا تم فکر مت کرو ہم سب ہیں نا تمہارے پاس۔'' میں تو فقط اسے دلاسہ دے سکتا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا وہی ضیا جو چند گھنٹوں پہلے چودھویں کی رات میں سفید پتنگ اڑائے پیچا لگا رہا تھا تاروں سے جگمگاتے آسمان تک خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا اور پھر میری اور راحت کی ریسٹورنٹ میں ہوئی ملاقات کا احوال جان کر مجھ پر فریفتہ ہوا جا رہا تھا اور کیسے پھر اس نے بائیک نکالی اور شہر کی جگمگاتی روشنیوں کے بیچ وہ سڑک پر ون ویلنگ کرتا ہوا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا بیتے چند لمحوں نے ہی اسے کہاں سے کہاں لا پٹخا تھا۔ وہی ضیا جو آج مجھ سے گرینڈ پارٹی لینے والا تھا۔ اب ایمرجنسی میں ہمارے سامنے بے بسی سے چلا چلا کر ہمیں پکار رہا تھا کہ اسے دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ کیوں کچھ نہیں دیکھ پا رہا؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا اس کے اس سوال کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتا تھا۔ ضیاء کے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر بھی اس کے پاس ہی موجود تھا اور اب وہ ضیا کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا جب اس نے ضیا کے سامنے ہی سبھی کو بتایا کہ ضیا کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھیں اور مزید تفصیلات جاننے کے لیے انہیں ضیا کے سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی اور مزید کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے ڈاکٹر یہ سبھی ٹیسٹ لکھ کر ہمیں دے گیا تو تھوڑی ہی دیر میں ہم ضیا کو ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری لے گئے۔
اسپتال کی لیبارٹری میں ہی ضیا کے سبھی ٹیسٹ

لیے گئے تھے اور واپسی تک ضیا کے ابا اس کے لیے وی آئی پی روم تک بک کرا چکے تھے اب ہم اسے سیدھا وہیں لے آئے تھے۔ ایک دم سے اپنی آنکھوں کی بینائی کھو جانے پر وہ صدمے میں لگ رہا تھا اور بار بار مجھے اپنے لیے دعائیں کرنے کو کہہ رہا تھا اور میں اسے تسلی اور دلاسہ دیتا رہا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لوگ پھر سے اس کے گھر کی چھت پر کھڑے رنگ برنگی پتنگیں اڑائیں گے۔ میں اس کے ذرا قریب بیٹھا اسے کہنے لگا ضیا ہم ایک اتنی بڑی پتنگ اڑائیں گے جس کے ایک طرف ضیا اور دوسری طرف طٰہٰ لکھا ہوگا۔'' وہ میری یہ بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا نہیں طٰہٰ اب ضیا نہیں اب پتنگ کے ایک طرف طٰہٰ اور دوسری طرف راحت لکھا ہوا میں وہ پتنگ ضرور اڑاؤں گا طٰہٰ اور پھر اسے ہم راحت کے گھر کی چھت پر گرا دیں گے۔

اگلے روز صبح ہی تمام رپورٹس آ گئیں تو ڈاکٹر نے ہمیں ایک اور بری خبر سنا دی۔ ضیا کو دکھائی نہ دینے کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی دماغی چوٹ تھی۔ خون اس کے سر سے باہر نکلنے کی بجائے اس کے دماغی خلیوں میں ہی جم کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر اب اس کا واحد علاج نیوروسرجری ہی بتا رہے تھے۔

ضیا کے ماں اور ابا یہ بات جان کر سکتے میں لگ تھے وہ یہ بات ضیا سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ضیا کو معلوم پڑے کہ چند روز بعد ہی اسے نیوروسرجری جیسے خطرناک آپریشن سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن پھر بھائی مصطفیٰ عالم نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں یہ بات ضیا سے ہرگز نہیں چھپانا چاہیے نہیں تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کے مترادف ہوگا جو بھی بات ہے وہ ضیا تک ٹھیک ٹھاک پہنچنی چاہیے وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اب وہ ان سب باتوں کو سمجھ سکتا ہے اس گھڑی میں ضیا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جب اس کی ماں اور ابا کے بجائے بھائی مصطفیٰ عالم نے نیوروسرجری والی بات ضیا کو بتائی وہ اسے یوں سمجھا رہے تھے جب اچانک ضیا نے ایک سوال پوچھ لیا۔

''مصطفیٰ بھائی نیوروسرجری میں بچنے کا چانس کتنے فیصد ہوتا ہے۔'' ضیا کا یہ سوال سنتے ہی کمرے میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ اس کے اس سوال پر مجھ سمیت سبھی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ ضیا کی ماں خود کو سنبھال نہیں پائی وہ اپنے چہرے کو آنچل میں چھپائے باہر چلی گئیں ضیا کے ابا بھی ان کے پیچھے ہی چلے گئے میں نے جو ہاتھ بڑھا کر ضیا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے دیکھا مصطفیٰ بھائی بھی کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔

اب فقط میں ہی ضیا کے پاس موجود تھا جب وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''طٰہٰ میں زندگی بھر تم سے کھیل کے ہر میدان میں آگے رہا ہوں اور اب......!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے رک گیا۔

''اور اب ضیا'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا اور اب...... میں دنیا سے بھی تم سے پہلے......!'' میں نے اگلی بات سننے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔

اسی روز مجھے راحت کی کال آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اکیڈمی کیوں نہیں آیا میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو پھر وہ بھی فوراً ہی اسپتال آ پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں

پہنچی تو اس وقت ضیا کے پاس کمرے میں فقط میں ہی موجود تھا میں ضیا کے سرہانے بیٹھا تھا اور راحت پھولوں کا بوکے اٹھائے ضیا کے پیروں کی سمت کھڑی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرہ خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ جب میں نے دھیرے سے ضیا کے کان میں کہا۔

''ضیا تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' ضیا یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھا وہ اس گھڑی بالکل بھی بیمار نہیں لگ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ بیٹھا ہو اس کے چہرے پر ایک پیاری سی مسکراہٹ سجی تھی اور پھر اس نے یہ بتا کر کہ اس کے سامنے راحت کھڑی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو ہی حیران کر دیا تھا۔ راحت کی موجودگی تک کمرہ قہقہوں سے گونجتا رہا پھر میرے ماں اور ابا بھی کمرے میں آ پہنچے تھے۔

یہاں آج پہلی بار میں نے انہیں راحت کا تعارف کرایا تھا اس روز بڑے ابا ان کے ہمراہ نہ آئے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ راحت اور میں ایک ساتھ اکیڈمی میں پڑھتے تھے اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میں اسے اپنے دوست ضیا کے لیے دعائیں کرنے کو کہتا رہا۔ پھر اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا اور میں پلٹ کر واپس ضیا کے پاس چلا آیا تھا۔

اسی روز ضیا کے ابا ڈاکٹر سے ملے تھے جب ڈاکٹر نے انہیں اگلے دن صبح دس بجے آپریشن کا وقت دے دیا تھا۔ وہ چند روز تک ادویات دیتے رہے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ ادویات سے ہی کچھ بہتری آ جائے لیکن اب ڈاکٹر مزید دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اگلے روز صبح ہم سبھی ضیا کے پاس موجود تھے ہم اسے حوصلہ اور یقین دلا رہے تھے کہ اس آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک اور تندرست ہو جائے گا وہ پھر سے اپنی آنکھوں سے اس دنیا کی خوب صورتی کو دیکھ سکے گا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے اردگرد موجود تھے اور چھوٹی جو ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ یہ سبھی باتیں ابھی نہ سمجھتی تھی وہ بھی ضیا کے قریب سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔

''چھوٹی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو کر گھر چلے جائیں۔'' وہ میری بات سن کر اسے دہرا رہی تھی۔

''اللہ تعالیٰ ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو جائیں۔''

اب پونے دس ہو رہے تھے جب ضیا کو آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ جب اچانک اس نے یوں بچوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا وہ یہ آپریشن کرانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی چند لمحوں پہلے تک ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ضیا جسے ہم ایک روز پہلے سے امید دلا رہے تھے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے رہے تھے اب آپریشن سے ذرا پہلے وہ اتنا خوف زدہ ہو جائے گا کہ آپریشن کرانے سے ڈرنے لگے گا۔ ضیا کے ابا اسے ایسا کرتا دیکھ کر اس پر جھکے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے بولے۔

''میرے بیٹے ہم تمہیں تندرست دیکھنا چاہتے ہیں۔'' قریب ہی کھڑی ضیا کی ماں یہ سب دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی اور میری ماں انہیں دلاسہ دے رہی تھی دادی ماں عینک کے پیچھے ٹپ ٹپ گرتے موتیوں کی لڑی کو اپنے آنچل میں

سموتی جارہی تھی۔ ضیا کے ابا انہیں ذرا سہارا دے کر ضیا کے پاس لے آئے اور وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”ضیا پتر تجھے کچھ نہیں ہوگا، گبھرا نہ پتر۔“ وہ ابھی اتنا ہی بول سکی تھی جب اسپتال کا عملہ ضیا کو آپریشن تھیٹر لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آپریشن تھیٹر کی لال بتی جل اٹھی۔ اس کا مطلب تھا آپریشن کا آغاز ہو چکا تھا ہم سبھی دل ہی دل میں ضیا کی صحت کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ میرے قریب ہی ضیا کی دادی ماں بیٹھی سر جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی میں نے جگہ بدل لی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں دادی کی نگاہوں میں اٹھتے سوالوں کے جواب دے پاتا ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے میری ایک ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں ضیا کو ون ویلنگ جیسے خطرناک کھیل سے روکوں اور پھر ون ویلنگ کرتے ہوئے پیش آئے حادثہ کے وقت میں ہی تو اس کے ہمراہ موجود تھا اس سے پہلے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا ضیا کو حادثہ پیش آ چکا تھا۔

اب جس جگہ میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اس جگہ دیوار کے مخالف سمت میرے عین بالکل سامنے اسلامک کیلی گرافی کا ایک کافی بڑا فن پارہ نصب تھا جس پر اسماء الحسنیٰ اور اسما محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوب صورتی سے لکھے گئے تھے اللہ تعالیٰ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صفاتی نام کی نسبت اور تاثیر کی مناسبت سے مختلف رنگوں کا استعمال اس فن پارے کو بنانے والے کے دل میں اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ عشق کا ثبوت تھا۔ وہی کھڑے کھڑے نہ جانے کیسے میرے دل میں اس آرٹ کو سیکھنے کی خواہش نے جنم لیا اور میں سوچنے لگا کہ جب ضیا اچھا ہو جائے گا اور مجھے فرصت کے کچھ لمحے میسر آئیں گے تو میں اسلامک کیلی گرافی کے اس فن کو ضرور سیکھوں گا اور ساتھ ہی ساتھ میں اسما الحسنیٰ اور اسما محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد کرتے ہوئے ضیا کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ بالآخر ایک طویل آپریشن کے بعد جب آپریشن تھیٹر کی لال بتی اچانک بجھی تو ڈاکٹر کو باہر آتا دیکھ کر سبھی جو بیٹھے تھے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی زبانی یہ الفاظ سن کر کہ ضیا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا وارڈ چیخ و پکار سے گونج اٹھا عین اس لمحے مجھے لگا اگر میں نے دیوار کا سہارا نہ لیا تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاؤں گا میں دیوار سے پیشانی ٹکائے بے بسی سے روتا رہا میرے عقب میں ضیا کے ماں ابا، دادی اور خود میرے گھر والوں کا بھی یہی عالم تھا ضیا ایک ہی پل میں ہم سے بچھڑ کر عالم برزخ میں جا پہنچا تھا جہاں سے پھر پلٹ کر کوئی نہیں آتا ہم چاہے کتنا ہی رو پیٹ لیں کئی کئی روز تک ان کو یاد کرتے کھانا پینا چھوڑ دیں ہمیں اپنے خالق کی رضا بارضا ہی ہونا پڑتا ہے۔ ضیا سے بچھڑنا میرے لیے اس لیے قدر شدید صدمہ تھا کہ پھر کئی روز تک میں نے خود کو گھر میں ہی قید کر لیا تھا۔

ایک روز مجھے راحت کی کال آئی وہ بھی ضیا کی اچانک ہوئی موت پر بے حد غم زدہ تھی اور اب مجھ سے ملنا چاہتی تھی اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ رہی ہے۔

چچا مرزا کی بات سن کر میں ایک دم سے

خیالوں کے دائرے سے پلٹا اور بآواز بلند مجھ پر ہی برس رہے تھے۔

''یہ کیا بتائے گا لڑکی کہاں ہے کبھی کسی چور نے بھی اپنی چوری قبول کی ہے لڑکی اگر گھر میں آئی ہے تو اسے ہم خود ہی کھول لیں گے۔ چلو عبدالقادر اور مائیکل تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' چچا اتنا کہہ کر آگے کمروں کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا غصے کے عالم میں مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب ماں میرے پاس آتے ہی بولی۔

''طٰہٰ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں یہ سب کیا دیکھ رہی ہوں بیٹا؟'' ماں حیرت زدہ سی میرے قریب آ کر مجھ سے سوال کر رہی تھی۔ جانے یہ مرزا کیوں میرے اور میرے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ مجھے ٹھوکا سا لگا کر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے اور اب ہم دونوں باپ بیٹا چچا مرزا کے پیچھے ہو لیے ہمارے ان تک پہنچنے تک وہ ایک کمرے کا معائنہ کر چکے تھے اور پھر وہ بابا عبدالقادر اور مائیکل کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے میرے کمرے کی جانب بڑھے انہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر میں نے اپنے ابا کی جانب دیکھا وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئے تھے وہ چچا کو میرے کمرے میں جانے سے روکنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے چچا سے مخاطب تھے۔

''رک جاؤ مرزا۔'' لیکن ابا کے انہیں آواز دینے تک وہ میرے کمرے میں داخل ہو چکے تھے ابا نے بابا عبدالقادر اور مائیکل کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور پھر چچا کے پیچھے ہی میں اور ابا بھی کمرے میں پہنچ گئے چچا نے ابھی ایک پردہ ہٹایا ہی تھا جب وہ ابا کی آواز پر وہی رک گئے۔

''مرزا یہ سب تم بہت غلط کر رہے ہو۔ کیا طٰہٰ یا مصطفیٰ تمہارے بچوں جیسے نہیں۔'' چچا مرزا جواباً کی بات سن کر رک گئے تھے اور جو غصے سے بے قابو ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خشمگین نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

''میرے بچوں جیسے ہیں اسی لیے تو انہیں سزا دینا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ تم جیسے نہ ہو جائیں خورشید عالم۔'' چچا اتنا کہہ کر غصے سے ہاتھ ملتے باہر نکل گئے اور ابا کچھ دیر تک ساکت کھڑے چچا کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اتنے میں، میں نے راحت کو باہر آنے کو کہا اور وہ ہمارے عقبی جانب لگے پردے کے پیچھے سے باہر چلی آئی۔ ابا نے اسے دیکھتے ہی جیسے اپنا مزاج درست کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار دیتے ہوئے تسلی دینے لگے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اس کے گھر چھوڑ کر آئیں گے۔

ابھی ابا وہاں کھڑے اسے تسلی دے ہی رہے تھے کہ جب ماں بھی ہمارے تعاقب میں میرے کمرے تک آ پہنچی اور پھر جیسے وہ ایک بار پھر سے میرے اور ابا کے درمیان کالا عبایا پہنے کھڑی راحت کو دیکھ کر ششدر سی ہو کر رہ گئی راحت نے انہیں سلام کیا تو جیسے انہیں یقین آیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ ان کے سامنے واقعی ہی چوہدری عبدالغنی کی بیٹی راحت عبدالغنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ماں سارا ہی کھیل سمجھ چکی تھی۔ بڑے ابا کے شدید غصے سے بھرے کلمات، چچا مرزا کی سارے گھر میں چھان بین اب یہ راز ان پر عیاں ہو چکا تھا پچھلے کئی لمحوں سے وہ باہر لگی کچہری میں کھڑی جو کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی اب وہ

عقدہ ان پر کھل چکا تھا میں نے اور ابا نے انہیں ملنے گھر آئیں گے۔

اس بات سے بے خبر رکھا تھا اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ماں جیسے کمرے میں داخل ہوئی تھی اب راحت کو میرے اور ابا کے ساتھ کمرے میں موجود پا کر الٹے پیروں لوٹ گئی۔ ماں کے راحت سے بات کیے بغیر باہر نکل جانے پر راحت نے حیرت سے میری جانب دیکھا وہ تو فقط مجھ سے میرا حال دریافت کرنے آئی تھی اور پھر اس کے میرے کمرے میں آتے ہی میں نے پہلے اسے پردے کے پیچھے چھپا دیا پھر دیر تک وہ وہیں چھپی میرے لوٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر چچا مرزا جو اسے ڈھونڈتے کمرے میں آ پہنچے تھے وہ باتیں بھی اس نے سن لی تھیں اور اب ماں کا رویہ بھی اسے عجب لگ رہا تھا لیکن اس سے پہلے جب بھی میرے مخالف ہوگئے تھے۔ میرے ابا نے جو میرا ساتھ دیا تھا اور بڑے ابا کی نگاہ میں مجھے گرنے سے بچا لیا تھا۔ میں ان کا یہ احساس کبھی نہیں بھول سکتا تھا چاہے اس وقت میرا ساتھ دینے کے پیچھے ان کے کتنے ہی مفاد چھپے تھے لیکن اس سب کے باوجود ان کا وقار میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا پھر ابا کچھ دیر تک مجھے اور راحت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں جب وہ لوٹے تو انہوں نے مجھے اور راحت کو اپنے ساتھ باہر آنے کو کہا باہر پورچ میں آنے تک میں نے دیکھا ابا نے ساری ہی بتیاں بجھا دی تھیں پھر وہ خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور انہوں نے گاڑی چوہدری عبدالغنی کے گھر سے ذرا پہلے ہی روک دی راحت گاڑی سے اتر کر مجھے اور ابا کو گھر چلنے کے لیے اصرار کرتی رہی لیکن ابو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے ہوئے بولے کہ وہ جلد ہی اس سے

گاڑی واپس موڑتے ہوئے اپنے گھر پہنچنے تک ابا نے جو بھی باتیں مجھ سے کیں ان باتوں نے ساری ہی رات مجھے جگائے رکھا میرے ابا کی انہی باتوں کی وجہ سے ان لمحوں کو بھی بھول گیا تھا جب بڑے ابا اور چچا مرزا مجھے خطاوار ثابت کرنے کی کوشش میں لگے تھے اور چچا تو واقعتاً ایسا کر گزرتے اگر ابا ان کے تعاقب میں میرے کمرے میں پہنچ کر انہیں روکتے نا اور میرے ہی بے حد اچھے ابا راحت کو اس کے گھر پہنچا کر راستہ میں مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ اگر ان کا بیٹا اور راحت ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں تو پھر وہ چوہدری عبدالغنی سے ان کی بیٹی کا ہاتھ اپنے بیٹے طٰہٰ کے لیے مانگ لیتے ہیں۔"

ابا کی یہ بات سن کر چند لمحوں تک تو مجھے اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آیا کہ میرے ابا جو چوہدری عبدالغنی کے سیاسی حریف تھے وہ اتنی بات کہہ سکتے تھے کہ وہ خود چوہدری عبدالغنی کے گھر جا کر اپنے بیٹے کے لیے ان کی دختر کا ہاتھ مانگیں گے پھر راستہ بھر ابا اور میں اسی موضوع پر بات کرتے تھے اور اب اپنے کمرے میں پہنچ کر یہی سوچتے ہوئے جیسے میری نیند ہی اڑ چکی تھی ابھی تو فقط ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات ہی کی تھی لیکن میں جیسے ابھی سے راحت کو پا لینے کی خوشی میں پھولے نہ سما رہا تھا۔ جب ایک دم سے مجھے ضیا کا خیال آ گیا آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اسے یہ سن کر کتنی خوشی ہوتی ضیا کا خیال آتے ہی میں مضطرب سا ہو کر اس کی مغفرت کے لیے سوہنے رب کے حضور دعائیں کرنے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ماں میرے کمرے

میں آئی وہ جو رات غصے کے عالم میں راحت سے ملے بغیر ہی کمرے سے چلی گئی تھی۔ اب یکسر بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں پہنچتے ہی پہلے مجھے یوں پیار سے جگانے لگی جیسے میرے بچپن کی ہر صبح وہ میری پیشانی چوم کر مجھے جگایا کرتی تھی۔ میں نے جاگتے ہی اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا اور وہ پیار سے میرے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

''میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اب وہ مجھ سے اپنی باتیں بھی چھپانے لگا ہے۔'' میں ماں کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات کے چھپانے کا شکوہ کر رہی تھی بس میں کچھ دیر تک یونہی خاموش رہا اور پھر بولا۔

''ماں میں نے آپ کو راحت سے ملوایا تھا جب ضیا اسپتال میں تھا وہ اس سے ملنے آئی تھی وہیں آپ اور ابا کو میں نے راحت سے ملوا دیا تھا۔'' میری یہ بات سنتے ہی ماں جھٹ سے بولی۔

''ہاں بیٹا جی یاد ہے مجھے تم نے اسے اپنے ابا کو اس سے ضرور ملوایا تھا اور ہمیں پوچھے بنا ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ راحت تمہارے ساتھ اکیڈمی میں پڑھتی ہے۔'' اور پھر اگلی بات کہنے سے پہلے ماں نے میرے گال پر اپنے ہاتھ سے ایک چپت لگائی اور بولی۔

''بیٹا جی آپ نے یہ بات تو ہم سے چھپائے ہی رکھی کہ آپ اور راحت ایک دوسرے سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں۔'' ماں کی یہ بات سن کر میں شرما کر ماں کی گود میں اور بھی سمٹ گیا تھا۔ جب اگلی بات سن کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ماں کی گود میں سر رکھے یونہی پڑا رہوں اور ماں میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولتی رہی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میرے ابا، بڑے ابا سے اس سلسلے میں ہی بات کرنے گئے تھے کہ وہ چوہدری عبدالغنی کے ہاں طٰہٰ کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جانا چاہتے ہیں پھر اماں میرے ساتھ شادی کی تیاری تک کی باتیں کر کے چلی گئی اور میں اپنے بستر پر پڑا سوچنے لگا کہ جب میرے ابا خورشید عالم بڑے ابا سے میرے اور راحت کے رشتے والی بات کریں گے تو کیا وہ اس رشتے پر راضی ہوں گے یہ خیال ذہن میں اٹھتے ہی اب میں عجب سیمابی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا ایک رات پہلے میں نے بڑے ابا کو کس قدر شدید غصے میں دیکھا تھا جب کسی نے انہیں یہ اطلاع کر دی تھی کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی چوری چھپے ان کے پوتے سے ملنے ان کے گھر موجود تھی لیکن پھر میرے ابا خورشید عالم کی مداخلت پر وہ یہ ثابت نہیں کر پائے تھے کہ راحت واقعتاً گھر میں موجود تھی یا نہیں اور پھر یہ سوچ کر مجھے کچھ سکون ملا اور ساتھ ہی میں دعائیں کرنے لگا کہ یا اللہ میرے بڑے ابا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہو کیونکہ ایک وہی تھے جن کے راضی ہونے پر بات آگے بڑھ سکتی تھی تھوڑی دیر تک میں یونہی خیالوں میں گم بستر پر پڑا رہا اور پھر بستر سے نکل کر تازہ دم ہو کر میں نے اپنے کمرے سے ایک قدم باہر رکھا ہی تھا کہ جب میں نے دیکھا ابا میری طرف ہی بڑھ چلے آ رہے تھے انہوں نے قریب آتے ہی مجھے اپنے گلے سے لگا لیا وہ بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے انہی کی زبانی مجھے معلوم پڑا کہ بڑے ابا کو میرے اور راحت کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ انہیں تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جوان اولاد غلط راہ پر چل نکلے ابا یہ خوش خبری سنا کر چلے گئے اور میں جو یہ خوش خبری سن کر پھولے نہ سما رہا تھا مجھے ایک بار پھر اپنے

دوست ضیا کا خیال آ گیا اور میں وہیں سے الٹے پیروں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

اگلے روز جب ماں، مصطفیٰ عالم ابا اور بڑے ابا چوہدری عبدالغنی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے عین وقت پر چچا مرزا نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ چچی جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر آئی تھی وہ بھی چچا کا انکار سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی کہ اچانک سے یہ انہیں کیا ہو گیا تھا وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ باقی سب جاتے ہیں تو جائیں لیکن وہ نہیں جائیں گے بلکہ وہ بڑے ابا کو بھی ساتھ جانے سے روکتے رہے پھر میرے ابا کے استفسار پر کہ وہ ان کے ہمراہ کیوں نہیں جانا چاہتے انہوں نے تلخ کلامی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ چوہدری عبدالغنی کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے اور وہ وہاں جا کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتے۔ اس سے پہلے کہ چچا کے ایسے جواب کا میرے ابا کوئی جواب دیتے بڑے ابا نے انہیں اشارتاً ایسا کرنے سے روک دیا اور پھر وہ ابا سے کہنے لگے کہ اگر مرزا نہیں جانا چاہتا تو یہ ان کا اپنا فعل ہے وہ خاندان بھر کی خوشیوں میں اگر شریک نہیں ہونا چاہتا تو نہ ہو ہم کسی کے ساتھ کوئی زور زبردستی کا معاملہ نہیں رکھیں گے اگر چوہدری عبدالغنی اس رشتے سے انکار کرنا چاہتے تو پھر وہ ہمیں گھر بلاتے ہی کیوں، وہیں کھڑے کھڑے چچا نے بڑے ابا کی یہ باتیں سن کر چچا کو اشارہ کیا اور پھر وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے یہ دیکھ کر ماں، ابا، بڑے بھائی، مصطفیٰ عالم اور بڑے ابا ہم سبھی خوش ہو گئے کہ ایسے موقع پر سب کو ایک ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔

جب سبھی چوہدری عبدالغنی کے ہاں بات طے کرنے کو چلے گئے تو میں اب گھر پر تنہا ہی تھا اور میرا وقت گزارنا بے حد دشوار ہو رہا تھا میں نے راحت سے گپ شپ لگانے کو جو کال کی تو چند ایک باتوں کے بعد اس نے بھی یہ کہہ کر کال کاٹ دی کہ وہ بے حد مصروف ہے یوں وہ ایک ایک پل میں نے گن گن کر گزارا اور پھر جو رات گئے سبھی واپس لوٹے تو مبارک بادیوں اور میٹھے میٹھے قہقہوں سے ساری حویلی جھوم اٹھی۔ چوہدری عبدالغنی نے مہمان نوازی اور خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی چچی اور چچا مرزا جن کو ہمراہ لے جاتے ہوئے کچھ تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی اب گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے مبارک باد دی تو حویلی کے کسی کونے میں دبکی بیٹھی چچا مرزا کی دونوں صاحبزادیاں آمنہ اور یومنہ بھی یہ آوازیں سن کر وہاں پہنچ گئیں یومنہ تو اس وقت بہت چھوٹی تھی آمنہ نے بھی مجھے مبارک باد دی۔ وہ بھی بہت خوش لگ رہی تھی اور جب میں نے ماں سے منگنی کی رسم کے حوالے سے دریافت کیا تو گویا انہوں نے مجھے یہی بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو چوہدری عبدالغنی نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی تھی لیکن ساتھ ہی وہ مجھے بتانے لگی کہ سبھی وہاں دونوں خاندانوں کے جڑنے سے اتنا خوش تھے کہ سمجھو کہ رشتہ تو پکا ہو ہی چکا ہے پھر ان کی یہ بات سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی میرے وہ دوست جن سے ابھی میں نے راحت کا ذکر تک نہ کیا تھا وہ بھی مجھے کال کر کے مبارک باد دے رہے تھے باہر طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا اور کوئی اس فیصلے کو

درست قرار دے رہا تھا۔ کئی جواریوں نے تو جوا لگا دیا تھا اور میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جیت کسے ملنے والی تھی ہارنے والا کون تھا میں تو فقط اس نشے میں ڈوبا مست ہوا رہتا تھا کہ راحت میری ہونے جا رہی تھی میری پہلی چاہت میرا سکھ چین راحت ہمیشہ کے لیے میری ہو رہی تھی۔

ابھی اس بات کو چند روز ہی بیتے تھے کہ گھر میں پھر ایک نیا فساد برپا ہو گیا میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان پھر سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس جھگڑے کی شروعات وہاں سے ہوئی جب چچا مرزا نے بڑے ابا سے آمنہ اور میرے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کے رشتے والی بات کی وہ چاہتے تھے کہ اگر میرے ابا نے میرا رشتہ خاندان سے باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ عالم کے لیے ان کی بیٹی آمنہ کا رشتہ قبول کر لیں اور جب طہٰ کی منگنی ہو تو پھر ساتھ ہی ان کی بیٹی اور مصطفیٰ عالم کی منگنی بھی ایک ساتھ ہو جائے لیکن جب بڑے ابا نے چچا مرزا کی خواہش ابا کو بتائی تو ہاں نے ابا سے یہ بات سن کر فوراً ہی اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا جو ایم فل کر رہا تھا پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے تو پھر وہ اس کی شادی کے حوالے سے سوچیں گے لیکن ماں کی کہی یہ بات فقط رشتے کو ٹالنے کا ایک جواز تھا درحقیقت تو اس رشتے سے انکار کی وجہ آمنہ کی تعلیم تھی وہ ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی اور یوں چچا یہ انکار برداشت نہ کر سکے تھے انہوں نے پھر سے جائیداد کا مطالبہ اٹھا لیا۔

میرے ابا اور چچا مرزا کے درمیان ابھی یہ سرد جنگ جاری ہی تھی کہ جب ایک روز بڑے ابا نے سبھی کو اپنے پاس طلب کر لیا مجھ سمیت سبھی کا خیال یہی تھا کہ شاید بڑے ابا چچا مرزا اور خورشید عالم کے درمیان چل رہی رنجش کو مٹانے اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے سبھی کو اکٹھا کر رہے تھے لیکن جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات بتائی کہ چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بڑے ابا کی زبانی یہ بات سن کر مجھ سمیت سبھی نے تاسف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا جیسے انہیں بھی میری طرح اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا پھر بڑے ابا ذرا تفصیل سے بتانے لگے کہ چوہدری عبدالغنی نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اب وہ مجبور تھے انہوں نے جب اپنے خاندان والوں سے بات کی تو انہوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے بڑے ابا ابھی یہ ساری تفصیل بتا رہی رہے تھے کہ جب چچا مرزا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اور ڈھول پیٹتے پھر سارے شہر میں کہ ہم لوگوں نے چوہدری عبدالغنی کے ہاں رشتہ پکا کر لیا ہے۔'' وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں بات کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)



لارنس آف افغانستان

زرین قمر

زرین قمر کا نام نئے افق قارئین کے لیے نیا نہیں ہے۔ آپ اکثر ان کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ چڑیا کا گھونسلہ' ادھورا خواب' انجانے فیصلے' بددعا' غزہ کی سسکیاں اور پناہ گزین جیسی ان کی متعدد لازوال کہانیاں رسالے کی زینت بن چکی ہیں۔ وہ ہر موزوں پر قلم اٹھانے کی قدرت رکھتی ہیں۔ ان کے کردار ہمیں اپنے معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی کرائم نمبر کے لیے اس بار انہوں نے بطور خاص افغانستان کے سیاسی پس منظر کو اپنا موزوں قلم بنایا ہے۔

ایک امریکی فوجی کمانڈر کا احوال' جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے' لیکن وہ ایک جنگی رپورٹر کے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا۔

سرخ وسفید رنگت' بھورے بال' ہلکے سرمئی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس ایک براؤن کلر کی بڑی سی چادر کاندھوں پر ڈالے ہاتھوں میں کلاشنکوف پکڑے وہ بڑی پھرتی سے ایک پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر دوسری پہاڑی کے پیچھے روپوش ہوگیا تھا۔ اس نے قمیص کے اوپر جو واسکٹ پہنی ہوئی تھی اس میں بہت سی جیبیں تھیں جن میں گولیاں بھری تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی واسکٹ کے ساتھ بلٹس کی پیٹیاں بھی لٹک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت جھلک رہی تھی اس نے پشاوری چپل اور پشاوری ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں موزے اور چہرے پر داڑھی تھی' پہلی نظر میں وہ کوئی مقامی افغان لگتا تھا لیکن دراصل یہ امریکی فوج کا بہادر کمانڈر جیم گینٹ تھا جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے اور جم گینٹ کو اس کی ضمانت سمجھا رہا تھا کہ وہ امریکی فوجیوں کے لیے افغانستان میں سازگار فضا پیدا کرلے گا' اس نے عراق میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے اور ''بہادری'' کے کئی تمغے حاصل کیے تھے۔ اس کی چال میں چیتے جیسی پھرتی' آنکھوں میں لومڑی جیسی عیاری تھی اور اس کا ذہن منصوبے بنانے اور دشمن کے خلاف جال بننے میں ماہر تھا اس نے افغانستان آتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ہر حالت میں اس ہاری ہوئی جنگ کو امریکا کی فتح میں تبدیل کردے گا اور اس کے لیے اس نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ افغانستان میں آتے ہی اپنا حلیہ تبدیل کردیا تھا اور مقامی لوگوں جیسا لباس اور حلیہ بنالیا تھا اسے جو فوجی دیئے گئے تھے وہ امریکا سے حال ہی میں بھجوائے گئے تھے جو کم عمر اور نہ تجربہ کار تھے اور گینٹ نے انہیں تربیت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام میں اس کا ایک دوست پیٹریو اس کے ساتھ تھا جو امریکی آرمی میں کمانڈر کے عہدے پر فائز تھا اور افغانستان میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسی کی درخواست پر گینٹ کو عراق سے افغانستان بلایا گیا تھا کیونکہ گینٹ کے بہادری کے کارنامے پیٹریو کے پاس پہنچ چکے تھے اور اس نے گینٹ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

گینٹ پھر فائرنگ کرتا ہوا پہاڑی کی اوٹ سے نکلا تھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا کچھ فاصلے پر لگی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا تھا۔ اس کے اردگرد پہاڑیوں میں اس کے ساتھی بھی اسلحہ سے لیس موجود تھے اس وقت ان

کا مقابلہ دور پہاڑیوں میں چھپے طالبان سے ہو رہا تھا۔ گینٹ اپنی فوجی اصطلاح میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت بھی دیتا جا رہا تھا۔

اس نے ایک مخصوص سمت اشارہ کر کے اپنے ایک فوجی کو فائرنگ کا آرڈر دیا اور اس فوجی نے اس سمت نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔ اس سمت سے آتی ہوئی گولیاں کچھ دیر کے لیے رک گئی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوسری طرف سے فائرنگ کرنے والا یا تو زخمی ہو گیا ہے یا اپنی پوزیشن بدل چکا تھا۔

جیم گینٹ کا طالبان سے یہ مقابلہ ایک جنگی مقابلہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فوجیوں کی ٹریننگ بھی تھی۔ وہ انہیں راتوں رات ٹرینڈ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جن حالات کا سامنا تھا اس میں اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ الگ سے وقت دے کر انہیں تربیت دے اسے تو ہر وقت دشمن کا سامنا تھا۔

''تمہیں عراق سے آئے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔'' اس کے دوست پیٹریو نے ایک دن اس سے کہا۔ ''اور تم نے اپنا حلیہ بالکل مقامی لوگوں جیسا بنا لیا ہے آخر تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ طالبان مجھے مقامی باشندہ سمجھیں۔'' گینٹ نے جواب دیا۔

''لیکن طالبان اتنے احمق نہیں کہ انہیں یہاں ہماری موجودگی کا احساس نہ ہو صرف حلیہ بدل لینے سے ہم افغان نہیں بن سکتے۔'' پیٹریو نے کہا۔

''میں جانتا ہوں ابھی اس سلسلے میں بہت کام کرنا ہے۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان باتوں میں وقت ضائع کریں۔ ہمیں ہر وقت دشمن کا سامنا ہے۔'' پیٹریو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں اور کسی چیز سے بے خبر نہیں ہوں جب مجھے یہاں بھیجا گیا ہے تو میں اپنے افسروں کی امید پر پورا اتروں گا اور انہیں مایوس نہیں کروں گا۔ دراصل میرا کام کرنے کا طریقہ بہت مختلف ہے۔'' جیم گینٹ نے اسے سمجھایا۔

''تمہیں جو فوجی دیئے گئے ہیں وہ بھی ناتجربے کار ہیں' تم یہ جنگ کیسے جیتو گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو' بس جیسے میں کہتا جاؤں ویسے کرتے جاؤ' میرا طریقہ کار مختلف ہے اور میں اپنے اس طریقے کی مدد سے سب کر لوں گا اور سب کو حیران کر دوں گا۔'' گینٹ نے کہا اور واقعی اس نے بہت کم عرصے میں ان ناتجربہ کار فوجیوں کو تربیت دے کر اپنی مرضی کے مطابق تیار کر لیا تھا۔ اس نے ان سب کو فوجی وردیوں کے بجائے مقامی لباس پہنا دیا تھا اور یہی نہیں بلکہ ان کو مقامی زبان بھی سکھائی تھی خود بھی سیکھی تھی اور وہ بات کرنے کے لیے زیادہ تر مقامی لوگوں سے ان ہی کی زبان میں بات کرتے تھے' ان کا اٹھنا بیٹھنا' ان کی بول چال' ان کا پہننا اوڑھنا سب کچھ مقامی لوگوں جیسا تھا اور دور سے انہیں دیکھ کر کوئی بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔

پہاڑیوں میں طالبان سے ان کی جھڑپیں معمول کی بات تھیں۔ اس روز بھی کچھ دیر کی جھڑپ کے بعد وہ خاموشی سے اپنے فوجی بیس میں واپس آ گئے تھے۔ ان کا یہ فوجی بیس چاروں طرف سے اونچی اونچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کونار دریا کے کنارے واقع تھی اور کونر صوبے کا حصہ تھی جو پاکستان کے بارڈر کے ساتھ واقع تھا اور افغانستان کی خطرناک ترین پوسٹوں میں سے تھا اور مشرقی افغانستان میں واقع تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کسی مقامی اہم شخصیت سے تعلقات پیدا کیے جائیں۔'' ایک شام گینٹ نے اپنے دوست کمانڈر پیٹریو سے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس طرح ہمیں اپنے کام میں ان کی مدد حاصل ہو جائے گی۔'' گینٹ نے جواب دیا۔

''بھلا وہ ہماری مدد کیوں کریں گے؟''

''کیونکہ ہم ان کے دوست بن جائیں گے۔'' گینٹ نے مسکراتے ہوئے کہا' وہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کو سہلا رہا تھا۔

''لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ مسلمان کسی کے دوست نہیں ہوتے' وہ کسی دوسرے مسلمان کے مقابلے میں ہماری مدد نہیں کریں گے۔'' کمانڈر پیٹریو نے یقین سے کہا۔

''تم درست کہہ رہے ہو لیکن تم دیکھتے جاؤ میں جس طریقے سے ان کے قریب ہوں گا اور جو کچھ ان سے کہوں گا وہ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' اس بار گینٹ کے لہجے میں پیٹریو سے زیادہ یقین جھلک رہا تھا۔

''تمہاری بات پر مجھے یقین نہیں ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ میں تمہاری مدد کرسکوں اور کسی اہم شخصیت سے رابطے میں آ جاؤں۔'' کمانڈو پیٹریو نے کہا۔

پھر چند ہی روز میں پیٹریو نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ افغانستان کے مہمند قبیلے کے سردار نور افضل تک رسائی ہوگئی ہے وہ اس علاقے کا بہادر ترین سردار ہے اور اسے سیٹنگ بل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر گینٹ نے اس سے ملنے میں دیر نہیں کی تھی وہ اپنی وردی کے بجائے مقامی لباس میں ہی اس سے ملنے گیا تھا' جب وہ اپنے دوست کمانڈو پیٹریو کے ساتھ نور افضل کے ڈیرے پر پہنچا تو اسے اپنا منتظر پایا تھا۔ نور افضل نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ بے چینی سی تھی اور اس کی آنکھیں بار بار کمانڈر گینٹ کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ نور افضل کے ڈیرے پر اس کے کچھ قریبی دوست بھی موجود تھے جو اس قبیلے کے انتظامات میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ نور افضل بہت محتاط انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ڈیرے کے باہر اس کے اپنے مسلح افراد تعینات تھے جو بہت ہی چاق و چوبند تھے۔

''یو ایس آرمی تو 2001ء سے اس علاقے میں سرگرم ہے۔ اس طرح پہلے تو کسی نے مجھ تک یوں رسائی کی کوشش نہیں کی۔'' نور افضل نے تنقیدی نظروں سے گینٹ کو دیکھتے ہوئے براہ راست سوال داغ دیا۔ وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے کے بعد زمین پر بچھے قالین پر بیٹھ گئے تھے جس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر افغانی طرز کا بستر تھا نور افضل اس پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھی گینٹ اور پیٹریو کے ساتھ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے سردار کی باتوں پر آہستہ آہستہ سر ہلاتے جا رہے تھے۔

''ہاں' تم درست کہہ رہے ہو۔'' گینٹ نے کہا۔ اس نے افغانستان آنے کے بعد جلد ہی مقامی زبان سیکھ لی تھی کیونکہ اسے جس انداز سے کام کرنا تھا یہ اس کا ایک ضروری حصہ تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت نور افضل سے افغانی ہی میں بات کر رہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ اس سے پہلے کسی نے تم سے اس طرح رابطہ نہیں کیا لیکن ان کا طریقہ کار مختلف تھا۔ میں جہاں جاتا ہوں' وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔'' گینٹ نے دل کی بات کہہ دی اور نور افضل چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم اپنی اس بات کی وضاحت کرو گے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں تمہارے یا تمہاری قوم کے خلاف لڑنے نہیں آیا' یہاں پر یہی تصور لیا جاتا ہے کہ امریکی فوجیں افغانستان میں اپنی برتری جمانے آئی ہیں یا وہ یہاں پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔'' گینٹ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی' وہ سوچتا جا رہا تھا کہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کرے کہ اسے نور افضل کی مدد بھی حاصل ہو جائے اور امریکی فوج پر لگا ہوا جارہ داری کا ایک دھبہ بھی مٹ جائے۔

"دیکھو! ہم سمجھتے ہیں کہ افغان مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے' یہاں القاعدہ اور طالبان کے دہشت گرد برسرپیکار ہیں اور افغان عوام ان تربیت یافتہ دہشت گردوں کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتے ہم لوگ آپ کی مدد کرنے آئے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" گینٹ نے کہا اور نور افضل بے یقینی کے انداز سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کیسے مان لوں کہ امریکا ہم سے ہمدردی رکھتا ہے۔" نور افضل نے پوچھا۔

"اگر امریکا آپ کی مدد نہ کرنا چاہتا تو ہمیں یہاں کیوں بھیجا جاتا اور اس جنگ میں اتنا پیسہ' اسلحہ اور فوجی کیوں لگائے جاتے۔ امریکی فوجیوں کی جانوں کو بھی خطرہ ہے یہاں۔ اب تک کتنے ہی امریکی فوجی مارے گئے ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔" گینٹ نے وضاحت کی اور نور افضل سوچ میں پڑ گیا۔

"ہوں...... ں...... ں" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں صرف اور صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہماری مدد کریں' ہماری لڑائی صرف طالبان اور القاعدہ کے ساتھ ہے ہم آپ لوگوں کو ان سے تحفظ دلوانے آئے ہیں اور ان کا قلع قمع کرنے آئے ہیں۔ اس میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہوگی۔"

"کس قسم کی مدد؟" نور افضل نے پوچھا۔

"ویسے تو ہم خود بھی طالبان کے ساتھ جنگ میں مصروف ہیں اور ان کے ساتھ ہماری جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں آپ کو آپ کے لوگوں نے Sitting Buld سیٹنگ بل کا لقب یونہی نہیں دیا۔ آپ بہت بہادر ہیں اور ان کا مقابلہ جوانمردی سے کرتے ہیں۔" گینٹ نے نور افضل کی تعریف کی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ٹھیک ہے میں اس بارے میں سوچ کر جواب دوں گا۔" نور افضل نے کہا اور کمرے میں باادب کھڑے ایک شخص کو ہاتھ سے اشارہ کیا وہ فوراً ہی باہر چلا گیا اور چند لمحوں میں ان لوگوں کے سامنے دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ دیا گیا تھا یہ خاص افغان کھانا تھا جس سے بہترین خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ افغانوں نے اپنی مہمان نوازی کا ثبوت دے دیا تھا۔ گینٹ اور اس کے ساتھیوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا جس کے بعد انہیں گرم گرم قہوہ پیش کیا گیا تھا۔

"میں آپ کے پاس پھر آؤں گا اور آپ کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر آپ کو مطمئن کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔" گینٹ نے رخصت ہوتے ہوئے نور افضل سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں بھی امید کرتا ہوں کہ جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔" نور افضل نے اپنی گھنی سرمئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جس کے بعد گینٹ' پیٹریو کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

ابھی اس کے ذہن میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بہت سے پوائنٹ موجود تھے لیکن وہ تمام ہدف ایک ہی نشست میں حاصل نہیں کر سکتا تھا اور یہ مناسب بھی نہیں تھا۔ اسے آہستہ آہستہ موقع کے حساب سے جب جب لوہا گرم ہو تب تب اس پر چوٹ لگانا تھی تاکہ اس کے منصوبے کی ناکامی ممکن ہی نہ ہو اور اسے سو فیصد کامیابی نصیب ہو' وہ جس مشن پر تھا اس پر ذرا سی بھی غلطی نہ صرف اس کے منصوبے کو فیل کر سکتی تھی بلکہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا اس صورت میں اسے طالبان اور القاعدہ سے مقابلے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کا بھی سامنا کرنا پڑتا' کیونکہ اگر انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ وہ ان سے ہمدردی صرف اور صرف اس لیے حاصل کر رہا ہے کہ ان کی مخالفت سے بھی بچ جائے اور ان کی مدد بھی حاصل کر لے تو اس کا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا نور افضل تمہاری مدد

کرنے کو تیار ہو جائے گا۔'' پیٹریو نے واپسی میں راستے میں اس سے پوچھا' وہ دونوں اپنی فوجی جیپ میں بیٹھے اپنے فوجی بیس کی طرف جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا اور جیپ اپنی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ناہموار زمین پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی' اس وقت بھی فضا میں گرمی کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا تھا' جو سورج غروب ہونے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

''ہاں' مجھے امید ہے اگر اس میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ اس پیش کش کو ضرور قبول کرے گا۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن ایسا وہ اس صورت میں ہی کرے گا جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ ہم واقعی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔'' پیٹریو نے کہا۔

''ہاں' یہ یقین دلانے کے لیے ہمیں مواقع کا انتظار کرنا ہوگا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہوگا' اس کے لیے شاید ہمیں کچھ قربانیاں بھی دینا پڑیں۔''

''قربانیاں؟'' پیٹریو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں..... میں اس کی وضاحت ابھی نہیں کر سکتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مواقع آئیں گے جب ہم انہیں اپنا ہمدرد بنا سکیں گے۔'' گینٹ نے کہا اور پیٹریو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے پروائی سے کاندھے اچکائے اور جیپ کی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ گینٹ بھی خاموش ہو گیا تھا اور سگریٹ سلگا کر اس کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے مشن کو کامیاب کرنے کے منصوبے سر اٹھا رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ انہیں کیسے عملی جامہ پہنائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔

''اچھا گینٹ! صبح ملاقات ہوگی۔'' پیٹریو نے جیپ سے اترتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور فوجی کیمپ میں واقع اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کیمپ کے باہر اور اندر امریکی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ گینٹ نے ایک جائزہ لیا اور پھر وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی' کبھی کبھی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ جاتی تھیں یا پھر گشت کرتے ہوئے فوجیوں کے جوتوں کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔ گینٹ بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ نمودار ہوا جو چپکے چپکے چلتا ہوا گینٹ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر وہ سایہ ایک لمبی راہداری سے گزر کر گینٹ کے کمرے کے دروازے پر رک گیا تھا' اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور آہستگی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گینٹ کی آنکھ اپنے سر کے بالوں میں کسی کے انگلیاں پھیرنے سے کھلی تھی' اندھیرے میں اسے کچھ نظر تو نہیں آیا تھا صرف ایک سیاہ ہیولا سا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف اور صرف اس کی محبوبہ این اسکاٹ ٹاکسن ہے کیونکہ وہی اس طرح اس سے ملنے آتی تھی۔ این ٹاکسن واشنگٹن کے ایک اخبار کی رپورٹر تھی اور افغانستان میں رپورٹنگ کرنے آئی ہوئی تھی وہ گینٹ کی بہادری سے بہت متاثر تھی۔ 2010ء سے جب سے گینٹ افغانستان میں تعینات ہوا تھا وہ اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہر محاذ پر جاتی تھی۔ جنگ کی ویڈیو بناتی تھی اور رپورٹ لکھتی تھی جسے واشنگٹن میں اپنے اخبار کو بھیجتی تھی لیکن اس کے اور گینٹ کے دل میں اٹھنے والے محبت کے طوفان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیونکہ یہ گینٹ کی فوجی ذمہ داریوں کے خلاف تھا چنانچہ دونوں نے اس کو راز ہی رکھا تھا۔

''تم کہاں تھیں؟'' گینٹ نیند سے بھرے لہجے میں ٹاکسن سے پوچھا۔

''میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' ٹاکسن نے کہا۔

''مجھے آئے ہوئے تو بہت دیر ہو گئی۔'' گینٹ نے ٹارچ کی روشنی میں گھڑی پر نظر ڈالی۔

''ہاں لیکن تمہارے پہرے دار تو جاگ رہے

ہیں۔'' ٹاکسن نے مسکراتے ہوئے کہا اور گینٹ نے اس کی طرف غور سے دیکھا ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کے بھورے گھنگریالے بال اس کے شانوں پر بکھرے بہت اچھے لگ رہے تھے اس نے یہاں آتے وقت جو چادر اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی، وہ اتار کر کمرے میں رکھی کرسی پر ڈال دی تھی اور اس وقت گینٹ کی ہدایت کے مطابق مقامی خواتین کی طرح کا شلوار قمیص پہنا ہوا تھا جس کے ساتھ دوپٹہ بھی تھا جو اس نے گلے میں ڈالا ہوا تھا وہ گینٹ کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

''تم شام کو پیٹریو کے ساتھ کہاں گئے تھے؟'' اس نے گینٹ سے پوچھا۔

''میں مہمند قبیلے کے سردار نور افضل سے ملنے گیا تھا۔'' گینٹ نے بلا جھجک اسے بتایا حالانکہ اپنے فوجی راز وہ کسی کو بھی بتانے کے لیے پابند تھا اسے اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی سے بھی ان کا ذکر کرے اسی طرح اس کی جو فوجی دستاویزات تھیں جن میں اس کے آئندہ منصوبے اور یو ایس آرمی کے حکام سے اس کی خط و کتابت اس کی ملاقاتوں اور افغانستان میں ان افسران کے دوروں کی تفصیلات درج تھیں وہ بھی اس کی تحویل میں تھیں اور بروقت اس کے کمرے میں اس کے پاس ہوتی تھیں اور ان تمام دستاویزات تک این ٹاکسن کی رسائی تھی اسے آزادی تھی کہ وہ جو دستاویز چاہے اور جب چاہے دیکھ سکتی تھی پڑھ سکتی تھی اس کی کاپی تک محفوظ کر سکتی تھی کیونکہ گینٹ کو اس پر بھرپور اعتماد تھا اور وہ اس کی شدید محبت میں گرفتار تھا۔ این کے اپنے پاس بیٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور گینٹ کی انگلیاں این کے بالوں سے کھیلنے لگی تھیں۔

''تم مہمند قبیلے کے سردار سے ملنے کیوں گئے تھے......؟ وہ تو کٹر مسلمان ہے اور بہت بہادر ہے۔ اسے سیٹنگ بل کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ وہ اور اس کے لوگ امریکیوں پر بھروسہ نہیں کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ این ٹاکسن نے اپنی صحافیانہ مہارت سے گینٹ کو وہ معلومات دینے کی کوشش کی جو وہ پہلے سے جانتا تھا کیونکہ کمانڈر پیٹریو نے اسے تفصیل سے نور افضل کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' گینٹ نے کہا۔

''پھر بھی تم اس سے ملنے گئے؟'' این نے کہا۔

''ہاں یہ ضروری تھا۔'' گینٹ نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اس کے آدمی کتوں کی طرح امریکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔'' این نے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں...... لیکن اگر ان کا سردار ہی میری مٹھی میں آجائے تو وہ اس کے احکامات کے خلاف نہیں جا سکتے۔'' گینٹ نے ہنستے ہوئے کہا اور این اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تم بہت چالاک اور موقع شناس ہو۔'' اس نے تعریفانہ انداز میں کہا۔

''ہاں! یہ تو ہے...... گینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں نے تمہاری محبت سے بھی تو فائدہ اٹھایا ہے۔ ابھی تم جیسی خوبصورت، بہادر اور ہوشیار صحافی میری بانہوں میں ہے۔'' گینٹ نے کہا اور ٹاکسن اس سے چمٹ گئی۔

دوسری صبح ناشتے پر گینٹ کی ملاقات پیٹریو سے ہوئی تھی وہ بہت پریشان لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔

''کیا بات ہے پیٹریو...... تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔'' گینٹ نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت گینٹ کے کمرے میں موجود تھے اور ناشتے پر تنہا ہی تھے۔

''ہاں...... مجھے تمہاری فکر ہے...... تم یہاں طالبان سے جنگ کے لیے جو طریقہ اپنانا چاہتے ہو وہ بہت خطرناک ہے...... اگر امریکی افسران کو اس کا پتہ چل گیا کہ تم لوگوں میں گھل مل رہے ہو تو یہ خطرناک ہوگا۔'' پیٹریو

نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں سب جانتا ہوں پیٹریو۔'' گینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو میں نے افغانستان آنے سے پہلے عراق میں پچاس ماہ تک جنگ لڑی ہے اور وہاں کامیابی حاصل کی ہے مجھے امریکا کا سلور ایوارڈ بھی ملا جو بہت کم فوجیوں کو نصیب ہوا ہے اور امریکی حکومت میری مداح ہے...... میری تعریف کرتی ہے اور میرے طریقہ کار کو پسند کرتی ہے۔''

''ہاں...... ہاں میں یہ سب جانتا ہوں۔'' پیٹریو نے کہا۔ ''مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا' میں نے ہی...... تمہیں یہاں بلوایا ہے اور میں نے ہی امریکی فوجی افسران کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ افغانستان کی ہاری ہوئی جنگ جیتنا چاہتے ہیں تو تمہیں عراق سے یہاں بلوالیں اور یہاں کی کمانڈ تمہیں دے دیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''تو پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر تم امریکی افواج کے اصولوں کی خلاف ورزی کرو گے تو مجھے بھی ذمہ دار سمجھا جائے گا۔'' پیٹریو نے قدرے برہمی سے کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا...... تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے سوچ لیا ہے میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے افسران سے ملوں گا ان سے اپنے منصوبے کی تحریری اجازت لوں گا پھر کام کروں گا۔'' گینٹ نے پیٹریو کو سمجھایا اور وہ پراطمینان انداز میں سر ہلانے لگا اسی وقت این ٹاسن ہنستی ہوئی گینٹ کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے سرمئی رنگ کا مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور گلے میں سفید چادر پڑی تھی جسے اس نے پشت کی طرف ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حسب معمول ویڈیو کیمرہ تھا جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتی تھی۔

''اچھا تو تم دونوں ابھی ناشتہ کررہے ہو؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور قریب رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گئی اسے دیکھتے ہی گینٹ کی آنکھوں میں پیار بھری چمک آ گئی تھی جسے پیٹریو محسوس نہیں کرسکا تھا وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ این صرف ایک صحافی کے طور پر یہاں تعینات ہے اور ذمہ داری سے اپنا کام کررہی ہے' وہ ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی ہے اور خبر اور ویڈیو بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

''ہاں ہم ابھی سو کر اٹھے ہیں۔'' گینٹ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اسے حیرت تھی کہ اسے افغانستان آئے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا اور وہ یہاں آتے ہی این کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا لیکن اس کے کسی ساتھی کو بھی اس محبت کا علم نہیں ہوا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ این کو بھی فوجی تربیت دی تھی' وہ بھی کبھی کبھی فوجی وردی میں اس کے ساتھیوں میں موجود ہوتی تھی یہ اور بات تھی کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کے بجائے کیمرے ہوتے تھے لیکن کبھی اگر ضرورت پڑے تو وہ رائفل بھی اٹھا لیتی تھی۔ گینٹ اس سے بہت خوش تھا اور گینٹ کے علاوہ بھی این دوسرے فوجیوں کا خیال رکھتی تھی ان سے بے تکلف تھی چنانچہ کسی کو بھی گینٹ اور اس کے معاشقے کا شک نہیں ہوا تھا۔

''پیٹریو! تم تو یہیں لڑتے لڑتے بوڑھے

مہکتی کلیاں

جو شخص نگاہ کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے زبان کو مت شرمندہ کرو۔

تم اس شخص کو تو بھول سکتے ہو جس کے ساتھ ہنسے ہو لیکن اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتے جس کے ساتھ روئے ہو۔

مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔

دوسروں کے حال پر غور کرنے سے نصیب ملتا ہے۔

جو لوگ زندگی کو مقدس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوتے۔

فیاض اسحاق مہانہ...... سلانوالی

ہو جاؤ گے۔'' این نے ہنستے ہوئے پیٹریو کو چھیڑا۔

''کوئی بات نہیں یہ تو میرا پیشہ ہے میں اپنے وطن کے لیے جوانی کیا اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' پیٹریو نے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' این نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اسی وقت دور سے فائرنگ کی آواز آتی سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک فوجی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے عجلت میں سلوٹ کیا تھا۔

''سر! یہاں سے تھوڑے فاصلے پر طالبان نے ہماری پیٹرولنگ پارٹی پر فائرنگ شروع کر دیا ہے' وہ پہاڑیوں سے فائر کر رہے ہیں۔'' اس نے تیزی سے بتایا اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پیٹریو اور گینٹ کھڑے ہو گئے تھے' پھر انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے تھے اور کمرے سے نکل گئے تھے۔ این بھی اسی تیزی سے ان کے ساتھ باہر آ گئی تھی اور پھر چند فوجیوں کو لے کر گینٹ بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر اس سمت روانہ ہو گیا تھا جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا' این بھی اس کے ساتھ تھی اور بہت چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔

جائے وقوع پر پہنچ کر اس نے فوجیوں کو مختلف سمتوں میں ڈیوٹیز پر لگا دیا تھا۔ جنہوں نے فوراً ہی اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور موقع پر موجود دوسرے فوجیوں کے ساتھ حملے کا جواب دینے لگے تھے۔ این نے بڑی مہارت سے اس لڑاء کی ویڈیو بنانا شروع کر دی تھی لیکن گینٹ نے اس کو ایک قدرے محفوظ چٹان کے پیچھے چھپ کر یہ کام کرنے کی ہدایت کی تھی اسے ہمیشہ ہی این کی حفاظت کا خیال شدت سے رہتا تھا اور کیوں نہ رہتا وہ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ پیٹریو' گینٹ کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا اور فائرنگ کا جواب دیتا ہوا گینٹ کے ساتھ ہی ایک محفوظ پہاڑی کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔

''پتہ نہیں ان طالبان نے ان پہاڑیوں میں کیسے ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں کہ اچانک ہی غائب ہو جاتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گئے۔'' گینٹ نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

''یہاں جگہ جگہ پہاڑیوں میں غار بنے ہیں اور اکثر کی چھت میں قدرتی طور پر سوراخ بنے ہیں وہ ان سوراخوں کی مدد سے ان غاروں میں اتر جاتے ہیں ان کے پیچھے ان غاروں میں اترنا خطرناک ہے کیونکہ وہاں ان کا تمام اسلحہ او جنگجو ساتھی موجود ہوتے ہیں اور نیچے اترنے والے فوجی کو زندہ نہیں چھوڑتے بلکہ بڑی اذیت سے مارتے ہیں' تمہارے یہاں آنے سے پہلے ہمارے کئی فوجی اس طرح مارے جا چکے ہیں۔''

''ہوں...... اسی لیے میں نے ان سے لڑنے کے لیے اپنا طریقہ بدل دیا ہے...... ہمارے پاس اتنی فوج نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا ضروری تھا۔ اور میں اس پر بھی کام کر رہا ہوں وہ بھی طالبان اور القاعدہ کی کارروائیوں سے پریشان ہیں اور آئے دن ان کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے ہیں وہ بڑی آسانی سے ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن وہ مسلمان ہیں...... وہ ہمارا ساتھ شاید نہ دیں۔'' پیٹریو نے ایک بار پھر اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں تم نے یہ نہیں سنا کہ مسلمان اور خاص طور سے افغان بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور اپنی پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں۔''

''تو' اس بات سے ہمارا کیا تعلق ہے؟''

''ہم بھی تو ان کے مہمان ہو سکتے ہیں۔'' گینٹ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور دشمن کی طرف سے آنے والی ایک گولی کے جواب میں اس سمت ایک فائر داغ دیا اس کے ساتھی برابر دشمن کے فائر کا جواب دے رہے تھے۔

''اور ہم ان کی پناہ میں بھی اپنے آپ کو دے سکتے ہیں۔'' گینٹ نے ادھوری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے لیے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوں گی۔'' پیٹریو نے سامنے پہاڑیوں کی طرف فائر کرتے ہوئے اپنی جگہ بدلی تھی اور اسی لمحے اس پہاڑی سے ایک طالبان لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا تھا۔ شاید گولی لگنے سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی پھر تھوڑی ہی دیر میں طالبان کے کئی ساتھی مارے گئے تھے اور ان کی طرف سے آنے والے فائر بھی بند ہو گئے تھے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد گینٹ کو وائرلیس پر اطلاع ملی تھی کہ طالبان کا گروہ پیچھے ہٹ گیا تھا پھر گینٹ نے بھی اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ کیا تھا اور اس پوسٹ پر کچھ مزید فوجیوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔

''میں نے ان طالبان کے گولی کھا کر گرتے ہوئے مناظر کی ویڈیو بنالی ہے۔'' این نے واپسی پر بتایا۔

''ٹھیک ہے یہ ویڈیوز نہ صرف تمہارے لیے تمہارے میگزین کے لیے نئی انفارمیشن ہے بلکہ یہاں پر میری کارکردگی کے ریکارڈ میں رکھے جانے کے لیے ایک بہترین ثبوت بھی ہے۔'' گینٹ نے کہا تو این ہنسنے لگی۔ پیٹریو اس وقت بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور لاتعلقی سے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''یہاں بہت خطرہ ہے ہم کس طرح یہاں سے بچ کر نکلیں گے۔'' پیٹریو نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

''ہم ضرور کامیاب ہوں گے، مجھے یقین ہے میری کوشش ہوگی کہ میرے فوجیوں کو کم سے کم نقصان اٹھانا پڑے۔'' گینٹ نے کہا پھر اچانک وہ چونکا جیسے اسے کوئی خاص خیال آیا ہو۔

''پیٹریو تم ایک دو روز میں ہی نور افضل سے ملنے کا بندوبست کرو ہمیں اپنے کام میں تیزی لانا ہوگی یوں ہم طالبان کے حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اس بار این بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔'' اس نے کہا تو پیٹریو چونک کر اسے دیکھنے لگا اسے حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ وہ نور افضل سے ملنا چاہتا تھا بلکہ اس بات پر تھی کہ اس نے این کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کی تھی جو پیٹریو کے نزدیک بلا جواز تھی۔

''تمہیں یہ بات بعد میں سمجھاؤں گا۔'' اس نے پیٹریو کی حیرت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ لیکن این نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ویڈیو کیمرے کو الٹ پلٹ رہی تھی۔

پھر دو دن بعد ہی پیٹریو نے گینٹ کی ملاقات نور افضل سے طے کروی تھی اور اس بار گینٹ اس سے ملنے نہیں گیا تھا بلکہ نور افضل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کے آرمی بیس پر آیا تھا اس خواہش کا اظہار نور افضل نے خود ہی کیا تھا کہ اس بار وہ گینٹ کا مہمان ہوگا شاید وہ اس کی فوجی ساکھ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔'' گینٹ نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا تو نور افضل مسکرانے لگا۔

''ہاں جب ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر تم مجھ سے ملنے آؤ یا میں تم سے ملنے آؤں ایک ہی بات ہے۔'' نور افضل نے ہنستے ہوئے کہا اس کے لہجے میں بہادروں کے لہجے والی بے باکی جھلک رہی تھی اس روز گینٹ اور نور افضل کی ملاقات خاصی طویل ہوئی تھی اور اس ملاقات میں گینٹ نے اس کا تعارف این سے بھی کروایا تھا۔ این بھی نور افضل کے ساتھ بڑے تپاک سے ملی تھی۔

''تم بہت بہادر ہو اپنے وطن سے اتنی دور اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر صرف اپنے میگزین کے لیے خبریں جمع کرنے یہاں آئی ہو۔'' نور افضل نے تعریفی انداز میں کہا لیکن اس کے لہجے میں حسرت بھی پوشیدہ تھی۔

''ہاں یہ میری ملازمت کا حصہ ہے اور میں یہاں افغان عورتوں سے بھی ملنا چاہتی تھی میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ بہادر عورتیں کس طرح زندگی گزارتی ہیں اور کس طرح اپنے شوہروں اور بیٹوں کے ساتھ طالبان کے ساتھ جنگ میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔'' این نے گینٹ کے رٹائے ہوئے الفاظ بڑی مہارت سے ادا کیے۔

"ہاں..... ضرور..... ضرور..... میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گا۔" نور افضل نے ہنستے ہوئے کہا اور گینٹ کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے' اسے افغانوں کے گھروں میں گھس بیٹھنے کے منصوبے میں کامیابی کی پہلی کرن نظر آئی تھی اس روز کی ملاقات میں نور افضل نے گینٹ کو پیش کش کی تھی کہ وہ اس کے گھر کے قریب ہی ایک گھر میں اس کے ساتھ رہائش رکھ سکتا ہے اس طرح وہ افغانوں کے ساتھ ہوگا اور زیادہ محفوظ ہوگا۔ گینٹ کے دل کی مراد پوری ہوگئی تھی اور اس نے جلد ہی اس گھر میں منتقل ہونے کا وعدہ کرلیا تھا اس روز گینٹ نے بھی نور افضل اور اس کے ساتھیوں کی خوب تواضع کی تھی اور انہیں قیمتی تحائف بھی دیئے تھے۔ جس سے اس کی دوستی اور مضبوط ہوگئی تھی۔

چند روز بعد وہ اس جگہ منتقل ہوگیا تھا جو نور افضل نے اس کے لیے منتخب کی تھی' یہ جگہ افغانستان کے تپتے ہوئے میدان میں بکولک کونار دریا کے کنارے پہاڑوں کے دامن میں تھی کچی پکی اینٹوں کا بنا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں دو کمرے اور باتھ روم بنا ہوا تھا اس گھر کے باہر کوئی چہار دیواری نہیں تھی اور بنجر میدان میں جگہ جگہ خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے زیادہ تر سوکھی ہوئی تھی دور دور تک کوئی اور گھر نہیں تھا بظاہر وہ جگہ بڑی پرسکون لگ رہی تھی لیکن یہاں بھی طالبان کی کارروائیوں کا ڈر تھا کیونکہ چاروں طرف پھیلی پہاڑیاں ان کا مسکن تھیں۔

"ویسے تو میں زیادہ وقت اپنے فوجیوں کے ساتھ ہی گزاروں گا کیونکہ میں اپنی فوجی ذمہ داریوں کو نہیں بھول سکتا لیکن کبھی کبھی آرام کرنے کے لیے یہ جگہ بہت اچھی ہے۔" گینٹ نے اس جگہ کی تعریف کی تو نور افضل مسکرانے لگا این اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔

"ہاں جب تمہارا دل چاہے تو تم میرے ڈیرے پر بھی آسکتے ہو۔" نور افضل نے کہا اور گینٹ اثبات میں سرہلانے لگا' اسے معلوم تھا کہ نور افضل کا گھر اس ڈیرے کے قریب ہی ہے اور اس طرح این کی رسائی وہاں تک حاصل ہوسکتی ہے۔

"ہاں کیوں نہیں ضرور..... اور جب میرے یہاں آنے کا مقصد ہی آپ لوگوں کی مدد اور حفاظت کرنا ہے تو ہماری ملاقاتیں تو ہوتی رہیں گی ہمیں یہ جنگ مل کر ہی لڑنا ہے۔" گینٹ نے کہا اور نور افضل کے چہرے پر اپنی بات کے ردعمل پر آنے والے تاثرات تلاش کرنے لگا۔

"ہاں..... مجھے تمہاری بات سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔" نور افضل نے کہا اس کے چہرے پر یقین بھری مسکراہٹ تھی جس کو دیکھ کر گینٹ کو احساس ہوا کہ اس نے آدھا معرکہ سر کرلیا ہے۔

"ہمارا اور تمہارا دشمن مشترکہ ہے۔ القاعدہ اور طالبان کا ہاتھ نائن الیون کے امریکی حادثے میں ہے یہ بات ثابت ہوچکی ہے' اور وہی تمہارے بھی دشمن ہیں جو تمہارے ملک میں چھپے ہیں اور تمہارے لیے ایک نئی جنگ چھیڑ دی ہے۔" گینٹ نے نور افضل کو سمجھانے والے انداز میں کہا اور نور افضل اثبات میں سرہلانے لگا۔

"ہاں..... میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور گینٹ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

پھر متواتر ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اب این کی پہنچ نور افضل کے گھر کے اندر تک ہوگئی تھی۔ اس نے نور افضل کی بیوی اس کی پڑوسی عورتوں اور بچوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا وہ اکثر ان میں تحفے اور تحائف تقسیم کرتی تھی ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی اور وہ اسے مقامی لباس' رسم ورواج کے بارے میں بتاتی تھیں اور اس پر بہت بھروسہ کرنے لگی تھیں اب وہ لوگ گینٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔

نور افضل اور گینٹ کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز گینٹ کے فوجیوں کا سامنا پھر طالبان کے ساتھ ہوگیا۔ گینٹ کو اطلاع ملی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح

ان کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوگیا اس بار بھی اس کے ساتھیوں کی خاصی تعداد اس کے ساتھ تھی ان کی گاڑیاں جو اسلحہ سے لیس تھیں این اپنے مووی کیمرے کے ساتھ موجود تھی اس بار طالبان کا حملہ کافی شدید تھا۔ گینٹ کے ساتھی مقامی لباس میں تھے لیکن ان کے ہتھیار ان کی گاڑیاں جن پر اینٹینا نصب تھا ان کے امریکی ہونے کی چغلی کھارہی تھیں گینٹ کا قافلہ اس جانب تیزی سے سفر کررہا تھا جہاں طالبان کے ساتھ اس کے فوجی معرکہ آرائی میں مصروف تھے نورافضل کو بھی اس حملے کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گینٹ کی مدد کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

دشمن کی طرف سے شدید فائرنگ اور گولہ باری ہو رہی تھی جس کا جواب گینٹ کی آرمی کی طرف سے دیا جارہا تھا۔ گینٹ کی گاڑی تیزی سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ چلنے والی دوسری گاڑی میں این اپنے کیمروں اور ہتھیاروں کے ساتھ سوار تھی اچانک چلتے چلتے گینٹ کی گاڑی سڑک کے کنارے نصب ایک بم سے ٹکرائی جو بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے وہاں بڑی مہارت سے نصب کیا گیا تھا' اور وہ ایسی جگہ تھا کہ کوئی بھی گزرنے والی گاڑی اس سے ٹکرا سکتی تھی۔ اچانک ہی زوردار دھماکا ہوا تھا اور گینٹ کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ اس کے پرخچے اڑ گئے تھے اور گینٹ کو گرتے ہوئے سر اور اپنی سیدھی ٹانگ میں شدید درد کی لہر محسوس ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک مقامی اسپتال میں بیڈ پر موجود تھا اور این کے علاوہ نورافضل بھی وہاں موجود تھا' اسے بے انتہا سیکورٹی میں رکھا گیا تھا اور نورافضل کے لوگ اسے سیکورٹی دے رہے تھے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اس حادثے میں اس کی ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں جس کی وجہ سے اس کے سر کا آپریشن بھی کیا گیا تھا اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اسے شدید قسم کی برین انجری کا سامنا ہے اور وہ کافی عرصے تک ٹھیک نہیں ہوسکے گا۔

''کیا ہوا تھا؟'' اس نے ہوش آتے ہی این سے پوچھا تھا جو اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ کافی فکر مند محسوس ہورہی تھی۔

''راستے میں سڑک کے کنارے ایک بم نصب تھا جس سے تمہاری گاڑی ٹکرا گئی تھی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔ تمہیں شدید زخم آئے ہیں خاص طور سے سر میں۔'' این نے اسے بتایا۔

''باقی لوگ......اور طالبان کا حملہ......وہ سب لڑ رہے تھے کیا ہوا؟ کوئی مارا تو نہیں گیا؟'' گینٹ نے پوچھا۔

''نہیں......کچھ فوجی زخمی ہوئے ہیں ان کو طبی امداد دی جارہی تھی ہم نے اس معرکے میں طالبان کو مار بھگایا تھا۔ نورافضل بھی ہماری مدد کررہا تھا۔'' این نے کمرے میں موجود نورافضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھا۔

''ہاں......تم فکر مت کرو گینٹ......ہم تمہارے ساتھ ہیں......میرے ساتھی اپنی جان دے کر بھی تمہاری مدد کریں گے......ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے تم بھی تو ہماری خاطر آئے ہو......ہماری مدد کرنے۔'' نورافضل کے منہ میں گینٹ کی زبان بول رہی تھی اور گینٹ دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کا اسے افسوس ضرور تھا لیکن وہ ذہنی طور پر تیار تھا کہ افغانستان میں اپنی ڈیوٹی کے دوران اسے خطروں اور حادثات سے دوچار ہونا ہی تھا۔

''میں تمہارا مشکور ہوں۔'' گینٹ نے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے اس بار کی جھڑپ میں القاعدہ والوں کے ساتھ اسامہ بن لادن بھی دیکھا گیا' انہوں نے جگہ جگہ راستوں میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں ایسی ہی ایک بارودی سرنگ سے تمہارا ٹرک بھی ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی جانی

نقصان نہیں ہوا۔ کچھ فوجیوں کو زخم آئے ہیں۔ انہیں طبی امداد دی جا رہی ہے لیکن تمہارے سر کی انجری بہت خطرناک تھی۔ آپریشن کرنا پڑا اور تمہارے جسم پر بھی غیر معمولی زخم آئے ہیں۔'' نور افضل نے اسے بتایا تو گینٹ نے مسکرا کر این کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں این کے لیے بے پناہ محبت جھانک رہی تھی اور این بھی اس سے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر اسی رات انہیں قدرت نے ایک موقع دیا تھا۔ اسپتال میں دن کی تمام مصروفیات سے فارغ ہو کر تمام لوگ اپنے اپنے کمروں اور اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر چلے گئے تھے۔ این گینٹ کے کمرے میں موجود تھی یوں تو شروع ہی سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب حادثے کے بعد گینٹ ہوش میں آیا تھا۔

''گینٹ! میں تمہارے لیے بہت فکرمند تھی۔ ہم لوگ ناامید ہو چکے تھے تمہارے سر کی انجری بہت خطرناک تھی۔'' این کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا ہوں۔'' گینٹ نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی مر جاتی۔'' این نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''پھر تمہارے چاروں بچوں کا کیا ہوتا جو واشنگٹن میں تمہارے منتظر ہیں۔'' گینٹ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہیں میرے بچوں کی فکر ہے اور اپنے بچوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے وہ بھی تو چار ہیں اور تمہاری واپسی کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔'' این نے کہا۔

''ہاں! ان کی ماں بہت اچھی ہے وہ ان کا بہت خیال رکھتی ہے۔'' گینٹ کے لہجے میں کچھ افسردگی تھی۔ شاید یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ این سے محبت کر کے وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' اچانک ہی اس نے این سے پوچھ لیا اور وہ حیران رہ گئی اسے گینٹ سے توقع نہیں تھی کہ وہ این کے ساتھ اپنی رومانی داستان کو کوئی حقیقی رشتہ دے گا۔

''کیا......؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں' جب ہم ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے ہیں تو پھر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟'' گینٹ نے کہا۔

''نہیں ...... میں ایسا نہیں کر سکتی...... تم جانتے ہو میرا ایک شوہر ہے...... چار بچے ہیں...... وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے اس نے مجھے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔ میری خواہش پر اس نے مجھے افغانستان جیسے خطرناک ملک میں رپورٹنگ کرنے کی اجازت بھی دے دی اور میں...... میں اسے بدلے میں دھوکا دوں؟'' این نے کہا۔

''تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ کیا ہم یونہی چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟'' گینٹ نے کہا۔

''کیا کروں......؟ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چار بچے ہونے کے بعد مجھے اپنے خوابوں کا حقیقی شہزادہ مل جائے گا۔'' این کے لہجے میں خوشی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی۔

''ہاں...... میں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا تھا...... مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت ہی پیار ہے...... میں انہیں بھی چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی۔'' گینٹ نے این کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''اور میرا حال بھی بالکل یہی ہے گینٹ۔'' این نے بے بسی سے کہا۔ ''میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں نہ انہیں چھوڑ سکتی ہوں اور نہ تمہیں اور ہم لوگ شادی بھی نہیں کر سکتے۔''

''لیکن شادی تو میں تم سے ضرور کروں گا۔'' گینٹ کے لہجے میں ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔

''نہیں گینٹ یہ ممکن نہیں۔'' این اس کے قریب

اس کے بستر پر ہی دراز ہوگئی اس نے اپنا سر گینٹ کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

''اس بارے میں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے این...... تم اچھی طرح سوچ لو۔'' گینٹ نے کہا۔

''گینٹ تمہیں پتہ ہے جب تمہارا حادثہ ہوا تو میں بہت روئی...... میں بہت پریشان تھی تو نور افضل کی بیوی نے مجھے بہت دلاسہ دیا وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اس نے مجھے کئی دنوں تک اپنے ساتھ رکھا......اور...... میری حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ میں تم سے کتنی قریب ہوں اور تمہاری محبت میں بھی گرفتار ہوں...... پھراس کے پوچھنے پر میں نے اسے سچ بتادیا وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھے بہت سے خوبصورت کپڑے دیئے جن کے ساتھ مقامی طرز کے زیورات بھی ہیں۔ وہ اکثر ضد کر کے مجھے وہ پہناتی ہے اس نے مجھے کئی افغانی کھانے پکانا سکھائے ہیں اور میں نور افضل کی فیملی کے ساتھ بہت گھل مل گئی ہوں۔''

''بہت خوب' گویا میری انجری کی وجہ سے تم نے میری غیر حاضری میں میرا کام سنبھالا ہوا ہے تم نے میرے پلان کے مطابق نور افضل پر اعتماد قائم کرلیا ہے اور تمہاری پہنچ اس کی فیملی تک ہوگئی ہے۔'' گینٹ کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آرہے تھے۔

''لیکن اس کے لیے مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی کیونکہ کچھ تو حادثے کی وجہ سے نور افضل کی بیوی کو مجھ سے ہمدردی ہوگئی تھی اور پھر اس کے خیال میں ایک عورت کا اپنے مرد کے بغیر اتنے فوجیوں میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں تھا چنانچہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر ہی میں ہوں اس کے بچے مجھے بہت پسند کرتے ہیں میں انہیں انگریزی سکھاتی ہوں اور وہ مجھے افغانی سکھاتے ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے خوشی ہوئی تمہارا کام کرنے کا طریقہ وہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔'' گینٹ ابھی تک فوجی انداز ہی سے سوچ رہا تھا وہ اسے اتفاق ماننے کو تیار نہیں تھا۔

رت

چاندی کے ورق میں لپٹی خوشیاں دل کے نہاں خانے سے پھلجھڑی کی مانند پھوٹتی ہیں اور جب یہ فضاؤں میں جلترنگ کی طرح بکھر جائیں تو پھر رُت چاہے کوئی بھی ہو صرف دل کا منظر گلابوں سا کھلا کھلا رات کی رانی سا مہکا مہکا ہوجاتا ہے سچ مچ...... خوشی کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کسی ناپ تول کی اکائی سے ناپا جاسکتا ہے۔ کبھی پانی کی روانی دیکھ کر دل کی ویرانی میں خوشی کے غنچے کھل اٹھتے ہیں تو کبھی آسمان پر لہراتے پرندے مسحور وشادماں کرتے ہیں۔ خوشی کسی خاص شے احساس سے قطعاً مشروط نہیں' کبھی تو چتوکی سرسراہٹ' چڑیوں کی چہکار' آب شاروں کا شور۔ چاند' چاندنی' ستارے' شبنم' جگنو' تتلیاں' رنگ برنگے پھول' بارش کی ننھی ننھی بوندیں' چوڑیوں کی کھنک' رنگ کی دھنک' مہندی کے رنگ' مٹی کی خوشبو اور گجرے کی مہک تک دل کے پور پور میں مہک خوشی کی بھر جاتی ہے اور پھر من خود بہ خود ہی گنگنانے سجنے سنورنے کو مچلنے لگتا ہے۔

پروین افضل شاہین...... بہاولنگر

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' گینٹ نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''یہی کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔''

''میں ڈرتی ہوں...... ایسا کرنا ہمارے لیے خطرناک ہوسکتا ہے...... اس کی وجہ سے تمہارا اور میرا کیریئر تباہ ہوجائے گا' ہمارے گھروں میں ہمارے لیے جگہ نہیں ہوگی...... ہم پوری طرح برباد ہوسکتے ہیں۔'' این نے خدشات کا اظہار کیا۔

''میں بھی یہ سب جانتا ہوں۔'' گینٹ نے کہا۔ ''لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہے میں ان چیزوں سے ڈر کر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''دیکھو گینٹ مجھے وقت دو...... میں اس بارے میں سوچوں گی۔'' این نے اس وقت اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گینٹ بھی خاموش ہوگیا اس رات بہت عرصے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا اور محبت کی دو بے قرار روحیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوگئیں۔

کافی عرصہ اسپتال میں گزارنے کے بعد گینٹ کو اسپتال سے فارغ کردیا گیا تو نور افضل اسے اسی گھر میں لے گیا جو پہاڑوں کی وادیوں میں اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ تھا اور گینٹ کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہاں ایک چھوٹی فیملی کے رہنے کے لیے تمام انتظامات تھے گینٹ نے سوالیہ نظروں سے نور افضل کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ نور افضل اتنا نادان نہیں ہے اسے ایک فوجی کی ضروریات کے درمیان تمیز نہ ہو اس کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر نور افضل مسکرانے لگا تھا۔

''مجھے معلوم ہے تم این سے محبت کرتے ہو اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتے پھر ابھی تمہیں خاص دیکھ بھال کی ضرورت بھی ہے اور اس کے لیے این سے بہتر کوئی نہیں، تم یہاں اس کے ساتھ سکون سے رہ سکو گے چاروں طرف تمہارے فوجی اور میرے قبیلے کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے پہاڑوں میں موجود ہیں۔''

''لیکن میں نے کسی پر بھی اپنی محبت کو ظاہر نہیں ہونے دیا' یہ این اور میرے درمیان ایک راز ہے...... ہم چھپ کر ملتے ہیں...... ویسے تو وہ سارا دن میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن محض ایک رپورٹر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے کسی کو پتہ نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' گینٹ نے وضاحت کی۔

''میں جانتا ہوں...... اس کا اظہار کرنے میں تمہارے لیے بھی خطرہ ہے اور این کے لیے بھی...... اس کی نوکری جاسکتی ہے اور تمہاری بھی یہ فوجی اصولوں کے خلاف ہے لیکن...... اس سلسلے میں تمہارا دوست ہونے کے ناتے میں تمہاری مدد کروں گا اور کسی کو بھی اس راز کا پتہ نہیں چلے گا سب یہی سمجھیں گے کہ این محض تمہاری تیمارداری کے لیے یہاں ہے۔'' نور افضل نے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے۔'' گینٹ نے مطمئن ہوکر کہا اور اس کے بعد وہ این کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ آرمی بیس سے اس کے کمرے کا کافی سامان وہاں منتقل کردیا گیا جس میں اس کی خفیہ دستاویز کا بیگ بھی تھا ان دستاویز میں وہ تمام منصوبہ بندیاں تحریر تھیں جو گینٹ نے افغانستان میں آزمائی تھیں۔ ان میں وہ خطوط بھی تھے جن میں اس نے افغانستان میں جنگ لڑنے کی نئی ترکیب اختیار کرنے کی اجازت امریکی افسران سے لی تھی اور امریکی افسران کا وہ جواب بھی تھا جس میں اسے یہ نئی ترکیب آزمانے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ افغانوں میں گھل مل جائے اور ان کی مدد سے طالبان اور القاعدہ کا مقابلہ کرے اس مقصد کے لیے اس نے اجازت مانگی تھی کہ اسے اپنے فوجیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر افغانوں میں گھس بیٹھنے کی اجازت دی جائے اور انہی کاغذات میں وہ اجازت بھی موجود تھی...... پھر مختلف موقعوں پر افغانستان میں اس سے ملنے امریکی حکام آتے رہتے تھے اس کا ریکارڈ بھی موجود تھا اور یہ ساری دستاویزات گینٹ کے بعد صرف این کی دسترس میں تھیں وہ جب چاہے انہیں دیکھ سکتی تھی جبکہ یہ فوجی اصولوں کے خلاف تھا اور گینٹ کے علاوہ ان خفیہ دستاویزات تک کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی لیکن گینٹ این کے معاملے میں بہت بے پروا واقع ہوا تھا شاید یہ اس کی محبت اور این پر بے حد اعتماد کا نتیجہ تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ گینٹ کی حالت بہتر ہوتی گئی اور وہ دوبارہ سے اپنی روزمرہ فوجی ذمہ داریوں میں مصروف ہوگیا تھا لیکن اب اس نے ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کرلیا تھا کہ وہ اکثر این کے ساتھ افغان قبیلوں میں نکل جاتا تھا وہ ظاہر یہ کرتا تھا کہ وہ

این کے ساتھ سیر کے لیے نکلا ہے لیکن اس کا مقصد مقامی لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا اور ان میں گھل مل جانا تھا' اس کے لیے وہ ان کے مسائل بھی سنتا تھا اور انہیں کسی حد تک حل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن اسے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ عام افغانوں میں یوں بغیر سیکورٹی کے گھومے اس سے اس کی جان کو خطرہ بھی ہوسکتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کی پروا نہیں کی اور اسی طرح اس نے امریکن آرمی کے ایسے ہی بہت سے قوانین بھی توڑے وہ سب سے الگ انداز میں کام کرنا چاہتا تھا اور عراق میں حاصل ہونے والی فتح اس کے لیے کامیابی کی ضمانت سمجھی جارہی تھی امریکی اعلیٰ حکام کا بھی خیال تھا کہ اس کی جنگ کی نئی ترکیب اسے کامیابی سے ضرور ہمکنار کردے گی اب اسے کئی حلقوں میں لارنس آف عربیہ کے کردار سے مماثلت دی جارہی تھی اور کئی موقعوں پر اسے لارنس آف افغانستان کا خطاب بھی دیا گیا تھا خود امریکی حکومت نے بھی ایک موقع پر اسے لارنس آف افغانستان کے نام سے پکارا تھا وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھا اور اسے بھی پختہ یقین تھا کہ کامیابی ضرور اس کے قدم چومے گی۔

''این تم نے سوچ لیا جو میں نے پیش کش کی تھی اس کے بارے میں؟'' ایک رات اس نے این سے پوچھا جو اس کے ساتھ موجود تھی اور اپنی والہانہ محبت کا اظہار کررہی تھی۔

''ہوں..... کون سی پیش کش؟'' این نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے شادی کی پیش کش۔'' گینٹ نے کہا۔

''تم جانتے ہو گینٹ یہ بہت خطرناک ہے۔'' این نے کہا وہ واقعی خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

''میں جانتا ہوں..... کیا ہم ہمیشہ یونہی مل سکیں گے؟ یہاں سے واپس جانے کے بعد بھی؟ کیا ہمیں موقع ملے گا..... یہ راز تو پھر بھی فاش ہوگا..... ہم کب تک ڈرتے رہیں گے؟'' گینٹ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ تم اس بارے میں سوچو گی اب کافی دن گزر گئے ہیں..... بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' این نے کہا۔

''اور میں بھی ..... لیکن ہمیں شادی کرکے بچوں کو چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے ہم ان سے ملتے رہیں گے۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن لوگ ہمارے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔'' این نے کہا۔

''وہ کوئی نئی بات نہیں ہے..... سب پیار کرنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔'' گینٹ نے ہاتھ میں پکڑی شراب کی بوتل سے کئی گھونٹ بھر لیے۔

''تم بہت زیادہ پینے لگے ہو۔'' این نے تشویش سے کہا۔

''ہاں..... اس کی وجہ تم ہو..... میں تمہاری بے رخی برداشت نہیں کرسکتا۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن میں تو تم سے ملنے آتی ہوں۔''

''ہاں لیکن یہ خیال تو میرے دل میں رہتا ہے کہ تم کچھ عرصے بعد مجھ سے بچھڑ جاؤ گی۔ تم میری نہیں ہو۔ تمہیں میری محبت کی پروا نہیں ہے۔''

''ایسا مت کہو۔ گینٹ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر مجھ سے شادی کرلو۔'' گینٹ نے کہا۔

''ابھی نہیں..... ابھی ضد نہ کرو..... ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔'' این نے کہا اور گینٹ بے بسی سے بستر پر لیٹ گیا وہ خاصہ دل برداشتہ نظر آرہا تھا اور بہتر زیادہ نشے میں تھا۔ این کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد واپس کیمپ میں چلی گئی تھی۔

دوسرے روز این کو گینٹ کے ساتھ افغان کی ایک بستی میں جاکر لوگوں سے ملنا تھا اس نے نور افضل کی بیوی کا دیا ہوا مقامی لباس زیب تن کیا تھا اور اس کے ساتھ افغان جیولری بھی پہنی تھی وہ ایک خوبصورت

افغان عورت لگ رہی تھی جب وہ گینٹ سے ملنے پہنچی تو وہ اس کو دیکھتا رہ گیا اس لباس میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ گینٹ نے بھی اس وقت مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے کاندھے پر ایک بڑی سی چادر پڑی ہوئی تھی' ہاتھ میں گن تھی۔

''تم تیار ہو؟'' این نے اس سے پوچھا۔

''ہاں...... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' گینٹ نے کہا پھر وہ دونوں گھر کے باہر کھڑی اس جیپ میں بیٹھ گئے تھے جس میں این اس سے ملنے آئی تھی۔

وہ افغانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی یہاں کچے مکان بنے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ خاصے غریب ہیں۔ ان کے لباس اور ان کے گھر اس بات کا اظہار کر رہے تھے۔ گینٹ سے پہلے اس کی شہرت دہاں پہنچ چکی تھی اور وہ لوگ گینٹ کے منتظر تھے۔ گینٹ نے دہاں جاتے ہی ان لوگوں میں ضرورت کی چیزیں' کپڑے' اور مختلف تحائف تقسیم کیے تھے۔ بستی کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی جھلک نظر آ رہی تھی خاص طور سے بچے بہت خوش تھے' پھر گینٹ نے ان سے چھوٹا سا خطاب کیا تھا جس کی ویڈیو این نے بنائی تھی۔

''ہم یہاں آپ لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔ ہم 'بیماری کے خلاف' جہالت کے خلاف اور طالبان کے خلاف ہیں ہم سلسلے میں آپ کی مدد کریں گے اگر آپ پسند کریں گے تو ہم آپ کے بچوں کو تعلیم بھی دیں گے۔ ہم آپ کے دوست بننا چاہتے ہیں اور آپ کے مہمان ہیں۔'' گینٹ نے مہمان کا لفظ خاص طور سے استعمال کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں میں مہمان کو کیا درجہ دیا جاتا ہے اور مسلمان مہمان کی جان کی حفاظت ہر چیز سے بڑھ کر کرتے ہیں اور پھر ایسا مہمان جو ان کی حفاظت کرنے آیا ہو' گینٹ کو اپنی سوچ سے بھی زیادہ پذیرائی ملی تھی ہر افغان کی خواہش تھی کہ گینٹ ان کا مہمان بنے اور این کو تو بچوں نے گھیر لیا تھا وہ بچوں میں ہر دلعزیز ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی دلچسپ باتیں اور مسکراہٹ بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی اور وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے اس نے عادت کے مطابق یہاں بھی بچوں میں مٹھائیاں' کیک اور کہانیوں کی باتصویر کتابیں تقسیم کی تھیں۔ جنہیں حاصل کر کے سارے بچے خوش تھے اس بستی کا ان کا یہ دوزہ مزید کامیاب یوں ہوا تھا کہ انہوں نے بیماروں کے لیے ایک مفت کیمپ لگا دیا تھا جہاں فوجی ڈاکٹر موجود تھے لیکن سب پروگرام کے مطابق مقامی لباس میں تھے اور مقامی بولی بول رہے تھے انہوں نے بستی کے لوگوں کا معائنہ کیا تھا اور انہیں مفید دوائیں فراہم کی تھیں وہ کیمپ کئی روز تک لگا رہا تھا اور اس کی وجہ سے گینٹ کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس کی پذیرائی بڑھی تھی۔

اس رات جب گینٹ اپنی رہائش گاہ میں این کے ساتھ موجود تھا تو بہت خوش تھا۔

''این آج مجھے ایک اور کامیابی ملی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی شراب کی بوتل موجود تھی جواب اس کی عادت بن چکی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ کام کرتو رہی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم یہاں طالبان سے لڑنے آئے ہو...... انہیں ختم کرنے آئے ہو اور اس کام سے زیادہ تم یہاں کے لوگوں سے دوستیاں کرنے میں مصروف ہو' یہ بات امریکی قانون کے خلاف ہے۔''

''ہونہہ...... امریکی قانون۔'' گینٹ کے لہجے میں موجود حقارت کو این نے محسوس کر لیا تھا۔

''کیوں؟ کیا بات ہے تم اپنے ہی ملک کے قانون کو ایسا کیوں کہتے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ان لوگوں کو لڑنے کی صحیح اسٹریٹجی نہیں آتی یہ دشمن پر واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں ختم کرنے آئے ہیں اس طرح انہیں کہیں بھی ہمدردی نہیں ملتی اور وہاں کی فوج کے ساتھ ساتھ وہاں کے عوام

بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں پھر انہیں دو محاذوں پر لڑنا ہوتا ہے۔'' گینٹ نے کہا۔

''لیکن دشمن کے ساتھ دوستی؟'' این نے سوال کیا۔

''یہ ضروری ہے...... تم دیکھو ویت نام میں اتنے سال جنگ کے بعد امریکہ کو شکست ہوئی اور بھی جگہوں پر انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ افغانستان ان کے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کا طریقۂ جنگ غلط ہے اور وہ کھل کر مقابلے پر آ جاتے ہیں اس سے انہیں نقصان ہوتا ہے جبکہ میں نے یہ طریقہ بدلدیا ہے...... دیکھو عراق میں ہمیں فتح ہوئی ہے اس کا سہرا میرے سر ہے میں نے امریکہ کے روائتی طریقے نہیں اپنائے اور اب میری بہادری اور میرے لڑنے کے نئے انداز ہی کی وجہ سے مجھے یہاں تعینات کیا گیا ہے تاکہ میں افغانستان میں امریکہ کی ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دوں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔'' گینٹ نے کہا وہ آہستہ آہستہ شراب کے گھونٹ لیتا جا رہا تھا اور زیادہ پی لینے کی وجہ سے اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ الفاظ بھی صاف ادا نہیں ہو رہے تھے۔

''بس کرو گینٹ...... تم نے بہت پی لی ہے۔'' این نے اس کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... رہنے دو...... میں انہیں بتاؤں گا کہ ہار کو جیت میں کیسے بدلتے ہیں۔'' اس نے این کو کھینچ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے میری وہ ٹیبلٹ دے دو میں سکون چاہتا ہوں۔''

''تم بہت زیادہ نشہ کرنے لگے ہو یہ شراب کیا کم تھی کہ اب تم نشے کی دوائیں بھی لے رہے ہو۔''

''تم بس دے دو۔ مجھے سکون چاہیے تم دیکھنا...... یہ افغان...... یہ سب سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی مدد کرنے آئے ہیں اور یہ اس جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف ہماری مدد کریں گے...... ہم جیتیں گے۔'' گینٹ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

این نے اسے بستر پر لٹا دیا تھا اور اس کی نشہ آور گولیاں اسے دے دی تھیں۔

''ہمیں دو محاذوں پر لڑنا نہیں پڑے گا اب افغان ہمیں دشمن سمجھ کر ہم سے لڑنے کے بجائے ہمیں دوست سمجھ کر ہماری مدد کریں گے۔'' گینٹ نے کہا آخری جملہ ادا کرتے کرتے اس پر غنودگی چھا گئی تھی اور این اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس جنگ میں گینٹ نے بہت سے فوجی قوانین توڑے ہیں اگر وہ یہ جنگ نہ جیت سکا تو اس کا کیا انجام ہوگا؟

اگلے دن گینٹ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ این اس کے قریب اس کے بستر پر ہی موجود تھی۔

''تم رات بہت بہک رہے تھے۔'' این نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... لیکن میں افغانوں کے دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

''ہو سکتا ہے...... یہ تو وقت ہی بتائے گا اگر عین موقع پر انہوں نے تمہارا ساتھ دیا اور تمہیں کامیابی بھی نصیب ہوگئی تو شاید تمہیں کئی امریکی قوانین توڑنے کی وضاحت نہ کرنی پڑے۔''

''ہوں...... دیکھا جائے گا۔'' گینٹ نے بے پروائی سے کہا۔

''فی الحال تو میرا مقصد افغانستان میں امریکہ کی ہاری ہوئی جنگ کو جیتنا ہے۔'' گینٹ نے کہا اور پھر این کی طرف دیکھنے لگا۔

''این! تم نے کیا سوچا؟ مجھ سے شادی کے بارے میں......؟'' اچانک ہی اس نے این سے سوال کر دیا۔

''تم ابھی تک اسی بات پر اڑے ہوئے ہو۔'' این نے کہا۔

''ہاں...... میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... تم میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہو تمہیں پتہ ہے میں اپنی ڈیوٹی بھی پورے طور پر ادا نہیں کر پا رہا ہوں کیونکہ تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔''

''تم جانتے ہو...... میں شادی شدہ ہوں...... میرے چار بچے ہیں۔''این نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں...... میں بھی شادی شدہ ہوں اور میرے بھی چار بچے ہیں لیکن یہ عشق ومحبت...... میں اس کا کیا کروں یہ دل میرے بس میں نہیں ہے۔''

''تم اپنے لیے خطرناک مسائل پیدا کررہے ہو' تمہارا قوانین کو توڑنا...... افغانوں سے بے تکلفی...... نشہ کرنا اور میرا عشق تمہیں برباد کردے گا...... عقل کے ناخن لو......اور صرف اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دو۔''

''میں نہیں کرسکتا...... ہرگز بھی نہیں کرسکتا' میرا ذہن میرے ساتھ نہیں ہے...... اگر تم میرا ساتھ دینا چاہتی ہو اور یہ چاہتی ہو کہ مجھے کامیابی نصیب ہو تو تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔'' گینٹ نے کہا' این اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''تم بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟'' گینٹ نے پوچھا۔

''کرتی ہوں...... تم میرے سپنوں کے شہزادے ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسے ہی بہادر آدمی کی خواہش کی تھی لیکن ......'' این خاموش ہوگئی اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔

''لیکن کیا...... لیکن کیا این؟'' گینٹ نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

''میں ڈرتی ہوں۔'' این کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''ڈرو نہیں ...... کود پڑو...... اسٹیپ آن۔ اس نے فوجی اصطلاح میں کہا اور این چند لمحوں تک اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی پھر جیسے ہار مان گئی تھی اور اس نے گینٹ کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔'' این نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی اور گینٹ خوشی سے پاگل ہوگیا تھا۔

''اوہ...... تھینک یو این...... تم نے مجھے خوش کردیا...... میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔'' اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ہمارا راز فاش ہوجائے گا۔'' این کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔

''نہیں ...... میں پوری رازداری رکھوں گا۔ میں اس کام میں اپنے دوست پیٹریو اور نور افضل کی مدد لوں گا۔'' گینٹ نے کہا اور پھر ہوا بھی یہی تھا اس نے نور افضل کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوا وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اب وہ شادی کرکے رشتہ ازدواج میں بندھنا چاہتے ہیں تو اس نیک کام میں وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔

پھر اسی شام نور افضل کے ڈیرے پر یہ کام کیا گیا تھا۔ شادی کی اس مختصری تقریب میں گینٹ اور این کے علاوہ نور افضل اس کے گھر والے گینٹ کا دوست پیٹریو شامل تھے۔ نور افضل کی بیوی نے این کو افغان دلہن کا لباس پہنایا تھا اور اسے تیار کیا تھا اس شادی کی رسومات ادا کرنے کے بعد وہ رات گینٹ اور این نے نور افضل کے ڈیرے پر ہی گزاری تھی اور اس شادی کا علم اس میں شریک ہونے والوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوا تھا۔

شادی ہونے کے بعد بھی گینٹ اور این وہی معمول کی زندگی گزارتے رہے تھے جو شادی سے پہلے گزار رہے تھے اسی طرح گینٹ اپنے فوجیوں کے ساتھ طالبان کے مقابلوں کے لیے جاتا تھا' این اسی طرح کیمروں کے ساتھ ان مقابلوں کی رپورٹنگ کرکے واشنگٹن اپنے میگزین کو بھیجتی تھی اور معرکوں کے موقع پر اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ گینٹ کی مدد بھی کرتی تھی اس کا کام رپورٹنگ کے علاوہ گینٹ کے فوجیوں کو اگلے مورچوں پر اسلحہ فراہم کرنا بھی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان بنے نور افضل کی طرف سے تحفے میں دیئے گئے گھر میں ایک شادی شدہ بھرپور زندگی گزار رہے تھے لیکن ڈیوٹی کے اوقات میں گینٹ کبھی بھی اپنے فوجی کیمپ سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا ان

دونوں کی ملاقاتیں رات کے وقت ہوتی تھیں پھران کی زندگی میں ایک اور کٹھن وقت آیا جب امریکی فوجیوں نے کونار جیل میں ایک آپریشن کے دوران غلطی سے قرآن پاک جلادیا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ کونار جیل میں کچھ طالبان چھپے ہوئے ہیں اور انہیں وہاں تحفظ دیا جارہا ہے فوجیوں نے وہاں آپریشن کیا اور اس موقع پر غلطی سے قرآن پاک جلادیا گیا اس پر افغان عوام اور طالبان میں بھی نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی اور امریکیوں کے خلاف ان کی کارروائیوں میں شدت آ گئی گینٹ کو جب اطلاع ملی تو اس نے اپنے اہم فوجی حکام کو فوجی کیمپ میں اپنے آفس میں طلب کیا اور انہیں کچھ اہم ہدایات دیں اس موقع پر وہ بہت چاق و چوبند نظر آرہا تھا اور یہ میٹنگ رات کے وقت کی گئی تھی۔ انہیں ہر لمحے طالبان کے حملے کا ڈر تھا کیونکہ کسی بھی وقت وہ جوابی کارروائی کرسکتے تھے گینٹ کا بریفنگ روم چٹانوں پر بنا ہوا تھا اس کی بنیادیں سیمنٹ کی اینٹوں کی تھیں جن کے اوپر چٹانوں نے دیواروں کی صورت اختیار کی ہوئی تھی جب وہ اپنے فوجیوں کو ہدایات دے رہا تھا اسوقت وہ خود اور اس کے فوجی بھی اپنے فوجی وردی ہی میں تھے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

"تمہیں بہت ہی محتاط رہنا ہوگا۔" اس نے اپنے فوجیوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں پانی کی ایک خالی بوتل تھی جسے وہ آہستہ آہستہ اپنی ہتھیلی پر مارتا جارہا تھا۔

"اپنے سامان کو بچانا...... وہ تمہارے سامان پر قبضہ کریں گے اور تمہیں نہتا کردیں گے...... انہیں شکست دینا آسان ہے...... اپنے چاروں طرف نظر رکھنا...... چاہے تم کچھ بھی کررہے ہو چوکنے رہنا اپنے اطراف سے باخبر رہنا...... زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔ باتیں کرنے کے لیے آواز اور الفاظ کا استعمال کرنے کے بجائے اشاروں کا استعمال کرنا' تمہاری ذرا سی غلطی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ غلطیاں سب ہی کرتے ہیں تم ان کی غلطیوں سے فائدہ اٹھانا۔" وہ باتیں کرتے ہوئے نسوار بھی کھاتا جارہا تھا جو اس نے نور افضل سے سیکھا تھا تاکہ اصل افغان دکھائی دے۔

"اپنی طرف سے لڑائی میں پہل مت کرنا لیکن اگر کوئی تم سے لڑنا چاہے تو بہادری سے اس کا مقابلہ کرنا اور اسے مار دینا ورنہ تمہارا دشمن تمہیں مار دے گا...... یہ جان لو کہ مقامی لوگ بھی تمہاری مدد جب کریں گے جب تم اپنے دفاع یا ان کے دفاع کے لیے لڑرہے ہوں گے تم نے لڑائی کرنے میں پہل کی تو ان کی ہمدردیاں تمہیں نہیں ملیں گی۔"

"لیکن رابرٹ کی وجہ سے ہم پریشان ہیں۔" ایک فوجی نے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں وہ ہمارا اسٹاف فوجی سارجنٹ روبرٹ بیلز تھا اس کی حماقت کی وجہ سے ہم زیادہ خطرے میں ہیں جنگ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ فرار ہوگیا ہے۔ اور اس نے گاؤں کے سولہ لوگوں کو ذبح کردیا ہے لیکن ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ طالبان کی کارروائی ہے...... ہمارے فوجی نے ایسا نہیں کیا...... لیکن تمہیں کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں میں یہ معاملہ خود دیکھ لوں گا۔" گینٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"دیکھو آج رات تمہیں خود کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔" اس نے ایک ایک فوجی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم...... تم...... تم...... میں تم سب کو کہہ رہا ہوں...... اس کی فکر مت کرو کہ وہ بھیڑیے کس پوزیشن میں ہیں...... تمہیں ساری رات پیٹرولنگ کرنا ہے...... اوکے...... جاگتے رہنا...... اور کل سہ پہر تک چھپے رہنا اس کے بعد ان بھیڑیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے...... صورت حال خراب بھی ہوسکتی ہے' پتہ چلا ہے کہ اسامہ بن لادن کو بھی یہاں دیکھا گیا ہے...... وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح پھر رہا ہے...... وہ کوئی موقع نہیں چھوڑے گا۔"

اس میٹنگ کے بعد گینٹ نے نور افضل کے ڈیرے پر مقامی لوگوں سے بھی میٹنگ کی ۔ وہاں سارے اہم افغان لیڈر موجود تھے۔

''طالبان سے اپنے گھروں کی حفاظت کرو اپنے بچوں کی حفاظت کرو...... میں یہاں لڑتے نہیں آیا تمہاری مدد کرنے آیا ہوں اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم تیار ہیں ہم ان کے حملوں کا جواب مل کر دیں گے...... ہم بھی لڑنے میں پہل نہیں کریں گے ...... ہمارے پاس بہترین ماڈرن اسلحہ ہے...... تربیت یافتہ لوگ ہیں...... بہترین گاڑیاں ہیں جن میں ضرورت کے مطابق اسلحہ بھی ہے اور ان پر ریڈار بھی لگے ہوئے ہیں جو پل پل ہمیں دشمن کے ٹھکانوں کی نشاندہی کریں گے۔'' گینٹ بڑی مہارت سے افغانوں کو سمجھا رہا تھا۔

پھر دوسرے دن اس کے خدشہ کے مطابق ان کے فورس بیس پر طالبان نے حملہ کردیا تھا رات کا وقت تھا وہ سب اپنے کیمپوں میں آرام کررہے تھے ایک فوجی دستہ کیمپ کے باہر پہرہ دے رہا تھا اور کچھ فاصلے پر مقامی لوگ جن کی کمانڈ نور افضل کررہا تھا موجود تھے اور ایسے ہی کسی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے فورس کیمپ میں اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی گاڑیاں موجود تھیں جیسے ہی حملہ ہوا تمام فوجی اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ گئے تھے اور حملے کا بھرپور جواب دے رہے تھے۔ گینٹ بھی ایک ...... میں موجود تھا اور این بڑی مہارت سے فورس بیس میں ہونے والے معرکے کی ویڈیو بنا رہی تھی۔

افغان طالبان نے بہت شدید حملہ کیا تھا گولیاں کسی لمحے رک نہیں رہی تھیں فورس کمپاؤنڈ میں کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا جو فوجی گولیوں کا جواب دے رہے تھے وہ بھی کسی دیوار کسی گاڑی یا کسی ٹینک کی آڑ میں رہ کر جواب دے رہے تھے دن بھر فائروں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا وقفے وقفے سے گرینیڈ بھی پھینکے جارہے تھے ۔ رات کے قریب اس حملے میں کمی آئی تھی اب امریکی فوجی نور افضل کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر باہر سے طالبان کے حملوں کا جواب دے رہے تھے اور کمپاؤنڈ کے اندر سے گینٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فائرنگ کررہا تھا۔ رات کے آخری پہر میں گولیوں کا یہ تبادلہ بند ہوگیا تھا یا تو طالبان تھک گئے تھے یا ان کا اسلحہ ختم ہوگیا تھا۔ رات گئے گینٹ نے نور افضل کے مجاہدوں اور اپنے فوجیوں کے ساتھ ایک ساتھ میٹنگ کی تھی اور انہیں ضروری ہدایات دی تھیں اور چند گھنٹوں بعد طالبان کا حملہ دوبارہ شروع ہوگیا تھا اور دونوں طرف سے دھواں دھار لڑائی شروع ہوگئی تھی۔

اس بار کے حملے میں کئی فوجی اور نور افضل کے کئی مجاہد زخمی ہوئے تھے جنہیں امریکی بیس ہی میں ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا امریکی فوجیوں اور نور افضل کے فوجیوں کو طبی امداد دیتے اور ان کا علاج کرنے میں کسی تفریق کا اظہار نہیں کیا جارہا تھا گینٹ بذات خود اس کام کی نگرانی بھی کررہا تھا اور این اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہر نرس کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔

''تم بہت بہادر ہو۔'' ایک موقع پر نور افضل نے این سے کہا وہ ایک زخمی کو دوا پلا رہی تھی۔

''میں نے تم جیسی بہادر عورت نہیں دیکھی جو یوں اپنی آسان زندگی چھوڑ کر ایک مشکل ترین زندگی گزار رہی ہے۔''

''میں یہ سب اپنے وطن اور گینٹ کے لیے کررہی ہوں۔ اس کے علاوہ غریب انسانیت کی خدمت کرنا میرا مذہب ہے مجھے مظلوموں کی مدد کرکے سکون ملتا ہے۔'' این نے جواب دیا جس سے نور افضل بہت متاثر ہوا۔

پھر طالبان کے حملے کا تیسرا دن تھا جب یہ اطلاع ملی کہ طالبان نے اس شبے میں ایک قریبی گاؤں پر حملہ کردیا ہے کہ ان کی جان کا دشمن گینٹ اپنی منظور نظر این کے ساتھ وہاں موجود ہے حالانکہ گینٹ اپنے کیمپ میں موجود تھا لیکن شاید طالبان کو غلط فہمی تھی یا غلط اطلاع دی گئی تھی انہوں نے کئی ہفتے شہریوں کے گھروں میں تلاشی بھی لی تھی لیکن اس واقعے کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی

کہ نورافضل اور گینٹ کچھ ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے تھے اور چند گھنٹوں ان کا مقابلہ کرنے کے بعد انہیں مار بھگایا تھا پھر فورس کیمپ پر بھی طالبان کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا اور وہ رات گینٹ اور اس کے ساتھیوں نے سکون سے گزاری تھی۔

اگلی صبح گینٹ این کے ساتھ ناشتہ کررہا تھا کہ اسے امریکی ہیڈکوارٹر سے ایک خط موصول ہوا جو لیفٹیننٹ جنرل جان مالہولینڈ کی طرف سے تھا اور جان مالہولینڈ اس وقت امریکی فوج میں اسپیشل آپریشن برانچ میں تھا اور ڈپٹی کمانڈر آف اسپیشل برانچ تھا اس خط نے گینٹ کے ہوش اڑادیئے وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا کسی نے اس کی مخبری کردی تھی اور اسپیشل آپریشن برانچ کو پتہ چل گیا تھا کہ گینٹ اپنی مرضی سے افغانستان میں امریکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے ساتھ ساتھ آپریشن کے دوران ایک امریکی رپورٹر عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے اور نشے کا بھی عادی ہوگیا ہے اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

جان مالہولینڈ نے اپنے خط میں گینٹ کو مخاطب کیا تھا اور اس نے لکھا تھا۔

''ایک آفیسر ہونے کے باوجود تم نے اپنی عزت خودخاک میں ملائی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ اب تمہیں اعتبار کے قابل نہیں سمجھا جارہا تمہیں فوراً واپس آنا ہے۔'' گینٹ کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ این حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے جھک کر خط اٹھایا تھا وہ بھی اسے پڑھ کر حیران رہ گئی تھی اسے ڈر تو تھا کہ ان کا یہ راز ایک دن فاش ہوجائے گا لیکن اتنی جلدی یہ ہوگا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا ابھی اسے گینٹ کے ساتھ یہاں محبت بھری زندگی گزارتے ہوئے صرف نوماہ ہی ہوئے تھے۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے آہستہ سے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''واپس جائیں گے۔'' گینٹ نے کہا۔

''اور...... یہاں؟...... یہاں کون ہوگا؟'' این نے پوچھا۔

''کوئی اور...... میرے جیسا سرپھرا...... یا پھر قوانین پر چلنے والا کوئی بہادر۔'' گینٹ نے ہنس کر کہا۔

''میں تمہیں سمجھاتی تھی کہ یہ کام خطرناک ہے...... میں اسی لیے شادی کے لیے رضامند نہیں تھی...... دیکھو تمہارا اور میرا کیریئر تباہ ہوگیا۔''

''کوئی بات نہیں...... مجھے ملازمت جانے کا دکھ تو ہے لیکن تمہیں پانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' گینٹ نے کہا' این حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

اگلے ہی روز وہ دونوں امریکہ کے لیے روانہ ہوگئے تھے اس کی رجمنٹ میں سب کو یہ خبر پتہ چل گئی تھی اور ہر کسی کو ان سے ہمدردی تھی انہیں گینٹ کی بہادری اور ہوشیاری پر پورا بھروسہ تھا وہ اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن مجبور تھے کیونکہ گینٹ پر قانون توڑنے کا الزام لگ چکا تھا اور جو سچ تھا جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

امریکی آرمی نے بڑے خفیہ انداز میں اس کیس کو دوسال تک ڈیل کیا اور اس بارے میں کوئی خبر عام لوگوں تک نہ پہنچنے دی لیکن پھر جون ۲۰۱۴ میں شام سات بج کر ۲۱ منٹ پر ABC نیوز پر اس کا انٹرویو نشر ہوا اور لوگوں کو حیران کرگیا۔

''میں نے اپنی ایک ذاتی تخیلاتی دنیا بسالی تھی جس میں این کے ساتھ رہتا تھا اس سے محبت کرتا تھا میں طالبان کے درمیان تھا اور میں نشہ آور گولیوں کا اور شراب کا بھی عادی ہوگیا تھا لیکن میں اس زندگی سے خوش تھا۔'' اس نے ABC نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے جب این سے شادی کی درخواست کی تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی لیکن آخر کار میں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔''

''مجھ سے ریٹائر ہونے کے لیے کہا گیا۔ مجھ سے

میرے اعزازات بھی لے لئے گئے لیکن میں نے این کے ساتھ رہ کر جو کامیابی حاصل کی یہ اس سے بہت کم ہے میرے لیے این کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات بہت قیمتی ہیں۔" گینٹ بہت افسردہ نظر آ رہا تھا ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

"ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم جو کر رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے لیکن اگر مجھے موقع ملے تو میں یہ سب دوبارہ کرنے کو تیار ہوں مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں اپنے عہدے سے بالاتر ہو کر غلط کام کر رہا تھا لیکن اصول توڑنے پر بھی کامیابی مل سکتی ہے...... میں نے ہار کر بھی میدان نہیں چھوڑا...... مین نے کبھی ایک آدمی کا نقصان بھی نہیں اٹھایا اور اپنی جدوجہد کی لڑائی کے بدلے مجھے بیس بہادری کے ایوارڈ ملے...... ہم نے ہر روز ان سے لڑائی کی اور اپنے تمام آدمیوں کو زندہ سلامت واپس لے کر آیا...... میں جانتا ہوں کہ اصولوں کو توڑ کر بھی بعض اوقات کامیابی حاصل ہو سکتی ہے...... میں نے لارنس آف عربیہ سے کم کردار ادا نہیں کیا اور لوگ مجھے لارنس آف افغانستان یونہی نہیں کہتے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

اب گینٹ اور این اپنے وطن Seathle میں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں لیکن گینٹ کو اپنا عہدہ جانے کا بہت دکھ ہے۔

وہ اب بھی اپنی بیس سالہ زندگی میں ملنے والے زخموں کو یاد کرتا ہے اور اس خطرناک برین انجری کو یاد کرتا ہے جو اسے افغانستان میں سڑک کے کنارے پھٹنے والے ایک بم دھماکے میں ہوئی۔

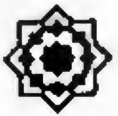
گینٹ کچھ گھنگھریالے سے بھورے بالوں اور داڑھی کے ساتھ بلو جینز پہنے شہر کے کافی اور میوزک کے ماحول میں کھو گیا ہے اور موجودہ ذمہ داریاں پوری کر رہا ہے اس کی بیوی این نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس پر اسامہ بن لادن کی طرف سے بھی حملہ کیا گیا تھا لیکن وہ بڑی مہارت سے بچ نکلا تھا اس واقعے کا ذکر این نے اپنی کتاب

spartan`the American promise,the mission and the Betrayal of special forces Majar jim cant.

میں کہا ہے

اپنے شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے گینٹ سوچتا ہے کہ ایک .... فورس کمانڈرر کا انجام کیا یہی تھا کہ اسے یو ایس آرمی سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جائے صرف اس لیے کہ اس نے ایک جنگی رپورٹر سے محبت کی تھی اور شادی کی تھی اور این جس نے اپنی جاب صرف اس لیے چھوڑ دی تھی کہ اس نے گینٹ کے ساتھ ایک سال تک خاموش زندگی گزاری تھی وہ بھی دنیا کی خطرناک ترین جگہ افغان پوسٹ پر...... لیکن وہ دونوں اپنی موجودہ زندگی سے بھی خوش ہیں اور محبت میں کامیابی ان کی فتح ہے۔

اکثر شام کو وہ دونوں جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتے ہیں اور افغانستان میں گزارے ہوئے محبت بھرے لمحات کو یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں محبت میں انہیں جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ ملازمت جانے کی خوشی سے بہت زیادہ ہے۔



سیاست کے دکھ

الشبہ مخدوم

پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی ادارے سیاست کا گڑھ بن کر رہ گئے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات کا ان پر براہ راست اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں زیر تعلیم ہر طالب علم کو کسی نہ کسی سیاسی گروہ کا ساتھ لازمی دینا ہوتا ورنہ اس پر مذکورہ ادارے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔

سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک کالج کی طالبہ کا احوال' جو اپنی شرارتوں' ذہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

وہ حادثہ تھا یا' اپنا حق مانگنے کی سزا' جو بھی تھا' میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ سدرہ کے بارے میں جیسے ہی یہ سنا کہ وہ ضلعی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ میری کلاس فیلو تھی اور کالج میں اپنی شرارتوں' ذہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ہمارے کالج میں بنیادی طور پر دو گروپ تھے۔ ایک گروپ شہری لڑکیوں کا اور دوسرا دیہاتی لڑکیوں کا تھا۔ میں شہر میں رہتی تھی اور وہ دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ لمبے قد کی گوری چٹی اور بھرپور جسم کی مالک تھی۔ گہرے سیاہ گھنے بال' موٹی آنکھیں' بھرے بھرے گال تیز تیز باتیں کرنے والی۔ اسے لباس کے بارے میں اتنا سلیقہ نہیں تھا۔ یونیفارم تو تھا ہی لیکن کبھی کبھار جب کوئی فنکشن ہوتا تو اس میں وہ نری دیہاتی ہی لگتی تھی۔ وہ گہرے اور اوٹ پٹانگ قسم کے رنگ' گوٹا کناری' اور پرانے فیشن کی کٹنگ والے لباس ہی پہنتی تھی۔ یہ سب ہونے کے باوجود وہ اپنی باتوں' اپنے بولڈ پن اور بہادری کی وجہ سے ہر کسی کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ دیہاتی لڑکیوں کے گروپ میں ہونے کی وجہ سے وہ اتنا زیادہ شہری لڑکیوں میں گھلتی ملتی نہیں تھی۔

میرے ساتھ اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ میرے خاندان میں وکیل کچھ زیادہ ہی ہیں اور سدرہ کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کے وکیل بنے۔ اس کی یہ خواہش کیوں تھی؟ یہ اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہہ دیا کرتی تھی کہ مجھے وکیل بننا اچھا لگتا ہے۔

کالج دور کے بعد کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے وکیل بننے کا خواب ادھورا تھا یا پورا ہوگیا تھا؟ مجھے اس بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں بی ایس ای کر گئی تو وہ بی اے کرنے کے بعد ایک دم سے گم ہوگئی۔ بس ایک دن اس کا مجھے فون ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ تقریباً تین برس بعد اس کی آواز سنی تھی۔ اس نے مجھ سے ملنا چاہا تھا اور میں نے بخوشی اسے اپنے گھر بلایا تھا لیکن بجائے ملاقات کے اس کے بارے میں یہ خبر ملی کہ اس کے گھر کو آگ لگ گئی تھی' جس میں وہ بری طرح جھلس گئی تھی۔ مقامی اسپتال والوں نے سہولیات نہ ہونے کے باعث ضلعی اسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا تو اسے وہاں لے گئے۔

دوپہر کے وقت مجھے پتہ چلا۔ یہ خبر سننے کے دو گھنٹے تک میں اس دکھ کے حصار سے نہ نکل سکی۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ تجسس بھی تھا کہ آخر وہ مجھ سے ملنا

کیوں چاہتی تھی؟ تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گی۔ گھر سے ضلعی اسپتال تک کا راستہ سوا گھنٹے کا تھا۔ میں نے اپنے کزن سے کہا کہ وہ مجھے ضلعی اسپتال لے جائے۔

"یہ تمہیں اچانک کیا کام پڑ گیا وہاں اور وہ بھی اس وقت؟"

"مجھے ضلعی اسپتال جانا ہے' اپنی ایک دوست کی عیادت کرنی ہے اور واپس آ جانا ہے۔" میں نے بتایا

"صبح چلیں گے۔ ابھی گئے تو واپس آتے رات ہو جائے گی۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

"دیکھو' گاڑی مجھے بھی چلانا آتی ہے' میں خود چلی جاؤں گی۔" میں نے رعب دکھایا۔

"کیا اتنا ہی ضروری ہے وہاں جانا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تبھی تو اس وقت جانے کا کہہ رہی ہوں۔" میں نے اسے احساس دلایا۔

"مجھے اس وقت بھی تمہیں لے جانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن پلیز مجھے بتاؤ تو۔ کوئی اتنی اہم ہی سہیلی ہے تمہاری' کون ہے وہ؟"

تب میں نے سدرہ کے بارے میں بتا کر کہا "پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟"

"میرے خیال میں اگر تم وہاں نہ ہی جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں' بلکہ پوری بات سے آگاہ ہوں۔ اگر چاہو تو مجھ سے ساری بات سن لو۔" میرے کزن نے صوفے پر پھیل کر اطمینان سے کہا۔

"تم چلو تو سہی اور جو تمہیں معلوم ہے وہ راستے میں بتا دینا' اس طرح راستہ بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔" میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"لیکن میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم اگر اس کے بارے میں سن لوگی تو مجھے امید ہے کہ یہ سب سن کر تم وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لوگی۔" اس نے کہا تو میں بولی۔

"ٹھیک ہے بتاؤ۔"

"چلو' میں بتا دیتا ہوں۔" اس نے کہا تو میں خاموش رہی۔ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگا۔



سدرہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ لیکن ایسا بھی غریب نہیں کہ وہ دو وقت کی روٹی کو ترس جائیں۔ ان کی زمین تھی' جو کسی وقت اس کے دادا نے بنائی تھی۔ اس علاقے میں جن لوگوں کو زمین الاٹ ہوئی تھی' وہ نو آباد کار تھے۔ حکومت نے اس علاقے میں نہر نکال کر گاؤں آباد کیے تھے۔ انہوں نے بھی یہ زمین اس لیے بنائی تھی کہ پانی کا وسیلہ ہے نہر کے ساتھ زمین ہے' ہوتے ہوتے آباد ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہر کے منبع اور ان کی زمین کے درمیان کئی بڑے بڑے جاگیردار تھے۔ وہ سارا پانی روک لیتے۔ وہ لوگ ٹیلوں پر تھے۔ باوجود زمین دار ہونے کے' ان کی زمین' پانی نہ ہونے کے باعث فصل نہ دے سکتی تھی۔ یوں وہ لستم پشتم وقت گزار رہے تھے۔

سدرہ بچپن ہی سے اس تنگ دستی کو دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ سارے علاقے کی طرح وہ یہی سمجھتی تھی کہ اگر ان کی زمینوں کے لیے پانی دستیاب ہو جائے' جو اُن کا حق ہے تو وہ لوگ بھی خوشحال زندگی گذار سکتے ہیں اور ان کی تمام تر تنگ دستی کے ذمہ دار وہی دو جاگیردار ہیں' جو اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کے باعث ان کا پانی روک لیتے ہیں۔

ان کی شنوائی کہیں نہیں تھی۔ اگر کوئی محکمے کو درخواست دیتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی

طرح زخم کھا کر خاموش ہو جاتا اور اگر کوئی سر پھرا قسم کا افسر آ جاتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ یا تو اس کا تبادلہ کرا دیا جاتا' یا پھر اس قدر ڈرایا دھمکایا جاتا کہ وہ خود ہی تبادلہ کروا کے چلا جاتا۔ موج اگر تھی تو چھوٹے عملے کی' وہ ہر طرح سے کھاتے پیتے تھے۔ اس علاقے کے پٹواری دونوں ہاتھوں سے نوٹ کما رہے تھے۔

وہ دو جاگیر دار اگر صرف جاگیر دار ہی ہوتے تو کہیں نہ کہیں سے شاید کوئی معاملہ حل ہو جانے کی امید ہوتی لیکن دراصل دونوں سیاست دان بھی تھے۔ اعجاز خان ہمیشہ ایم این اے کی سیٹ جیت جاتا اور اللہ یار ایم پی اے بن جاتا' دونوں ایک ساتھ ہو کر پورے علاقے پر حکومت کر رہے تھے۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنے جرائم پر سیاست کا پردہ ڈالے ہوئے تھے۔

یہ وہ حالات تھے' جس نے سدرہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس علاقے میں اگر سیاسی تبدیلی ہو گی تو ہی ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ورنہ وہ تو یہ عذاب بھگت رہے ہیں' ان کی آئندہ نسل بھی بھگتے گی۔ وہ دن رات یہی سوچتی رہتی۔ اس کے تعلیم حاصل کرنے کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ بڑے خواب دیکھا کرتی تھی کہ وہ وکیل بنے گی' وکالت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو ان دونوں سیاست دانوں کے بارے میں شعور دے گی کہ وہ لوگ کس طرح ان کا استحصال کر رہے ہیں اور ان کے اس ظلم سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

اس نے کالج کی تعلیم ختم کی تھی اور آگے پڑھنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ پیپر دے کر فارغ تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی کہ انہی دنوں اس کی شادی کی بات ہونے لگی۔ اس کا تایا زاد دبئی میں کام کرتا تھا۔ وہ آیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ آیا ہوا ہے تو اس کی شادی کر دی جائے۔ سدرہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے کچھ وقت کے لیے مہلت مانگی۔ جو اسے نہیں دی گئی۔ معاملہ کافی بڑھا۔ بات یہاں پر آ کر ختم ہو گئی کہ فی الحال اس کا نکاح کر دیا جائے۔ جب یہ وکالت پاس کر لے گی اور اس کا تایا زاد دوبارہ واپس آ جائے گا تو رخصتی ہو جائے گی۔ یہ تنازعہ طے ہوا لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے مسئلے نے سر اٹھا لیا۔ دونوں بھائیوں کی اولادیں یہ چاہتی تھیں کہ زمین بانٹ لی جائے۔ جس کے حصے میں جو آتی ہے اسے مل جائے۔ تایا زاد کا خیال تھا کہ زمین بیچ کر وہ شہر میں کوئی کاروبار کریں گے۔ یہاں کھیتی باڑی میں کہاں اتنی آمدن ہے۔ یہ معاملہ بھی تب تک کے لیے ٹالا جانے لگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور ان کی زمین تقسیم ہو گئی۔ سدرہ کا چونکہ ایک ہی بھائی تھا' ساری زمین اسے مل گئی۔ باقی کو بہت تھوڑی آئی۔ جو بھی ہوا وہ وقت گزر گیا۔

سدرہ نے دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پڑھنے لگی۔ انہی دنوں اسے پتہ چلا کہ ان کے ساتھ والے گاؤں کا ایک لڑکا وسیم الحق بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اس کا شعبہ الگ تھا۔ اکثر اوقات ان کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ پھر ان میں بات چیت بھی شروع ہو گئی۔ یہ بات چیت اس وقت گہری دوستی میں بدل گئی' جب دونوں کو پتہ چلا کہ بنیادی طور پر وہ دونوں ہی اپنے علاقے کے سیاست دانوں کے خلاف ہیں۔ اور ان سے نجات کے نت نئے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ ان کی باتیں اسی موضوع کے گرد گھومنے لگیں۔

سدرہ ذہین تھی' اس نے ان دونوں جاگیر داروں کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھنے لگی۔ جب بھی وہ یونیورسٹی سے

واپس آتی، اپنے اردگرد کی عورتوں اور خاص طور پر نوجوان لڑکیوں کو سمجھاتی کہ ان کے سب سے بڑے دشمن وہی دونوں سیاست دان ہیں۔ جو ان کے وسائل پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ تقریباً ایک برس کے اندر اندر اس نے اپنے بہت سارے ہم خیال پیدا کر لیے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی، جس شہر میں وہ پڑھتی تھی۔ دہاں کی ایک این جی او تھی۔ وہ لوگ میڈیکل کیمپ لگواتے تھے۔ وسیم اور سدرہ این جی او والوں سے ملے۔ وہ راضی ہو گئے اور ہر مہینے ایک میڈیکل کیمپ لگانے لگے۔ علاقہ وہی تھا، لیکن ہر بار گاؤں بدل جاتا۔ اس علاقے کے ہر گھر میں سدرہ اور وسیم کا نام پہنچ گیا۔ جو نہیں جانتے تھے، وہ بھی پہچاننے لگے۔ دونوں ہی علاقے کا چھوٹا موٹا کام کرنے لگے تھے۔ سدرہ نے گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ایک سلائی اسکول بھی کھول دیا جہاں لڑکیاں سینے پرونے کا ہنر سیکھنے لگیں۔

جو علاقوں پر حکومت کرتے ہیں، وہ بے خبر نہیں ہوتے۔ علاقے میں چلنے والی مخالف ہواؤں پر وہ ہمیشہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ انہیں سدرہ کی سرگرمیاں کھٹکنے لگیں۔ وہ اس کی ٹوہ میں رہنے لگے کہ وہ کیا کرتی ہے؟ وہ سدرہ اور وسیم کی سرگرمیوں بارے میں پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں یہ پوری طرح احساس ہو گیا کہ دونوں ہی ان کے خلاف بے حد نفرت رکھتے ہیں۔ ان کی نفرت کیوں تھی، یہ بھی انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

کوئی بھی حکمران اپنی مخالفت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے وہ خوشامدی تو پسند ہوتے ہیں، جو اس کی رگوں میں میٹھا زہر اتارتے رہتے ہیں۔ جو انہیں سمجھ ہی نہیں آنے دیتے سیاست کا دوسرا نام عوامی خدمت ہے۔ اور خلق خدا کی خدمت عبادت ہے۔

یوں وقت گزرتا گیا اور ضلعی حکومتوں کے لیے الیکشن کا شور شروع ہو گیا۔ جس طرح ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ جیسے ہی الیکشن کا موسم آجائے، انہی دنوں نہ صرف نئے نئے لیڈر پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں، بلکہ عوامی خدمت کا نقاب اوڑھ کر بہتیرے بہروپیے بھی الیکشن میں کود پڑتے ہیں۔ مقابلہ کی فضا بن جاتی ہے۔ ان میں کئی لوگوں کی روٹی روزی نکل پڑتی ہے۔

ضلعی نظام کے اس الیکشن میں ہر یونین کونسل کی سطح پر ناظم اور نائب ناظم کے چناؤ کے ساتھ آٹھ دوسرے ممبران بھی چنے جانے تھے۔ پھر تمام یونین کونسلوں کے ممبران مل کر تحصیل کا ناظم اور نائب ناظم کا چناؤ کرنا تھا۔ مقابلے کی اس فضا میں، انہی جاگیرداروں کی طرف سے ایک امیدوار کرم داد تحصیل ناظم کے لیے سامنے آ گیا اور اس نے اپنا گروپ تشکیل دے کر الیکشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تو دوسری طرف عبدالرحیم کا گروپ سامنے آ گیا اور الیکشن مہم شروع ہو گئی۔

عبدالرحیم گروپ کو لیڈی کونسلر نہیں مل رہی تھی۔ وسیم اس گروپ کا حصہ تھا۔ اس نے گروپ کی توجہ سدرہ کی طرف دلائی کہ لیڈی کونسلر کے لیے اس سے بہتر امیدوار کوئی نہیں ہے۔ وہ سارے کا سارا گروپ ان کے گھر آ گیا اور سدرہ کے باپ کو مجبور کر دیا کہ لیڈی کونسلر کے لیے سدرہ کو امیدوار بنا دیں۔ اس میں سدرہ کی بھی خواہش تھی۔ سو الیکشن مہم میں وہ بھی شامل ہو گئی۔ اس کی حامی عورتوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ این جی او والوں نے بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ دن بدن اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے چلے گئے۔

الیکشن ہوا اور اس کا جو نتیجہ سامنے آیا اس میں عبدالرحیم گروپ تو ہار گیا' لیکن ان کے دو امیدوار سدرہ اور وسیم کا والد چوہدری نیاز کامیاب ہو گئے۔ اب اس سے اگلا مرحلہ تحصیل ناظم کے چننے کا تھا۔ ان کی یونین کونسل کا ناظم چوہدری منظور تھا۔ اس نے کرم داد کے ووٹوں کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کرم داد گروپ کے لوگ بھی ان کے پاس آنے لگے۔ انہوں نے منت سماجت سے لے کر پیسوں کی آفر تک کی لیکن چوہدری نیاز نہیں مانا۔ تب انہیں دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ لالچ سے لے کر ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ چناؤ تک رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب تحصیل ناظم کا چناؤ ہونا تھا۔ انہوں نے مخالفت میں ووٹ دیا لیکن کرم داد تحصیل ناظم بن گیا۔ جس کا چوہدری منظور کو بے حد رنج تھا۔

الیکشن کا ہنگامہ ختم ہوا تو سدرہ پھر سے یونیورسٹی آ گئی۔ کچھ دن بعد وسیم بھی آ گیا۔ چونکہ الیکشن کے دنوں میں وہ بہت قریب رہے تھے' اس لیے ان دونوں میں قربت ہو جانا فطری سی بات تھی۔ دن گزرتے گئے' یہاں تک کہ ایک دن اسے اپنے ہی گاؤں سے ایک خاتون کا فون ملا۔ چند باتوں کے بعد اس خاتون نے پوچھا۔

"سدرہ! کیا تم وہاں یونیورسٹی میں وسیم سے عشق کا چکر چلا رہی ہو؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہو اور ایسی بات تم سے کس نے کہی؟" سدرہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے یہاں تو ہر گھر میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے تمہارے اور اس کے فوٹو بھی ہیں وسیم کے ساتھ۔" جیسے ہی اس نے کہا' اسے لگا کوئی سازش اپنا کام دکھا گئی ہے۔ اس لیے سدرہ نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"کیسے فوٹو ہیں' ان کے بارے میں بتا سکتی ہو؟"

دل ایک سپر ہائی وے

نماز کے دوران دل میں غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوس یا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل ضرورت نہیں' دراصل انسان کا قلب تو ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں۔ امیر کبیر بھی چلتے ہیں' غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں۔ خوب صورتیوں اور بدشکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے' نیکو کاروں' پارساؤں' مجرموں اور گناہ گاروں کے لیے بھی یہ شارع عام ہے۔

عافیت اس میں ہے کہ اس شاہراہ پر جیسی بھی ٹریفک آئے اسے خاموشی سے گزرنے دیا جائے اگر اس ٹریفک کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو دل کی سڑک پر پہیہ جام ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ اس راستے کا ٹریفک سگنل صرف سبز بتی پر مشتمل ہوتا ہے اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

شیخ سکندر قریشی ...... لاڑکانہ

"کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر اس خاتون نے تفصیل بتانی شروع کر دی۔ وہ سارے کے سارے فوٹو اس کے یونیورسٹی اور ایک ریستوران کے تھے۔ جہاں وہ وسیم کے ساتھ گئی تھی۔ خاتون نے تو اسے اطلاع دے کر فون بند کر دیا مگر اسے سوچ میں ڈال دیا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا؟

اسی دن وہ وسیم سے ملی۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

"تمہیں آج پتا چلا ہے۔ مجھے تو ایک ہفتہ سے

معلوم ہے۔"

"تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" سدرہ نے تلخی سے پوچھا۔

"تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی۔" اس نے تحمل سے جواب دیا تو اس نے غصے میں پوچھا۔

"کیا میں اب پریشان نہیں ہوں؟"

"ظاہر ہے بات پریشانی والی ہے۔ پریشان تو ہونا بنتا ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟" وسیم نے پھر تحمل سے کہا

"آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟" سدرہ نے پوچھا تو وسیم بولا۔

"ایک دو دن میں معلوم ہو جائے گا۔ میں نے یہاں بھی اور گاؤں میں بھی بندے لگائے ہوئے ہیں۔ فکر نہ کرو میں......"

"مگر میں اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گی؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"دیکھو۔ اگر ہم میں کوئی غلط ہے تو پھر تمہیں ڈرنا چاہئے' جب ہمارے درمیان ایسی کوئی بات ہی نہیں تو پھر ہمیں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ تم اپنے گھر والوں کو بتاؤ کہ یہ غلط بات ہے اور کوئی ہمارے خلاف ایسا کر رہا ہے۔" وسیم نے اسے سمجھایا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' کہیں یہ سیاسی مخالفین کا تو کام نہیں ہے؟" سدرہ نے پوچھا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ خیر مجھے ایک دو دن دو' سب کچھ سامنے آ جائے گا۔" وسیم نے اُسے حوصلہ دیا تو وہ کچھ دیر ساتھ رہنے کے بعد جدا ہو گئے۔

دو دن بعد اسے وسیم نے فون کر کے بتایا کہ اس بندے کا پتہ چل گیا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ چوہدری منظور کے ایماء پر کیا۔ وہ لڑکا ہمارے ہی گاؤں کا ہے۔ وہ کرم داد کے گروپ کا ہی ہے۔ الیکشن کے دنوں میں وہ بڑا سرگرم تھا۔ اسی نے سیل فون سے تصویریں بنوائی ہیں۔ اس نے کئی لوگوں کے سامنے اعتراف بھی کیا ہے۔ میں آج گاؤں جا رہا ہوں۔ اگر چاہو تو تم بھی آ جاؤ۔ اس پر سدرہ نے اگلے دن آنے کا کہہ دیا۔

سدرہ گاؤں آئی تو سب سے پہلے اسے اپنے والدین کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس سے متنفر ہو چکے تھے ۔ان کا کوئی اور بس نہیں چلا تو یہی کہہ دیا کہ اب پڑھنا لکھنا بند' یہ ممبری بھی ختم۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے تایا کے بیٹے نے بھی بہت جلد آنے کی ہامی بھر لی لیکن سدرہ کا یہ سوال تھا کہ جب ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ مگر کسی نے بھی اس کی نہیں سنی۔ اسے یونیورسٹی جانے سے منع کر دیا گیا۔ وہ خاموش ہو گئی تاکہ اس وقت تو ان لوگوں کو غصہ ہے لیکن کچھ دن بعد جب انہیں یقین آ جائے گا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے خلاف سازش کی گئی ہے تو وہ دوبارہ سے یونیورسٹی چلی جائے گی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔

ایک ہفتہ ہی گذرا تھا۔ وسیم نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور اس نے ساری بات اُگل دی۔ وہ اس لڑکے کا کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے جوتے مارنے کے۔ وہ اس نے مار دیئے۔ اسے خوب ذلیل کیا۔ وہ لڑکا چوہدری منظور کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے وسیم کے خلاف تھانے میں اقدام قتل کا پرچہ کروا دیا۔ بات حد سے بڑھ گئی۔ ایک طرف اقتدار کی قوت تھی تو دوسری طرف سچائی۔ چوہدری منظور اور اس کے حواری تو یہ موقع تلاش کر رہے تھے کہ ایسا کچھ ہو اور یونین کونسل میں یہ دو لوگ مخالفت کرنے والے ہیں یہ بھی ختم ہو جائیں۔ اور پھر وہ اپنی من مانی کریں۔ دوسرا وہ سیاسی

انتقام بھی تو لینا چاہتے تھے۔ وہ پورے علاقے پر اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتے تھے۔ لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتے تھے کہ وہ ہی ہیں جو پورے علاقے میں من مانی کر سکتے ہیں۔ ان کے مخالفین ان کا سامنا نہیں کر سکتے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ آگے اسمبلیوں کے الیکشن ہیں۔ ابھی سے علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ وہ ابھی دونوں کو کچل دینا چاہتے تھے۔

وسیم کو پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ تو ان کی قسمت اچھی تھی' یا ان کا تھوڑا بہت اثر رسوخ تھا جس کے بل بوتے پر اس کی ضمانت ہو گئی۔ اس سارے تنازعے میں لوگوں کو بہر حال پتہ چل گیا کہ سدرہ کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ لیکن افواہیں اس قدر تھیں کہ گرد میں معاملہ صاف نہیں ہوا۔ اس کے گھر والوں کا من بھی کافی حد تک صاف تو ہو گیا۔ لیکن یونیورسٹی جانے کی اجازت پھر بھی نہیں دی گئی۔

چوہدری منظور اور کرم داد گروپ کے لوگ سدرہ کے باپ کے پاس آئے اور بڑے آرام سے سدرہ کا استعفیٰ مانگ لیا۔ انہوں نے وسیم کی مثال دے کر کہا کہ ایسا اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ تو پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے کرم داد گروپ کے بندوں سے استعفیٰ دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے باپ نے بات کی تو اس نے یہی شرط رکھ دی کہ وہ وسیم کے خلاف پرچہ واپس لے لیں تو وہ استعفیٰ دے دے گی۔ اس کی یہ شرط کرم داد گروپ کو ناگوار گزری۔ مگر وہ وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔

سدرہ کے تایا زاد کو دوبئی سے آنے میں کچھ رکاوٹیں درپیش ہوئیں تو اس نے دو ماہ بعد آنے کا کہہ دیا۔ اب انہیں انتظار کرنا تھا۔ سدرہ نے پھر اپنے گھر والوں سے یونیورسٹی جانے کی اجازت چاہی جو اسے نہیں ملی۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن اپنے سلائی اسکول کا کام زیادہ کرنے لگی تا کہ اسے مزید ترقی دے سکے۔

دو ہفتے نہیں گزرے تھے کہ ایک خاتون نے اینٹی کرپشن میں درخواست دے دی کہ سدرہ نامی لیڈی کونسلر نے اس سے بھاری رشوت لی ہے تا کہ سرکاری ملازمت دلا سکے۔ اب نہ تو وہ پیسے واپس کر رہی ہے اور نہ ملازمت دلوا رہی ہے۔

اس درخواست کے بارے میں اسے پتہ ہی اس وقت لگا' جب پولیس اسے پکڑنے کے لیے ان کے گاؤں آ گئی۔ گاؤں میں کسی کے گھر پولیس یوں چھاپہ مار دے تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ وہ لوگ مصر تھے کہ وہ سدرہ کو لے کر ہی جائیں گے۔ لیکن سدرہ ہمسائیوں کے گھر میں جا چھپی۔ یہاں بھی وسیم کا والد چوہدری نیاز ان کے کام آیا۔ اس نے لے دے کے ان پولیس والوں کو واپس بھیج دیا۔ ان سے دو دن کی مہلت مانگی گئی۔

سدرہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس دوران جہاں سدرہ کے گھر والوں نے چوہدری نیاز کے ساتھ مل کر ضمانت کروائی' وہاں وسیم بھی اس کے کام آیا۔ اس نے درخواست دینے والی عورت سے رابطہ کیا اور درخواست واپس لینے کی بات کی۔ وہ عورت بہت خرانٹ تھی۔ اس نے کرم داد گروپ سے پیسے لیے ہوئے تھے۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہمیں استعفیٰ دے دو تو ہم درخواست واپس لے لیتے ہیں۔ اس پر سدرہ مان جاتی لیکن اس کے تایا زاد نے دوبئی سے فون کر کے اس کے رشتے ہی سے انکار کر دیا کہ میں ایسی لڑکی کے ساتھ شادی ہی نہیں کرنا چاہتا' جسے پکڑنے پولیس گھر آ گئی ہو۔ اس کے تایا زاد کا فون کیا آنا تھا۔ گاؤں کے علاوہ پورے علاقے میں افواہ ساز فیکٹریوں نے نجانے کیا کیا افواہیں

گھڑیں اور پھیلا دیں۔ تبھی سدرہ دلیر ہوگئی۔ ان نے اپنے من میں طے کرلیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔
کچھ ہی دنوں بعد یونین کونسل کا اجلاس رکھ لیا گیا۔ اس نے وسیم کو ملنے کے لیے کہا اور اسے بتادیا کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔ اس کا نتیجہ جو بھی ہوگا' وہ اس کے لیے تیار ہے۔ اس نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملادی۔ اجلاس والے دن وہ بڑے اہتمام سے وہاں چلی گئی۔ وسیم بھی اپنے باپ کے ساتھ یونین کونسل کے دفتر چلا گیا۔
اجلاس جاری تھا۔ تمام ممبران کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے' تبھی سدرہ نے چوہدری منظور سے کہا
"جناب ناظم صاحب! مجھ پر جو جھوٹی اور ناجائز درخواست دی گئی ہے' اس بارے آپ جانتے ہیں؟"
"ہاں مجھے پتہ چلا ہے۔ اب تم نے رقم کھائی ہو گی تو وہ غریب درخواست دینے پر مجبور ہوگی۔" ناظم نے بڑے تفاخر اور طنزیہ انداز میں یوں کہا جیسے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ تبھی سدرہ نے انتہائی غصے میں کہا
"نہیں چوہدری منظور! یہ درخواست صرف اور صرف تمہاری بے غیرتی کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اگر کل شام تک وہ درخواست واپس نہ لی گئی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا کروں گی۔"
اس پر وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
"جو کرنا ہے وہ بڑے شوق سے کرو۔ میں اس کا دفاع کروں گا۔ سیاست میں تو ہوتا ہی ہے۔ تم ابھی سے پاگل ہورہی ہو۔"
"یہ سیاست نہیں غنڈہ گردی ہے۔" سدرہ نے کہا
"تو یہی سمجھ لو۔" اس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگادیا۔
"دیکھو۔ درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں سارے کچھے چھٹے پریس کو دے دوں گی اور خود ہر اس محکمے کو درخواست دوں گی جس......" اس نے کہنا چاہا تو چوہدری منظور نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔
"کہا نا جو مرضی کرو' جس طرح ہم تمہیں عشق کرنے سے نہیں روک سکے۔"
اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سدرہ کسی بگولے کی مانند اٹھی اور اس نے چار قدم پر بیٹھے ہوئے چوہدری منظور کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گی۔ کوئی بندہ بھی اسے پکڑنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ دوسری لیڈی کونسلر ادھیڑ عمر عورت تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ تبھی سدرہ نے دہاڑتے ہوئے کہا۔
"اب میرا ہاتھ کھل گیا ہے چوہدری منظور۔ کل شام تک درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں جو تمہارے ساتھ کروں گی وہ زمانہ دیکھے گا' میں باہر کھڑی تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ اب تو نے جو کرنا ہے کر۔"
سدرہ یہ کہہ کر وہاں سے نکل پڑی۔ باہر وسیم کھڑا تھا۔ جس وقت تک سدرہ باہر آئی اسی طرح اندر کی بازگشت بھی باہر آگئی۔ ایک دم سے ہلچل مچ گئی۔ سدرہ یونین کونسل کے لان میں کھڑی تھی۔ کوئی بندہ باہر نہیں آیا۔ تبھی چوہدری نیاز ہی نے آکر اسے سمجھایا بجھایا اور اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا۔ اپنے گھر لا کر اس نے سمجھایا
"دیکھو بیٹی! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے بہت برا کیا تھا' اس پر تمہارا ردعمل کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ لیکن' یہاں کی سیاست جرم کی خوراک پر پرورش پاتی ہے۔ تمہارا یہ ردعمل جرم کی ابتدا بن جائے گا۔ ایک جنگ......"
"جنگ شروع ہوتی ہے تو ہوجائے۔ انہوں نے ذلیل کرنے کی اخیر کردی ہے۔ کیا لڑکی ہونا جرم

ہے۔ کیا اپنے حق کی آواز اٹھانا جرم ہے۔'' سدرہ نے نہایت غصے میں کہا۔

''جرم ہے نہیں بنا دیا جاتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام ایسا ہے جس میں مجرم پیدا کیے جا رہے ہیں۔ جو بھی حق کی آواز اٹھاتا ہے اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو کمزور ہوتے ہیں وہ یا تو دب جاتے ہیں یا پھر وہ ایسا شعلہ بن کر ابھرتے ہیں کہ جو جرم کی راہ پر اپنا آپ بھی جلا لیتا ہے۔ یہ طاقت کی جنگ ہے اور جرم ہی اس کو بڑھاتا ہے۔''

''کچھ بھی ہے تایا جی میں اب نہیں چھوڑوں گی۔ میں ابھی جاؤں گی اور اس عورت کا بھی بندوبست کرتی ہوں۔'' سدرہ نے کہا اور اٹھ گئی۔

''نہیں بیٹی! آج تم اس کی طرف نہیں جاؤ گی۔ آج شام یا رات میں اس کا کوئی حل نکالتا ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ حوصلے اور صبر سے کام لو۔ کل پھر بات کرتے ہیں۔'' چوہدری نیاز نے سمجھا بجھا کر اپنے گھر بھجوا دیا۔

اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی جب وہ گھر واپس لوٹی۔ اس کے گھر آنے سے پہلے ہی یونین کونسل میں پیش آنے والے واقعے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی مصیبت کو گلے لگا آئی ہے جس سے چھٹکارا بہت مشکل ہے۔ وہ شام تک بھی اپنے گھر نہیں رہ سکی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی۔ وہ کل اپنا سب کچھ لے گی اور یونیورسٹی نکل جائے گی۔ پھر جب تک معاملہ حل نہیں ہو جاتا وہ وہیں رہے گی۔ وہ اپنے سلائی اسکول چلی گئی۔ اس نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسکول کا چوکیدار اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا بنوانے چلا گیا۔ اس دوران سدرہ نے وہیں سے وسیم کو فون کر کے پوچھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ وہ اس سے مل کر اگلا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتی تھی۔ وسیم شہر سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے وسیم کو وہیں اسکول میں بلا لیا تاکہ سکون سے بات کر سکے۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ وسیم نے اس سے ملنے کا وعدہ کر لیا کہ وہ شہر سے واپسی پر سیدھا اس کے پاس آ رہا ہے۔

وہ کھانا کھا چکی تھی۔ جب وہ اس کے پاس آ گیا۔ ان دونوں نے وہیں بیٹھ گئے سارے حالات کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب کرم داد اور اس کے سارے سیاسی گروپ کے ساتھ اسی زبان میں بات کی جائے گی جس زبان میں وہ بات کریں گے اگر کل شام تک انہوں نے درخواست واپس نہ لی تو وہ بھی اپنی کسی خاتون کے ذریعے درخواست دے دیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر طرح کے ردعمل کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً دس بجے کے قریب وسیم اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے گھر کو چلا گیا اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک سلائی اسکول میں آگ لگ گئی۔ آگ لگانے والوں نے پہلے چوکیدار کو قابو کیا۔ پھر اسکول میں اس طرح آگ لگائی کہ وہ آگ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سدرہ کی آنکھ کافی دیر بعد کھلی۔ اس نے شور مچایا۔ تو لوگوں کو پتہ چلا۔ وہ اُسے بچانے کے لیے دوڑے۔ سدرہ کو بچا تو لیا گیا لیکن اس کی حالت بہت بری تھی۔



میرے کزن نے ساری تفصیل بتا دی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں یہ سب کیسے پتہ؟''

''اس لیے کہ وسیم کے والد چوہدری نیاز کے ہم

وکیل ہیں۔ سدرہ کا کیس بھی ہم نے لڑا تھا۔ اور اب بھی ہمارے پاس ہی ہے۔'' میرے کزن نے کہا۔ جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے خاندان میں زیادہ وکیل ہیں۔ بڑوں نے چھوٹوں کو سکھایا اور وہ سب ایک گروپ میں کام کر رہے ہیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، سدرہ کہاں تک ٹھیک تھی، کیا اس نے یہ سب کرکے غلطی نہیں کی؟''

''ہاں آلیشبہ! اس نے بہت بڑی غلطی کی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک بے وقوف لڑکی تھی اور.....'' اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''نہیں، میں نہیں مانتی کہ وہ بے وقوف تھی۔''

''میں اسے بے وقوف ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ اس نے خواہ مخواہ یہ جنگ شروع کر دی تھی۔ حالانکہ جنگ اسی وقت لڑی جاتی ہے، جب تھوڑی بہت بھی اس کے پاس قوت ہوتی۔ اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ اس کا مقابلہ جاہل، بے غیرت اور کمینے سیاست دانوں سے ہے اور وہ ہمارے معاشرے کی ایک مجبور اور بے بس لڑکی۔ جس کے والدین بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔'' میرے کزن نے کافی حد تک جذبات سے کہا

''کیا اپنے حق کی آواز بلند کرنا جرم ہے کیا؟'' میں اس سے بحث کرتے ہوئے کہا

''دیکھو! امن صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب طاقت کا توازن ہو۔ یہ جو ہمارا سیاسی نظام ہے یہ بہت کرپٹ ہو چکا ہے۔ اب دیکھو، ہوگا کیا؟''

''کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ وہ مر جائے گی یا اگر بچ گئی تو ان کے خلاف لڑے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''جب تک اڑنے کے لیے پَر پورے نہ ہوں، اس وقت تک فضا میں اُڑان نہیں بھری جا سکتی۔ اس نے بھی ایسا کیا اور زمین پر آ رہی۔ وہ مر گئی تو اس کرپٹ سیاسی نظام کے سمندر میں ایک اور جرم یوں ڈوب جائے گا کہ اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور اگر بچ گئی تو اس کی جتنی زندگی بھی ہوگی وہ جنگ کرتے گذرے گی۔ وہ بھی وہی ہتھکنڈے اپنائے گی، جرم کی راہ پر چلے گی۔''

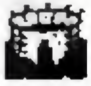
''ایسا کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل ہمارے اس کرپٹ اور بدبودار سیاسی نظام کی کوکھ سے جرم ہی پیدا ہو رہا ہے۔ اسی سیاسی نظام میں طاقت والے ظلم کر رہے ہیں اور مظلوم ظلم سہہ رہے ہیں۔ جو ظلم نہیں سہتے وہ باغی ہو جاتے ہیں اور ان کا انجام سدرہ کی طرح ہی ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا، پھر مجھ سے پوچھا۔ ''اب چلوگی؟''

''نہیں، کل چلیں گے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں رات بہت دیر تک سدرہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے یہی لگا کہ اس سڑاند مارتے ہوئے سیاسی نظام میں باصلاحیت اور حساس لوگ ویسے ہی مر جاتے ہیں۔ میں اگر سدرہ سے مل بھی لوں گی تو کیا کر پاؤں گی؟

اگلے دن صبح صبح سدرہ کے فوت ہو جانے کی خبر آ گئی۔ میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔



غیر سیاسی انٹرویو

خورشید پیرزادہ

ہمارے ملک میں کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو ہاتھوں میں ڈگریاں لیے گھومتے ہیں مگر ان کو کہیں نوکری نہیں ملتی کیونکہ ہمارے ملک کا نظام ہی خراب ہے۔ یہاں صرف اس کو نوکری ملتی ہے جس کی کوئی بڑی سفارش ہوتی ہے یا پھر وہ رشوت دینے کا اہل ہوتا ہے۔

حالات کی ستائی ایک جرنلسٹ کی کا احوال' جس نے بلا کسی اجرت اعزازی رپورٹر بننا منظور کر لیا تھا۔

سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک غیر سیاسی انٹرویو

میرا نام ہما انصاری ہے۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب میں نے جرنلزم میں ایم اے کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ حالانکہ میرے گھر والوں اور دوستوں نے کافی سمجھایا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے اس لیے اس سے گریز ہی کرو تو تمہاری ناتواں صحت کے لیے بہتر رہے گا لیکن چیونٹی کی طرح میرے بھی پر نکل آئے تھے سو میں نے لاکھ مخالفت کے باوجود یہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا کیونکہ سر امتیاز نے مجھے پڑھایا ہی اتنے اچھے طریقے سے تھا۔

چلیں جی امتحان بھی ہو گئے اور میں پاس بھی ہو گئی اور اس پاس ہونے کے زعم میں ملک کے چیدہ چیدہ نیوز چینلز پر اپنی سی وی ارسال کر دی' ارسال تو کر دی لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ اگر ایک ساتھ سارے ہی چینلز نے میری ڈیمانڈ کر دی تو میں کس چینل کو ہاں کہوں اور کس چینل کو نا۔ مگر ٹی وی چینلز نے میری یہ الجھن خود ہی ختم کر دی۔ وہ یوں کہ کسی نے میری سی وی پر دھیان ہی نہیں دیا اور ایک بار ایک چینل کے باہر کھڑے کھڑے تھک ہار کر میں ٹھیلے والے سے پکوڑے خریدے تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ میری ہی سی وی میں لپٹے ہوئے ہیں جو میں نے اس چینل میں جمع کروائی تھی۔ اس کے بعد میری عقل شریف (اس شریف کا ملک کے سیاسی اور فوجی شریفوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے) میں یہ بات آ گئی کہ پاکستان کے کسی ٹی وی چینل میں اتنا شعور نہیں ہے کہ وہ میرے جیسی ہونہار جرنلسٹ کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا سکے۔

اور جب غیر ارادی طور پر یہ بات میں نے اپنے گھر والوں کے سامنے کہی تو سب ہی میرا مذاق اڑانے لگے کہ ہم تو پہلے ہی منع کر رہے تھے کہ اس آگ میں مت کودو مگر تم مانی ہی نہیں' اب بھگتو لیکن میں بھی کہاں ہار ماننے والی تھی۔ میں نے سر امتیاز سے رجوع کیا کہ اب کیا کیا جائے' آخر کیا وجہ ہے تو انہوں نے نہایت رسانیت کے ساتھ میرے دماغ میں یہ بات بٹھائی کہ میرے پاس نہ تجربہ ہے اور نہ ہی سفارش۔ میں بولی تو سر آپ ہی کہیں سفارش کر دیں نا' انہوں نے کہا بیٹا میری سفارش بھی کسی کام نہیں آئے گی' میں حیرت سے بولی کیوں سر آپ تو جرنلزم کے اتنے بڑے استاد ہیں آپ کو کون منع کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے میرا سب سے بڑا دشمن میرا تجربہ ہے' جس کو دیکھتے ہوئے چینل میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی کرسیاں خطرے میں نظر آنے لگتی ہیں۔

میں ناکام و نامراد دل کے ساتھ گھر واپس آ گئی اور سوچنے لگی کہ اب اس ڈگری کا کیا کروں' اوپر سے بھائی بہنوں اور دوستوں کے طعنے میرے خون جلانے کے

لیے کافی تھے بلکہ یوں سمجھ لیں کہ جرنلزم کو میری چڑ بنا لیا گیا تھا۔ میں مایوسی کی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی صحافیانہ عقلمندی کو کہاں خرچ کروں۔ ایسے میں ایک دن سر امتیاز کا فون آ گیا ان کے لہجے میں ایک جوش بھرا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ ایک اخبار میں پولیٹیکل رپورٹر کی اسامی کے لیے اشتہار آیا ہے' جو انہوں نے ایک پٹھان کے ہوٹل پر چائے پینے کے دوران اخبار خراشی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور پٹھان کی نظر چوکتے ہی انہوں نے وہ اشتہار پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا کہ سر اخبار کی جاب سے کیا ہوگا' تو انہوں نے کہا کہ ارے پاگل یہ جاب نہیں ہے' اعزازی رپورٹر کی پوسٹ ہے' یعنی تمہیں تنخواہ وغیرہ نہیں ملے گی۔ میں نے حیرت سے کہا تو پھر...... وہ بولے اس سے کم از کم کئی فائدے مل سکتے ہیں۔ میں نے کہا مثلاً۔ سر نے کہا پہلا تو یہ کہ تمہیں صحافت کا عملی تجربہ ہو جائے گا' دوسرے یہ کہ تمہیں گھر پر بیٹھ کر لوگوں کی باتیں نہیں سننا پڑیں گی۔ تم مصروف ہو جاؤ گی۔ اس کے بعد تم کسی اچھی جگہ بھی اپلائی کر سکتی ہو کیونکہ تمہارے پاس تجربہ ہوگا۔

سر امتیاز کی باتیں سن کر مجھے امید کی ایک چھوٹی سی کرن نظر آئی جو کم از کم میری چھوٹی بہن کرن کی نسبت تو کہیں بہتر تھی جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے مجھے صحافی صاحبہ کہہ کر پکارتی تھی۔ حالانکہ صحافی پکارے جانے پر مجھے خوش ہونا چاہئے تھا مگر اس کے لہجے میں جو طنز بھرا ہوتا تھا وہ مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھائی کے چکر میں میں نے گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا اور مجھ سے پیاز تک نہیں کاٹی جاتی تھی۔ لیکن اب مجھے ایک راستہ نظر آیا تھا جس کے ذریعے میں ایک عملی صحافی بن سکتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی دن مذکورہ اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ دفتر کیا تھا لگتا تھا کسی کباڑ خانے کو دفتر کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ میں نے دروازے پر رک کر ہلکے ہلکے دستک دی اور کوئی جواب نہ پا کر میں ہمت کر کے اندر داخل ہوگئی۔

میں جب اندر داخل ہوئی تو صرف ایک ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا اب پتہ نہیں جل رہا تھا یا سسک رہا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں ہر جگہ اخبار کے بنڈلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً وہ اخبار تھے جو فروخت ہونے کی حسرت لے کر واپس اپنے مقام پر پہنچ گئے تھے۔

مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مچمچائی اور جب آنکھیں اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے ایک بڑے سے ڈھیر کے پیچھے کوئی انسان نما چیز نظر آئی۔ میں نے اسے ہی غنیمت جانا اور قریب پہنچ کر جھٹ سے سلام جھڑ دیا۔

آئن اسٹائن نما وہ انسان میرے سلام کی آواز سنتے ہی اس بری طرح اچھلا جیسے میں نے اس کی بغل میں بیٹھ کر خودکش جیکٹ کا ربن کھینچ لیا ہو اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہے تو ان کی جان میں کچھ جان آئی اور دوسرے ہی لمحے وہ گیدڑ سے شیر بن چکے تھے۔

''جی فرمائیے۔ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے دفتر میں داخل ہونے کا۔''

میں سٹپٹا کر بولی۔ ''سر میں نے کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو اندر آنا ہی پڑا۔''

''اوہ۔'' وہ ایک لمبی سی اوہ کر کے بولے۔ ''میں مصروف ہی اتنا رہتا ہوں کہ مجھے آس پاس کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ آخر ایک کامیاب اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔''

میں نے دوبارہ ایک نظر آفس پر اور اس میں دھرے ہوئے کامیاب اخبار کے بنڈلوں پر ڈالی۔ وہ صاحب بھی ایک کائیاں تھے۔ میرا مطلب سمجھ کر بولے۔ ''یہ بنڈل ہی اخبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' ظاہر ہے یہ سوال پوچھنا تو میرا حق بنتا

ہی تھا۔
''وہ ایسے کہ.....'' وہ صفائی دیتے ہوئے بولے۔ ''اس ملک کے عوام اور سیاست دانوں میں اتنا شعور ہی نہیں ہے کہ میرے اخبار میں لکھی ہوئی باتوں کو سمجھ سکیں۔''
''چلیں سر یہ بھی بہت ہے کہ آپ خود تو سمجھ لیتے ہیں نا۔''
''سچی بات تو یہ ہے کہ۔'' وہ ناک پر عینک جما کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کبھی کبھی میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا کہ میں نے یہ کیا لکھ دیا ہے اور کیوں شائع کر دیا ہے۔ بہرحال۔ تم بتاؤ کون سے ادارے کے لیے چندہ لینے آئی ہو۔''
''مجھے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔
انہوں نے مجھے غور سے دیکھنے کے لیے دوبارہ عینک ناک پر سیٹ کی اور مجھ سے بھی زیادہ تیز لہجے میں بولے۔ ''تو میں تم کو کیا نظر آتا ہوں۔ میں کوئی چپراسی لگ رہا ہوں جو اس دفتر کی صفائی کر رہا ہوں۔ ارے بی بی میں ہی اس اخبار کا اکلوتا اسٹاف ہوں سمجھیں۔''
''سمجھ گئی سر۔ تو آپ ہی وہ ہستی ہیں جن سے مجھے ملنا ہے۔''
''اور کس سلسلے میں ملنا ہے۔ یہ بھی بتادو۔''
''ارے سر آپ نے اشتہار دیا تھا کہ آپ کے اخبار کے لیے ایک پولیٹیکل رپورٹر کی ضرورت ہے۔''
''میں نے اشتہار دیا تھا۔'' وہ اپنے آدھے گنجے سر کو کھجاتے ہوئے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اتنی گہری سوچ میں کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں مجھے انہیں گہری سوچ میں غرق کر دینے کے الزام میں گرفتار نہ کر لیا جائے۔
پھر وہ بیٹھے بیٹھے اپنی کرسی پر اچانک یوں پھدکے کہ اگر کوئی مینڈک بھی انہیں پھدکتے ہوئے دیکھ لیتا تو یقیناً انہیں مینڈکوں کا گرو تسلیم کر لیتا۔
''ہاں یاد آیا۔'' انہوں نے اپنی یادداشت کو پکڑ کر

ایک مسلمان گھرانے کا یومیہ دستور العمل

سویرے بے دار ہونا تا کہ نمازِ فجر بر وقت ادا ہو۔ نمازِ فجر کے بعد مسنون اذکار کا معمول، تلاوتِ قرآن مجید۔ چھوٹے بچوں کو وقت پر نیند سے بے دار کرنا تا کہ وہ وضو، غسل، نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر بروقت اسکول یا مدرسہ جا سکیں۔ طلوع آفتاب کے وقت ہلکی پھلکی ورزش اور سیر کرنا تا کہ سستی دُور ہو جائے۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنا، بچے والد کے ساتھ مسجد میں جائیں اور بچیاں اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں نماز پڑھیں۔ گھر کے بزرگوں کی خدمت میں جا کر خیریت پوچھنا۔ دینی اعمال کو بخوشی بجا لانا۔ بات بات میں اللہ کی بڑائی بیان کرنا۔ گھر میں دینی کتب فضائلِ اعمال، فضائلِ صدقات، بہشتی زیور وغیرہ کی تعلیم کا اہتمام کرنا۔ بعد از عشاء جلدی سونا۔

(مرسلہ: عاطف علی.....اسلام آباد)

اپنے دماغ میں واپس لاتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ تو کئی مہینے پہلے کی بات ہے اور اب تک۔''
''اور اب تک آپ اس پوسٹ پر کسی کو رکھ چکے ہیں۔'' میں نے مایوس لہجے میں کہا۔
''ارے کہاں خاک رکھ لیا ہے۔'' انہوں نے گلا کھنکارا اور بلغم کا ایک بڑا سا گولہ ایک کونے میں داغتے ہوئے بولے۔ ''حرام ہے جو کسی نے اس اشتہار کے جواب میں جھوٹے منہ ہی اس دفتر میں جھانکا ہو۔''
یہ بات سن کہ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔
''سر ہو سکتا ہے کسی نے جھانکا ہو مگر اسے آپ نظر نہ آئے ہوں تو مایوس ہو کر چلا گیا ہو۔''
''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے میری تائید میں سر ہلایا تو ناک پر ٹکی ہوئی عینک نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ''تو تم نے اب پڑھا ہے وہ اشتہار۔''
''نہیں سر میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔''

''ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی اس ملک کی اکثریتی آبادی کی طرح ہو۔''

''نن نہیں سر۔ میں نے ایم اے جرنلزم امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔'' میں نے بڑے فخر سے کہا۔

''مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔'' وہ میرے بال کی کھال نکالتے ہوئے بولے۔

''سر وہ اشتہار میں نے نہیں میرے استاد امتیاز صاحب کے ہتھے چڑھا تھا۔''

''ہتھے۔'' ایڈیٹر صاحب ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئے۔ ''بی بی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہتھے چڑھ گیا۔ ارے ہمارا اشتہار تھا یا کوئی اشتہاری ملزم جو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔''

''وہ۔ وہ۔ میرا مطلب تھا کہ۔'' میں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میرے استاد امتیاز صاحب نے پڑھا تھا اتفاقاً شاید انہوں نے بازار سے کوئی سودا لیا تھا وہ اخبار میں بندھا چلا آیا تھا۔''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔'' وہ ٹھنڈے ہوکر کرسی پر پھیلتے ہوئے بولے۔ حالانکہ وہ بیچارے کتنا بھی پھیلتے بیکار تھا۔ اتنے مختی سے تھے کہ ایک کرسی پر ان جیسے دو ڈھائی ایڈیٹر تو آرام سے استراحت فرما سکتے تھے۔ ''تو تمہارے استاد امتیاز صاحب نے وہ اشتہار دیکھا۔ امتیاز۔ جرنلزم۔ ارے کہیں یہ وہی امتیاز تو نہیں ہے جو یونیورسٹی میں جرنلزم پڑھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔''

''جی جی سر۔ وہی ہیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں۔'' میں یہ جان کر خوش ہوگئی کہ یہ سر امتیاز کے جاننے والے ہیں اب تو میرا کام اور بھی آسان ہوجائے گا۔

''اس گدھے کو کون نہیں جانتا۔'' انہوں نے سر امتیاز کو شاندار خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔ ''میں کتنی بار اسے سمجھا چکا ہوں کہ میاں کیوں خواہ مخواہ بچے بچیوں کو جرنلزم پڑھا کر ان کا مستقبل تاریک کررہے ہو لیکن وہ بھی میری طرح ایک نمبر کا سنکی ہے اور کیوں نہ ہو آخر کو میرا چھوٹا بھائی جو ٹھہرا۔''

اس انکشاف پر میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ تو یہ ایڈیٹر صاحب اور امتیاز سر آپس میں بھائی ہیں اور صحافت کی سربلندی کے لیے ان دونوں حضرات کی اپنی اپنی جگہ پر کی گئی کوشش کو سراہتے ہوئے میری آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

''ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے۔'' انہوں نے میری آنکھوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کہا اور ان کی ڈپٹ سن کر آنسو بیچارے وہیں کے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

خیر قصہ مختصر میں نے اپنی سی وی ان کے آگے رکھ دی جو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف پھینک دی۔ ''امتیاز کا حوالہ دینے کے بعد اس سی وی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ امتیاز ہر کسی گھسیارے کو کہیں جانے کا مشورہ نہیں دیتا۔ خیر تم آگئی ہو تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ میں ہمت کررہا تھا کہ خود ہی جا کر یہ کارنامہ سرانجام دوں۔''

''کون سا کارنامہ سر۔''

''ارے بھئی آج کل ایک خاتون سیاستدان کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔''

''مثبت یا منفی؟'' میں نے سوال داغ دیا۔

''بھئی واہ۔'' انہوں نے خوش ہوکر میری پیٹھ ٹھونکی جس کے نتیجے میں میں تین ٹانگوں والے اسٹول سے اوندھے منہ گرتے گرتے بچی۔

''سر ابھی میں گر جاتی۔'' میں نے شکایتی لہجے میں انہیں ٹوکا۔

''کوئی بات نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ اور صحافت کے میدان سے زیادہ خطرناک تو جنگ کا میدان بھی نہیں ہوتا۔''

''لیکن آپ نے میری پیٹھ کسی خوشی میں ٹھونکی تھی یا ٹھرک میں۔''

''لاحول ولا۔ خوشی میں ٹھونکی تھی۔ مثبت یا منفی۔

واہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم میں صحافت کے جراثیم کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔''

''جی سر۔ حالانکہ میرے گھر والوں نے کئی قسم کے اسپرے کر کے ان جراثیموں کو مارنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن۔''

''لیکن ناکام ہی رہے۔ گڈ۔ میں تمہارے اندر مستقبل کی نہایت کامیاب صحافی کو دیکھ رہا ہوں اور وہ دن دور نہیں جب ایک آنے والا میڈیا نیٹ ورک تمہیں خرید کر مفت کی تنخواہ دیتا رہے گا تاکہ تم کچھ اور نہ لکھ سکو۔''

ایڈیٹر صاحب کے منہ سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سن سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تعریف کا یہ نشہ مجھے ہوا میں نہ اڑا دے۔

''مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صحافیوں میں سے نہیں ہو۔ اب تم جلدی سے تیاری پکڑ لو میں کل ہی ٹائم لے کر تمہیں ان خاتون کے پاس انٹرویو کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے کانوں کو جھاڑا مگر وہ صاف تھے۔

ایڈیٹر صاحب اس بار پھر سمجھ گئے۔ ''تم بالکل ٹھیک سن رہی ہو لڑکی۔ تم کل ہی اس انٹرویو کے لیے روانہ ہو رہی ہو اور صاف گوئی سے یہ بھی بتا دوں کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ۔''

''ورنہ......''

''ورنہ میں نے کہا تھا کہ مجھے خود ہی انٹرویو کرنا پڑتا اور میں عورتوں سے بات کرتے ہوئے بہت نروس سا ہو جاتا ہوں۔''

''مگر سر آپ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے تو ذرا بھی نروس نہیں ہوئے۔''

''سوری۔ میں سیاسی عورتیں کہنا چاہتا تھا۔ اور تم تو صحافتی عورت۔ نہیں بلکہ لڑکی ہو۔ چلو جاؤ سوالات کی تیاری کرو اور کل صبح ٹھیک تین بجے انٹرویو کے لیے روانہ ہونا ہے۔''

''جی۔ صبح تین بجے؟'' میں حیرت سے بولی۔

''ارے ان سیاست دانوں اور شوبز والوں کی صبح ہی سہ پہر تین بجے ہوتی ہے۔ نئی ہو آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جاؤ گی۔''

''بہت بہت مہربانی سر۔ اچھا اب میں جاؤں۔''

''ارے ایسے کیسے جاؤں۔ چائے پانی کے بغیر کیسے جانے دیں۔''

''نہیں سر۔ رہنے دیں۔ پھر کبھی سہی۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''ایسے کیسے جانے دیں۔ طلب تو ابھی ہو رہی ہے۔ شاباش اٹھو اور وہاں کونے میں چولہے پر پتیلی رکھی ہے اس میں چائے بنا لو۔ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔ شاباش۔''

اور یہ میری عملی زندگی کا پہلا کام تھا۔

......☆☆☆......

خیر جی میں نے ساری رات سوالات بنانے میں کالی کر دی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ بس ایک دھن سوار تھی اور یہ میرا پہلا عملی امتحان جس میں، میں پوری طرح سے کامیاب ہونا چاہتی تھی۔ اس کے لیے میں نے سر امتیاز سے بھی مدد لی اور وہ بھی فون پر مجھے کئی نقطے سمجھاتے رہے۔

اور دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ اب میری سمجھ آیا کہ مصروف لوگوں کی صبح اتنی دیر سے کیوں ہوتی ہے اور لاشعوری طور پر مجھے یہ سوچ کر بھی خوشی مل رہی تھی کہ اب میں بھی مصروف ہو گئی ہوں۔

میں الٹا سیدھا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھا کر بھاگم بھاگ سی این جی رکشہ میں بیٹھ کر اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ اندر داخل ہوئی تو ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب بھی براجمان تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو۔ ایڈیٹر صاحب بولے۔ ''ارے بھئی یہ اپنے شمسی

صاحب ہیں۔ اس فیلڈ کے نہایت مشہور فوٹو گرافر۔ یہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ تم انٹرویو کرو گی اور یہ فوٹو کھینچیں گے۔''

شمسی صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ وہ اونٹ کی طرح جگالی کرتے ہوئے گٹکا چبا رہے تھے۔ انہوں نے نہایت بے دردی سے گٹکے کی پیک ایک بنڈل پر اچھالی۔ میں نے چونک کر ایڈیٹر صاحب کی طرف دیکھا مگر انہوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تو میں سمجھ گئی کہ یہ مفتے کا فوٹو گرافر ہے اس لیے اس کی ہر بدتمیزی روا ہے۔

''وہ۔ ان خاتون کو انٹرویو کے لیے انہوں نے راضی کیا ہے۔ یہ ان کے کئی فوٹو سیشن کر چکے ہیں۔ سمجھ رہی ہو، نا۔''

میں نے نہ سمجھتے ہوئے بھی ہاں میں گردن ہلائی اور رات بھر کی محنت کے بعد ترتیب دیا گیا سوال نامہ ایڈیٹر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے ایک دو جگہ ایڈیٹنگ کی اور او کے کہہ کر سوالنامہ میرے حوالے اور مجھے شمسی صاحب کے حوالے کر دیا۔

ہم دونوں دفتر سے اتر کر باہر سڑک پر آئے تو شمسی صاحب نے بڑے رعب سے ایک رکشہ کو آواز دے کر روک لیا۔ چالیس منٹ کی مسافت کے بعد شمسی صاحب نے رکشہ کو ڈیفنس میں واقع ایک بنگلے کے سامنے روک لیا۔ جیسے ہی رکشہ رکا شمسی صاحب اتر بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

''شمسی صاحب کرایہ۔'' میں نے ان کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر پلٹے بولے۔ ''ہاں ہاں تم ہی دے دو۔ میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔''

میری تو جان ہی جل گئی۔ مگر کیا کرتی پیسے دے کر رکشے والے کو فارغ کیا اور شمسی صاحب کے پیچھے لپکی۔ اتنی دیر میں وہ گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا جس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اکثر یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

چوکیدار نے انٹر کام پر اندر اطلاع کی اور ایک ملازمہ نے ہمیں ریسیو کرتے ہوئے ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا۔ میں وہاں کی آرائش دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی اور شمسی میری مرعوبیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے مالکن کے آنے کی اطلاع دی تو شمسی کے اشارے پر میں بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ بہت ہی شاندار عورت تھی' مہنگا ترین لباس' دو کلو سے زیادہ میک اپ' زیورات سے لدی پھندی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور کچھ بولے بغیر ہی شمسی نے اپنے بیگ سے کیمرہ نکالا اور دھڑا دھڑ مختلف انداز میں ان کی تصاویر کھینچنے لگا۔ میں خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ صحافت کا یہ روپ میرے لیے بہت ہی انوکھا تھا اور ابھی تو مجھے نہ جانے اور کتنے روپ دیکھنے تھے۔

تقریباً چھ رول کی فوٹو گرافی کے بعد خاتون کے چہرے پر تھکن نمودار ہونے لگی تو شمسی رک گیا۔ ملازمہ نے فوراً ناشتہ میز پر لگا دیا اور جب تک میں نے ایک سموسہ ختم کیا شمسی پوری پلیٹ کے ساتھ انصاف کر چکا تھا۔

''اچھا بیگم صاحب۔ میں یہ تصویریں تیار کر کے کل تک پہنچا دوں گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ اور یاد سے اپنا چیک بھی لیتے جانا اور ہاں یہ تصویریں سارے اخباروں اور رسالوں میں لگ جانی چاہیں۔''

''ارے بیگم صاحبہ کیوں نہیں لگیں گی۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا۔''

بیگم صاحبہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو وہ فوراً بولا۔ ''یہ بھی اخبار سے ہیں۔ یہ جو مانگتی ہیں آپ دے دینا مجھے اجازت دیں۔''

یہ کہہ کر شمسی تو اپنا بیگ اٹھا کر چلتا بنا اب بیگم صاحبہ

اور میں دن ٹو ون آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

''ہاں تو آپ کیا لینے آئی ہیں؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''آپ کا انٹرویو۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ شروع کرو۔''

میں نے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر بیچ میں میز پر رکھ دیا۔

''السلام علیکم۔'' لیکن بیگم صاحبہ خاموش ہی رہیں۔ ''میں نے آپ کو سلام کیا ہے۔ کم از کم اس کا جواب تو دے دیں۔''

''میں نے آج تک کسی کو کچھ دینا سیکھا ہی نہیں ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ یہ انٹرویو اسی طرح شروع ہوگا۔ اس لیے میں بھی اسٹارٹ ہوگئی۔

''تو آپ نے کیا سیکھا ہے؟''

''سیاست کرنا۔''

میں نے تپ کر کہا۔ ''فی الحال تو آپ میرے ساتھ سیاست کرنا بند کریں اور سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کے جواب دیں۔''

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ صوفے پر مردے کی طرح اکڑ کر بیٹھ گئیں اور سمع خراش لہجے میں بولیں۔ ''ابھی موبائل پر بیل ماروں گی۔ اور میرے گارڈز تمہیں اٹھا کر ایسی نجی جیل میں لے جائیں گے۔ جسے ابھی تک امریکا نے بھی دریافت نہیں کیا ہے۔''

''میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے کہ آپ انتہا پسندی پر اتر آئی ہیں۔'' میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔

''میں جب تمہیں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے کچھ لینے کی امید مت رکھنا۔ تو بار بار کہے جا رہی ہو کہ سوالوں کے جواب دیں۔ کیسے دے دوں۔ اپنی روایت توڑ دوں تمہارے لیے۔''

''مگر بیگم صاحبہ یہ تو انٹرویو ہے۔ اس سے تو آپ کی واہ واہ میں اور اضافہ ہوگا۔'' میں نے اپنے پٹارے میں سے مکھن نکال کر لگاتے ہوئے کہا۔

کیا سچ کہہ رہی ہو۔ کہیں تم مجھ سے وہ والا کھیل تو نہیں کھیل رہیں۔ جو ہم نے ایل ایف او کے نام پر کھیلا تھا۔'' وہ خوش ہو کر گومگوں کی کیفیت میں بولیں۔

''مجھے سیاست سے سخت چڑ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اب میں مطمئن ہوں۔ تم پکی جرنلسٹ لگتی ہو۔ ویسے یہ انٹرویو کون کون پڑھے گا۔'' وہ صوفے پر کشن کے سہارے پھیلتے ہوئے بولیں۔

''وہ سب۔ جنہیں آپ پڑھوانا چاہتی ہیں۔ عوام وغیرہ۔'' میں نے اپنے تئیں بہت بڑھیا بات کہی۔

''ارے عوام کو تو مارو گولی۔ وہ اخبار میں یہ انٹرویو دیکھے نہ دیکھے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اور تمہاری صحت پر تو بالکل ہی نہیں پڑنا چاہیے۔ بس وہ ضرور دیکھیں جن کے دیکھے سے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہیں دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں انہیں تو ہم کئی اعزازی کاپیاں بھجوا دیں گے۔''

''یہ ہوئی نا بات۔ انٹرویو بھی تو ایسا ہونا چاہیے جس سے سیاسی قد میں اضافہ ہو نہ ہو۔ بڑے صاحب کے سامنے اپنے نمبروں میں اضافہ ضرور ہونا چاہیے۔''

''سب سے پہلے تو آپ اپنا تعارف کروائیے۔'' میں انٹرویو کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

وہ تپ کر بولیں۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا ہیں۔ میں اتنی مشہور سیاست دان ہوں ملک کا بچہ بچہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔''

''مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ سب تمہیں کیوں جانتے ہیں۔ لیکن یہ تو انٹرویو کا اصول ہے۔ آخر آپ کو اپنے بارے میں بتانے پر کیا اعتراض ہے۔''

''مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ ویسے پروگرام کی حد تک بتا دیتی ہوں کہ نام تو میرے دادا ابا نے کچھ اور رکھا تھا۔'' وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولیں۔

''کہاں رکھا تھا۔ کہیں رکھ کر بھول گئے تھے یا۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے مذاق اچھا نہیں لگتا ہاں اور کسی صحافی کا تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے تو تم سب زہر لگتے ہو۔''

''اور یہ زہر پینا بھی کسی کسی کا کام ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا ایک اور تیر چلایا۔ ''ہاں تو تم بتا رہیں تھیں کہ تمہارا نام کہیں کھو گیا تھا۔'' میں ان کے ساتھ تو تڑاک سے اس لیے بات کر رہی تھی کہ میں سمجھ چکی تھی کہ یہ بندی یہی زبان زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ اگر میں نصابی گفتگو شروع کر دیتی تو پھر مجھے ہر سوال کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی بیان کرنی پڑتی۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ نام کھو دیا تھا۔ بہت زیادہ بول رہی ہو تم۔''

''بولنے کے ہی تو پیسے ملتے ہیں۔ اگر خاموش بیٹھی رہوں گی تو اخبار والے مجھے بھگا کے کسی اور کو لا بٹھائیں گے۔'' ایک اور صاف گوئی۔

''تم جیسی صحافی جو ہوتی ہیں نا۔ وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی اخبار یا چینل کی محتاج رہتی ہیں۔ ہمیں دیکھو ہم بیک ڈور چینل سے بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں۔''

''نام تو وہیں رہ گیا۔'' میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

وہ چڑ کر بولیں...... ''تو اٹھا لے۔ ارے تجھے بڑی فکر لگی ہوئی ہے میرے نام کی۔ اتنی تو مجھے خود بھی نہیں ہوتی۔''

''میں ان ناموں کی بات نہیں کر رہی ہوں جو عوام نے مختلف دور میں آپ کو دیئے ہیں۔ میں تو ذاتی نام کی بات کر رہی ہوں۔'' میں بھی ان سے پیچھے رہنے والی نہیں تھی۔ اور یہ سب سر امتیاز کا پڑھایا سکھایا ہوا سبق تھا کہ صحافی کو کسی سے دب کر بات نہیں کرنی چاہیئے۔

''وہی تو بتانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنی دیر سے۔ مگر تمہاری زبان تو اتنی پٹر پٹر چل رہی ہے کہ مجھے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہو تم۔ حالانکہ ہم تو سیاست میں بھی کبھی کبھار دوسری پارٹیوں کو بولنے کا موقع دے ہی دیتے ہیں۔''

''چلو اب میں بھی تم کو موقع دے رہی ہوں۔'' میں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرا نام تو کچھ اور تھا لیکن ابا حضور نے مجھے لکی بیگم کا لقب دیا تھا۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''جس دن میں پیدا ہوئی تھی نا اسی دن الیکشن تھے اور ابا حضور بڑی اکثریت سے وہ الیکشن جیت گئے تھے۔''

''تو انہوں نے سوچا کہ تم ان کے لیے لکی ثابت ہوئی ہو۔''

''بالکل یہی بات تھی۔''

''کاش عوام کے لیے بھی ثابت ہوتیں۔'' میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیوں میں نے عوام کے کون سے کان کتر لیے ہیں جو تمہیں عوام کی اتنی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میں ایک بات صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ میرے سامنے یہ عوام شوام کا ناٹک مت کرنا۔ جو پوچھنا ہے میرے بارے میں ہی پوچھنا۔''

''مگر آپ کو عوام سے اتنی چڑ کیوں ہے؟'' میں نے انہیں کریدتے ہوئے پوچھا۔

''سیاستدان جو ٹھہری۔''

''مگر یہ عوام ہی تو ہیں جو لائنوں میں لگ کر تمہیں ووٹ دیتے ہیں۔''

''اے لو۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہمیں عوام ووٹ دیتے ہیں۔'' انہوں نے بلند آواز قہقہہ لگا کر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو بچپن سے یہی دیکھا ہے۔''

''اے تم تو بہت پرانی ہے۔ یہ تو شاید پچھلی صدی کی بات ہے۔ بی بی اپنے بچپن کو بھول جاؤ اور بڑی ہو کر جوانی کی طرف آ جاؤ۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''میں پرانی ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن اس کا ووٹ سے کیا تعلق۔''

''ارے بھئی یہ بہت پہلے ہوتا تھا کہ عوام ووٹ دیتے تھے اور سیاستدان ووٹ لیتا تھا۔'' انہوں نے میری ناقص معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو اب الیکشن میں کیا ہوتا ہے۔''

''بڑی بھولی بنتی ہو تم۔ بچپن کے الیکشن تو یاد ہیں تمہیں لیکن آج کل کے الیکشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔'' وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔

''آج کل جو سیاست چل رہی ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے میں نے ووٹ دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''اور ہم نے تمہارے ووٹوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح تم مان رہی ہو نا کہ آج کل تم یعنی عوام ووٹ دینے نہیں آتے۔'' ان کے لہجے میں عجیب سا فخر تھا۔

''لیکن جب نتیجہ آتا ہے تو ہزاروں ووٹ نکل آتے ہیں۔ یہ کیا جادوگری ہے۔''

''یہ وہ جادوگری ہے جو پہلے صرف یہیں چلتی تھی۔ اب پچھلے الیکشنوں میں ہم نے امریکہ بھی ایکسپورٹ کر دی ہے۔ بیچارہ الگور میامی میں اپنے ووٹ ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔'' وہ ایک بار پھر سامری کی طرح قہقہہ لگا کر بولی۔

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ بش نے بھی تمہارے نقش قدم پر چل کر کامیابی حاصل کی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''ارے کیوں نہ کرتا۔ آخر اسے ہماری حمایت چاہیے تھی یا نہیں۔''

''تو ثابت ہوا کہ آپ سیاست دان ہیں۔''

''نہیں میں گھروں میں کام کرنے والی ماسی ہوں۔'' وہ ایک بار پھر چڑ کر بولی۔

''مگر میں تو سیاست دان سمجھ کر تمہارا انٹرویو کر رہی ہوں۔''

''ارے تم کو صحافی کس گھامڑ نے بنایا ہے۔ جب جانتی ہو کہ میں سیاست دان ہوں تو ایسے بے وقوفانہ سوالات کر کے لوگوں پر اپنا آئی کیو کیوں ظاہر کر رہی ہو۔''

''اس میں آئی کیو والی بات کہاں سے آ گئی۔ میں تو لوگوں کو ریمائنڈ کروا رہی تھی۔'' میں اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ جو تمہارے عوام ہیں نا۔ یہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی سیاستدان ہوں۔ اور جو نہیں جانتے وہ بھی جان لیں۔'' وہ پر تفخر سے بولی۔

''آپ ایک صحافی کے سامنے بیٹھ کر عوام کو تڑی نہیں لگا سکتیں۔'' میں نے عوام کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو اسمبلی میں بیٹھ کر اپوزیشن کو بھی تڑیاں لگاتی ہوں۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔'' اس نے نہایت حقارت سے میری طرف دیکھا۔

''اچھا اب بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔''

''میں خود بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوں۔ اس لیے جو بات بھی کرنا۔ پہلے تولنا پھر بولنا۔'' وہ مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''تب تک تو انٹرویو کا وقت ہی ختم ہو جائے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہماری اسمبلیوں کا وقت بھی تو کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔''

''میں بات شروع کرتی ہوں۔''

''تو کرتی رہو۔ مجھے کیا۔'' وہ بدتمیزی سے بولی۔

''عجیب بدتمیز عورت ہو تم۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''اے خبردار مجھے عورت مت کہنا۔ میں سیاستدان ہوں سمجھیں۔ تم ہم جنس ہونے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ اور رہ گئی تمیز تو تم جیسی غریب صحافی اس قابل ہی نہیں ہوتیں کہ ان سے تمیز سے بات کی جائے۔ میں بھی کبھی کبھی کوئی اخبار یا چینل دیکھ لیتی ہوں۔ اور ایک چینل والوں نے تو مجھ سے بھی بڑا بدتمیز لا بٹھایا ہے۔ ہم سیاستدانوں سے ایسے اکھڑ لہجے میں بات کرتا ہے کہ اگر کیمرہ سامنے نہ ہو تو اس کے دانت نکال کر اپنے کھیتوں میں گڑوا دوں۔'' اس کا غصہ

ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔
میں ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ "سمجھ گئی۔ تو تمہاری باتوں سے کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم جدی پشتی سیاست دان ہو۔"
"صرف میں ہی کیا۔ اس ملک میں جتنے بھی ہیں سب ہی جدی پشتی ہیں۔ نئے نویلے کو تو ہم اسمبلی کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ بس اس بار پتہ نہیں کیسے چوک ہوگئی کہ ایک نیا سیاستدان بھی انٹر ہوگیا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگتا جارہا ہے۔"
"اب ذرا تم اپنے خاندان کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"
"تم سے پہلے بھی کئی صحافیوں نے ہمارے خاندان کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور آج وہ سب انڈر گراؤنڈ ہو چکے ہیں۔"
"کہاں؟"
"یہ تو ان کی روحوں کو بھی پتہ نہیں ہوگا۔" وہ ہنس کر بولی۔
"تم نے کتنی بار الیکشن میں حصہ لیا ہے۔" میں نے سوال کیا۔
"جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اور اب تک تو گنتی بھی بھول گئی ہوں۔"
"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آپ ہر بار جیتی ہی آرہی ہیں۔" مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔
"ابھی تک ہمارے حلقے کی کسی مائی نے وہ لعل ہی پیدا نہیں کیا جو مجھے ہرا سکے۔" وہ گردن اکڑا کر بولی۔
"حالانکہ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ ہر بار جیتنے کے باوجود آپ نے اپنے حلقے میں ایک بھی ترقیاتی کام نہیں کروایا۔" میں اپنی حاصل کردہ معلومات کے مطابق سوال کرتے ہوئے کہا۔
"تو کیوں کرواؤں۔"
"اس لیے کہ آپ اس حلقے کی نمائندہ ہیں۔"
"اول تو میں جن کی نمائندہ ہوں انہی کے لیے کام کرتی ہوں۔ ویسے تم کو ایک راز کی بات بتاؤں۔" وہ رازداری سے بولی۔
"سٹے کا نمبر تو نہیں ہے۔"
"ایک تو جس کو دیکھو سٹے بازی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ سب نے ہماری نقل کرنا ضروری سمجھ لیا ہے۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔
"آپ سٹے کو بھی چھوڑیں اور بازی کو بھی۔ راز کی بات بتائیں۔ مجھے سسپنس ہونے لگا ہے۔"
"تو مجھے اس سے کیا کہ تمہیں کیا ہونے لگا ہے۔" وہ پھر بدتمیزی پر اتر آئی۔
"چلیں آپ وہ بات تو بتا دیں جو بتانا چاہ رہی ہیں۔"
"راز کی بات یہ ہے کہ سیاست دان وہ واحد مخلوق ہوتی ہے جس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں ہے آج کل کے دور میں۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔
"نہیں۔ نہیں۔"
"ہاں۔ ہاں۔ تو کیا میں تم کو جھوٹی لگتی ہوں۔"
"میں نے کب کہا۔ آپ خود ہی خود کو سیاست دان بول رہی ہیں۔" میں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔
"میں سیاست دان ہوں کسی اور ٹائپ کی۔"
"یہ تو مجھے آج پتہ لگا ہے کہ سیاست دانوں کا بھی کوئی ٹائپ ہوتا ہے۔ ویسے تم کون سی کورٹ کے باہر ٹائپ کرتی تھیں۔"
"دیکھو کورٹ کی باتیں یہاں رہنے دو۔ ویسے بھی اب بڑی مشکلوں سے کالے کوٹ والی ریلیوں سے جان چھوٹی ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔
"پھر تو تم کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ ملک کی اٹھانوے فیصد آبادی بھی تم سے تنگ ہے۔" میں نے ایک اور وار کیا۔ اور یہ وار اداکار شان کی فلم وار کے علاوہ تھا۔
وہ غصے سے تلملا اٹھی۔ "میرے ساتھ مسخری کرتی ہے۔ تم کو پتہ ہے کہ ایک سیاست دان سے اور خاص

طور سے اس سیاست دان سے جو چوہدرانی بھی ہو، مسخری کرنا کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔"

"یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ آپ تاوان کے لیے بہت بھاری رقم وصول کرتی ہیں۔" میں نے ایک اور چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ادھر ادھر کی باتیں لے بیٹھی ہو تم۔ جس مقصد کے لیے بلایا ہے وہ بات کیوں نہیں کرتیں۔" اس سوال سے وہ کچھ ہڑبڑا سی گئی تھی۔

"تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم کو یہ خیال کب آیا کہ تم بھی سیاست دان بن سکتی ہو۔"

"لگتا ہے تم کو ہمارے خاندان کی ہسٹری کا پتہ نہیں ہے۔" وہ پھر اکڑ کر بولی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی ہسٹری شیٹر کو نہیں جانتی۔"

"کتنی بار بول چکی ہوں اور تم خود بھی اعتراف کر چکی ہو کہ ہم لوگ جدی پشتی، خاندانی سیاست دان ہیں۔" وہ میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی بہت ہی احمقانہ سوال کر دیا ہو۔

"آپ کا دادا تو وڈیرا یا چوہدری تھا۔"

"ہر وڈیرا اور چوہدری سیاست دان بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ سیاست سے کام نہیں لے تو پھر علاقے میں اپنا ٹھکا کیسے بٹھائے گا۔" اس نے چوہدراہٹ کا ایک زریں اصول بتاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ تم ہر حکومت میں شامل رہتی ہو۔" میں نے اگلا سوال دیکھ کر کیا۔

"تو اس میں کیا برائی ہے۔" ظاہر ہے ان کو اس میں کیا برائی نظر آتی۔

"آخر انسان کا ضمیر بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔" میں نے اس کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ضمیر کو تو ہم نے کاروکاری کر کے کبھی کا دفن کر دیا ہے۔"

"اور یہ بھی ہے کہ تم نے تقریباً ہر وزارت کے دفتر کا مزا چکھا ہے۔" میں نے سر امتیاز کی دی ہوئی معلومات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بس کیا کروں۔ تھوڑی چٹوری ٹائپ بھی ہوں نا۔" وہ مسکرا کر بولی اور اس کی مسکراہٹ میں بھی بلا کا زہر بھرا ہوا تھا۔

"تم وزیر تعلیم بنیں۔ لیکن تم نے اپنے علاقے میں ایک اسکول تک نہیں کھولا۔" اور یہ بھی میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ ایک وزیر تعلیم نے اپنے حلقے میں کوئی اسکول نہیں کھولا تھا۔ پھر ایسے انسان کو وزیر تعلیم ہونے کا کیا فائدہ۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ "کون کہتا ہے کہ میں نے اسکول نہیں کھولا۔ ایک نہیں چار چار اسکول کھولے۔"

"اور اب ان چاروں اسکولوں میں آپ کی گائے

دل سے نکلے ہیں لفظ

✦ رشتے کا تقاضہ اس بات میں نہیں کہ کوئی تمہیں مکمل کر دے لیکن کوئی تو ایسا ہونا چاہیے جس کے ساتھ تم اپنے ادھورے پن کو بانٹ سکو۔

✦ پریشانیاں چھوٹے پتھروں کی طرح ہوتی ہیں اگر تم اسے اپنی آنکھوں کے قریب رکھو گے تو یہ تمہاری بینائی کو چھپا دیں گی لیکن اگر تم اسے فاصلے پر رکھو گے تو تم دیکھ سکو گے کہ یہ کتنی چھوٹی ہیں۔

✦ کسی کے برا کہہ دینے سے نہ ہم برے ہو جاتے ہیں نہ وہ اچھے' ہر شخص اپنی زبان سے اپنا ظرف دکھاتا ہے نہ کہ دوسرے کا عکس۔

✦ انسان تب سمجھ دار نہیں ہوتا جب وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگے بلکہ تب سمجھ دار ہوتا ہے جب وہ چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھنے لگے۔

حسن اختر ..... اسلام آباد

بھینس بندھی ہوتی ہیں۔"
"بہت نا سمجھ ہو تم۔ اسی لیے تو صرف صحافی ہو۔ ورنہ ہماری طرح وی وی آئی پی نہ ہوتیں۔" وہ مجھے ہمدردانہ نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔
"تم اسکولوں کی بات کرو۔"
"سرکاری عمارتیں تھیں۔ سرکار کا پیسہ خرچ ہوا تھا۔ اب کوئی پڑھنے ہی نہیں آتا تھا تو مجبوری میں عمارت کا کوئی تو استعمال کرنا تھا نا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔
"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے اس اسکول کو آباد ہی نہیں ہونے دیا۔" یہ معلومات بھی مجھے سر امتیاز نے فراہم کی تھی۔
"اے میرے سے اس لہجے میں بات مت کرنا۔ ورنہ باہر میرے بیس گارڈ کھڑے ہیں۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہارا وزن تو ان کے لیے کچھ نہیں ہے اٹھانے کے لیے۔"
"پھر تم وزیر صحت بنیں۔ لیکن تم نے صحت کے لیے کچھ نہیں کیا۔" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں کیا۔ یہ دیکھو میری صحت تم کو کہاں سے خراب نظر آ رہی ہے۔" وہ باقاعدہ اٹھ کر کیٹ واک کے انداز میں چلتے ہوئے بولی۔
"میں عوام کی بات کر رہی ہوں۔"
"دراصل مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ میں عوام کے لیے وزیر بنی ہوں۔" اس کے لہجے میں معصومیت اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ دل چاہا کہ اسے یہیں کوٹ کر رکھ دوں۔
"اور یہ بھی ہے کہ تم چند مخصوص اسپتالوں کا ہی دورہ کرتی تھیں۔"
"مخصوص ہی سہی۔ اسپتالوں کا دورہ تو کرتی تھی نا۔ تم عوام تو کسی حال میں خوش ہی نہیں رہتے ہو۔"
"تم بھی عجیب ہو........"
"میں عجیب ضرور ہوں۔ لیکن غریب نہیں ہوں۔"
"لیکن ہر الیکشن میں تو تم غریبوں کے حقوق کی بات کرتی ہو۔" میں اندر سے کھول رہی تھی لیکن مجھے اپنی کھولاہٹ پر قابو رکھنا تھا ورنہ اس بدتمیز عورت سے کوئی بعید نہیں تھا کہ میرے بدن کے تمام اسپیئر پارٹس کھلوا کر رکھ دیتی۔
"تو بات کرنا کوئی جرم ہے کیا۔ وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولی۔
"میں بات کر رہی تھی غریبوں کی۔ ان غریبوں کو حقوق تو کبھی نہیں ملتے۔"
"ان کو حقوق ملیں نہ ملیں، ہم کو تو وزارت مل جاتی ہے نا۔"
"مطلب عوام کو صرف لارے لپے ملتے ہیں۔"
"ایک غریب کے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہم خود اس کے پاس ووٹ مانگنے جاتے ہیں۔" وہ ایسے لہجے میں بولی جیسے اس کا پاؤں کسی گند پر پڑ گیا ہو۔
"بڑی بات ہے ورنہ تم تو اٹھ کر خود سے پانی بھی نہیں پیتیں۔" میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔
"یہ تم نے ایسے ہی بات کی ہے یا مجھ پر طنز کیا ہے؟"
"میری کیا مجال جو آپ پر طنز کروں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ باہر تمہارے بیس گارڈ کھڑے ہیں۔ جن کے لیے میرے جیسا وزن اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"
"بندی تم سیانی معلوم ہوتی ہو۔" وہ مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"بندی اور سیانی سمجھنے کا شکریہ۔ اچھا یہ کیوں مشہور ہے کہ ہر وڈیرا اور چوہدری ظالم ہوتا ہے؟"
"یہ سب وڈیرا دشمن لابی کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ ہم تو بابا ہر کسی کے ساتھ انصاف سے پیش آتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دور دور سے ہمارے پاس جرگہ کرانے آتے ہیں۔" یہ جرگہ اس جرگے کے علاوہ تھا جو ایک نیوز چینل پر ہفتے وار پیش کیا جاتا ہے۔
"کوئی ایسا انصاف جو تم کو آج تک یاد رہ گیا ہو۔"

''ایسے تو بہت سے ہیں لیکن میں تم کو ایک واقعہ بتاتی ہوں۔ ایک بار ہمارا جرگے میں ایک کیس آیا۔ جس میں ایک کھیت کے دو دعویدار تھے۔'' وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔

''پھر تم نے کیا انصاف کیا؟''

''میں نے کہا بابا یہ تو خون خرابہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کا ایک ہی حل ہے۔ یہ کھیت نہ تیرا نہ اس کا۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔''

''واہ قربان جاؤں تمہارے انصاف پر۔''

''جاؤ۔ ضرور قربان جاؤ اور جو نہیں ہوتا اسے ہم خود قربان کر دیتے ہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو سب سے زیادہ مزا کس وزارت میں آیا۔''

''وزارت اطلاعات ونشریات میں۔''

''مگر یہ تو شاید وہ واحد وزارت ہے جو تم کو آج تک نہیں ملی۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اسی لیے تو مزا آیا۔ مجھے دوسرے کی وزارت میں ٹانگ اڑانے میں بہت مزا آتا تھا۔ بہت ناٹی ہوں میں۔''

''وہ تو لگ ہی رہی ہیں۔''

''بہت مستیاں کرتی رہتی ہوں۔ وزیر اطلاعات ابھی اطلاع کو نشر بھی نہیں کرتا تھا اور میں سب کو بتا دیتی تھی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

''اور اس کا انجام کیا ہوا۔''

''سنا ہے کہ آج کل وہ بیچارہ ریلوے انجن کے ساتھ سر ٹکرانے کے بعد دیوار سے سر ٹکرا رہا ہے۔''

''اچھا۔ تم مجھے کوئی ایک مثال دو کہ تم نے وزیر بننے کے بعد کیا بنایا۔'' مجھے اس کی باتیں سن سن کر بدہضمی ہو رہی تھی۔

''کیوں نہیں بنایا۔ بہت مال بنایا۔ تم پہلے بتاتیں تو بینک اسٹیٹمنٹ ساتھ لے آتی۔''

''آج کل تم اپنی عادت کے مطابق ایک بار پھر سرکاری پارٹی میں شامل ہو لیکن کوئی وزارت نہیں لی۔ کیوں؟'' میری حیرت حقیقی تھی۔

''بس چھوٹے بھائی کی ضد کے آگے مجبور ہوگئی۔ میں نے بھی کہا چلو بچے اس دفعہ تم عیش کرلو۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''میں نے ایک چینل پر تمہارا انٹرویو دیکھا تھا۔ جس میں تم نے بڑی مزے مزے کی باتیں کی تھیں۔''

حالانکہ حرام ہے جو میں نے وہ انٹرویو دیکھا ہو۔ بس سر امتیاز نے ہی بتایا تھا اس کے بارے میں۔

''چماٹ مار کے دانت باہر نکال دوں گی۔ میں تم کو جوکر لگتی ہوں کیا جو مزے مزے کی بات کرتی ہوں۔'' اسے پھر غصہ آ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ غصہ اس کی ناک پر دھرا ہوا ہے۔

''مم میرا مطلب ہے بہت اچھی اچھی باتیں کی تھیں۔''

''حیرت ہے میں بھی اچھی بات کر لیتی ہوں۔ خیر ہے خیر ہے۔'' اس بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔

''بچپن میں آپ کے کیا شوق تھے؟''

''کودنا۔ چھلانگیں مارنا۔ اسے ٹھی سے اسے ٹھی پر۔ اسے ٹھی سے اسے ٹھی پر۔'' وہ بچپن کو یاد کر کے خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''یعنی تم کو ٹھے ٹپتی تھیں۔''

''نہیں۔ اس وقت تک ہم کوٹھی میں آ گئے تھے۔'' وہ رسانیت کے ساتھ بولی۔

''تو بڑے ہونے کے بعد تم نے یہ شوق چھوڑ دیا۔''

''لو بچپن کے شوق بھی ختم ہوتے ہیں کیا۔''

''یعنی یہ شغل آج تک چل رہا ہے۔''

''ہاں۔ لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ۔ پہلے میں کوٹھیاں ٹاپا کرتی تھی۔ اب ہوائی جہاز سے ٹاپتی ہوں۔'' وہ ہوائی جہاز کا اشارہ کرتے ہوئے بولی تاکہ مجھے سمجھا جائے کہ ہوائی جہاز کسے کہتے ہیں۔

''بغیر پیراشوٹ کے؟''

''میں جانتی ہوں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہاری تو یہ دلی خواہش ہے کہ میں کسی دن پیراشوٹ پہنے بغیر

ہی کود جاؤں۔ لیکن میں تمہیں اور تمہارے عوام کو بتائے دیتی ہوں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے تم لوگوں کے سینے پر مونگ دلتی رہوں گی۔'' وہ باقاعدہ دلنے کا اسٹائل کرتے ہوئے بولی۔

''اب تو مونگ بھی بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ غریب آدمی کی پہنچ سے دور۔''

''اچھا ہی ہوا۔''

''تم کیوں نہیں چاہتیں کہ غریب بھی سکھی ہو۔ پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت آرام کی زندگی گزارے۔'' میرے لہجے میں غریبوں کے ہمدردی ہی ہمدردی بھری ہوئی تھی۔

''ارے اگر ہم نے ان کے لیے یہ سب کرلیا ناتو یہ جو زبردستی کے ہمارے جلسوں میں آجاتے ہیں۔ ہم اس سے بھی محروم ہوجائیں گے۔ اس لیے جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔'' اس نے پھر میری معلومات میں اضافہ کیا۔

''مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ غریبوں کی یہ حالت دیکھ کر۔''

''ظاہر ہے۔ ایک غریب کو ہی غریب کی حالت پر دکھ ہوتا ہے۔'' وہ مجھے اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے بولی۔

''تم نے اب تک میری کسی ایک بات کا بھی ڈھنگ سے جواب نہیں دیا ہے۔''

''تو تمہیں ڈھنگ سے جواب دینے پر مجھے کون سا تمغہ مل جائے گا۔''

''چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتائیں اسمبلی کا ماحول کیسا ہے؟''

''بہت اچھا۔ بہت گھریلو۔ بالکل میرج بیورو جیسا۔''

''میرا خیال ہے اب انٹرویو کو یہیں ختم کردیتے ہیں۔'' میں نے ٹیپ ریکارڈر آف کرتے ہوئے کہا۔

''بہت ہی نیک خیال ہے۔''

میں نے اپنا سامان بیگ میں رکھا اور اس سے ہاتھ ملائے بغیر باہر جانے لگی۔ ظاہر ہے میں اپنے ہاتھ گندے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ایک منٹ رکو۔'' اس نے پیچھے سے آواز دے کر مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہے۔ انٹرویو تو ختم ہوگیا۔'' میں بولی۔

''پتہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ تمہیں ہمارے ساتھ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے بڑے صاحب کہتے ہیں کہ ہماری کوتاہیوں اور جہالت کو چھپانے کے لیے ایک آدھ پڑھا لکھا بندہ بھی ساتھ ہونا چاہئے۔ میں نے تم سے شروع میں ہی کہا تھا کہ میں کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ لیکن تم کو ایک گولڈن مشورہ دے رہی ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ یہ صحافت وحافت چھوڑ دو۔''

''تو پھر کیا کروں؟'' میں نے تنک کر جواب دیا۔

''وہی جو میں کررہی ہوں۔ سیاست میں آجاؤ۔''

میں نے تیز نظروں سے اس کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اور جس اخبار میں یہ انٹرویو چھپنا تھا اسی میں یہ خبر شائع ہوئی کہ۔'' حکومتی جماعت نے ضمنی انتخابات کے لیے ایم اے جرنلزم میں گولڈ میڈلسٹ ہما انصاری کو پارٹی ٹکٹ جاری کردیا ہے۔''

بھینٹ

علی اختر

سیاست ایک سسٹم کا نام ہے' جس کے تحت عوام سے محبت کرنے والے ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار سماجی کارکن خود کو بطور عوامی نمائندہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور عوام اپنے حق رائے دہی کے ذریعے انہیں پارلیمنٹ میں پہنچاتے ہیں تاکہ وہ ان کے حقوق کے لیے قانون سازی کر سکیں۔ لیکن ہمارے ہاں سیاست ایک کاروبار کا درجہ اختیار کر چکی ہے جس کے تحت کرپٹ عناصر اپنے کرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے ہیں۔

دو سیاست دانوں کا قصہ' جنہوں نے اپنے مفادات کے تحت خونی رشتوں کو سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا تھا

میں اپنے چیمبر میں ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا چاچا عبدل میری میز صاف کر رہا تھا' سائلین کی فائلیں اِدھر اُدھر رکھی ہوئی تھیں' ٹھک سے دروازہ کھلا۔ شیشے کا دروازہ تھا' زور سے بجا تو مجھے لگا جیسے ٹوٹ گیا ہو' میں نے بڑی غصیلی نظروں سے آنے والے کو دیکھا' چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا جس نے سر پر میلا کچیلا صافہ باندھ رکھا تھا۔ اندر آتے ہی وہ یوں کرسی پر ڈھیر ہوا' جیسے بڑی دور سے بھاگتا آ رہا ہو۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی' میری غصیلی نظریں دیکھ کر وہ پھولے سانس میں بولا۔

''معاف کرنا صاحب جی...... دمے کا مریض ہوں' تیز چلوں تو سانس پھولنے لگتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں' پانی پئیں۔'' میں نے چاچا عبدل سے کہا۔

''چاچا! انہیں پانی پلاؤ۔'' چاچا عبدل پہلے ہی صفائی چھوڑ چکا تھا' فوراً قریب پڑے کولر سے پانی کا گلاس بھرنے لگا۔ اتنی دیر میں اس کا سانس بحال ہو چکا تھا' گلاس پکڑتے ہوئے وہ بولا۔

''غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں' آپ قادر وکیل ہیں ناں...... میں آپ کے آبائی چک کرتار پور کے ساتھ والے گاؤں ڈھولے آل سے آیا ہوں اور چوہدری بلاول کا نوکر ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے ان کی دشمنی پرانے وقتوں سے نوکھراں قصبے کے زمیندار ہیبت خاں کے خاندان سے چلی آ رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہیبت خان کا بھائی رشید خان لین دین کے جھگڑے میں قتل ہو گیا۔ انہوں نے یہ قتل چوہدری بلاول کے کارندوں پر ڈال دیا' کتنا عرصہ تک کیس چلتا رہا مگر ثبوتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمارے بندے عدالت سے بری ہو گئے۔ انہوں نے یہ ضد دل میں پالے رکھی اور ایک روز موقع ملتے ہی چوہدری بلاول کے چھوٹے بھائی کو گولیوں سے بھون ڈالا' اب ان کے آدمی قتل کی اس واردات کی وجہ سے جیل میں ہیں ان کی آج کل گواہیاں لگنے والی ہیں۔'' وہ تھوڑی دیر سانس لینے کو رکا تو میں نے ہنکارا بھرا پھر...... سانس لینے کے بعد وہ پھر بولا۔

''ابھی چند روز پہلے کی بات ہے' ہیبت خاں کی سوتیلی بہن قتل ہو گئی قاتلوں نے اس کی عزت لوٹی

اور پھر اسے اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئے' جاتے جاتے ان کی چہیتی بھینس گوری کو بھی گولی مار کر ختم کر گئے۔ اگلے روز گاؤں سے ہٹ کر چری کے کھیت سے اس کی لاش ملی۔ لاش کا چہرہ مسخ کیا ہوا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے۔ مسخ شدہ لاش کے پوسٹ مارٹم اور ڈاکٹری ملاحظہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ملزموں نے گینگ ریپ کے بعد بڑی بے دردی سے پہلے گولیاں ماریں اور پھر چہرے کو تیز آلے سے مسخ کر ڈالا۔ پرچے کے ساتھ دونوں رپورٹیں بھی لگی ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے پھر رکا' اس کی سانسیں اتنا بولنے سے درہم برہم ہو رہی تھیں' کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"وکیل صاحب یہ دمہ بھی بڑی موذی مرض ہے' ہموار اور چلتی حیاتی کو بھی چھدری چھدری کر دیتا ہے' ابھی تک اس کا علاج ہی نہیں نکلا۔"

"ہاں تو میں بتا رہا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے اور مقامی تھانے میں نامزد پرچہ درج کروا دیا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ آج کل الیکشنوں کا زور ہے اور چوہدری بلاول اپنے گاؤں سے الیکشن بھی لڑ رہا ہے' پولیس والے پہلے تو ان کے دبدبے کی وجہ سے خاموش تھے مگر پرچہ درج ہونے کے بعد انہوں نے گرفتاری کے لیے زور مارنا شروع کر دیا ہے' میں اس بارے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

میں اس کی کہانی سن کر سوچوں میں ڈوب گیا' نہ جانے ہمارے معاشرے سے یہ لعنت کب ختم ہوگی' مقامی لوگ اپنی اپنی دشمنیوں میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کی نسلیں ختم ہو جاتی ہیں' دشمنیاں نہیں ختم ہوتیں۔ وہ اپنی چوہدراہٹ اور ناک اونچا رکھنے کے لیے مخالفوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسا کر مزہ لیتے ہیں میں جس گاؤں میں رہتا ہوں وہاں بھی ایسے کیس آئے دن بنتے رہتے ہیں اور آپس کی دشمنیاں نسلوں تک پالنے پر فخر کیا جاتا ہے۔ ایک تو ان کی جہالت اوپر سے ہمارا عدالتی نظام بھی اپنی پیچیدگیوں سے بندے کو نکلنے نہیں دیتا۔ میرے والد صاحب گورنمنٹ کی بنائی ایسی مصالحتی کمیٹی کے چیئرمین ہیں جو مقامی لوگوں کے جھگڑوں میں مصالحتی کردار ادا کر کے معاملات نبٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نمبرداری تو ہمارے خاندان میں وراثتی چلی آ رہی ہے' میں نے شہر کے کالج سے بی ایس سی بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا اور نمبروں کے لحاظ سے میرا میرٹ بھی بنتا تھا مگر جب والد صاحب نے گاؤں میں پلتی دشمنیوں کا تناسب دیکھا اور عدالتی چکروں میں لوگوں کو پانی کی طرح روپیہ بہاتے دیکھا تو انہوں نے مجھ پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ میں ڈاکٹر بننے کی بجائے وکالت کا امتحان پاس کر کے وکیل بنوں۔

میں نے بہت شور مچایا مگر والد صاحب کی دلیلوں نے میری ایک نہ چلنے دی بالآخر میں نے ایل ایل بی کا امتحان بھی اچھے نمبروں میں پاس کیا اور وکیل بن کر کچہری آ گیا۔ یہ چیمبر مجھے چند سال پہلے ہی الاٹ ہوا تھا۔ میرا کام گاؤں کے روایتی جھگڑوں اور کیسوں کی وجہ سے اچھی طرح چلنے لگا تھا' ان کے علاوہ مجھے اور بھی کیسز ملنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آفس میں ایک کمپیوٹر کلرک اور ایک چپڑاسی رکھا ہوا ہے جو میرے عدالتی کام اور دفتری ضروریات پورا کرتے ہیں' آج کے کیس کی روداد سننے کے بعد میں نے ایک بار پھر آنے والے کارندے سے پوچھا۔

''چوہدری بلاول آج کل کدھر ہیں؟''

''وہ تو جی لاہور گئے ہوئے ہیں اور اکثر وہیں رہتے ہیں' واردات والے دن بھی لاہور میں ہی تھے۔ گاؤں کبھی کبھار آتے ہیں' آج کل الیکشنوں کی وجہ سے روزانہ رات گاؤں آجاتے ہیں اور اپنے سپوٹروں کے ساتھ حویلی میں میٹنگیں کرتے رہتے ہیں' اس کیس نے انہیں بے حد پریشان کر رکھا ہے۔''

''بڑے لوگوں کو ایسی کا ہے کی پریشانی...... پولیس سے مل کر سودا بازی کر لیتے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہوا تھا...... ایسا بھی کرنے کی کوشش کی گئی تھی' پولیس کے بڑے افسروں کے ساتھ تو چوہدری بلاول کا ویسے ہی اٹھنا بیٹھنا ہے مگر تھانیدار کہتا ہے دوسرے فریق نے اوپر سے بڑا ڈاہڈا دباؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک بار چوہدری بلاول کو ہتھکڑیاں ضرور لگوانی ہیں۔''

''چوہدری بلاول بھی پارٹی کا دباؤ ڈلوا دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ان کی پارٹی برسر اقتدار نہیں ہے اس لیے ان کی سنی نہیں جاتی' اب تو پارٹی نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ پہلے چوہدری ماتھے پر لگی کالک دھوئے تو اسے ٹکٹ ملے گا ورنہ...... وکیل بابو! اس طرح ٹکٹ چھوڑ دینا مردوں کا کام تو نہیں اور پھر یہ ساری عمر کے لیے طعنہ بن جائے گا۔''

''تھانہ کون سا ہے؟'' میں نے اس کی بات ٹوکی۔

''وہ جی گردیال سنگھ کا تھانہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تھانے کا کوئی ٹیلی فون نمبر یا چوہدری بلاول کا رابطہ نمبر...... کچھ ساتھ لائے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی جی...... چوہدری صاحب کا کارڈ ہے میرے پاس۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کرتے کی جیب سے کاغذوں کے مڑے تڑے جتھے سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

''ٹھیک ہے بات کر لوں گا' جب تک چوہدری بلاول سے بات نہیں ہو جاتی کیس کو ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔'' میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

''جی جی......'' اس نے جیسے میری بات کی تصدیق کر ڈالی ہو' تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔

''آپ کی فیس......؟''

''یہ تم طے کرو گے یا چوہدری بلاول...... پھر کیس کی نوعیت دیکھ کر کہوں گا۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے جی' ٹھیک ہے...... پھر میں چوہدری صاحب کو بتا دیتا ہوں' وہ خود آپ سے بات کر لیں یا آپ ان سے تفصیلات پوچھ لیں' میں چلتا ہوں۔ شہر میں دوسرے کام بھی ہیں گاؤں پہنچتے پہنچتے شام اتر آئے گی۔'' یہ کہہ کر وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اپنا کلرک متعلقہ تھانے میں بھیجا اور وہاں سے ایف آئی آر کی نقل منگوائی' ایف آئی آر ہیبت خاں کے کارندے کے ذریعے درج کروائی گئی تھی میں نے اس کا مطالعہ کیا اس میں درج تھا۔

''میں جمیل عرف جیلا قوم موچی سکنہ قصبہ نوکھر اں ہیبت خاں کا عرصہ تیس سال سے ملازم ہوں اور میں ان کی بھینسوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کا خیال رکھتا ہوں مورخہ ۲۱ جولائی ۸۴ کو میں بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے جب حویلی گیا تو میں نے دیکھا چوہدری ہیبت خاں کی سب سے چہیتی بھینس گوری کو نامعلوم لوگوں نے گولی مار کر

ہلاک کر دیا ہے۔ میں نے ہیبت خاں کو اطلاع دی تو وہ بھاگا بھاگا جانوروں کے باڑے کی طرف آیا تو پیچھے سے دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہوگئے۔ شور کی آواز سن کر ہیبت خاں کی کوٹھی سے سکینہ نوکرانی بدحواسی سے بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ نجین اپنے کمرے میں نہیں ہے' اس کا دوپٹہ بیڈ کے آدھا اوپر اور آدھا زمین پر پڑا ہے اور اس کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں ہم سب اِدھر چلے گئے اور نجین کو ڈھونڈنے لگے وہ از خود کہیں نہیں جاسکتی تھی کیونکہ وہ آنکھوں سے اندھی تھی۔ لگتا تھا اس کو زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے ابھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ خان جی نے سب کامیوں کو کہہ دیا تھا کہ اگر اس بات کی اطلاع کسی نے گاؤں میں کی تو اس کی خیر نہیں۔ لگتا تھا کہ نجین کو زمین نگل گئی ہے' وقت گزرتا جارہا تھا مگر نجین کا کچھ پتا نہ تھا۔ اگلے روز صبح ہی گاؤں کا بندہ جس کا نام فضل عرف پھجی ہے اس نے اطلاع دی کہ چری کے کھیتوں میں کسی جوان لڑکی کی لاش ملی پڑی ہے اس کا چہرہ مسخ کیا گیا ہے۔ اس نے لاش پھینک کر جانے والے آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں چوہدری بلاول بھی شامل تھا۔

ہیبت خاں خود ان کھیتوں میں گیا تو دیکھا کہ یہ لاش نجین کی ہے اس نے لاش کپڑوں' اس کی چوڑیوں اور سب سے بڑھ کر ہاتھ کی انگلی میں پڑی سونے کی انگوٹھی سے شناخت کی۔ لاش کا ڈاکٹر ملاحظہ کروایا گیا تو انکشاف ہوا اس کے ساتھ گینگ ریپ ہوا ہے اور جسم سے چھ گولیوں کے نشان پوسٹ مارٹم میں آئے ہیں۔ دونوں رپورٹیں ایف آئی آر کے ساتھ ہیں۔''

بیان کے نیچے ایف آئی آر درج کروانے والے کا نام اور انگوٹھا ثبت تھا' ایک طرف دوسرے بندے فضل عرف پھجی کے ٹوٹے پھوٹے دستخط تھے اور محرر کے دستخطوں سے ایف آئی آر مکمل ہوئی تھی۔

ایف آئی آر پڑھنے کے بعد میں نے چوہدری بلاول کے موبائل پر کال کی' تھوڑی دیر تک بیل جاتی رہی پھر دوسری طرف سے آن ہوا اور ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

''ہیلو...... کس سے ملنا ہے؟''

''اگر میں غلط نہیں تو یہ چوہدری بلاول کا سیل نمبر ہے' آپ کون......؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کون...... اور کس لیے ملنا ہے؟''

''انہیں کہیے یہ نمبر جو آپ کے موبائل پر آ گیا ہے عبدالقادر وکیل کا ہے' فارغ ہوں تو مجھ سے بات کرلیں۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل بند کر دیا۔

یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک رواج ہے کہ بڑے لوگ خوامخواہ اپنا رعب جمانے کے لیے دوسروں کو زچ کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی سرکاری دفتر میں چلے جائیں' آپ کو چپراسی اندر نہیں جانے دے گا کہ صاحب مصروف ہیں' کسی اہم میٹنگ میں بات کر رہے ہیں۔ چاہے اندر صاحب ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہے ہوں' دوسروں کے وقت کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ یہی حال تو دولتیوں اور چوہدریوں کا ہوتا ہے' صاحب کا نوکر مالک سے زیادہ صاحب ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے غصے میں موبائل بند کر دیا تھا اور دوسرے کیسوں میں مصروف ہوگیا تھا۔

دفعتاً میرے سیل پر چوہدری بلاول کا وہی نمبر جگمگایا' گھنٹی ہوتی رہی میں نے بھی دانستہ موبائل آن نہیں کیا پوری گھنٹیاں ہونے کے بعد موبائل بند ہوگیا۔ مگر دوبارہ ٹون آنے لگی آدھے سے زیادہ ٹون گزری تو میں نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری طرف

سے اسی بھاری بھرکم آواز میں ملائمت تھی۔

"قادر وکیل بات کررہے ہیں؟" پوچھا گیا۔

"جی فرمائیے۔" میں نے بھی آواز میں نرمی رکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری بلاول بول رہا ہوں' ابھی ابھی آپ کا فون آیا تھا۔" دوسری طرف سے استفسار کیا گیا۔

"میں نے آپ کے کیس کے بارے میں کچھ باتیں کرنا تھیں۔" میں نے بات کا آغاز کیا۔

"میرے کارندے نے آپ کو بتایا تھا۔" ادھر سے جواب ملا۔

"آپ کے کیس کی ایف آئی آر میرے سامنے پڑی ہے کچھ باتیں جواب طلب ہیں اور پھر آپ پسند فرمائیں تو اس کیس کی ذمہ داری اٹھالوں اگر آپ کا ارادہ کسی اور وکیل کو رکھنے کا ہو تب بھی بتادیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"ارے نہیں نہیں..... یہ آپ کو کس نے کہہ دیا' میں نے ہی تو اپنے کارندے کو بھیجا تھا' آپ اپنی فیس کے بارے میں بتائیں اور یہ کیس آپ ہی لڑیں گے۔" میں نے اپنی فیس اور کاغذات کے خرچہ وغیرہ کا بتایا تو دوسری طرف سے چوہدری بلاول بولا۔

"وکیل صاحب! یہ تو محض ضد ہے مخالفوں کی وگرنہ جس طرح کی مرضی قسم لے لیں' حلف اٹھالیں مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں اور نہ ہی میری صلاح اور مشورہ اس میں شامل ہے۔ اب بتائیں چوہدری بلاول اندھی لڑکیوں سے ایسا کام کرے گا جس کا ذکر ایف آئی آر میں کیا گیا ہے' اس کی نقل میں نے بھی نکلوا رکھی تھی آپ کو بھجوانے کے لیے۔"

فیس طے ہونے کے بعد میں نے دوبارہ کہا۔

"آپ اپنے کسی کارندے ممکن ہو تو اسی بزرگ کو بھجوا کر کاغذات منگوالیں اور ان پر اپنے دستخط کر کے شناختی کارڈ کی کاپی بھجوادیں تاکہ میں آپ کی طرف سے کیس لڑسکوں اور کچھ رقم بھی بھجوادیں کم از کم فیس کا آدھا حصہ....."

"میں نے اس ملک میں رہنا ہے اور اسی جگہ سے الیکشن لڑنا ہے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"اصول تو اصول ہی ہوتے ہیں چوہدری صاحب!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا بابا اچھا..... اب آپ کے بس میں جو آگئے ہیں۔ میں آج ہی بھجوادیتا ہوں بلکہ ابھی تیار کرتا ہوں اسے آپ کے پاس بھجوانے کے لیے۔" اس کے بعد فون بند ہوگیا۔

کچہری میں آہستہ آہستہ رش ہونے لگا' مختلف دیہاتوں' علاقوں اور شہر کے محلوں سے سائلین اپنی تاریخوں پر پہنچنے لگے تھے۔ وکلا اور ان کے کارندے بغلوں میں مثلیں اور ان کی فائلیں' لفافے اٹھائے تیزی سے عدالتوں کی طرف آجارہے تھے۔ میں نے بھی ڈائری دیکھی اور آج کے کیس دیکھ کر ان کی فائلیں میز پر رکھیں جن عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج صاحبان چھٹی پر تھے وہاں حاضری لگوانے کو چاچا عبدل کو ضروری کاغذات کے ہمراہ روانہ کردیا اور اہم کیس خود دیکھ کر انہیں باری کے تحت رکھا۔ عام دنوں میں نو بجے کچہری لگتی ہے اس وقت تک کچہری میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ دس بجے تک تو معاملات پورے عروج پر ہوتے ہیں' ابھی دس بجنے میں پانچ دس منٹ باقی ہوں گے جب چاچا عبدل بڑی تیزی کے ساتھ دفتر میں آیا۔

"وہ جی پتا چلا ہے شہر میں کسی بڑی سیاسی پارٹی کا جلوس نکلا ہوا ہے اور شہر کا تمام کاروبار بند ہوچکا

ہے' شٹر ڈاؤن ہورہے ہیں۔ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی کام چھوڑ چکے ہیں اور کچہری بھی بند کی جارہی ہے اوپر سے احکامات ہیں' معاملہ زیادہ خراب نظر آرہا ہے۔'' چاچا عبدل ایک سانس ہی میں سب کچھ کہہ گیا۔

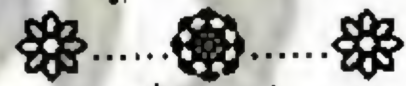
میں چیمبر سے نکلا تو کچہری میں تقریباً افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ جلدی جلدی کچہریوں سے باہر نکل رہے تھے پھر کچھ ہی دیر میں کچہری خالی ہوگئی۔ میں بھی چیمبر میں آ گیا تھا' ابھی میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ چوہدری بلاول کا وہی نوکر آ گیا اور آتے ہی بولا۔

''توبہ ہے جی...... شہر میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔''

''ہم لوگ اسے تفریح سمجھتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کرکے خوش ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے فائلوں سے کچھ کاغذ نکالے' وکالت نامہ تیار کیا اور جس جس جگہ دستخط مطلوب تھے' نشان لگا کردے دیئے اور کہا۔

''کل تک کاغذات مجھے پہنچادیئے جائیں۔''



ہیبت خاں کی حویلی نما کوٹھی کے سرسبز لان میں بچھی کرسیوں پر ابھی بھی تجین کے قتل کا افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا' اس کا ایک کارندہ افسوس کے لیے آنے والوں کو چائے پانی پیش کررہا تھا۔ لوگ دو' دو چار' چار کی ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ بات ہیبت خاں کی بہن کے قتل سے شروع ہوکر نہ جانے کہاں تک پہنچ جاتی تھی اور جب وہ اپنی اپنی دلیلوں کی تلواروں سے دوسروں کی سوچوں کو زخمی نہ کرلیتے انہیں سکون نہ ملتا پھر ایک فریق اپنے ترکش کا ہر تیر آزما کر فتح یاب ہوجاتا تو دوسرا اٹھ کر یا تو باہر نکل جاتا یا پھر کسی دوسری ٹکڑی میں جابیٹھتا۔

ہیبت خاں سب سے الگ بیٹھا تھا اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے' اس کی باڈی لنگویج بتارہی تھی جیسے اس قتل کا اسے قطعاً کوئی افسوس نہیں مگر سب کے سامنے وہ اداکاری کررہا تھا۔ اتنے میں ایک کارندہ تیزی سے کوٹھی کا مین گیٹ عبور کرکے لان میں سے ہوتا ہوا ہیبت خاں کے قریب پہنچا۔ ہیبت خاں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اپنا منہ ہیبت خاں کے قریب کرکے کچھ کہا تو ہیبت خاں اونچی آواز میں بولا۔

''ہاں ہاں تو آنے دو......'' اس کے ساتھ بیٹھے یار غار کرار خاں نے پوچھا۔

کون ہے......؟''

''ڈی ایس پی طاہر ایوب ہے......'' ہیبت خاں بولا۔

''ہاہا...... بتا تو اس طرح رہا ہے جیسے ملک کا سربراہ آرہا ہو۔ ارے بھائی آنے دو......'' کرار خاں ہنستے ہوئے بولا۔

''یہ میز سے بوتلیں' گلاس اٹھالو اور میز صاف کردو......'' ہیبت خاں نے اپنے ملازم سے کہا اور اس سے پہلے کہ آنے والا ان تک پہنچتا' ہیبت خاں کے سامنے رکھا ہوا میز صاف ہوچکا تھا۔

ڈی ایس پی طاہر ایوب اپنے دو سپاہیوں سمیت اس کے پاس پہنچا تو ہیبت خاں نے اس کا اٹھ کر استقبال کیا' طاہر ایوب نے آتے ہی کہا۔

''معاف کرنا خاں جی! میں آپ کو اس وقت زحمت دے رہا ہوں لیکن آپ کو پتا ہے قانونی تقاضے بھی پورے کرنا ہوتے ہیں۔''

"جی جی...... میرا مطلب ہے بیٹھیے کچھ چائے پانی ہوجائے باقی کام تو ہوتا رہے گا۔" ہیبت خاں نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں خاں جی! پہلے ہم اپنا کام کرلیں۔" پھر اس نے ایک سپاہی کی طرف دیکھا۔ "کاپی پنسل ہے تمہارے پاس؟"

"وہ تو جی گاڑی میں رکھی ہے۔" سپاہی نے سہمے انداز میں جواب دیا۔

"نکمے ہو...... بالکل نکمے...... جاؤ جاکر لے آؤ۔" ڈی ایس پی طاہر ایوب نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"آپ ٹھہریں میں بندہ بھجواتا ہوں۔" پھر ہیبت خاں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ "اوئے ایوبے...... جا بھاگ کر باہر سے صاحب کی گاڑی میں کاغذ پنسل لے آ۔" تیرہ چودہ سالہ دبلا لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور فوراً ہی پلٹ آیا۔

"میں مقتولہ کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" ڈی ایس پی طاہر ایوب نے کہا۔

"ضرور ضرور...... اب وہاں کیا رہ گیا ہے صرف یادیں ہی باقی ہیں۔ بہت پیار کرتی تھی مجھ سے یقین کریں ابھی تک میرے کانوں میں اس کی جی لالہ...... جی لالہ کہنے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی اندر سے نکل آئے گی۔" ہیبت خاں نے اداس لہجے میں کہا۔

"خان صاحب! مجھے بھی اس بارے میں بڑا دکھ ہورہا ہے آپ جیسی شخصیت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔" ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

دونوں چلتے ہوئے ایک کمرے میں آگئے' کمرہ عام سا تھا کوئی غیر معمولی سجاوٹ بھی نہ تھی۔ ڈی ایس پی نے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ذرا دیدہ نظروں سے ہیبت خاں کی طرف دیکھا تو ہیبت خاں فوراً بولا۔

"بڑی سادگی پسند تھی میری بہن حالانکہ گھر میں سب کچھ تھا مگر اپنے کمرے میں وہ کسی قسم کی سجاوٹ نہیں چاہتی تھی اور پھر کون سا اسے نظر آتا تھا۔"

"کیا وہ بچپن سے ہی نابینا تھی؟" ڈی ایس پی نے سوال کیا۔

"جی نہیں...... پہلے اچھی خاصی دیکھ لیتی تھی' 18 سال یا میرے خیال میں بیس سال کی ہوگی جب اچانک اس کی نظر ختم ہوگئی۔"

"کیا کوئی حادثہ ہوا تھا یا......"

"بس یہ بھی ایک کہانی ہے وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں گئی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھوں میں شدید قسم کا درد اٹھا تھا تو وہ چیختی ہوئی گھر آگئی' اس کی سہیلیاں بھی ساتھ تھیں انہوں نے بتایا تھا کہ کھیتوں میں ایک درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے اسے اچانک چکر سا آگیا' وہ گرنے لگی تو اس کی سہیلیوں نے اسے سنبھال لیا پھر وہ ان سے کہنے لگی۔

"مجھے جلدی سے گھر لے چلو' لگتا ہے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا ہے' میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔" جلدی سے وہ گھر پہنچیں تو میں نے فوراً جیپ نکالی اور نزدیکی قصبہ میں اسے لے گیا' اس وقت تک اس کی آنکھوں کے آگے پوری طرح اندھیرا چھا چکا تھا اور وہ بے تحاشہ رونے کے ساتھ چیخ رہی تھی۔

"جی لالہ...... مجھے کچھ نظر نہیں آرہا...... جی لالہ کیا میں اندھی ہوگئی ہوں...... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے......" میں اسے تسلی دے رہا تھا' جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں'

آنکھوں میں ڈالنے کے لیے ڈراپس دیئے ہم واپس آ گئے۔ بس اسی روز سے میری بہن اندھے پن کا شکار ہو گئی' میں نے شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔''

''سجین...... یہی نام تھا نا مقتولہ کا......؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔

''جی جی......'' ہیبت خاں بولا۔

''آپ کی یہ سگی بہن تھی؟'' ڈی ایس پی نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں جی' سوتیلی تھی لیکن مجھے سگی بہن کی طرح عزیز تھی۔''

ڈی ایس پی طاہر ایوب نے بڑی عمیق نظروں سے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا تو بیڈ کے قریب سے اسے چوڑی کا ٹکڑا ملا اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور سپاہی کو سنبھالنے کے لیے کہا۔

''ہوں تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟'' طاہر ایوب ڈی ایس پی نے دوبارہ ہیبت خاں سے پوچھا۔

''جی میں بتا رہا تھا وہ مجھے بہت عزیز تھی۔'' ہیبت خاں نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک ملازم بھاگتا ہوا اندر آیا۔

''خان جی...... خان جی...... ایک بری خبر؟''

''کیا ہوا' کیوں اس قدر بولایا ہوا ہے۔'' ہیبت خاں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''وہ جی...... قبرستان میں کتوں نے بی بی صاحبہ کی قبر کو کھول دیا ہے اور اس میں سے بی بی صاحب کا کفن نظر آ رہا ہے۔''

''کیا بکواس کرتے ہو...... اس عورت نے مر کر بھی میرے لیے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔'' ہیبت خاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر فوراً ہی اسے جیسے اسے ہوش آ گیا۔

''اوہ معاف کرنا صاحب! میں واقعی سٹھیا گیا ہوں' پتا نہیں جذبات میں کیا اول فول بک رہا ہوں۔ دراصل یہ صدمہ ہی ایسا پھر اوپر سے پولیس کیس اور میری بنی بنائی ساکھ...... سب نے مجھے پاگل کر ڈالا ہے' معاف کرنا جی!'' ہیبت خاں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

''ہاں تو بہت پیار تھا آپ کو اپنی بہن سے......'' طاہر ایوب نے ٹھہرے انداز میں پوچھا۔

''سر! اس وقت میرے حواس ٹھیک نہیں ہیں' میں آپ سے خود مل لوں گا' معذرت خواہ ہوں جناب میں آپ کو پورا وقت نہیں دے سکا۔''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے...... تم نے ہماری گفتگو نوٹ کر لی ہے۔'' طاہر ایوب نے بیک وقت ہیبت خاں اور اپنے سپاہی کو کہا۔

''جی سر!'' سپاہی نے جواب دیا۔

''میں مل لوں گا جی آپ سے' بے فکر رہیں۔'' ہیبت خاں نے اسی انداز میں کہا اور پھر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر طاہر ایوب کی طرف بڑھائی۔

''معاف کرنا خاں صاحب! ہر آدمی کو ایک ہی ترازو میں نہ تولا کریں۔'' طاہر ایوب نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ بھی نوٹ کر لیا ہے کہ نہیں......؟''

''جی سر...... کر لیا ہے۔'' سپاہی نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''گڈ......'' طاہر ایوب نے کہا اور اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اس کا بٹن بند کرتے ہوئے ہیبت خاں کو کہا۔

''معاف کرنا خاں صاحب کا غذات کی گواہی

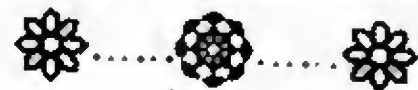
اگر چہ پکی ہوتی ہے لیکن کایاں آدمی جب مکر جائیں تو یہ گواہی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔اس لیے میں نے یہ جرأت کرلی' ریکارڈ ہو گئی ہے ہماری گفتگو تاکہ سندھ رہے' امید ہے آپ برا نہ مانیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے طاہر ایوب اپنے سپاہی کو لے کر تیزی سے باہر نکل گیا' اس کے جاتے ہی ہیبت خاں کی حویلی میں گویا زلزلہ سا آ گیا۔

''اوئے فیضو کدھر ہے......؟ بلاؤ اس ماں کے......؟'' غصے میں ہیبت خاں دہاڑا۔ اتنے میں فیضو ڈرتا اور کانپتا ہوا قریب آ گیا۔

''اوئے تمہیں اتنا نہیں پتا جب دو بڑے باتوں میں مصروف ہوں تو ان کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔'' ہیبت خاں نے غصے میں پوچھا۔

''پتا تھا خاں جی لیکن بات ہی ایسی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' فیضو نے ڈرتے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

''جا او بلا بختو نائی کو......اور اس کا سر' مونچھیں' داڑھی اور ابرو سب مونڈھوا دو' تمہاری غلطی کی یہ سب سے چھوٹی سزا ہے ورنہ تو جانتا ہے ہیبت خاں بندہ مروا دے تو اس کی کھوج بھی نہیں نکلتی وہ تو...... جو کندھوں پر پھول لگا کر اکڑتا پھرتا ہے اس کو تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ سالا جیب میں ٹیپ لیے پھرتا ہے اور اکھاڑ دو یہ سب شامیانے' کرسیاں اٹھوا دو...... بہت ہو چکا سوگ' حرام خور مرتے مر گئی لیکن ہمیں مصیبت میں ڈال گئی ہے اور تم...... بندے ساتھ لے جاؤ قبرستان' اچھی طرح سے دوبارہ قبر بنا دو' ایک دو دن تک اس کا بھی کچھ کرتا ہوں۔''



چوہدری بلاول کی حویلی کے لان میں لگے شامیانوں کے نیچے چند پولیس والے اور کچھ

سنہری باتیں

❁ محبتوں میں شدت اس وقت تک رہتی ہے جب تک وصال نہ ہو' جب ہجر محبت میں سے تفریق ہو جاتا ہے تو محبت میں کشش ختم تو نہیں البتہ بہت قلیل رہ جاتی ہے۔

❁ جب عورت والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف عورت کی ''میں'' ختم ہو رہی ہوتی ہے۔

❁ زندگی ایک عجیب سفر ہے' جس کے کسی اسٹیشن کا پتا نہیں چلتا کہ کہاں پر گاڑی رکے گی۔

❁ عورت کی سادہ آنکھیں جھکی پلکیں اس کی حیا کی دلیل ہیں۔

❁ جب تم پر برا وقت آئے تو اچھے وقت کو یاد کرو۔

❁ دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے (شیکسپیئر)

❁ ہم اندھیرے سے ڈرنے والے بچے کو بآسانی درگزر کر سکتے ہیں لیکن زندگی کا حقیقی المیہ یہ ہے کہ لوگ روشنی سے ڈرتے ہیں (ایمل کردتگی)۔

❁ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ (برٹرینڈ رسل)

محمد ارسلان......اسلام آباد

دوسرے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے' چوہدری بلاول کے گن مین ہاتھوں میں جدید اسلحہ پکڑے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے' عجیب تناؤ زدہ ماحول تھا۔ کھانا کھانے کے بعد پولیس والے اٹھے ان میں سے ایک بڑے نے چوہدری بلاول کے کارندے سے کہا۔

''چوہدری صاحب کو بولنا ہم آئے تھے' انہیں اپنی ضمانت کروا لینی چاہیے' ہماری اوپر بڑا دباؤ پڑ رہا ہے

ہم آپ کا نمک کھاتے ہیں' ہمارا کام تو آپ کو بتانے کا ہے ویسے آج کل لاہور ہوتے ہیں یا کبھی گاؤں بھی آتے ہیں۔"

"ادھر لاہور ہی ہوتے ہیں' گاؤں کم ہی آتے ہیں میں بتا دوں گا انہیں۔" کارندے نے جواب دیا۔

"کب تک میں کاغذوں کا پیٹ یہ لکھ کر بھرتا رہوں گا کہ وہ گاؤں میں نہیں ہیں' ہم بھی مجبور ہیں۔ کیا کریں ان کا خیال کریں یا قانون کو دیکھیں۔" جاتے جاتے پولیس والے کہہ گئے۔

پولیس والوں کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب حویلی میں چوہدری بلاول کی پجارو آ کر رکی۔ کلف لگے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں نئے ماڈل کا مہنگا موبائل پکڑے پجارو سے نیچے اترا تو وہ کارندہ بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور پولیس کا پیغام اسے پہنچا دیا۔

"اچھا اچھا...... ان سے بھی نبٹ لیں گے' وہ باورچی کدھر ہے اسے بلواؤ۔" ملازم نے وہیں کھڑے کھڑے باورچی کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آ گیا۔

"جی چوہدری صاحب!" وہ آتے ہی بولا۔

"بابا! دیکھو میرے چند خاص مہمان دوپہر کو آنے والے ہیں ان کے کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ مچھلی کے کٹلس بن جائیں گے۔ میں مچھلی منگوا دیتا ہوں' ساتھ چکن کڑی بنا لینا' میٹھے میں اگر کسٹرڈ بن جائے تو ٹھیک ہے ورنہ فرنی بنا لینا لیکن شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"پہلے کبھی شکایت ہوئی ہے چوہدری صاحب!" وہ منمنایا۔

"میں آج کی بات کر رہا ہوں' میری عزت کا سوال ہے۔" چوہدری دوبارہ بولا۔

"ٹھیک ہے چوہدری جی' آپ ان کے لوازمات منگوا دیں۔"

"میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں چاہو تو خود ساتھ چلے جاؤ اور پسند کی چیزیں لے آؤ یا اسے لکھ دو' یہ لے آئے گا۔ دیکھ فرید...... اوئے فرید......"

"جی چوہدری صاحب!" فرید بھاگا بھاگا آیا۔

"تم بابا کو ساتھ لے جاؤ' بازار سے کچھ چیزیں لانا ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ پیسے نکال کر بابا کو پکڑائے اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ حویلی میں چند ایک لوگ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے' جب انہوں نے چوہدری بلاول کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اوئے نصیرے...... کار کون لے کر گیا ہے۔"

"جی وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی' دھکا لگا کر مکینک کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔" نصیرے نے جواب دیا۔

"اس سالی کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا کب تک ٹھیک ہو گی؟" چوہدری بلاول نے پوچھا۔

"میں فون کرتا ہوں' ابھی پوچھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کُرتے کی جیب سے پرانے ماڈل کا موبائل نکالا اور مکینک کو فون کرنے لگا۔ فون ہونے میں کچھ دیر لگی تو چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا۔

"اوئے سالے...... بابا آدم کے وقت کا موبائل رکھا ہوا ہے وہ جو تم روزانہ لوگوں سے چھینتے ہو ان میں سے کوئی ایک رکھ لو۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ مدعا سمیت پکڑا جاؤں' وہ تو ادھر چھینا اِدھر بیچنے والا معاملہ ہوتا ہے۔" اس نے دوبارہ فون ملاتے ہوئے جواب دیا' کچھ دیر کے بعد فون کر کے اس نے بتایا کہ کار ٹھیک ہو چکی ہے اور

ڈرائیورا سے لے کر آ رہا ہے۔

"اچھا نصیرے! دیکھو یہ حویلی کو صاف ستھرا کرلو' شہر سے بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں' میں کوٹھی میں انہیں کھانا کھلا کر حویلی میں لے آؤں گا۔ ٹھیک ہے' یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے یہ جتنا فالتو سامان اور ٹوٹی ہوئی چیزیں ہیں یہاں نظر نہیں آنی چاہئیں۔" ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ کار حویلی کے اندر آ گئی' کار آتے دیکھ کر چوہدری بلاول ادھر جانے لگا' جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر نصیرے کی طرف دیکھا۔

"سمجھ گئے ہو ناں۔"

"جی جی' چوہدری صاحب! آپ فکر ہی نہ کریں۔" چوہدری بلاول کار میں بیٹھا اور کوٹھی چلا گیا' کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں وہ دہاڑا۔

"دجینی......او جینی......" اس کی آواز سنتے ہی دس بارہ سال کی ایک کالی کلوٹی لڑکی اپنے گیلے ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی آ گئی۔

"وہ اندر دیکھو نوشین آئی ہے۔"

"جی اچھا......" وہ یہ سنتے ہی الٹے قدموں واپس چلی گئی' چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ اٹھارہ بیس سالہ' تیکھے نقوش اور ہنستی بڑی آنکھوں والی گوری چٹی لڑکی باہر آ گئی۔

یہ نوشین تھی اسے آپ صبح کی چٹکی اور کچھ کچھ سانولی روشنی کہہ لیں یا کڑیل دوپہر کی دھوپ۔ وہ آتے ہی چوہدری بلاول کے نزدیک آ کر بولی۔

"جی چوہدری جی......"

"ہزار بار کہا ہے تمہارے منہ سے چوہدری کا لفظ جچتا نہیں ہے۔" چوہدری بلاول نے ملائم لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا کہوں...... جان...... جانو...... جانی......" اس کے لہجے کی گھنٹیاں اک دم بج اٹھیں۔

"کچھ بھی کہہ لو لیکن چوہدری نہیں......" چوہدری بلاول نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

"اچھا' اچھا بابا...... حکم' کیوں بلایا ہے؟" گھومتی اور سوال کرتی آنکھیں چوہدری بلاول کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔

"دیکھو آج میرے خاص مہمان آنے والے ہیں' ہوسکتا ہے آج مجھے ٹکٹ بھی مل جائے۔ تم نے میرے ساتھ ساتھ رہنا ہے' تم میری سیکرٹری ہو۔"

"بس......" دلربانہ استفہامیہ انداز میں پوچھا گیا۔

"ان کے سامنے' چند ثانیے کے لیے......" چوہدری بلاول نے مسکراتے ہوئے کہا' "کچھ اس طرح کا انداز اختیار کرنا ہے کہ وہ لوگ مجھے پارٹی ٹکٹ دے کر ہی جائیں۔ ان میں ایک آدمی بااختیار ہوگا' میں تمہیں اشارہ کردوں گا بس تم نے اس کے اردگرد ہی رہنا ہے' یہ کام تو بڑی آسانی سے کرسکتی ہو۔"

"صرف آپ کے لیے......" دوبارہ مسکرا کر اس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں' اگر مجھے ٹکٹ مل گیا تو پتا ہے......"

"آپ کو اور کئی نوشین مل جائیں گی اور یہ نوشین اپنی حسرتیں سمیٹتی رہ جائے گی' ایسے ہی ہوگا ناں۔" نوشین نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بہت تیز ہو اور نشیلی بھی......" چوہدری بلاول بولا۔

پھر اس بات پر دونوں ہنس پڑے' نوشین کو چوہدری بلاول ہمیشہ نشیلی کہہ کر پکارتا تھا' گاؤں میں ایک ہی تو لڑکیوں کا مڈل درجے کا اسکول تھا۔ جس میں اس سمیت دو اور ٹیچرز تھیں مگر نوشین ان سے خوب صورت' تیز طرار اور بھرپور جوان تھی۔ اسے

بات کرنا اور کسی بھی راہی کو اپنے رستے سے چلتے ہوئے بھٹکا دینے کا انداز آتا تھا۔ چوہدری بلاول کا اس سے تعارف ایک اسکول فنکشن میں ہوا تھا جس کی وہ صدارت کررہا تھا اور نوشین میزبان تھی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس ادھیڑ عمر اور ڈھیلی ڈھالی سی خاتون تھی' وہ اگر شام تھی تو یہ ایک کڑکتی اور کوکتی ہوئی دوپہر تھی۔ فنکشن میں نوشین نے کچھ اس طرح سے چوہدری بلاول کی پذیرائی کی تھی کہ فنکشن ختم ہوتے ہی چوہدری بلاول اپنا آپ وہاں ہار آیا تھا۔

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً نوشین سے وہ ملتا رہا اور پھر آج کل کے دور میں سب سے بڑا رابطہ موبائل ہے جو سب سے بڑا رازدار ہے۔ نوشین سے رابطے بڑھے تو چوہدری بلاول کی تمام عنایتیں نوشین پر برسنے لگیں اور آج اس کا سب سے بڑا امتحان تھا۔

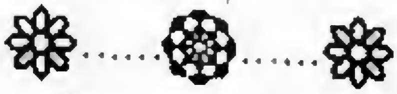
وہ کچھ دیر اس کے قریب کھڑی اپنے ایک ناخن سے دوسرے ہاتھ کی انگلی کے ناخن سے نیل پالش اکھاڑتی رہی' جب وہ خاموشی کی پاتال میں کہیں گم تھی تو چوہدری بلاول نے اس کا سکوت توڑا۔

''آج کا سارا فنکشن تمہارے نام اور تمہاری کامیابی میری کامیابی ہے' میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا تو نوشین فوراً بول اٹھی۔

''مگر وہ آپ کی بیگم کہیں.....''

''ایک بات ذہن میں رکھو ہم زمیندار وڈیروں کی گھریلو عورتیں کبھی کسی کے سامنے نہیں آتیں' اسے کوئی غرض نہیں کوٹھی میں کیا ہورہا ہے اور کون کیا کررہا ہے۔ وہ ہمارے حکم کی پابند ہوتی ہیں' ہمارے حکم کے بغیر یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ وہ تو پھر ایک کمزور اور نمانی سی عورت ہے' تم بے فکر ہوکر کام کرو' باورچی بابا تمہاری مدد کرے گا۔ باقی سامان کچن میں موجود ہے' اوکے۔'' پھر اس نے کمرے میں لگے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔

''اوہ..... وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے' میں چلتا ہوں مجھے اور بھی کام دیکھنے ہیں۔''



وہ پہر ڈھلنے سے پہلے پہلے دو تین کاریں اور ایک نئے ماڈل کی چمچماتی پجارو چوہدری بلاول کی حویلی میں آکر رکیں' چوہدری بلاول کا کارندہ گاڑیوں کو ترتیب سے حویلی میں لگوا رہا تھا اور چوہدری بلاول خود آنے والے مہمانوں کا استقبال کررہا تھا۔ انہیں ترتیب سے لگوانے کے بعد چوہدری بلاول نے اپنی پجارو اور کار میں مہمانوں کو بٹھایا اور ان کے ساتھ خود بھی کوٹھی میں آگیا۔ کوٹھی کے لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر مہمانوں کو بٹھا کر وہ اندر چلا گیا' جہاں نوشین بڑا خوب صورت لباس اور میک اپ میں ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی۔

''مہمان آچکے ہیں.....'' اس نے نوشین کے قریب آکر سرگوشی کی۔

''پھر ڈر کا ہے کا۔'' نوشین نے آنکھیں مٹکائیں۔ ''کھانا تیار ہے' ایک بار مہمان خانے پر نظر ڈال لیں' کوئی کمی بیشی ہو تو بتادیں۔ میٹنگ ادھر ہی ہوگی ناں۔'' نوشین نے دریافت کیا تو وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا مہمان خانے میں آگیا۔ ایک بڑے لیکن درمیانی میز کے اردگرد بڑی ترتیب سے کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چوہدری بلاول کو لگا جیسے اس کی ترتیب پہلے سے بہتر اور خوب صورت انداز میں کردی گئی ہو اس نے داد دی۔

''شکریہ۔'' نوشین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مہمانوں کو بوتلیں سرو کردی گئی تھیں اور پھر جب وہ ہر طرح سے مطمئن ہوگیا تو لان میں آکر اس نے

مہمانوں کو کھانے کے لیے مدعو کیا انہوں نے اپنے ایک سینئر کو آگے ہونے کی دعوت دی۔ وہ اونچے لمبے قد اور بڑی بڑی خوب صورت انداز میں تراشی مونچھوں والا ایک پچاس پچپن سال کا مضبوط جسم کا مالک تھا جس نے بڑی نفیس کمانی کی عینک لگا رکھی تھی اور کلف لگے شلوار قمیص کے اوپر اسی کلر کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔

وہ آگے بڑھا تو دوسرے بھی اس کے پیچھے ہال نما کمرے میں آگئے وہاں بڑی نفاست کے ساتھ کھانا پہلے سے چنا ہوا تھا وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں اور قہقہے لگتے رہے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چوہدری بلاول انہیں مہمان خانے میں لے آیا۔

''چائے ادھر چل کر پیتے ہیں۔'' چوہدری بلاول نے کہا تو وہ سارے اس بات پر راضی ہو گئے مہمان خانے میں بھی بڑی سادگی لیکن نفاست سے آرائش کی گئی تھی۔

''لگتا ہے بھابی آپ سے زیادہ نفاست پسند ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس گزارا ہے ہم غریبوں کے ڈیرے ہوتے ہیں کوٹھیاں تو شہر والوں کے نصیبوں میں ہوتی ہیں۔ یہ تو بیگم کو پڑھائی لکھائی نے شدبد دے رکھی ہے اس لیے وہ ایسے کام کرتی رہتی ہے وگرنہ ہم تو دیہاتی ہیں سدا کے دیہاتی۔'' چوہدری بلاول نے ہنستے ہوئے دلیل دی۔

وہ سارے جب بیٹھ گئے تو کچھ وقفے کے بعد ایک تازہ اور البیلی خوشبو کا ہیولہ تیرتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہوا وہ اس قدر اچانک اور اتنی تیزی سے اندر آئی کہ سب کی نظریں یکدم اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے جم کر رہ گئی ہوں۔

''میری سیکرٹری نوشین......'' چوہدری بلاول نے تعارف کرایا۔ اس نے ہلکی سی جنبش سے داد دیتی نظروں کا جواب دیا اور چوہدری بلاول کی قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ نئی تبدیلی ہے لگتا ہے ابھی سے لیڈر ہو گئے ہو۔'' ایک آواز آئی۔

''سمجھ دار اور عقل مند دوستوں کی سنگت میں کایا پلٹ ہو ہی جاتی ہے۔'' دوسری آواز ابھری۔

''بالکل درست کہا......'' چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

''میں پارٹی کے مخصوص اور بڑے عہدہ داروں کے ساتھ اس لیے ادھر آیا ہوں کہ پارٹی کچھ وضاحتیں آپ کی طرف سے چاہتی ہے اگر ان پر پورا اترے تو آپ کو اس حلقہ سے پارٹی ٹکٹ دے دیا جائے گا ورنہ آپ کو پتا ہے کہ پارٹی میں اس حلقے کے لیے اور بھی کئی لوگوں کی درخواستیں موجود ہیں لیکن آپ کو اس لیے اہمیت دی جا رہی ہے کہ آپ پارٹی کے پرانے ممبر ہیں اور آپ کی پارٹی کے لیے خدمات بھی دوسروں سے زیادہ ہیں وہ آپ کے کیس کا کیا ہوا؟'' اس بڑے نے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں ہوا دراصل میں نے ابھی سنجیدگی سے اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں۔''

''کیا آپ کی سیکرٹری ہماری گفتگو کے دوران ادھر بیٹھیں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو......؟'' چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

''رہنے دیں جی ہوا کا تروتازہ جھونکا آتا رہے تو ذہن کی بالیدگی برقرار رہتی ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا تو اس پر ایک بھرپور قہقہہ ابھرا۔

''لگتا ہے لودھی صاحب کی حس مزاح اور مزاج

کی رنگینی میں فرق نہیں آیا۔'' کسی دوسرے نے کہا۔

''ہاں اگر چوہدری بلاول برا محسوس نہ کریں تو ہم ان کا یہ شوپیس اسد صاحب کی بغل میں دیکھنا چاہیں گے' وہاں کیسا لگتا ہے۔'' لودھی نے دوبارہ ہنس کر تجویز پیش کی۔

''انہیں پارٹی میں کیوں نہیں لاتے۔'' اسد نے چوہدری بلاول سے پوچھا۔

''میں پارٹی میں ہوں تو یہ بھی پارٹی میں ہے۔'' چوہدری بلاول نے جواب گول کیا۔

''نہیں ایسے نہیں' ہم انہیں پارٹی کی لیڈیز ونگ میں کوئی عہدہ دیں گے۔'' اسد نے دوبارہ کہا۔

''بات کسی اور طرف جا نکلی' میری تجویز کا کیا بنا۔'' لودھی نے دوبارہ آواز اٹھائی۔

اس بات پر اسد کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اپنی کرسی پیش کی اور اٹھ کر دوسری نشست پر بیٹھ گیا۔ چوہدری بلاول نے نوشین کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کیٹ واک کرتے ہوئے اسد کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب بھی سب کی نظریں اسی کی طرف لگی ہوئی تھیں اور نوشین کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس تھا جبھی تو اس کی ہر ہر ادا کا فرانہ ہو رہی تھی۔

''گڈ...... اب ہوئی ناں بات' خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں دیوانے دو۔'' دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی نوشین سے نہ رہا گیا اور کھل کر ہنس دی' جلترنگ سی بج اٹھی۔

''اوہ گڑیا...... ہنستی ہے تو بولتی بھی ہوگی۔'' لودھی نے چہکتے ہوئے کہا۔

''بس بھئی' بہت ہو چکا' اب اصل بات کی طرف آتے ہیں۔''

''ہاں تو آپ کچھ بتا رہے تھے چوہدری صاحب!'' اسد نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

''میں نے بتایا کہ ابھی میں نے اس کیس کو سنجیدگی سے نہیں لیا' میں اندر سے مطمئن ہوں کیونکہ میں بے گناہ ہوں اور محض دشمنی کی بنا پر مجھے اس میں الجھایا گیا ہے۔ میں نے پہلے میٹنگ میں واضح کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے لیکن آج کل ماحول بدل گیا ہے' آج لوگ بہت تیز اور آگے جا چکے ہیں۔ کسی زمانے میں پولیس ہماری عزت کرتی تھی' ہمارے پوچھے بغیر کوئی کیس تھانے میں رجسٹرڈ نہیں ہوتا تھا لیکن اب وہ بھی ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں اگر آپ کو پارٹی ٹکٹ دے دیتی ہے اور مخالف اپنا داؤ استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی مرحلے میں آپ کی گرفتاری ہو جاتی ہے تو پارٹی بدنام ہو جائے گی' اس لیے ہم نے کہا تھا......''

''مگر اس سلسلے میں پارٹی نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا حالانکہ متحارب فریق اپنی پارٹی سے ہر قسم کی سہولتیں اور مراعات لے رہا ہے اس کیس کو رجسٹر کروانے میں بھی اس کی پارٹی کا بڑا ہاتھ ہے۔'' چوہدری بلاول نے گلہ کیا۔

''سب ٹھیک ہے پارٹی پوزیشن کو بھی تم جانتے ہو' برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن میں بہر حال فرق تو ہوتا ہے۔''

''اگر پارٹی اپنے ممبر کا تحفظ نہیں کرتی تو اور کون کرے گا؟ میں پارٹی معاملات پر معذرت خواہ ہوں۔'' ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز ابھری تو سب کی نظریں اس آواز کی طرف اٹھیں۔ یہ نوشین کی آواز تھی۔

''بات تو غور طلب ہے۔'' ایک مردانہ آواز ابھری۔

''مگر پارٹی کے معاملات میں آپ کس حساب سے دخل اندازی کررہی ہیں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''میں پہلے معذرت کرچکی ہوں اگر آپ کو برا لگا ہے تو ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر ایک بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گی کہ اس حلقے سے چوہدری بلاول سے زیادہ اچھا امیدوار آپ کو نہیں ملے گا جو ہر لحاظ سے جیتنے کی پوزیشن میں ہے۔'' نوشین نے ایک بار پھر دلیل دی ابھی وہ باتیں کررہے تھے کہ چوہدری بلاول کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

چوہدری بلاول نے موبائل کو دیکھا اور آن کرتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا' تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس مہمان خانے میں آیا تو پارٹی کے بڑے عہدیدار اسد کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''میرے وکیل عبدالقادر کا فون تھا اس نے بتایا کہ میری ضمانت قبل از گرفتاری عدالت نے منظور کرلی ہے۔''

''گڈ.....'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''پھر میں ایگزیکٹو باڈی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس حلقے سے آپ کو ٹکٹ کی یقین دہانی کراتا ہوں' آپ کو اس کی پیشگی مبارک باد ہو۔ پارٹی چیئرمین کے دستخطوں کے بعد آپ کو باقاعدہ اس کا نوٹیفکیشن جاری کردیا جائے گا۔'' اسد نے آہستہ آہستہ اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تو تمام دوستوں نے اس بات کی نہ صرف بھرپور تائید کی بلکہ تالیاں بجا کر اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔

''تو پھر آپ نے پارٹی کی رکنیت لینے کے بارے میں کیا سوچا؟'' اسد نے اب نوشین کو مخاطب کیا۔

''آپ جیسی ذہین اور باصلاحیت خواتین کی پارٹی کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔'' لودھی نے بات آگے بڑھائی۔

''جیسے چوہدری بلاول چاہیں گے میں فیصلہ کرلوں گی۔'' نوشین نے جواب دیا۔

''گویا آپ کی ڈور چوہدری بلاول کے ہاتھ میں ہے۔'' ایک بولا۔

''یونہی سمجھ لیں۔'' نوشین مسکرا کر بولی۔

''میں آپ کے فیصلے کا منتظر رہوں گا' یہ رہا میرا وزیٹنگ کارڈ۔ آپ براہ راست بھی مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرسکتی ہیں۔'' نوشین کی نظریں چوہدری بلاول سے ملیں تو چوہدری نے آنکھ کے اشارے سے اسے کارڈ لینے کا کہا۔ نوشین نے کارڈ پکڑ لیا اس کے بعد وہ سارے اٹھ گئے سب نے فرداً فرداً چوہدری بلاول سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد نوشین سے بھی ہاتھ ملایا سب سے آخر میں اس نے نوشین سے ہاتھ ملایا اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں ذاتی طور پر آپ کی آمد کا منتظر رہوں گا' آپ جیسی خوب صورت اور باصلاحیت خواتین کی پارٹی میں شمولیت سے پارٹی مضبوط ہوگی۔''

''میں کوشش کروں گی۔'' نوشین نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''اوکے' ایک بار پھر پارٹی ٹکٹ کی پیشگی مبارک۔'' سب نے یک زبان ہوکر کہا اور کوٹھی کے لان میں آگئے' چوہدری بلاول کے ڈرائیور فوراً انہیں لے کر حویلی آگئے۔

''میرے آنے تک رکنا۔'' چوہدری بلاول نے نوشین کو کہا اور ان کے ساتھ حویلی آگیا۔ چوہدری اپنے گارڈز سمیت اپنی پجارو میں بیٹھا اور گاؤں کی

حدود سے انہیں باہر تک چھوڑ کر واپس آ گیا' وہ سیدھا کوٹھی میں آیا تھا جہاں نوشین ابھی تک اس کی منتظر تھی۔

''یہ سب تمہاری محنتوں کا ثمر ہے۔'' چوہدری بلاول نے نوشین کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ نوشین بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' چوہدری بلاول نے نوشین سے پوچھا۔

''کوئی پرابلم...... نشیلی......'' وہ دوبارہ بولا۔

''کچھ نہیں اپنے چہرے پر جمی ان شہدوں کی تپتی نظریں صاف کر رہی ہوں۔'' نوشین مسکراتے ہوئے بولی۔

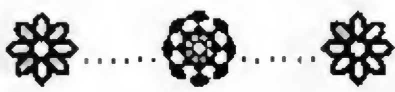
''ٹھیک ہے' کالے بادلوں میں چھپی ہوئی سفید دودھیا روشنی اچھی نہیں لگتی اور گہنائی ہوئی چاندنی چوہدری بلاول ویسے ہی پسند نہیں کرتا۔'' چوہدری بلاول نے اس کے سفید گلابی گال تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا تو ہنسی کا جلترنگ ایک بار پھر بج اٹھا۔

''اب میں جاؤں۔'' نشیلی نے پوچھا۔

''شکریہ...... ایک بار پھر شکریہ یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں' تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اب آزادی سے اس کیس کے بارے میں سوچتا ہوں' اس کم بخت نے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے اگر تم مناسب سمجھو تو پارٹی سے میرے لیے کوئی مدد بھی لے سکتی ہو۔'' کچھ سوچتے ہوئے چوہدری بلاول نے نشیلی سے کہا۔

''میرے اچانک بولنے سے وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے تھے' ضرورت پڑی تو بندی پھر بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔'' نشیلی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

''تم ہمیشہ سے میرا مان رہی ہو۔'' چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا تو نشیلی نے اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھ دیا۔



شہر میں ہونے والے ہنگامے اور توڑ پھوڑ کے بعد ذرا سکون ہوا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کاروبار کھلے تو بازاروں میں خریداروں کا رش جاگ اٹھا۔ کچہریاں بھی کھل چکی تھیں' قادر وکیل اپنے چیمبر میں بیٹھا آج کی تاریخ والے کیسوں کی فائلیں دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو یہ دو تین کیسز ہیں میرے خیال میں ان کی صرف تاریخیں ملنی ہیں۔ تم ان عدالتوں کا چکر لگا آنا۔'' قادر نے اپنے ٹائپسٹ کو فائلیں دیتے ہوئے کہا۔

''میں دوسرے جج کی عدالت میں ہوں گا' چوہدری بلاول کا کیس آج لگا ہے پہلی تاریخ ہے' پھر مجھے اپنا وکالت نامہ بھی داخل کرانا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو مجھے ادھر سے بلا لینا۔'' میں نے بتایا اور کیس کی فائل اٹھا کر اس متعلقہ عدالت کی طرف جانے لگا۔ میرا ایک قدم ابھی چیمبر اور دوسرا باہر تھا کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔

''تیس پینتیس سالہ' گھٹے جسم کا اونچے قد کاٹھ کا دیہاتی سا نوجوان تھا' جو بہت گھبرایا ہوا تھا اندر آتے ہی وہ ڈرے انداز میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے جی...... قادر وکیل سے ملنا ہے۔''

''میں ہی قادر ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے ڈرے انداز میں کہا۔

''تم بیٹھو میں عدالت سے ہو کر آتا ہوں۔''

''کتنی دیر لگے گی؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کچھ دیر تو لگے گی ہی' میں نے بتایا تم چیمبر میں بیٹھو' عبدل چاچا! مہمان کو چائے وائے پلاؤ۔'' میں نے عبدل چاچا سے کہا اور دوبارہ باہر نکل آیا۔

''ذرا جلدی آنے کی کوشش کیجیے گا صاحب! مجھے جانے کی جلدی ہے۔'' اس کی فضا میں تیرتی آواز آئی۔

میں عدالت میں پہنچا ابھی میرے کیس میں دیر تھی' میں عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور جج کے ریڈر سے مخاطب ہو کر میں نے اپنی فائل اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ چوہدری بلاول کیس میں تاریخ دے دی جائے' ابھی تک عدالت میں جج نہیں آیا تھا۔ ریڈر سے میری شناسائی تھی' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور فائل لے کر رکھ لی۔

''میں دوبارہ چکر لگا لوں گا یا اپنے آدمی کو بھیج کر تاریخ کے بارے میں پوچھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریڈر نے جواب دیا۔

اور میں عدالت کے کمرے سے باہر نکل آیا' تیزی سے چلتا ہوا اپنے چیمبر میں داخل ہوا تو مجھے وہ آدمی کہیں نظر نہیں آیا۔ چاچا عبدل دوسرے چیمبر میں بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر وہ بھی آ گیا اور آتے ہی بولا۔

''عجیب ہونق شخص تھا میں نے اسے پانی پلایا اور چائے کا کہنے چلا گیا' واپس آیا تو وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا ''میں دوبارہ آتا ہوں'' میں نے کہا کہ میں اس کے لیے چائے کا کہہ کر آیا ہوں تو وہ بولا ''پتا نہیں وکیل صاحب کو کتنی دیر لگ جائے میں اتنے میں شہر دوسرا کام کر کے آتا ہوں' ان سے کہیے گا میرا انتظار کریں کہیں اور نہ جائیں مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے چوہدری بلاول کیس سے متعلق۔''

میں نے آج کا اخبار اٹھا لیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا میرا اسٹینو ابھی تاریخیں لے کر واپس نہیں آیا تھا' میں کتنی دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا تو میں اگلے روز لگنے والے کیسوں کی فائلیں دیکھنے لگا۔ میں اس وقت تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ وہ دوبارہ آ گیا۔

اس کے چہرے پر ابھی تک ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں' آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

''آپ ہی قادر وکیل ہیں ناں؟'' اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر یقین دہانی کروانے کی خاطر پوچھا۔

''ہاں...... ہاں بھئی' تمہیں کوئی شک ہے۔''

''نہیں...... نہیں......'' وہ خوف زدہ انداز میں مسکرایا۔

''میرا نام سلیم عرف چھندا ہے' میں ہیبت خاں کے گاؤں سے آیا ہوں اور خان کا بڑا خاص ملازم ہوں یوں کہہ لیں اس کی مونچھ کا بال ہوں۔''

''ہوں......'' میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

''میں آپ کو اس کیس کے بارے میں خاص معلومات دینے آیا ہوں۔'' اس نے اپنے اردگرد دیکھ کر کہا۔

''یہ میرا چپراسی چاچا عبدل ہے اور دوسرا میرا اسٹینو ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک چیمبر میں کوئی دوسرا نہیں ہے' تم بلاخوف بتاؤ' کیا بتانا چاہتے ہو؟''

''اگر میں کہوں کہ ہیبت خاں نے چوہدری بلاول کو محض پھنسانے کے لیے قتل کا یہ کیس ان پر ڈالا ہے تو......؟''

''تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو جبکہ چوہدری بلاول کے کیس میں ان کی معاونت کرنے والے دوسرے لوگوں نے اپنی گرفتاری دے دی ہے اور وہ کیس کے مندرجات جان چکے ہیں۔'' میں نے اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''درست کہا آپ نے ایسے کئی کیس ہیبت خاں کے کہنے پر میں بھی قبول کر چکا ہوں' آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اور خاص طور پر ایسے وڈیروں' چوہدریوں اور خانوں کے ملازم اپنی بھوک مٹانے کے لیے ان کے آگے پیچھے دُم ہلانا اپنی ایمانداری اور جانثاری جانتے ہیں اور ان کے کہنے پر بعض کیس اپنے اوپر ڈلوا لیتے ہیں جو ہم نے نہیں کیے ہوتے۔ سچ پوچھیں کہ وفاداری ثابت کرتے ہوئے اس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا' پتا نہیں ہمارا یہ فعل کس کھاتے میں لکھا جاتا ہوگا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہیبت خاں کی سوتیلی بہن تحبین کا قتل چوہدری بلاول یا اس کے کسی کارندے نہیں کیا بلکہ اس قتل میں خود ہیبت خاں کا ہاتھ ہے' اسی نے اپنی بہن کو قتل کرایا ہے۔''

''اس کا ثبوت...... عدالت مفروضوں کی بجائے ثبوت مانگتی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''سب کچھ موجود ہے اور میں سب باتیں اور ثبوت آپ کو فراہم کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہیں تفتیشی افسر کو بھی بیان دینا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔'' وہ بولا۔

''اچھا اپنا موبائل نمبر مجھے دے دو میں بات کر کے آپ کو بلوا لوں گا۔'' میں نے بتایا۔

''ہیبت خاں بہت سفاک اور عیاش آدمی ہے اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے اگلی بار میں آپ کو نظر ہی نہ آؤں اگر آپ آج یہ تکلف کرلیں تو......''

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو۔'' میں نے اسے تسلی دی اور پھر چاچا عبدل سے کہا۔

''چاچا عبدل ذرا جلدی سے جاؤ اور کچہریوں میں موجود ایس ایس پی کے آفس میں دیکھ کر آؤ وہ تشریف رکھتے ہیں۔''

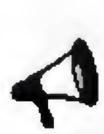
''ٹھیک ہے۔'' چاچا عبدل بولا اور چیمبر سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اور بتایا کہ وہ اپنے دفتر میں موجود ہیں' میں نے اسے ساتھ لیا اور ایس ایس پی کے آفس میں آ گیا باہر کھڑے اردلی سے ملاقات کے لیے کہا۔

اردلی کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور ہمیں اندر لے گیا' ہم دونوں دفتر میں چلے گئے۔

اس کے حلفیہ بیان نے کیس کی تمام مضبوطی ختم کر کے رکھ دی تھی اور کیس کا پانسہ بدل کر رہ گیا تھا اب میری درخواست پر ایس ایس پی نے اس بیان کو تاوقت ضرورت محفوظ رکھ لیا تھا۔ میں خوش تھا کہ اس اچانک خدائی امداد نے وقت سے بہت پہلے مجھے سرخرو کر ڈالا تھا۔

وہ اپنا پتا' نشان اور موبائل نمبر مجھے فراہم کر کے جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسے بھی کیس ہوتے ہیں جو بیٹھے بٹھائے مجھ جیسے بے ہنر وکیل جیت جاتے ہیں۔ اس کے بیان سے لگتا تھا کہ تحبین کا قتل عداوت نہیں' اک بھینٹ تھا۔



کالے چہرے

انجم فاروق ساحلی

ملک میں تعلیم کس قدر مہنگی ہے' کتابیں اسٹیشنری دیگر اخراجات جو تعلیم پر اٹھتے ہیں وہ رزق حلال سے پورے نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا جائزکام بھی نہیں کرواسکتا۔ یہ سب سیاستدانوں کا کیا دھرا ہے' ملکی و قومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔ اس پرمستزاد قرضوں پر قرضے لیے جارہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ کر باہر کے ملکوں میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی و قومی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

ایک ایم این اے کے بیٹے کا احوال' جس نے شراب کے نشے میں دھت انتہائی رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک معصوم بچی کو کچل دیا تھا۔

سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ان کالے چہرے والے سیاست دانوں کا احوال جو ملک کی دولت دونوں ہاتھ سے لوٹ کر باہر بھیج رہے تھے۔

برسراقتدار پارٹی کے رکن قومی اسمبلی وجاہت علی خان ناشتے کی میز پر اپنے دونوں بیٹوں عمران اور کامران کے ساتھ موجود تھے۔ جیسے ہی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے عمران نے اخبار انقلاب کی خبران کے سامنے کردی۔ وجاہت علی خان نے بڑبڑاتے ہوئے خبر کو پڑھا' نوکری نہ ملنے کی وجہ سے چاروں نوجوان خودکشی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سرکاری حکومت نوکریوں پر بین لگا کر بیٹھ گئی ہے' نوجوانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ حکومت ووٹ لے کر بے حس ہوگئی ہے اور کچھ نہیں کررہی۔

''بیٹے عمران! مجھے ان واقعات پر افسوس ہے لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا۔ وزیراعظم کی کابینہ فیصلہ کرتی ہے یا اسمبلی میں بل پیش ہوتا ہے پھر رائے شماری کے بعد اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔'' وجاہت علی خان نے غیرجذباتی لہجے میں اخبار میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی کیا یہ ایک سیاسی جرم ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' وجاہت علی خان نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

''جب آپ کی پارٹی انتخابی مہم کے دوران بار بار یہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ ہم برسراقتدار آکر نوجوانوں کو ملازمتیں دیں گے' انہیں ملک کی ترقی وخوشحالی کی راہ پر ڈالیں گے تو پھر ان وعدوں سے پھر جانا سیاسی جرم ہی ہوا۔'' عمران نے لہجے کو جارحانہ بناتے ہوئے کہا۔

''بیٹے عمران اس سلسلے میں اقدامات کیے جارہے ہیں' ملازمتوں کے مواقع محدود ہیں اور آبادی بہت بڑھ گئی ہے لہٰذا مسائل پر قابو پانے میں وقت لگتا ہے۔ اگر کسی کو سرکاری ملازمت نہ ملے تو وہ کوئی دوسرا کام بھی کرسکتا ہے' کسی کی خودکشی کو حکومت سے منسوب کرنا درست نہیں۔'' وجاہت علی خان نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن ڈیڈی آخر میرٹ کو کیوں نہیں اپنایا جاتا' میرے پاس اس وقت کئی سیاسی ورکروں کے لڑکے کے متعلق رپورٹ موجود ہے جنہیں نالائق ہونے کے باوجود ملازمتیں دی گئی ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کے

والدین برسرِ اقتدار پارٹی کے سیاسی گماشتے ہیں۔" عمران نے ناگواری کا اظہار کیا۔ وجاہت علی خان کے چہرے پر غصے سے شکنیں پڑ گئیں پھر وہ گویا ہوئے۔

"بیٹے انتخابی وعدے کوئی پارٹی بھی پورے نہیں کرتی ہم سے پہلی حکومت پانچ سال برسر اقتدار رہی لیکن صوبے بھر کی حالت کا کسے علم نہیں۔ ہماری حکومت کئی ترقیاتی منصوبوں پر کام کر رہی ہے سڑکیں، پل، انڈر پاس، پارک ڈیولپمنٹ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ رہے اخبار نویس تو وہ ہر وقت صرف منفی باتیں ہی اچھالتے ہیں، میں نے زندگی کی بہت بڑی غلطی کی تمہیں صحافی بننے دیا، اب تم میرا ہی احتساب کرنا چاہتے ہو۔"

"ڈیڈی ترقیاتی منصوبے سڑکیں، پل اپنی جگہ مگر مہنگائی کی آگ غریب کی زندگی کو جلا رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے کیا کیا؟ بجلی، پانی، سوئی گیس کے بل کس قدر زیادہ بھیجے جا رہے ہیں، عوام چیخ رہے ہیں، پرائم منسٹر صاحب مینڈیٹ کو رو رہے ہیں، کیا مینڈیٹ اس لیے دیا جاتا ہے کہ غریب عوام کا جینا حرام کر کے رکھ دیا جائے۔" عمران نے تنقید کا نشانہ بنایا۔

ڈیڈی تعلیم کس قدر مہنگی ہے، کتابیں اسٹیشنری دیگر اخراجات جو تعلیم پر اٹھتے ہیں وہ رزق حلال سے پورے نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا جائز کام بھی نہیں کروا سکتا۔ یہ سب سیاستدانوں کا کیا دھرا ہے، ملکی دقومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر مستزاد قرضوں پر قرضے لیے جا رہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ لوٹ کر باہر کے ملکوں میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی وقومی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔" عمران نے اپنی بھڑاس نکالی۔

"بیٹا عمران! تم عوام کی فکر کی بجائے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا سیکھو، جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں تم بھی اپنے بڑے بھائی کامران کی طرح ان سے محظوظ ہونا سیکھو کھاؤ پیو عیش کرو نوجوانی میں اپنے آپ کو روگ لگا لینا اچھا نہیں ہوتا آخر میں تمہارا باپ ہوں تمہارا دشمن نہیں اور جہاں تک جھوٹ سچ کا تعلق ہے تو حکومت کے انتخابی جھوٹ یا وعدہ خلافی کے علاوہ کیا سارا معاشرہ سچ بولتا ہے۔ دکاندار، تاجر، ڈاکٹر، اساتذہ، مذہبی اسکالر و محلّہ کے مولوی بھی سچ بولتے ہیں۔ ان سب کی زندگی بھی جھوٹ سے ہی عبارت ہے، مولوی قرآن کے واضح احکامات کے باوجود تفرقہ بازی پھیلاتے ہیں، لوگوں کو لڑا کر اپنی دکانداری چمکاتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنی کوتاہیوں سے مرنے والوں کی ذمہ داری کبھی اپنے سر نہیں لیتے، تاجر ناقص مال بیچ کر کبھی اعتراف نہیں کرتے۔ عورت عورت کو تباہ کر کے کبھی اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس دنیا میں کون ہے جو آلودہ نہیں۔" وجاہت علی خان نے عمران کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ان سب طبقوں کی اصلاح کی ذمہ داری حکومت پر ہی تو عائد ہوتی ہے ترقی یافتہ ممالک میں چونکہ قانون پر پورا عملدرآمد ہوتا ہے قانون بکتا نہیں اس لیے ان سب طبقوں کو بھی بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن جس ملک میں وزیر کا لڑکا بڑے سے بڑا جرم کر کے چھوٹ جائے اور غریب کو بلاوجہ تشدد کا نشانہ بنایا جائے اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔" عمران نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا میں ان تمام برائیوں کا اکیلا ذمہ دار ہوں۔" وجاہت علی خان غصے سے دہاڑے اس بار عمران خاموش رہا۔ وجاہت علی خان چند لمحے عمران کو گھورتے رہے پھر کامران کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان کا غصہ زائل ہو گیا۔

"ہاں تو بیٹا تمہیں کتنے روپے چاہئیں؟"

''ڈیڈی بس پانچ لاکھ روپیہ دے دیں' مجھے اپنی حسین محبوبہ کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتی ہیں اس کے علاوہ باقی دنیا داری بھی ہے۔'' کامران نے معصوم صورت بنا کر اپنا مطالبہ سنایا۔

''ٹھیک ہے بیٹا دے رہا ہوں بس یہ خیال رکھنا کہ تم سے کوئی ایسی حرکت نہ سرزد ہو جائے مجھے اخبار یا میڈیا والے پکڑ لیں۔'' سیٹھ وجاہت علی خان نے اب کی بار مسکراتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا پھر بریف کیس سے چیک بک نکال کر پانچ لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر کامران کو تھما دیا اس کے بعد اپنی بیٹی فرزانہ جو رات دیر سے گھر لوٹی تھی اور اس وقت سو رہی تھی اس کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر الگ سے کامران کو دے دیا۔

''اور تم بھی لے لو کچھ۔'' وجاہت علی خان نے چیک بک عمران کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ڈیڈی! میرے اخراجات اب اخبار کی ملازمت سے پورے ہو جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی' میں تمہاری بحث و مخالفت کے باوجود کسی امتیاز یا تفریق کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میرا سب کچھ تم لوگوں کے لیے ہی ہے۔'' وجاہت علی خان نے پُرشفقت لہجے میں کہا اور پھر موبائل کی بیل بجنے پر فون سنتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ایک ہنگامی میٹنگ پر اسلام آباد بلایا گیا تھا' وہ بریف کیس لے کر جلدی سے پورٹیکو میں گاڑی کی طرف لپکے' عمران اپنے اخبار انقلاب کی چھوٹی گاڑی میں آفس روانہ ہو گیا۔ کامران نے اپنی نئی لمبی کراؤن کرولا باہر نکالی اور گاڑی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے اس کا ذہن اپنی نئی محبوبہ کے گرد گھومنے لگا جو واقعی سورج کی شعاع کی مانند روشن' تر و تازہ اور نکھری ہوئی تھی۔ اس کا حسین سراپا' دلکش چال اور چہرے کے خوب صورت نقش و نگار دل میں اتر جانے والے تھے اس کے جسمی نشیب و فراز میں ایک خاص کشش تھی' وہ ایک ایسا ہیرا تھی جو کھنڈر میں بھٹک رہا تھا۔

وہ تاریک کھنڈر کیا تھا وہ تاریک کھنڈر غربت کا اندھیرا تھا جس میں وہ خوشنما کرن اپنا ذرا سا اجالا کیے ہوئے تھی۔ کامران زیر لب مسکرایا۔

''ابھی تک ٹالتی چلی آ رہی ہے اور خرچے پر خرچہ کروا رہی ہے لیکن کب تک آخر اسے میرے بیڈ روم میں آنا ہی پڑے گا پھر وہ میرے جال میں پھنس جائے گی اور اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور ہوگی۔ میں اس کی حالت جذبات میں تصاویر اتروالوں گا جس کے لیے میرے پاس جدید ترین ریموٹ کنٹرول کیمرے ہیں جو میرے فارم ریسٹ روم میں اور ہوٹل دلکش کے کمرہ نمبر 42 میں بھی نصب ہیں۔ میری امپورٹڈ گھڑی کے ڈائل پر ان کیمروں کو آن کرنے والے بٹن موجود ہیں۔

ابھی تک کتنی ہی حسین تتلیاں ہیں جو میرے دام ہوس کا شکار ہو کر بے بسی سے میرے تلوے چاٹ رہی ہیں۔ ڈیڈی سچ کہتے ہیں دماغ اور سیاست بڑی چیز ہے' ان کا صحیح استعمال ہی انسان کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اخلاقیات کے بندھے ٹکے اصولوں پر چل کر تو انسان کے لیے پیٹ بھرنا تن ڈھانپنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔'' کامران پانچ لاکھ کی مسرت سے مسکراتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی نگاہ سڑک سے ہٹ کر ایل سی ڈی اسکرین پر رقص کرتی نیم عریاں لڑکیوں پر بھی چلی جاتی تھی جو شریر اور بے باک تھیں۔

یتیم خانے کی ایک بوسیدہ گلی کے باہر مین روڈ پر گاڑی روک کر اس نے کرن کو مس کال دی' تھوڑی دیر بعد کرن اپنے حسن جاں سوز کے ساتھ اس کی گاڑی کی

اگلی نشست پر بیٹھی تھی لیکن نرم گداز سیٹ پر ٹیک لگا کر کھل کھلا اٹھی۔ گرمی کے موسم میں اے سی کی بدولت یخ ٹھنڈی فضا کتنی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی وہ سوچنے لگی کہ دولت وہ چابی ہے جس سے دنیا کے ہر عیش وآرام کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے اسے جادو کی چابی بھی کہا جاسکتا ہے۔ دولت کے آنے سے رشتہ دار پڑوسی ملنے جلنے والے کتنے قریب ہونے لگتے ہیں اور دوسری طرف غربت کے بھیانک سائے میں والدین کی تلخ نوک جھونک ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا' بچوں کی کثرت' مسائل' گھر کے کرائے کا خوف ہر وقت انسان اپنا ہی خون پیتا رہتا ہے۔ یہ آوازیں کرن کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس بھنور سے باہر ضرور نکلے گی۔

''کن خیالوں میں گم ہو؟'' کامران نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا دیا۔

''بس کامران صاحب! مکان کے کرائے کا مسئلہ' جب سے ابا کی کریانے کی دکان کی قریب دوسری بڑی دکان کھل گئی ہے ہمارا تو ناطقہ ہی بند ہوگیا ہے۔ مکان اور دکان کا کرایہ دینا ہی مشکل ہوگیا ہے ابا دمے کے مریض ہیں۔ کل تو ان کا سانس رک ہی گیا تھا' اپنی سہیلی شگفتہ کو فون کیا وہ گاڑی لے کر آئی پھر انہیں اسپتال پہنچایا جہاں ایمرجنسی میں دیکھ بھال کے بعد ان کی حالت سنبھلی تو رات دو بجے گھر لے کر آئی۔ ڈاکٹروں نے کبھی ادھر بھگایا کبھی اُدھر' یہ دوا لاؤ پھر یہ بھی لے آؤ' وہ بھی لاؤ۔ اگر شگفتہ ساتھ نہ ہوتی تو ابا کی سانس شاید ہی بحال ہوگی۔ امیر لوگ ہی کام آتے ہیں غریب کیا کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ وہ تو خود بے حال ہوتا ہے وہ کسی کی آگ کیا بجھائے گا۔ بقرعید آنے والی ہے بچوں کے کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ ہے' ابا نے بچوں کی لائن لگا کر مجھے کسی لائن پر نہیں پڑھنے دیا۔ میٹرک کے بعد کسی کالج میں داخل نہ کروایا اگر زیادہ پڑھ لکھ جاتی تو کوئی اچھی ملازمت مل جاتی مگر میرے نصیب کہاں ایسے تھے۔ آئینہ دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔'' کرن نے اپنے جلے دل کی بھڑاس نکالی۔

''گھبراتی کیوں ہو جان من! ابھی کچھ دیر بعد ہمارے پاس نوٹ ہی نوٹ ہوں گے' ڈیڈی نے چیک دے دیا ہے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میرے ہوتے ہوئے صرف میرے جذبات کی قدر کرنی چاہیے۔'' کرن نے اپنا بوجھ کامران کے کندھے پر ڈال دیا۔

''لیکن کامران ڈیئر! تمہیں مجھ سے شادی کا اعلان کرنا ہوگا آج ورنہ اس کے بغیر میں آگے نہیں جاسکتی۔'' کرن نے کامران کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں' میں بالکل تیار ہوں۔ صرف ایم بی اے کا رزلٹ آنے دو اس کے بعد بارات تمہارے ہی گھر جائے گی۔'' کامران کے چہرے پر مسکراہٹ اور یہ وعدہ کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کرچکا ہے۔

''کیا تمہارے سیاستدان اور امیر ڈیڈی مجھے اپنی بہو بنالیں گے۔'' کرن نے کچھ سوچتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں میں انہیں تمہاری تصویر دکھا کر رضا مند کرچکا ہوں' تمہاری تصویر دیکھ کر ڈیڈی نے کہا تھا کہ ہم اپنے بیٹے کی خاطر اس ہیرے کو غربت کی کان سے نکال لیں گے۔'' کرن مطمئن ہوکر پھر کامران کے کندھے سے لگ گئی۔ اس وقت سامنے نیشنل بینک دکھائی دینے لگا' کامران نے پارکنگ پر گاڑی کھڑی کی اور کرن کو ساتھ لے کر

بینک کے صدر دروازے کی طرف چلنے لگا' بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر کرن کے منہ میں پانی آ گیا اسے اپنے گھر کے سامنے عالی شان مکان میں رہنے والی ملک صاحب کی بیٹیاں یاد آنے لگیں جو کتنی شان سے نئے فیشن کے بھڑ کیلے خوش مالباس پہن کر باہر نکلتی تھیں اور اس کے پاس چند پرانے سوٹ ہی تھے جنہیں پہن پہن کر وہ بور ہو چکی تھی' جوتے بھی سستے اور غیر معیاری سے تھے۔ میک اپ کا سامان بھی ختم ہو چکا تھا اور جیولری تو اس کے مقدر میں ہی نہیں تھی۔ کامران نے مسائل کے حل کے لیے کئی نوٹوں کی گڈیاں کرن کو تھمادیں' کرن نے جلدی جلدی انہیں پرس میں ڈال کر لاک لگادیا کہ کہیں وہ اڑ کر دور نہ چلی جائیں۔

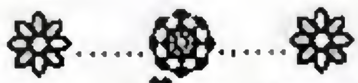
اب اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون دکھائی دے رہا تھا' فکر کے بادل چھٹ گئے تھے اور جوانی کا موسم امڈ آیا تھا۔ اس نے شوخ نگاہوں سے کامران کی طرف دیکھا' کامران کا ہاتھ مائل بہ شرارت تھا' دوسرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ دبئی چوک سے آگے نکل کر ایک مغربی طرز کے ہوٹل کے عقبی حصے میں پارکنگ پر اسپیشل ٹوکن لے کر کامران نے گاڑی کھڑی کردی۔ دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور ہوٹل کے عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ شیشے کے دروازے سے گزر کر وہ ایک خوشنما ہال میں سامنے نصف دائرے کی شکل کے سیاہ کاؤنٹر پر بیٹھی نیم عریاں لڑکی نے مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہا۔

کامران کے علاوہ یہاں اور بھی سیاستدان اور امرا کی ناز سے پالی ہوئی اولادیں موجود تھیں۔ کامران نے لڑکی کو اپنی شراب کی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا' باوردی ملازم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آرڈر کی تکمیل کے لیے متحرک ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہال میں لگی خوشنما میزوں میں سے ایک پر کامران کی پسندیدہ سرخ شراب سجادی گئی جسے وہ لال پری کہتا تھا' باقی شراب کی بوتلیں ڈگی میں رکھنے کے لیے ملازم کامران سے چابی لے کر باہر روانہ ہوگیا۔ کرن تھوڑی سی شراب تو پینے لگی تھی لیکن آج کامران نے ضد کرکے اسے تیز سرخ شراب پلادی پھر دونوں ڈانسنگ فلور پر چلے گئے جہاں دوسرے سیاستدانوں ایم این اے' ایم پی اے وغیرہ کے مختلف پارٹیوں کے ممبرز کے لڑکے لڑکیاں رقص و سرور کی محفل جمائے ہوئے تھے۔ ماحول نیم تاریک تھا اور چھت سے پڑتی روشنیوں کی رنگین چمک اچانک ہی لڑکیوں کے جسموں کے نشیب و فراز نمایاں کردیتی تھی۔ ماحول سحر انگیز تھا۔

کامران اور کرن نے خوب اچھل کود کا مظاہرہ کیا' جب دونوں ہال سے باہر نکلے تو دونوں پر ہلکا ہلکا سا نشہ چھایا ہوا تھا' کامران کی کار تیزی سے رائے ونڈ روڈ پر اپنے زرعی فارم کی طرف سفر کرنے لگی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل پھیلنے لگے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ راستہ دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا کیونکہ ہوا کے شدید جھکڑ شروع ہوگئے تھے۔ شراب کی بو کامران کے منہ سے اٹھ رہی تھی' آج وہ موج مستی میں آکر زیادہ پی چکا تھا' کبھی کبھی کار ڈگمگانے لگتی کرن کچھ فکر مند ہوگئی موسم بے حد خراب تھا۔

جیسے ہی کار رائے ونڈ روڈ پر آکر کچی کوٹھی اسٹاپ سے کچھ آگے نکلی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا' نشے اور بارش کی شدت کی وجہ سے کامران بروقت بریک نہ لگاسکا اور اس کی لمبی کرون کرولا نے سڑک پر بھیڑ بکریوں کا ریوڑ گزارتی لڑکی کو کچل کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی چیخ سے ماحول کانپ اٹھا' کامران نے تیزی سے سڑک کا جائزہ لیا تیز بارش زدہ

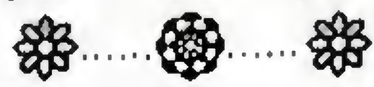
ماحول میں سڑک اور ماحول سنسان تھا۔
''یہ کیا ہوگیا.....اب کیا ہوگا؟'' کرن خوف زدہ لہجے میں بڑبڑائی۔
''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' کامران نے رکی ہوئی گاڑی کو پھر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا لیکن کرن نے چابی کھینچ کر گاڑی روک دی۔
''کامران اتنے بے حس نہ بنو اسے جا کر دیکھتے ہیں اگر زندہ ہے تو کسی قریبی اسپتال لے چلتے ہیں۔'' کامران تذبذب کا شکار تھا پھر باہر نکلا اور کرن کے ساتھ تڑپتی لڑکی کے پاس آیا' کار کے ٹائر اس کے سینے سے گزر گئے' وہ ٹھنڈی ہوچکی تھی بے حس وحرکت آنکھیں بے نور تھیں۔
''ختم ہوگئی اب بھاگنا ہوگا۔'' کامران بڑبڑایا' اسی وقت ایک تندرست سے بوڑھے نے چیخ مار کر سڑک پر آ کے اسے پکڑ لیا۔ کامران کسرتی جسم کا مالک تھا اس نے بوڑھے کو جھٹک کر دو گھونسے اس کے منہ پر مارے بوڑھے کا منہ خون سے سرخ ہوگیا لیکن وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ غضب ناک انداز سے گرج کر بولا۔
''حرام زادے تُو نے تو شراب پی رکھی ہے تُو نے میری بیٹی کو شراب کے نشے میں کچل دیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' بوڑھے کے بازوؤں میں پرانی خوراک کی طاقت موجود تھی وہ زخمی چہرے کے باوجود اسے دبوچے ہوئے تھے' کرن کانپ گئی۔ کامران نے اپنا ریوالور نکال لیا لیکن اس وقت سڑک پر دور کچھ گاڑیاں تیزی سے ادھر آتی ہوئی نظر آنے لگیں جن میں ایک پولیس کار بھی شامل تھی۔ اب کامران نے کچھ سوچ کر بوڑھے کے نازک مقام پر لات ماری جس سے ایک کراہ کے ساتھ بوڑھے کی چیخ نکل گئی اور گرفت کمزور پڑ گئی۔ کامران اسے جھٹک کر گاڑی کی طرف بھاگا' کرن اس کے ساتھ تھی۔
کامران نے گاڑی میں بیٹھ کر کار کو ایک ذیلی سڑک پر ڈال دیا تاکہ کسی کو ان پر شک وشبہ نہ ہو۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ زخمی بوڑھے نے اچانک بجلی چمکنے سے روشنی میں اس کی گاڑی کا نمبر ذہن نشین کر کے انگلی سے اپنے چہرے سے بہتے لہو کے ساتھ اپنی سگریٹ کی ڈبیہ پر ایک شیڈ کے نیچے جا کر لکھ لیا تھا۔
اس وقت زخمی بوڑھے کے پاس روزنامہ انقلاب کے رپورٹر انور کی گاڑی آ کر رکی انور نے سڑک کا منظر بھی دیکھ لیا تھا۔ بوڑھا سڑک کے کنارے دہائی دے کر گاڑیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن بہت سی کاریں نکلتی چلی گئیں وہ اس حادثے کے چکر میں نہیں الجھنا چاہتے تھے لیکن رپورٹر انور نرم دل اور ہمدردانہ مزاج کا انسان تھا' ظلم اور زیادتی تو وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔



آج کرن بھی نشے میں تھی کامران نے اسے کچھ زیادہ پلادی تھی' وہ اب بے خود ہوتی جارہی تھی۔ کامران کی گاڑی بارش میں نہاتی ہوئی اپنے زرعی فارم میں داخل ہوچکی تھی۔ کامران اور کرن ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے فارم ہاؤس کے بیڈ روم میں پڑے تھے۔ دونوں جذبات کی آخری حد سے گزر رہے تھے۔ کامران نے نشے میں ہونے کے باوجود اپنی اسکیم کے مطابق چہرے پر کپڑے کی پٹی لپیٹ لی تھی تاکہ کیمرہ اس کا چہرہ نہ عکس بند کرسکے۔ کرن کا چہرہ اور جسم کیمرے میں محفوظ ہوتا جارہا تھا۔
اب کرن اس کی مٹھی میں آچکی تھی' جب کرن کا شادی کا مطالبہ ایک دن زور پکڑ گیا تو کامران نے اس کی اپنے ساتھ اترنے والی ننگی تصاویر اس کے سامنے ڈال دیں کرن شرم وحیا سے کانپ اٹھی۔

"بے غیرت، کم ظرف، کمینے تو نے مجھے برباد کردیا، میں نادان تھی جو تجھ پر مرمٹی۔" کرن غصے سے کامران کو کوسنے لگی۔ "کچھ تو خیال کرو میں حاملہ ہوچکی ہوں، اپنے ہونے والے بچے کا ہی خیال کرو۔" کرن نے کچھ نرم رویہ اختیار کیا لیکن کامران نے چند نوٹ اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

"کبھی بھی اچھے کلینک سے ابارشن کروالو یہ اب ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔" یہ کہہ کر کامران ہوٹل کے کمرے سے نکل گیا اور کرن پھوٹ پھوٹ کررونے لگی، اس کی جوانی کی دھوپ کو سیاہ ناگ ڈس چکا تھا۔



انور بوڑھے شیر دل کے ساتھ خود تھانے جا کر رپورٹ درج کروانا چاہتا تھا لیکن اسے گھر سے بیوی کا فون آ گیا کہ اکلوتے بیٹے راجہ کو الٹیاں آ رہی ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں فوراً گھر آ کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ انور اپنے ایک دوست سے رائے ونڈ کے ایک ہوٹل میں ملنا چاہتا تھا جو اسے مشکوک مقامات کی اطلاعات دیا کرتا تھا لیکن اب ملاقات ملتوی ہوگئی تھی۔

شیر دل جس کی بیٹی کو سفید کرولا نے کچل ڈالا تھا، اس کا نمبر سگریٹ کی ڈبیہ پر اپنے خون سے لکھا ہوا دیکھا کر تھانیدار شجاعت علی جو ٹھوکر نیاز بیگ پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا متاثر تو ہوا لیکن جب گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس سے کار کے نمبر کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو تھانیدار بےزار اور لاتعلق دکھائی دینے لگا۔

"بڑے میاں آپ سے نمبر دیکھنے میں ضرور کوئی غلطی ہوگئی ہے، موسم بے حد خراب تھا پھر غصہ کی حالت میں آپ صحیح طور پر نمبر نہیں پڑھ سکے۔

یہ گاڑی کا نمبر برسرِاقتدار پارٹی کے ایم این اے

امید

- امید ایک ایسا لفظ ہے جو دل کو تسلی دیتا ہے
- امید ایک ایسا جگمگاتا جگنو ہے جو بھٹکے ہوئے انسان کو حوصلہ دیتا ہے
- امید انسان کی رگ رگ میں اس طرح دوڑتی ہے جس طرح زندہ انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے۔
- امید ایک ایسی رہ گزر ہے جو انسان کو اس کی منزل کے قریب لے جاتی ہے۔
- امید کے بل بوتے پر دنیا کا نظام چل رہا ہے

محمد اکرام......دہاڑی

وجاہت علی خان کے صاحبزادے کی کار ہے وہ تو بہت محتاط اور شریف لوگ ہیں اور ان کے صاحبزادے نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا، تم کیوں مجھے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔"

"صاحب جرم تو جرم ہی ہے چاہے کوئی چھوٹا آدمی کرے یا بڑا آدمی، قانون کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ میں نے گاڑی کا نمبر دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی اگر آپ مجھے اس پاپی کے سامنے لے چلیں تو میں فوراً اسے پہچان لوں گا۔"

"ٹھیک ہے بڑے میاں آپ جائیے میں وجاہت علی خان کے لڑکے کو چیک کرنے کے بعد آپ کو بلواؤں گا۔"

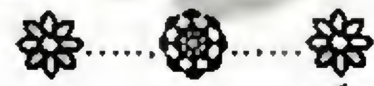
"جناب تھانیدار صاحب! گاڑی کے مالک کی تصدیق کے بعد تو آپ کو یہ پرچہ کاٹنا چاہیے میں تب ہی یہاں سے اٹھوں گا۔" بوڑھے نے کرسی سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا دیئے پھر اپنے موبائل سے اپنی اس پارٹی کے مقامی لیڈر سے رابطہ قائم کرنے لگا جن کے

وہ پوسٹر اور سٹیکرز وغیرہ لگایا کرتا تھا جو اس وقت برسر اقتدار پارٹی کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری تھی۔ غریب عوام کو انصاف دلوانا اس کی پہلی ترجیح تھی کچھ دیر میں ہی انقلابی پارٹی کا نمائندہ تھانہ ٹھوکر نیاز بیگ پہنچ گیا اور پھر بوڑھے نے اخباری رپورٹر انور کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا انور نے کہا۔

''فون تھانیدار کو دو۔'' بوڑھے نے فون تھانیدار کی طرف بڑھایا تھانیدار اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔ انور کرائم رپورٹر تھا اس سے بھی پولیس والوں کی جان جاتی ہے۔

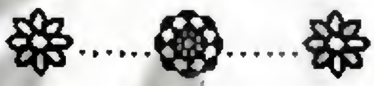
دو طرفہ دباؤ کے نتیجے میں مجبوراً تھانیدار نے وجاہت علی خان کے بیٹے کے خلاف پرچہ کاٹ دیا۔ وجاہت علی خان کی کوٹھی ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے چوک سے شروع ہو کر شیخ زید ہسپتال کی طرف جانے والے روڈ پر ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھی۔

وجاہت علی خان گاہے بگاہے تھانیدار محمد علی کی مالی امداد کیا کرتا تھا اور تھانیدار بھی وجاہت علی خان کی پارٹی کے افراد کی غنڈہ گردی اور قانون شکنی ذخیرہ اندوزی وغیرہ سے آنکھیں بند کیے رکھتا تھا لیکن اس بار دو طرفہ دباؤ سے وہ مجبور تھا' وہ وجاہت علی خان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔



کامران نے گردن جھکائے وجاہت علی خان کے سامنے حادثے کا سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔

''برخوردار! شراب اتنی پیو کہ حواس کنٹرول میں رہ سکیں' میں بھی پیتا ہوں لیکن کبھی آپے سے باہر نہیں ہوا خیر اب اس کا ایک ہی حل ہے تم گھبراؤ مت ہم اس بوڑھے کے بیان کو جھٹلا دیں گے رپورٹر انور کے ساتھ ہونے کے باوجود۔ بس تم یہ بیان یاد کر لو کہ تم ہوٹل راج محل میں فلاں فلاں افراد کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے وہاں سب میرے وفادار ہیں اور میری سرپرستی میں ہی وہاں جوا' غیر قانونی کام و بغیر پرمٹ کے شراب فروخت کی جاتی ہے۔ ہوٹل کا مالک ہماری پارٹی کا زبردست سپورٹر ہے اس لیے ہم اسے قانون سے بچائے رکھتے ہیں۔ میں ابھی فون کر کے تمہارا حادثے کے مقام سے عدم موجودگی کا ثبوت تیار کرتا ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی وجاہت علی خان نے موبائل فون پر ہوٹل راج محل کے مالک و منیجر اسحاق خان سے گفتگو کی پھر وہاں تاش کھیلنے والے چند افراد کو لالچ دے کر خرید لیا' اب کامران کو گرفتار کرنا آسان نہیں تھا۔

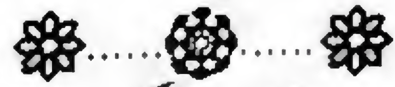


بوڑھے نے عدالت میں رٹ دائر کر دی جس کی سماعت کے وقت جھوٹے گواہوں نے بیانات دیے کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تو کامران صاحب ان کے ساتھ ہوٹل راج محل میں تاش کھیل رہا تھا۔ بیروں کو بھی خرید کر بیان رٹا دیا گیا' بوڑھا' انور اور سیاسی پارٹی کا نمائندہ انصاف کے اس خون پر دم بخود رہ گئے۔ عدالت نے وکیل صفائی کے کہنے پر بوڑھے شیر دل کی نظر ٹیسٹ کروائی تو اس کی دور کی نظر کمزور ثابت ہوگئی چنانچہ یہ سمجھ لیا گیا کہ اسے نمبر پڑھنے میں مغالطہ ہو گیا ہے۔

کامران کو جرم کے باوجود رہا کر دیا گیا' بوڑھا شیر دل اسے گالیاں دینے لگا۔ وجاہت علی خان نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے اخبار ٹی وی کے نمائندوں کو یہ بیان دیا کہ بوڑھا شیر دل چونکہ حکومت مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس نے نمبر بدل کر میرے بیٹے پر الزام عائد کر دیا' حادثہ ہوا ضرور ہے لیکن میرا بیٹا تو ہوٹل راج محل میں اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔

کامران کا بھائی عمران بھی اس مقدمے کا فیصلہ

سننے کے لیے آیا تھا اور اس کے بری ہونے پر اسے مسلسل گھور رہا تھا کیونکہ اس کے ایک دوست نے اسے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ دن کے دو بجے رائے ونڈ روڈ پر گزرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن گواہان نے بیان دیا کہ وہ اس وقت ان کے پاس ہوٹل راج محل میں تھا۔ عمران کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ انصاف کا خون ہو چکا ہے اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اصل صورت حال سے پردہ اٹھانے کی پوری کوشش کرے گا۔



کرن یتیم خانے کی تنگ گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آئی تو سامنے کھڑی ایک چھوٹی سی خوب صورت گاڑی کا اگلا دروازہ اچانک اس کے سامنے کھل گیا۔ کرن نے چونک کر ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ ڈالی تو کامران کے بھائی عمران کو دیکھ کر حیران ہو کر ٹھنک گئی' عمران نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر جمائی پھر گویا ہوا۔

''مس کرن صاحبہ! کامران صاحب تو آج کل ایک اور حسینہ کی زلفوں میں الجھے ہوئے ہیں' رنگین مزاج ہیں۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے' کیا آپ میرے ساتھ مون مارکیٹ والے پارک میں چل کر گفتگو کرسکتی ہیں۔''

''لیکن کس سلسلے میں؟'' کرن نے چونک کر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ گفتگو کامران اور ایک جرم کے سلسلے میں ہے۔'' عمران نے لہجے کو سرد بناتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔ کرن کامران سے سخت ناراض تھی پھر اسے عمران اس سے مختلف انسان معلوم ہوا وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے ہاں کردی اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔

مون مارکیٹ علامہ اقبال ٹاؤن کے ماڈل پارک میں کرن نے ایک اداس نگاہ پھولوں پر اڑتی تتلیوں پر ڈالی جنہیں اس کی زندگی کی مانند منزل کا کچھ پتا نہیں تھا پھر عمران کی طرف گلا کھنکار کر متوجہ ہوئی۔

''جی فرمایئے چھوٹے سرکار۔''

''مس کرن صاحبہ! جس قتل کے مقدمے میں کامران صاحب ملوث ہیں اور انہوں نے راج محل ہوٹل میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیا اس دن تو میرے قریبی دوست ڈاکٹر حسنین نے آپ کو کامران کے ساتھ رائے ونڈ روڈ پر طوفانی موسم میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ وہ آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہے' ہمارے فیملی ممبر کی مانند ہے لیکن آپ نے قانونی رابطہ کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کیا' کیوں؟'' عمران نے سخت نگاہوں سے کرن کو گھورتے ہوئے کہا۔ کرن چند لمحے خلا میں گھورتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''عمران صاحب! کامران صاحب نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن میں اس دن ان کے ساتھ موجود نہیں تھی' آپ کے دوست کو غلطی لگی ہوگی' دیکھنے میں دھوکا ہوسکتا ہے۔'' کرن نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں۔'' عمران نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''کیوں کہ میں نے بھی کامران بھائی کی کار کو سڑک پر ایک جگہ سفر کرتے دیکھا تھا اور اس کا رخ راج محل سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔''

''عمران صاحب کیا وہ کسی اور طرف جاکر واپس راج محل ہوٹل نہیں جاسکتے اور کیا میں ان کے ساتھ تھی اس وقت۔'' کرن نے بھی اپنی تیز نظریں عمران کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

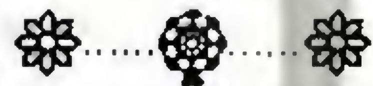
''نہیں اس وقت آپ ان کے ساتھ نہیں تھیں مگر ان کی گاڑی کا رخ اس وقت یتیم خانہ چوک کی طرف تھا۔'' عمران نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''یتیم خانے کی طرف اور بھی بہت سے کام انہیں ہوسکتے ہیں' وہ شہر کا ایک اہم مرکز ہے۔'' کرن نے اعتراض مسترد کردیا۔

''کرن صاحبہ آپ کی آواز آپ کے چہرے کے تاثرات کا ساتھ نہیں دے رہی' آپ کسی مجبوری کی وجہ سے خاموش تھیں لیکن آپ کو آخر صحیح بیان ایک نہ ایک دن دینا ہی پڑے گا' مجبوری کی وہ زنجیر ہم کاٹ ڈالیں گے۔'' عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم چل کر مڑا اور مخاطب ہوا۔

''آپ کو کس جگہ ڈراپ کر دوں؟''

''نہیں شکریہ' میں رکشہ میں چلی جاؤں گی۔'' کرن نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔



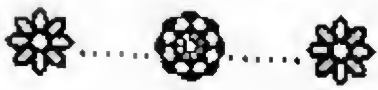
مہینے کی آخری تاریخ تھی اور وجاہت علی خان کی کوٹھی کا عقبی گیٹ محتاجوں' ضرورت مندوں اور بھکاریوں وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ حکومتی پارٹی کے ممبر قومی اسمبلی ہونے کی حیثیت سے عوام میں مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے وجاہت علی خان سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ آٹا' گھی' چینی وغیرہ غریب لوگوں میں تقسیم کیا جارہا تھا۔ عمران کا قریب سے گزر ہوا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''ڈیڈی اگر مہنگائی کم کردی جائے' روزگار کے مواقع زیادہ میسر ہوں تو لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکتے ہیں' بجائے اس کے کہ دھکم پیل میں خوار ہوکر کچھ لیں۔''

''تم تو ہر اچھے کام میں منفی پہلو ہی تلاش کرتے ہو حالانکہ ہماری پارٹی غریبوں کی سب سے بڑی ہمدرد ہے۔''

''ہاں اس لیے خودکشی کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔''

''تم اخبار کے کیڑے اور کیا کہہ سکتے ہو۔'' وجاہت علی خان کا پارہ چڑھ گیا اور عمران نے کھسک جانے میں عافیت سمجھی۔



عمران تھانہ ٹھوکر نیاز بیگ میں اپنے والد کے پسندیدہ تھانیدار شجاعت علی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ ایک بوڑھا تھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے' شیو بڑھا ہوا اور کپڑے میلے کچیلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گفتگو سے قبل آنسو لرز رہے تھے۔ تھانیدار کی سوالیہ نگاہیں بوڑھے کے ہاتھ میں موجود شراب کی ایک سبز رنگ کی بوتل پر جمی ہوئی تھیں جسے بوڑھے نے گردن سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

تھانیدار نے پہلے عمران پھر بوڑھے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس بوڑھے کے پاس اپنے بیٹے کی چھوٹی سی کہانی ہے' وہ سنیئے۔'' عمران نے تمہیدی طور پر آغاز کیا' اب تھانیدار نے اپنی سرخ آنکھیں بوڑھے پر مرکوز کردیں۔

''فرمایئے بزرگو!'' بوڑھا اپنے آنسو پونچھتا ہوا اندرونی کرب سے کانپ کر بولا۔

''تھانیدار صاحب! ہوٹل راج محل میں اعلیٰ شراب کے ساتھ ساتھ سستی جعلی شراب بھی بکتی ہے' غریب لوگ اس سستی شراب کا شکار ہوکر بعض اوقات اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھتے ہیں۔ میرے بیٹے کو راج محل ہوٹل کے ایک بیرے نے شراب کی عادت ڈال دی' یہ سستی زہریلی شراب ہوٹل کے بجائے ٹھوکر نیاز بیگ کے پرانے آسیب زدہ باغ میں واقع حویلی کے عقبی دروازے سے فراہم کی جاتی ہے جو بدروحوں کا مسکن مشہور ہے۔ شراب کے دیوانے وہاں پہنچ جاتے ہیں' نشہ بدروحوں کے قصوں سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے شراب کی چٹ ہوٹل کے بیرے دیتے ہیں' اس ہوٹل کو

سیاستدانوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ میرا بیٹا یہ سبز رنگ کی شراب کی بوتل اپنی سالگرہ پر لایا تھا' اس سالگرہ کی میز پر موم بتیاں روشن ہوچکی تھیں اس نے شراب دوسری منزل کے بیڈ روم میں چڑھائی تو نیچے آتے آتے اس کی زندگی کی شمع بجھ گئی۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی' میرا ایک ہی بیٹا تھا میں نے اسے اس کی ماں اور باپ دونوں بن کے پالا تھا میں سالگرہ کی تقریب میں اس کی شادی کا اعلان کرنے والا تھا مگر میری خوشیاں چھین لی گئیں' مجھے دیوانہ بنادیا گیا میرے خواب بکھر گئے' گھر اجڑ گیا۔ جوان بیٹے کی موت مجھے پاگلوں کی طرح گھماتی ہے' میں نشہ فروخت کرنے والوں کی تلاش میں نکلتا ہوں' بھٹکتا ہوں لیکن میں ناکام رہتا ہوں۔ وہ لوگ بڑے منظم ہیں' طاقتور ہیں' میں ایک بوڑھا' کمزور اور غریب انسان ہوں میں ان سیاستدانوں کے کالے چہرے کیسے بے نقاب کرسکتا ہوں۔ البتہ میں ایک بیرے کو جانتا ہوں جو شراب کے ٹوکن لوگوں کو فراہم کرتا ہے' میں اس کی آواز ٹوکن لیتے وقت ریکارڈ کرچکا ہوں۔ تھانیدار صاحب اگر آپ نے اپنا فرض نہ پورا کیا' آپ بک گئے' جھک گئے' ڈرا دیئے گئے تو اس معاشرے کے بہت سارے باپ ہاتھوں میں شراب کی خالی بوتلیں لیے پھریں گے اور ان کے گھر کے آنگن میں ایک قبرستان بھی ہوگا۔" بوڑھا سسک کر خاموش ہوگیا' تھانیدار عمران کو دیکھ کر مؤدب تھا۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں جناب بزرگو! ہم منشیات فروشوں' شراب فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ آپ اس بیرے کا نام بتادیں' میں اسے جا کر چیک کروں گا' آپ اب دو دن بعد آیئے گا۔" بوڑھا کچھ مطمئن سا ہوگیا لیکن عمران الجھن محسوس کررہا تھا پھر وہ تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

"جناب شجاعت صاحب آپ ذرا شجاعت کا مظاہرہ کریں اور میرے سامنے اس بیرے کو چیک کریں' میں اس معاملے کی رپورٹنگ کررہا ہوں' چلئے اس وقت۔" تھانیدار پس و پیش کے بعد تیار ہوگیا جب وہ لوگ پولیس کار میں ہوٹل راج محل کے پارکنگ پر اندر داخل ہوگئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی خوب صورت لڑکی جو نیم عریاں تھی اس گولڈن گرل سے بیرا نمبر 24 کے متعلق استفسار کیا تو لڑکی کو کوششوں کے بیرے کا کچھ سراغ نہ ملا۔ بوڑھا ٹیپ میں ریکارڈ شدہ گفتگو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ ہوٹل کا کونا کونا چھان مارنے کے بعد بھی اس بیرے جابر خان کا کوئی سراغ نہ ملا تو ہوٹل کے منیجر اور مالک نے تھانیدار اور عمران سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں بیرے جابر کے ناجائز اور ملاوٹ شدہ شراب کے کاروبار کا کچھ علم نہیں اگر ملے تو بے شک کھال اتار دیں' حرام زادے نے ہوٹل کی بدنامی کرائی ہے۔"

"کھال تو اب کسی نہ کسی کی اتر کر رہے گی۔" عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا اور ہوٹل کے مالک کے علاوہ انسپکٹر بھی عمران کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہوٹل سے نکل کر بوڑھا قلندر علی تو موٹر سائیکل رکشہ میں کہیں نکل گیا اور عمران انسپکٹر شجاعت کے ساتھ واپس آنے لگا۔

وہ کسی سوچ میں گم تھا' کار میں تین سپاہی بھی سوار تھے جن میں محمد رفیق گجر بھی تھا۔ سوچتے سوچتے عمران کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اس کی طبیعت سراغ رسائی کے موافق تھی۔ اسے وہ جملہ یاد آگیا تھا جو اس کا باپ اپنے ایک دوست سے کہتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گیا تھا۔ وہ جملہ یہ تھا۔

"تھانیدار اپنا خاص آدمی ہے' وہ ملبہ کسی اور پر ڈال دے گا۔" اس جملے سے عمران سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے' تھانیدار ہوٹل جانے سے پہلے باتھ روم میں

گیا تھا۔ وہاں جا کر اگر وہ بک چکا ہے تو کسی کو اطلاع دے دینا موبائل پر اب بڑا آسان کام ہے اور اخبار انقلاب کی رپورٹس کے مطابق یہ تھانیدار جرائم پیشہ عناصر کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔

''انسپکٹر شجاعت صاحب! کیا میں آپ کے موبائل کی آخری کال چیک کر سکتا ہوں۔'' عمران نے تھانیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ کس لیے اور کس قانون کے تحت۔'' تھانیدار نے ناگواری سے عمران پر جلتی نگاہ ڈالی۔

''بس دوستانہ طور پر' آپ میری کالز بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' عمران نے پینترا بدلا۔

''لیکن اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت کا کوئی جواز بھی تو ہو۔'' تھانیدار نے پھر ناگواری سے جواب دیا۔

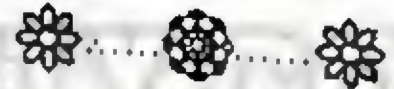
''کیا اس ملک کا ہر ادارہ اپنے فرائض کو ایمانداری سے سرانجام دے رہا ہے۔'' عمران نے ترش لہجے میں کہا۔

''عمران صاحب! آپ انقلاب کے کرائم رپورٹر ہیں اور وجاہت علی خان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں' ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کام میں بے جا مداخلت کریں۔'' تھانیدار نے تلخ لہجے میں کہا۔

''خیر آپ اس بیرے کو تلاش کیجیے میں بھی کرتا ہوں' موت کے سوداگروں کو آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ فرض کیجیے اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی......؟'' عمران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بس کیجیے چھوٹے سرکار۔'' تھانیدار چلا اٹھا۔

''گاڑی روک دو۔'' عمران نے مون مارکیٹ کے آتے ہی تھانیدار سے بارعب لہجے میں کہا۔



بھولڑ نیاں بیک سے چند فرلانگ کے فاصلے پر بیچر وال گاؤں کا ایک حصہ جنگل کی شکل اختیار کر گیا تھا' اس جنگل کے دواونچے اور گھنے درختوں پر دو بڑے سائز کے بندر پھدکتے پھر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی بے چین نظروں سے موٹروے سے اس طرف آنے والی ذیلی سڑک کو دیکھنے لگتے پھر ان کی نگاہ گھوم کر درختوں کے درمیان گھری ایک سیاہ تاریخی آسیب زدہ عمارت پر جم کر رہ جاتی۔ رات کا وقت تھا اور عمارت سے ابھرنے والی پُراسرار خوفناک آوازیں اردگرد دور دور تک پُرہول سناٹا طاری کیے ہوئے تھیں۔ اردگرد کی آبادی پر اس عمارت کی دہشت پوری طرح چھا چکی تھی' لوگ بستروں میں دبکے تھر تھر کانپنے لگتے وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کیے سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک بہادر مہمان نے اپنے میزبان کے گھر میں قیام کرنے والے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اندھیرے میں ٹیلے پر بنی سیاہ تاریخی عمارت پر نگاہ ڈالی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ عمارت کی چھت سے ایک سفید روح اڑتی ہوئی بلند ہوتی جا رہی تھی اس کا چہرہ سفید وجود کے اوپر چمکیلا اور خوفناک تھا' آنکھوں کی جگہ دو سرخ انگارے دہک رہے تھے۔ مہمان نے جھرجھری لے کر کھڑکی بند کر دی اور بستر پر گر پڑا۔

اس وقت دونوں بڑے بندروں کی چمکدار آنکھیں ایک سیاہ ٹرک پر مرکوز تھیں جو مین روڈ سے اندر آنے والی ذیلی سڑک پر سفر ختم کر کے اب کچی سڑک پر سیاہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک بندر نے فضا میں اپنے ریوالور سے فلیش لائٹ سگنل داغ دیا جس کے نتیجے میں گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے آنے والی گولیوں نے ٹرک کے ٹائر دھماکوں کے ساتھ برسٹ کر دیئے۔ ٹرک سے تین چار سیاہ سائے چونک

کر پستول اور ریوالور ہاتھوں میں لیے اونچے ہوکر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

اس وقت ٹرک گولیوں کے نرغے میں آ گیا اور جھاڑیوں سے نکل کر آگے بڑھتے خفیہ پولیس نے ٹرک کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ٹرک سے فائر کرنے کی کوشش کرنے والوں کو زخمی کردیا۔ کچھ دیر بعد پولیس کا ٹرک پر قبضہ ہوچکا تھا' گھنی لمبی جھاڑیوں کے سلسلے سے کافی تعداد میں سپاہی نکل کر عمارت کی عقبی جانب بڑھنے لگے۔ اس وقت عمارت سے روشنی کی لائنیں باہر پڑنے لگیں اور پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اندر سے دستی بم بھی پھینکے جانے لگے' بچ بچا کر پولیس نے پیش قدمی جاری رکھی اور بالآخر بیس منٹ کی فائرنگ اور تصادم کے بعد پولیس نے عمارت پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت دونوں بندروں نے درختوں سے چھلانگیں لگائیں اور پھر اپنا اوپری لباس اتار ڈالا اب بندروں کی جگہ کرائم رپورٹر عمران اور انور موجود تھے جن کے مخبروں کی رپورٹوں کی روشنی میں اس جگہ چھاپہ مارا گیا تھا۔ جہاں پشاور کی طرف سے منشیات اور جعلی ادویات ایک ٹرک میں ڈال کر پولیس ناکوں وغیرہ پر پیسہ استعمال کرکے اسے آسیبی عمارت میں لایا جاتا تھا پھر عمارت کے تہہ خانے سے نکلنے والی سرنگ کے راستے ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے پلازہ کے تہہ خانے میں منشیات پہنچا کر اوپر موجود میڈیکل اسٹور پر مال پہنچا کر لوگوں کی رگوں میں نشہ اتارا جاتا تھا۔

اچانک عمران کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ انور کو بتا کر ندی کی طرف نکل آیا جو عمارت کے عقبی حصے میں بہہ کر دور نکل گئی تھی' اس وقت وہ چونک کر رک گیا۔ ندی کے پل سے ایک سیاہ موٹر سائیکل تیزی سے گزرتی ہوئی آگے نکلتی جارہی تھی جو

> **محبت قلب**
>
> کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں' اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا بنایا جائے گا' جس طرح کسی خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس اور مائع گیس میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اس وقت ایک قلب کی سوئیاں کسی دوسرے قلب کے تابع کردی جاتی ہیں پھر جو وقت پہلے کا رہتا ہے وہی وقت دوسرے قلب کی گھڑی بتاتی ہے جو موسم جورُت' جو دن پہلے قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آئینے میں منعکس ہوجاتا ہے۔ دوسرے قلب کی اپنی زندگی ساکت ہوجاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے۔
>
> اقتباس: راجہ گدھ
>
> مونا شاہ قریشی......کبیر والہ

عمارت کے کھلے عقبی گیٹ سے ہی برآمد ہوئی تھی۔ پولیس اہلکار اور وہ دونوں بھی حیران تھے کہ چھ فٹ قد کا لمبا چوڑا سرغنہ جو اس عمارت میں منشیات کے کاروبار کا انچارج تھا کہاں غائب ہوگیا ہے۔ وہ ساری بلڈنگ چھان مارنے پر بھی نہیں ملا تھا' موٹر سائیکل پر وہی لمبا چوڑا سرغنہ سوار تھا۔

عمران نے جلد از جلد پیشاب سے فراغت حاصل کی اور وسل بجا کر پولیس اہلکاروں کو بلا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کیا پھر خود بھی جوش کے عالم میں اپنی اسپورٹس موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ندی کے پل کی طرف نکل گیا کیونکہ پل کی چوڑائی تین فٹ تھی پولیس کی کاریں اس پر نہیں چل سکتی تھیں۔ سرغنہ کافی دور سڑک پر دکھائی دے رہا تھا' عمران موٹر سائیکل تیز سے تیز بھگانے لگا' نئے افق ڈائجسٹ کی جاسوسی کہانیاں

پڑھ پڑھ کر اس کے اندر ایک عدد جاسوس تیار ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ محتاط انداز سے سیاہ پوش کے پیچھے اڑا جارہا تھا' اب اس نے دیکھا کہ سرغنہ زخمی تھا اور اس کی دائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا' کافی دیر تک تعاقب جاری رہا پھر عمران بڑے زور سے چونکا سرغنہ کا رخ ان کی کوٹھی کی طرف تھا۔ وہ عقبی دروازے سے موٹر سائیکل پھینک کر اندر داخل ہوگیا' عمران عقبی دروازے پر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گھوم کر اپنی کوٹھی کے سامنے والے حصے سے گیٹ کھلوا کر اندر داخل ہوا اور باغ کی طرف بھاگنے لگا لیکن باغ اور ساری عمارت چھاننے کے بعد بھی اس زخمی سرغنہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وجاہت گھر لوٹ کر اپنے کپڑے بدلنے کے بعد اپنے بیڈ روم میں چائے پی رہے تھے' ان کے سر میں درد تھا وہ لیٹنا چاہتے تھے۔ اس وقت عمران ان کی گاڑی پر نگاہ ڈال کر ڈرائنگ روم' ڈائننگ ہال اور دوسرے مختلف مقامات دیکھتا ہوا بیڈ روم میں ان کے سامنے پہنچا' کپ کی پرچ وجاہت علی خان کے سامنے بیڈ سائز ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔

جب عمران نے انہیں زخمی آدمی کے اندر گھس کر غائب ہونے کی خبر دی تو وجاہت علی خان چونک کر اچھل ہی پڑے چائے نیچے گرتے گرتے بچی۔

''اگر کوئی زخمی مجرم وغیرہ پچھلا دروازہ کھلا پا کر اندر گھس بھی آیا ہے تو اسے باغ یا عقبی برآمدے وغیرہ میں یا مالیوں کی کوٹھریوں کی طرف ہونا چاہیے۔'' وجاہت علی خان نے متفکرانہ لہجے میں عمران پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی سب جگہ دیکھ چکا ہوں لیکن وہ آدمی کہیں بھی نظر نہیں آیا۔'' عمران نے فکر مند لہجے میں سوچتے ہوئے کہا۔

''عمران بیٹے یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے گھوم کر کوٹھی کے سامنے والے حصے میں آتے ہی وہ شخص دوبارہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ہو۔'' وجاہت نے چونکتے ہوئے کہا۔

''نہیں ڈیڈی وہ شخص کوٹھی سے باہر نہیں نکلا۔''

''کیا مطلب؟'' وجاہت خان اچھل ہی پڑے۔

''ڈیڈی میں نے کوٹھی کے عقبی گیٹ کے سامنے سڑک کے پار گھنے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھنے والے ملنگ سے اس زخمی کے متعلق دریافت کیا ہے' اس کا کہنا ہے کہ اس نے زخمی آدمی کو اندر جاتے دیکھا ہے لیکن پھر دوبارہ باہر نکلتے ہوئے نظر نہیں آیا۔''

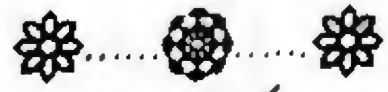
''بیٹا عمران ہوسکتا ہے وہ شخص دیوار پھلانگ کر باہر چلا گیا ہو' پھر اس نشئی ملنگ کی بات پر اتنا اعتماد نہیں کیا جاسکتا' اسے تو بعض اوقات اپنی خبر بھی نہیں ہوتی۔''

''ڈیڈی زخمی کا دیوار پھلانگنا قیاس نہیں اور ملنگ سے جس وقت میں نے گفتگو کی وہ نشے میں ہرگز نہیں تھا اور پوری طرح چاق و چوبند تھا۔'' عمران نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پھر بیٹا اور کیا ہوسکتا ہے' ایک دفعہ پھر کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی لی جاسکتی ہے۔'' وجاہت علی خان نے کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بستر کے کنارے لگی گھنٹی مسلسل بجانے لگے۔ جلد ہی ان کے سامنے ان کے ملازم اور حفاظتی گارڈ باادب کھڑے ہوگئے' وجاہت نے انہیں لمبے چوڑے زخمی سرغنہ کے متعلق بتا کر حکم دیا کہ ساری کوٹھی اور باغ میں اسے تلاش کیا جائے اگر مل جائے تو اس کے ہاتھ باندھ کر پیش کرو۔ ملازم اور گارڈ ''جی اچھا حضور'' کہہ کر کمرے سے نکلنے لگے۔

عمران کچھ سوچتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا' وجاہت بستر پر لیٹ گئے وہ تھکے ہوئے اور بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عمران نے ٹہلنا بند کردیا اور وجاہت کے قریب بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا'

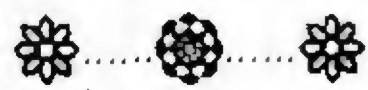
تقریباً آدھا گھنٹے بعد ملازم اور گارڈ سر جھکائے اندر داخل ہوئے اور اپنی ناکامی کا اعلان کیا' عمران ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔



کرن ایک میڈیکل سینٹر سے باہر نکلی اور موٹر سائیکل رکشہ کی طرف بڑھنے لگی اس کے چہرے پر اضمحلال اور کرب کے آثار تھے۔ اس نے محبت کا جو شیش محل تصورات میں بنایا تھا' اس کی کرچیاں اس کے دل میں اتر گئی تھیں۔ وہ کامران کی ہوس کا شکار ہو کر برباد ہو چکی تھی' اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اجلے تن والوں کے من اجلے نہیں ہوتے اور سیاستدان سانپ ہیں تو ان کے بچے بھی سانپ ہی ہوں گے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی مایوسانہ نقل و حرکت کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گئی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے بڑے بھائی مختار نے اسے میٹرنٹی ہوم سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہے' اس کا بھائی اتفاق سے ادھر سے گزر رہا تھا اور موٹر سائیکل کا ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے اب پیدل گھر کی طرف جا رہا تھا۔ کرن کا رکشہ بھی گھر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف رواں دواں تھا۔ کرن کا بھائی موبائل میں اس کی تصویر بھی میٹرنٹی سے نکلتے وقت لے چکا تھا' اس نے لمبی کار والے امیر لڑکے کے ساتھ بھی اسے دو مرتبہ آتے جاتے دیکھا تھا لیکن زبان بند ہی رکھی تھی لیکن اب وہ اپنے باپ کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

کرن چونکہ سر جھکا کر مایوس اور افسردہ چل رہی تھی اس لیے وہ مختار کو سامنے نہیں دیکھ سکی تھی۔



دونوں ایک دوسرے کے بعد گھر میں داخل ہوئی' کرن کے ابا مالی حالات نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی جھنجلائے ہوئے تھے۔ مکان کا کرایہ واجب الادا تھا پھر ادھار والے بھی جان کھا رہے تھے ایسے میں مختار نے ان کے کان بھر کر میٹرنٹی ہوم سے نکلتے وقت لی گئی تصویر اپنے ابا کو دکھا دی اس کے ابا کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا' پہلے تو غصہ سے بُرا بھلا کہتے رہے پھر مارنے لگے۔

''کس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہو۔''

''غریب کا تو نصیب ہی کالا ہوتا ہے ابا! وہ کیا منہ کالا کرے گا۔'' کرن نے غصے سے سلگتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے ہمیں کیا دیا ہے' ہم نے زندگی میں دکھ ہی دکھ اٹھائے ہیں۔'' کرن نے رک کر پھر زبانی وار کیا۔

''نکل جا میرے گھر سے' بے شرم بے حیا' تیرا تو سایہ بھی دوسری بچیوں پر نہیں پڑنا چاہیے۔'' کرن کی ماں سوئی ہوئی تھی وہ شور سن کر اٹھی اور صورت حال جان کر فکر مند ہو گئی۔ کرن کے ابا کرم دین نے اسے دھکے مارتے ہوئے گھر سے باہر نکال دیا۔ کرن سڑک پر گری اور اپنے نصیب کو رو کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی مین روڈ پر نکل آئی۔

''کاش ایسے امیر زادوں کو موت آجائے جو معصوم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر یہی مصرع تھا۔ مین روڈ پر گاڑیوں کا کافی رش تھا' شام کا وقت تھا اور اسٹریٹ لائٹس کے علاوہ گاڑیوں کی روشنیاں بھی جگمگا رہی تھیں مگر اس کے ذہن میں مجروح خیالات کا اندھیرا تھا اس نے ایک بار مڑ کر اپنے گھر کی طرف نگاہ ڈالی۔ میٹھی و تلخ یادیں اس کے اردگرد منڈلانے لگیں لیکن پھر اس نے یادوں سے پیچھا چھڑایا اور دو قدم سڑک پر آگے بڑھ گئی۔ اب اس کی زندگی کا فائدہ بھی کیا تھا وہ اپنی عصمت اچھی

زندگی کے جھول کی کوشش میں لٹا چکی تھی گھر میں سب کو پتا چل گیا تھا' عزت مٹی میں مل گئی تھی اگر وہ زندہ رہی تو ضمیر کا خنجر اسے لہولہان کرتا رہے گا چنانچہ اس نے مرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ایک پجارو تیزی سے اس کی طرف آرہی تھی ''بس یہ ٹھیک ہے'' کرن بڑبڑائی اور اس کے آگے کود گئی۔ ڈرائیور ماہر ہوشیار تھا' رش کے باوجود اس نے بریک لگاتے ہوئے گاڑی ایک طرف کردی۔ کرن کو صرف معمولی چوٹیں آئیں' خراشوں سے خون بہنے لگا اس وقت وہ تکلیف بھول گئی جب اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کے ساتھ بیٹھے کرائم رپورٹر عمران کو اچھل کر باہر نکلتے دیکھا جو اب تک گردن جھکائے اخبار پڑھ رہا تھا' اخبار کی وجہ سے وہ عمران کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔

''آپ زخمی ہوگئیں۔'' عمران نے قریب آکر کرن کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا نوجوان جو عمران کا بچپن کا دوست تھا اور وہ ایک تیسرے دوست کی سالگرہ میں جارہے تھے۔

''کیا حادثہ اتفاقیہ ہوا ہے۔'' عمران نے اپنے دوست شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کچھ غصے اور ناراضگی کے عالم میں کرن کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''نہیں عمران! یہ حادثہ نہیں اس لڑکی نے جان بوجھ کر اچانک میری گاڑی کے سامنے چھلانگ لگادی تھی یہ اپنی زندگی ختم کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو میں نے مہارت سے بچالیا ورنہ کوئی اناڑی ہوتا تو اس وقت یہ لڑکی شاید ہی زندہ ہوتی۔'' شوکت نے غصیلے لہجے میں کہا۔

عمران کرن کی طرف دیکھنے لگا ''ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ......'' عمران نے استفسار کیا۔

''بس عمران صاحب! کامران......'' کرن کے منہ سے اتنا ہی نکلا پھر وہ نڈھال ہوکر خاموش ہوگئی۔

عمران نے تیزی سے کرن کو کندھے پر ڈالا اس وقت دو سپاہی اس طرف آنکلے لیکن عمران کا کرائم رپورٹر کا کارڈ دیکھ کر کھسک گئے۔

''دوست ذرا جلدی چلو میں جس کیس پر کام کررہا ہوں یہ اس کا ایک گواہ ثابت ہوسکتی ہے۔'' عمران نے کرن کو پچھلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔

شوکت تیزی سے گاڑی چلانے لگا وہ خاندانی رئیس تھا عمران نے ایک بار اسے غنڈوں سے بھی بچایا تھا ویسے وہ بچپن کے جگری یار تھے۔

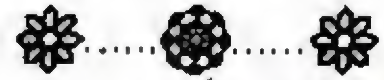
کچھ ہی دیر بعد اسے شیخ زید اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کردادیا گیا۔ زخم معمولی تھے اس لیے جلدی کرن کو مرہم پٹی کرکے فارغ کردیا گیا' وہ اندرونی اور جذباتی صدمے سے نڈھال سی ہوگئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے نارمل ذہنی کیفیت میں رہنے کا مشورہ دیا' چھوٹی ڈرپ لگنے کے بعد اب کرن اپنے پیروں پر چل رہی تھی اور نقاہت بھی کم ہوگئی تھی۔

شوکت پجارو چلا رہا تھا اور عمران کرن کے ساتھ عقبی نشست پر موجود تھا' کرن نے دکھی دل کے ساتھ عمران کو صورت حال سے آگاہ کردیا اور وہ ننگی تصویریں بھی اپنے ہینڈ بیگ کے خفیہ خانے سے نکال کر دکھادیں۔ عمران غم و غصے کی کیفیت میں اپنے بھائی کے کالے چہرے پر تھوک رہا تھا جو نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرچکا تھا دو اور لڑکیاں اسے حقیقت سے آگاہ کرچکی تھیں۔

''کرن جو ہونا تھا ہوچکا بہرحال تم حوصلہ رکھو کامران کو اس کے انجام سے میں دوچار کروں گا۔ اس کے علاوہ نشہ آور جعلی ادویات فروخت کرنے والوں کی بھی میں تلاش میں ہوں اور اس سلسلے میں کامیابیاں بھی ہورہی ہیں۔''

"آپ بہت اچھے ہیں' کاش میں کامران کی بجائے آپ سے ملی ہوتی۔" کرن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

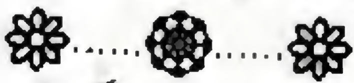
"آپ ابھی مجھ سے مل سکتی ہیں' آپ کا کوئی قصور نہیں۔" عمران نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے حوصلہ دیا' کرن کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی کرن جھلملانے لگی۔



عمران دوست کی سالگرہ میں تھوڑی سی شرکت کرنے کے بعد واپس پلٹ آیا' ویسے بھی اب وہاں شراب کا دور چلنے والا تھا اور شراب بالکل پسند نہیں کرتا تھا البتہ شوکت وہیں تھا وہ امیر زادہ تھا اور اکثر امیر زادے شراب کوک کی طرح پیتے ہیں۔

عمران تیار کی جانے والی "ماسٹر کی" ہاتھ میں لے کر باغ کے قریب واقع کامران کی چھوٹی سی کلر لیب کے دروازے پر پہنچا' کامران اس وقت کی لڑکی کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ عمران سوچ رہا تھا ہو نہ ہو اسی جگہ کامران بلیک میلنگ کا سامان تیار کرتا ہے' آج کرن کی تصویریں دیکھ کر کامران کی کلر لیب اسے بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ ماسٹر کی سے تالا جلد ہی کھل گیا' سامنے چھوٹی سی راہ داری تھی جس سے گزر کر وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس کے ایک جانب کلر لیب تھی۔

عمران نے کیبنوں میں گھس کر سامان کا جائزہ لیا' سامان استعمال شدہ تھا پھر عمران نے مختلف مقامات کی تلاشی لی لیکن کوئی قابل اعتراض مواد برآمد نہ ہوا اب عمران سیاہ رنگ کی ایک الماری کے سامنے آ کھڑا ہوا جو لیب کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ عمران نے اس کا قفل بے آواز پستول سے اڑا دیا' یہاں ماسٹر کی کام نہیں آ سکتی تھی' الماری کے پٹ عمران نے ایک جھٹکے سے کھول ڈالے وہ بالکل ایک جاسوس بن گیا تھا' اس نے الماری کا جائزہ لیا یہاں بھی قابل اعتراض مواد نہیں تھا' صاف ستھری تصاویر تھیں قدرتی مناظر وغیرہ کی' عمران چند لمحے کھڑا ریوالور کو دیکھتا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سامنے الماری کی موٹی چادر پر پے در پے کئی بے آواز فائر کیے۔ الماری کی چادر پھٹ گئی جگہ جگہ سے اور اس کے اندر کے لفافے اور تصویریں دینے لگیں۔ عمران نے دو اور فائر کر کے چادر کو کمزور کر کے کچھ حصہ کھینچ کر بڑا کر دیا اب خلا دکھائی دے رہا تھا جسے کھولنے کا طریقہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ عمران نے ہاتھ بڑھا کر لڑکیوں کی ننگی تصاویر اٹھالیں' کچھ لفافوں میں بند تھیں کچھ ویسے ہی پڑی تھیں۔ عمران نے بڑی مشکل سے انہیں دیکھا' مرد کے چہرے پر نقاب پڑی تھی لیکن عمران نے جسمانی ساخت اور کپڑوں سے کامران کو شناخت کر لیا' اس کے سامنے اس کے گھر کا ایک کالا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔



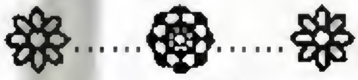
رات کے وقت جب عمران گھر کی جانب جا رہا تھا یکا یک اس کے اٹھتے قدم منجمد ہو کر رہ گئے۔ اس کے ڈیڈی پورٹیکو میں اپنی پجارو کھڑی کر کے سامان سے بھرا ہوا ایک شاپر بیگ نکال کر دقت کے ساتھ سنبھالتے ہوئے داخلی دروازے کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ عمران صحن کی طرف آنے والی گلی سے باہر نکل کر آگے بڑھا تھا' وہ کچھ سوچ کر قریبی ستون کی آڑ میں چھپ گیا۔ اس کے والد دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے' عمران سوچنے لگا اس بڑے سے شاپر بیگ میں کیا ہو سکتا ہے حالانکہ پرسوں صبح ہی وجاہت علی خان نے ملازموں کو بھیج کر کچن اور دوسری ضروریات زندگی کی کافی اشیا منگوائی تھی۔

عمران متحرک ہوا اور گلی سے گزرتا ہوا کچن میں

کھلنے والے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوکر اندرونی حصے کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ کامران اس وقت گھر سے باہر تھا وہ اپنی راتیں باہر ہی رنگین بناتا تھا' ان کی والدہ فوت ہوچکی تھیں اور اس کی بہن فرزانہ بھی رات کو دیر سے گھر لوٹتی تھی اور آج تو وہ اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ میں شرکت کے لیے خوب تیار ہوکر گھر سے باہر نکلی تھی اور عمران جانتا تھا کہ فرزانہ کی سہیلی ریحانہ کس قدر عیاش طبع لڑکی ہے اور اس کی سالگرہ پارٹی میں ڈانس کے علاوہ شراب کا دور تو لازمی ہی چلا کرتا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب فرزانہ سالگرہ پارٹی سے واپس لوٹی تو اس کے منہ سے شراب کی بو اٹھتی محسوس کرکے عمران اسے گھورتا ہوا دور چلا گیا تھا۔

عمران وجاہت علی خان کو رات کے بارہ بجے بڑا شاپر گھسیٹ کر اپنے بیڈ روم میں جاتا دیکھ کر باہر ہی رک گیا پھر دبے پاؤں آگے بڑھا اور بڑے بیڈ روم کی لائٹ آن ہوتے ہی دروازے میں نصب تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا' دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھا' جیب سے ایک ریموٹ کنٹرول نکال کر اس کے بٹن دبا کر فرش کو غور سے دیکھ رہے تھے' مخصوص بٹنوں کے پریس ہوتے ہی ان کے سامنے کا فرش گڑگڑاہٹ کے ساتھ دونوں جانب سمٹ گیا اور نیچے سیڑھیاں دکھائی دینے لگیں۔ سر وجاہت علی خان شاپر بیگ گھسیٹتے ہوئے نیچے اترنے لگے' عمران کا دل دھک دھک کرنے لگا کہ یہ کیا اسرار ہے' اس کے والد نیچے تہہ خانے میں کیا کرنے گئے ہیں۔ یہ تہہ خانہ کب تیار ہوا اس کا ریموٹ کنٹرول ڈور سسٹم کب فٹ کیا گیا سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک مرتبہ کچھ عرصہ قبل جب وہ تینوں بہن بھائی اپنے چچا کے ساتھ جولندن سے آئے تھے' سیر کرنے مری گئے تھے اور ان دنوں وجاہت نے کوٹھی کے پرانے ملازم فارغ کردیے تھے اور نئے رکھنے کے لیے اشتہار دے دیا تھا۔ پرانے ملازموں سے انہیں کچھ شکایتیں لاحق ہوگئی تھیں چنانچہ ان دنوں تہہ خانے کا جدید ریموٹ کنٹرول دروازہ فرش میں نصب کردیا گیا اور تہہ خانہ اس پرانی بلڈنگ کا حصہ ہوگا جو اُن کے والد نے خرید کر نئے سرے سے تعمیر کروائی تھی۔

یہ باتیں سوچتے ہوئے عمران کی نگاہ کمرے کے اندر مستقل فرش کے اس حصے پر جمی ہوئی تھی جو یکا یک شق ہوکر پھر برابر ہوچکا تھا اور کمرے سے اس کے والد وجاہت علی خان غائب تھے ایک ترکیب ذہن میں آتے ہی وہ مسکرادیا۔



وجاہت علی خان اگلے روز رات کے وقت بستر پر بے خبر سو رہے تھے' کمبل کندھوں تک ان کے شانوں پر موجود تھا۔ اس وقت ان کے بیڈ روم کا بیرونی دروازہ ماسٹر کی کے گھومنے سے کھل گیا اور ایک سیاہ پوش اندر داخل ہوا' اس کا چہرہ سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک واٹر پستول تھا' سیاہ پوش محتاط انداز سے چلتا ہوا وجاہت علی خان کے بستر کے قریب آکر رک گیا اس نے جیب سے رومال نکال کر اس پر کلوروفارم ملے پانی والی پھوار ماری اور پھر رومال وجاہت کی ناک پر رکھ دیا۔ وجاہت بالکل بے سدھ ہوگئے' ورنہ وہ کھانستے ہوئے اب اٹھنے ہی والے تھے۔ سیاہ پوش بے فکر ہوکر ان کے اتارے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا' جو بستر کی پچھلی دیوار پر موجود راڈ پر لٹکے ہوئے تھے لیکن سیاہ پوش کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی مطلوبہ شے اس لباس کی جیبوں میں موجود نہیں تھی۔ اب سیاہ پوش نے کچھ سوچ کر وجاہت کے سلیپنگ سوٹ اور پھر جب ان کے تکیے کے نیچے ہاتھ مارا تو اس کی انگلیاں کسی ٹھوس شے سے

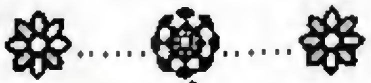
ٹکرائیں اس نے فوراً اس شے کو کھینچ کر باہر نکالا یہ ریموٹ کنٹرول تھا۔ سیاہ پوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کنٹرول کے بٹن اندازے سے دبانے شروع کردیئے کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کے ہاتھ صحیح پڑنے لگے اور فرش یکا یک شق ہوگیا۔ سیاہ پوش نے نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف جھانکا زینہ صاف ستھرا اور خوب صورت تھا ہلکی سی روشنی ایک ٹیوب سے پھوٹ کر اجالا کیے ہوئے تھی۔

سیاہ پوش پستول ہاتھ میں لیے نیچے اترنے لگا' ریموٹ کنٹرول اس نے جیب میں ڈال لیا اس کے آخری سیڑھی پر آتے ہی فرش کا خلا سرک کر برابر ہوگیا۔ سیاہ پوش سامنے موجود دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے زیرو کے بلب اس وقت روشن تھے سامنے کی سمت ایک تخت پر بچھے گدے پر وہ زخمی سرغنہ موجود تھا جس کا عمران نے تعاقب کیا تھا' عمران قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ تخت کے قریب ہی ایک ٹرالی پر کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں' کچھ اس بڑے شاپر میں تھیں جسے گھسیٹ کر وجاہت پورٹیکو سے بیڈ روم میں لائے تھے۔ پانی کی بوتلیں بھی موجود تھیں' اب عمران نے کمرے کی دیواروں کے ساتھ موجود سامان کا جائزہ لیا' وہاں ڈبوں اور بکسوں میں منشیات اور جعلی ادویات موجود تھیں۔ وہ مغرب کی سمت سے تہہ خانے میں داخل ہوا تھا' دراز قد زخمی سرغنہ جنوب کی جانب تخت پر پڑا تھا' سامان دیواروں کی ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ مشرقی سمت اور شمال کی جانب دکھائی دے رہا تھا۔

شمال کی جانب آگے جاکر ایک چھوٹا سا خوب صورت کانفرنس روم تھا جو شیشے کی دیوار سے ڈھکا ہوا تھا اس کے اندر گول دائرے کی صورت میں خوشنما نشستیں موجود تھیں اور چھت پر خوب صورت قمقمے بھی نصب دکھائی دے رہے تھے ایک بڑی ایل سی ڈی اسکرین' کمپیوٹر سسٹم انٹرنیٹ وغیرہ کا کیبن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ فیکس مشینیں بھی موجود تھیں' عمران نے کانفرنس روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ ایک دیوار پر مخصوص پوائنٹس کا نقشہ بھی موجود تھا۔

عمران نے تہہ خانے کی تیز روشنیاں آن کرکے موبائل کیمرے سے ماحول کی تصویریں اتار کر محفوظ کرلیں پھر جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر تخت پر لیٹے سرغنہ کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے قریب جاکر پھرتی سے اس کے ہاتھ پاؤں کھینچ کر جکڑ دیئے سرغنہ کسمسانے لگا پھر اسے چھینک آگئی وہ بیدار ہونے لگا اس وقت عمران نے زور سے ایک تھپڑ سرغنہ کے منہ پر مارا' سرغنہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمران کو دیکھنے لگا' وہ جانتا تھا کہ وجاہت کا بڑا لڑکا عمران جو کرائم رپورٹر ہے کس قدر خطرناک آدمی ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر پانی کی پھوار پھینکی جب وہ بے ہوش ہوگیا تو اس کی رسیاں کاٹ دیں۔

عمران تہہ خانے کے وسط میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور اسی ترتیب سے بٹن دبا دیئے فوراً ہی اوپر کمرے کا فرش سرک گیا اور وجاہت کا بیڈ روم دکھائی دینے لگا۔ عمران اوپر آکر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا' اس نے فیصلہ کیا کہ اب اگلی رات تہہ خانے میں جاکر سامان کو پریس اور میڈیا کی موجودگی میں پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔



وجاہت علی خان کانفرنس روم میں غصے سے ٹہلتے ہوئے اپنی پارٹی کے سیاستدانوں پر نظریں جمائے

ہوئے تھے۔

''یہ تو واقعی بڑی پریشان کن صورت حال ہے آخر آپ کے کمرے سے ریموٹ کنٹرول کس نے چرالیا؟ اور سرغنہ کو کس نے بے ہوش کیا' ہم خطرے میں ہیں۔ صبح آپ کا بیڈروم کا دروازہ بھی اندر سے کھلا تھا۔'' ایم این اے شوکت پرویز نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''میں نے پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی ہے' بچوں سے ملازموں سے سب سے پوچھا ہے لیکن سب لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ آج مجھے بھی سرنگ کے ذریعے ہی آنا پڑا ہے' پہلے گھر سے نکلا ہنجر وال گاؤں کے ایم پی اے کے ویران میٹنگ روم میں داخل ہوا پھر اس کے تہہ خانے میں موجود سرنگ کے ذریعے یہاں اپنے گھر کے تہہ خانے میں آیا۔ آپ لوگ تو خیر اسی طرف سے آتے ہیں لیکن میں......''

وجاہت غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ ''پوری طرح چوکنے رہو۔'' اس نے گفتگو روک کر اسٹین گنیں ہاتھوں میں لیے محافظوں سے کہا' زخمی سرغنہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

اس وقت اچانک کمرے میں دیوار کے پاس رکھے سامان کے ڈھیر کے پیچھے سے عمران کسی جاسوس کی مانند دونوں ہاتھوں میں پستول لیے باہر نکلا اور اس نے تیزی سے بے ہوشی کی دوا ملے پانی کی پوار مسلسل اسٹین گن بردار کے چہروں پر پھینکی دونوں بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ سرغنہ کو وہ دوبارہ بے ہوش کرچکا تھا' وجاہت علی اور دو سیاستدانوں نے ریوالور نکال لیے لیکن پانی کی پھوار برس چکی تھی وہ بھی بے ہوش ہوکر گرتے چلے گئے۔ دو گولیاں چلیں لیکن عمران پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا' اس کے سامنے اس کے گھر کا دوسرا کالا چہرہ بھی بے نقاب ہوچکا تھا اس کے ہمراہ کچھ اور کالے چہرے بھی جو معاشرے میں بڑے نیک نام خدمت گار مشہور تھے۔

ایک سیاستدان نے پھل کاٹنے والا چاقو پھینک مارا عمران جھک گیا اور وار خالی گیا' واٹر پستول کا پانی ختم ہوچکا تھا عمران نے دوسرے ہاتھ میں موجود پستول سے کار کی بیٹری کے تیزاب سے پھوار پھینکی وہ سیاستدان مسلسل چیخنے کی مشین بن گیا اس کا جسم جل گیا۔ باقی بچنے والوں کو قریب جاکر عمران نے ریوالور کے بٹ کنپٹی پر مار کر بے ہوش کردیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس تہہ خانے میں پولیس کے بڑے آفیسرز' میڈیا اور پریس کے نمائندے موجود تھے۔ وجاہت کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور کامران کو بھی لڑکیوں کی ننگی فلمیں بنانے بلیک میل کرنے کے جرم میں ہتھکڑیاں لگادی گئی تھیں۔ حکومتی پارٹی کے دوسرے کئی سیاستدان بھی گرفتار کرلیے گئے' جب وجاہت کو ہوش آیا تو عمران کی آنکھوں نے اپنے والد کی تمام تر مہربانیوں' پرورش کی ذمہ داریوں' حسن سلوک کے باوجود قانون کا بول بالا کردیا تھا۔ کمرے کی الماری سے ایسے شواہد مل گئے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ کالے چہرے والے سیاستدان ملک کی دولت باہر بھیج رہے تھے۔ یہ لوگ منشیات اور جعلی ادویات' جعلی شراب کی فروخت سے دولت کمارہے تھے' یہ سیاست کو جرائم کے لیے استعمال کرتے تھے۔

عمران نے کرن کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔



روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

سید اعجاز علی...... لاہور

جواب: یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

ذاکر علی...... پتوکی

جواب: ''یا علیم'' اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں' پڑھنے سے پہلے۔''یا قوی'' اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں سر پر ہاتھ رکھ کر نماز کے بعد۔

محمد ابراہیم...... نواب شاہ

جواب: ''یا لطیف یا ودود'' 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھ کر تصور میں لے کر گھر کے تمام افراد پر دم کیا کریں۔

کاظم رضا...... گجرات

جواب: فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان آیت 70,74 مرتبہ اول وآخر 11/11 مرتبہ درود شریف' جلد اور اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں۔

محمد سلمان...... میرپور خاص

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11-11 مرتبہ درود شریف' جاب اور معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔آپ بھی پڑھیں اور شوہر بھی' صدقہ بھی دیں۔

ارشاد احمد...... کراچی

جواب: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر دم کیا کریں ہر نماز کے بعد 3-3 مرتبہ۔ وظیفہ جاری رکھیں۔

زھب یاسر...... کراچی

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القریش 111 مرتبہ اول وآخر 11-11 مرتبہ درود شریف' جاب کے لیے دعا کریں۔

نوشاد احمد...... اسلام آباد

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القریش 111 مرتبہ اول وآخر 11-11 مرتبہ درود شریف' آسانی اور جلد رہائی کے لیے' صدقہ لازمی دیں۔

امامت علی...... منڈی بہاؤ الدین

جواب: سورۃ شمس اور سورۃ العصر 11-11 مرتبہ (اول وآخر 3-3 مرتبہ درود شریف) صبح شام پڑھ کر شوہر پر دم کیا کریں ہو سکے تو پانی پر دم کر کے بھی پلایا کریں۔نیت ہو کہ میری طرف اور بیٹی کی طرف توجہ دیں۔

زین کرامت...... لاہور

جواب: آپ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھا کریں فجر اور عشاء کی نماز کے بعد 21-21 مرتبہ اول وآخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

سورۃ یٰسین 1 مرتبہ فجر کی نماز کے بعد تمام معاملات ٹھیک ہونے کے لیے دعا کیا کریں' صدقہ بھی دیں۔

ایس خان...... سوات

جواب:۔ بعد نماز فجر، سورۃ یٰسین ایک مرتبہ۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 74،70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔(جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں)

جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل (اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیا کریں، چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال

میں آنے۔

علی ارشد...... ساهیوال

جواب:۔(۱)سورۃ اخلاص 11 مرتبہ پڑھ کردم کرلیا کریں۔اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

(۲)سورۃ عبس روزانہ ایک مرتبہ پڑھ کر دم کریں پانی پر بھی دم کر کے پی لیا کریں آپ دونوں۔

(۳)قرآن کریم کی آیات ثواب کی نیت سے پڑھنا اور کسی دنیاوی مقصد سے پڑھنا دونوں میں فرق ہے۔

نورالدین...... نیو کراچی

جواب:۔سورۃ عصر روزانہ 21 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلائیں اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

استخارہ کرلیں۔سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف، (جلد اور اچھے رشتے لیے دعا کریں)

اقبال احمد...... سرگودھا

جواب:۔امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک روزانہ 3 مرتبہ سورۃ عبس بعد نماز عشاء پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں اور پانی پر دم کر کے بھی پئیں۔

فاخر علی...... رحیم یار خان

جواب:۔سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔تصور رکھیں جہاں آپ کا دھیان ہے وہاں کا بھی۔(جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں) بچی کا صدقہ دیں۔ جہاں حق میں بہتر ہو ہو جائے (بچی خود پڑھے)

سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز عشا دعا بھی کریں۔(والدہ بھی پڑھ سکتی ہیں)

سمیرا نورین...... سرگودھا

جواب:۔بعد نماز فجر سورۃ رحمٰن کی تلاوت کیا کریں اور دعا کیا کریں۔



> نوٹ
> جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
> ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
> rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اپریل 2015ء

نام.................. والدہ کا نام.................. گھر کا مکمل پتا..................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں..................

منور آنگن

عفان احمد

مختصر مگر پُراثر

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں' فرماتے ہیں میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہوگئی اور سزا میں تلخی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاک گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

اقبال احمد..... قصور

پیر کے دن چھ خصوصیتیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پیر کے دن کو آقائے نامدار تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ:۔

- پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔
- پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔
- پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن حجر اسود کو اپنی جگہ رکھا۔
- پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے غارِ ثور سے سفر کی ابتداء فرمائی۔
- پیر ہی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

(مسند احمد: ۱/۲۷۷' رقم حدیث ۲۵۰۶)

انتخاب: عرفان اسلم..... کراچی

انتظار

ایک پاگل دوسرے سے "یار اگر کوئی ہاتھی درخت پر چڑھ جائے تو اترے گا کیسے؟"

دوسرا پاگل "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے' کسی پتے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے گا۔"

☆☆☆

شروعات

ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے کہا کہ "بھائی صاحب! کل تمام دن آپ کا کتا بھونکتا رہا جس کی وجہ سے میری بیوی گانے کی پریکٹس نہ کرسکی۔ عجیب کتا ہے آپ کا؟"

"دیکھئے بھائی صاحب!" پڑوسی نے جواب دیا۔ "شروعات آپ کی بیوی ہی کرتی ہے۔"

مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

حسن اور دوستی

فن کا منبع' فن کی روح ہے جب روٹی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے' اہرام مصر بناتا ہے' الحمرا کے طلسماتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کالی داس "شکنتلا" ملٹن "گم شدہ جنت" اور اقبال "جاوید نامہ" لکھتا ہے لیکن جب فن سے روٹی بچھڑ جاتی ہے تو شکنتلا مر جاتی ہے اور جاوید نامہ ردّی میں بکنے لگتا ہے پھر حسن مر جاتا ہے' مذہب مر جاتا ہے بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

...کمال بھٹی ......گھوٹکی، سندھ

خوب صورت باتیں

◉ جب آدم کی اولاد سے حیا' مروت وخلوص اور پاکی اٹھ جائے تو وہ انسان کے بجائے صرف مٹی ہی رہ جاتے ہیں اور بھلا مٹی سے امیدیں کیسی؟

◉ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہے' رشتے قائم کیے جاتے ہیں اور سودے طے کیے جاتے ہیں۔

جاوید یوسف......راولپنڈی

کیا آپ جانتے ہیں؟

□ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآنِ مجید لکھتا تھا۔

□ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا ہے۔

□ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

□ حرم شریف کے اندر دنیا کے چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

□ دنیا کا سب سے بڑا بلب پچاس کلوواٹ ہے اور یہ جاپان نے تیار کیا تھا۔

□ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکہ میں ہوتی ہے۔

□ درختوں میں سب سے پہلا کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔

□ انارکلی کا اصلی نام نادرہ بیگم تھا۔

□ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔

□ دنیا کا پہلا پاکٹ ٹیلی فون 28 اگست 1989ء میں بنایا گیا۔

انتخاب: نسیم قریشی......شاہ پور چاکر

کھڑے ہوکر پانی پینے کے نقصانات

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق پانی پینے کی چھ سنتیں ہیں۔

پانی ہمیشہ بیٹھ کر' بسم اللہ پڑھ کر' سیدھے ہاتھ سے دیکھ کر' تین سانس میں پینا چاہیے۔ پانی پینے کے بعد الحمدللہ کہنا چاہیے اس لیے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پانی پینا چاہیے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی نہ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں' جو درج ذیل ہیں۔

□ کھڑے ہوکر پانی پینے والا انسان شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

□ کھڑے ہوکر پانی پینے سے پیاس نہیں بجھتی۔

□ کھڑے ہوکر پانی پینے سے انسان کا پیٹ بڑھتا ہے۔

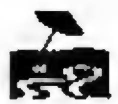
□ کھڑے ہوکر پانی پینے سے مثانہ میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔

□ کھڑے ہوکر پانی پینے سے شوگر کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔

□ کھڑے ہوکر پانی پینے سے انسان کا نظام انہضام خراب ہوجاتا ہے۔

□ ان تمام بیماریوں سے بچنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی پینا چاہیے۔

محمد حنیف......منڈی بہاؤالدین



خوشبو سخن

عمرا احمد

شہر تمنا

اک شہر تمنا ہو
جہاں پھولوں کا بسیرا ہو
کانٹوں کی چبھن زخموں کی رفو گر ہو
سورج کی تپش ہر گھر کے لئے شبنم ہو
جہاں چاند کی کرنیں
ہر دل کے لئے روشن ہوں
اک ایسا شہر تمنا ہو
سب موسم اللہ کی عنایت ہوں
جہاں مقدر کا ستارہ
ہر اک کے لیے چمکتا ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

میں ظلمتوں کے دیے اس طرح بجھاؤں گی
کہ اپنے خوں سے اندھیروں کو پھر مٹاؤں گی
کبھی نہ شکوہ شکایت زبان پر آئے گا
ہزار ظلم بھی سہہ کر میں مسکراؤں گی
میرے وجود سے عالم میں روشنی ہوگی
میں بوئے گل کی طرح جگ میں پھیل جاؤں گی
ہر ایک دل میں میرے عشق کے تذکرے ہوں گے
میں جان دے کر تیری انجمن سجاؤں گی
جو اپنے غم کو دلوں میں چھپا نہیں سکتے
میں کیسے دکھ کی کہانی انہیں سناؤں گی
بھٹک نہ جائے اندھیرے میں راہبر کوئی
میں آنسوؤں کے دیئے راہ میں جلاؤں گی
کبھی تو میری صدا عرش کو ہلائے گی
کبھی تو حال میں اپنا انہیں سناؤں گی
نجانے کس نے بچھائے ہیں خار راہوں میں
میں پھول بن کے تیری راہ پھر سجاؤں گی
میرے وطن کی فضائیں ہیں سوگوار غزل
میں جان دے کر انہیں پھر سے جگمگاؤں گی

سلمیٰ غزل...... گلشن، کراچی

غزل

وہ حسن جمال رکھتا ہے
غم سے رشتہ بحال رکھتا ہے
مجھ کو اس نے اداسیاں بخشیں
کتنا میرا خیال رکھتا ہے
رونے دیتا نہیں جو روں تو
وہ ہنر باکمال رکھتا ہے
گرنا چاہوں تو گرنے نہیں دیتا
کون مجھ کو سنبھال رکھتا ہے
مجھ کو اس کی تلاش ہے رانا
چہرہ جو بے مثال رکھتا ہے

قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

دلوں میں رہتے زمانے میں نام بھی کرتے
جو اور روز جہاں بھی قیام بھی کرتے
ہمارے حق میں بھی کچھ فیصلے ہوئے ہوتے
جو ہم سخن کے سوا اور کام بھی کرتے
کہاں نصیب تھی خوش قسمتی نصیبوں سے
ہمارے گھر بھی وہ آتے قیام بھی کرتے
ہمیں بھی کرتے زمانے میں رشک کے قابل
ہمارے نام کوئی اپنی شام بھی کرتے
خبر جو ہوتی کہ تم لوٹ آؤ گے اک دن

ہم اپنے جینے کا کچھ انتظام بھی کرتے
کہاں نصیب تھیں آزادیاں کہ ہم تیری
سفر بھی ساتھ میں کرتے قیام بھی کرتے
نیر رضوی..... کراچی

نظم

گر میری امانت ہے وجود تیرا
تو پھر یہ دوری نصیب کیوں ہے
میں مانتا ہوں حیا ہے تیری
جو تجھ کو مجھ سے ہے دور رکھتی
دکھ مگر اس بات کا ہے
کوئی غیر تیرے قریب کیوں ہے
وہ جو کل کھڑا تھا تیرے در پر
وہ جس سے مل کے تو کھل اٹھی تھی
کیا بگاڑا ہے میں نے اس کا
وہ شخص میرا رقیب کیوں ہے
جب پوچھے اس نے میرے اثاثے
دکھا دیئے میں نے دل کے جذبے
مسکرا کر پھر کہہ اٹھی
تو سب سے اتنا عجیب کیوں ہے
لوگو! ذرا انصاف کرنا
خدارا یہ انصاف صاف کرنا
وہ اس بات سے ہیں مجھ پر برہم
کہ میرا عشق حد سے شدید کیوں ہے
بن گیا ہوں سرِ عام مجرم
پھر وضاحتوں کی اب کیا ضرورت
جرم تیرا فاروق یہ ہے
کہ آخر تو غریب کیوں ہے
عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

یادیں

یادوں کی لہریں
جب میرے دل کے سمندر میں
مدوجزر پیدا کرتی ہیں
تو کتنے ہی ارماں
لاوارث لاشوں کی طرح
اس میں بہہ جاتے ہیں
مہر پرویز احمد دولو..... چک 123 میاں چنوں

یادیں

میں نے اپنے رخ روشن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے درپن کو بہت یاد کیا
ایک دوشیزہ گلشن کو بہت یاد کیا
میں نے جب اپنے نشیمن کو بہت یاد کیا
آئینہ جب بھی حالات کا دیکھا میں نے
اپنے بیتے ہوئے جیون کو بہت یاد کیا
پھر لگاتار برستے رہے آنسو میرے
جب بھی میں نے تیرے دامن کو بہت یاد کیا
جس سے رہتی تھیں درخشاں میری راتیں اکثر
میں نے اس چاند سی دلہن کو بہت یاد کیا
دیکھ کے روتی ہوئی اپنی جوانی میں نے
اپنے ہنستے ہوئے بچپن کو بہت یاد کیا
جب بھی تنہائی میں چھیڑا غم جاناں نے مجھے
میں نے خوشیوں بھرے آنگن کو بہت یاد کیا
محفل دوست سے اک زخم تمنا کھا کر
آج دل نے میرے دشمن کو بہت یاد کیا
جس نے بخشی تھی میرے جسم کو خوشبوئے چمن
اس مہکتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا
ادیب سمیع چمن..... حیدر آباد



آخری قسط

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جوروجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے' اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ "جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

بمشکل پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک مصیبت کھڑی ہوگئی۔ آس پاس کے رہنے والوں کو پتہ چل گیا کہ نیا کرائے دار اپنے وقت کا خطرناک ڈاکو ہے جو پیرول پر چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈر کے مارے وہ گھر میں رہنے لگے۔ چالی میں سونے والے اندر سونے لگے۔ چندن کور تنہا ہوتی تو عورتیں آ کر اسے کہتیں۔

"بہن! تم لوگ مکان نہیں چھوڑ سکتے؟ ہم رات کو سو نہیں سکتے' کیونکہ اعصاب پر تمہارے شوہر کا خوف مسلط رہتا ہے۔"

چندن گڑگڑاتی۔ "اب صرف ڈیڑھ ماہ رہ گیا ہے۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہو کہ تم لوگوں کو ہم سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" پھر حلق صاف کر کے کہتی۔ "وہ ڈاکو تھے مگر انہوں نے دشمن کے علاوہ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔" مگر یہ بات کسی کے دل میں نہ اتری۔ تب چندن کور کا دل گھبرانے لگا۔ نہ تو وہ کسی کو اپنی بات پر مجبور کر سکتی تھی اور نہ ہی جگت سے کچھ کہہ سکتی تھی۔

"تم اداس کیوں رہتی ہو؟ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟" جگت نے کئی بار اس سے پوچھا۔

آخر چندن اس کا سوال برداشت نہ کر سکی۔ وہ رو دی۔ "تم سے کہتے ہوئے زبان نہیں کھلتی۔"

"چندن! جو کچھ ہے بتاؤ میں تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔"

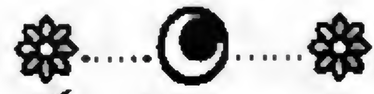
چندن اسے دیکھتی رہی۔ جگت کے لہجے میں اسے سچائی نظر آئی۔ اس نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "یہاں کے لوگ مکان خالی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ ان کو تم سے ڈر لگتا ہے۔"

یہ سن کر جگت کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ صبح سے شام تک باہر رہتا تھا' کسی سے نظر تک نہ ملاتا تھا' بلند آواز سے بات نہ کرتا تھا پھر بھی لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ ڈاکو کا ماضی پرچھائیں کی طرح اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ سماج کیا پھر اسے اسی راہ پر ڈال دینا چاہتا ہے؟ وہ سوچتا۔ اچھا آدمی بننے کے لیے مزدوری کی بے عزتی برداشت کی۔ نصف روٹی

گزارا کیا پھر بھی سب لوگ ایسے اچھا آدمی بننے سے روک رہے ہیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ چندن کور نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

"اب کیا کریں گے؟"

"اس کا جواب کل صبح دوں گا۔" یہ کہہ کر جگت پھر سوچ میں ڈوب گیا۔



وہ رات جگت نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح تک اسے فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ جیل میں لوٹ جانا یا چالی کے کرائے داروں سے کہہ دینا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ تم کو اگر ڈر لگتا ہے تو تم لوگ چلے جاؤ۔ دیکھتا ہوں کون مجھے نکالتا ہے؟ مجھے سیدھی طرح جینے دو ورنہ کیا......؟ جگت کے دل نے آواز دی۔ سوال پوچھا گیا جو سامنا کرے گا اس کا گلا دبا دوں گا ابھی کلائیوں میں اتنی طاقت ہے، میں بغیر اسلحہ کے بھی دو چار لاشیں گرا دوں گا۔

"لاشیں گرا کر کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟"

"بدلہ لوں گا...... جیسا تھا ویسا ہو جاؤں گا۔"

"بدلہ...... اب کون ہے، جس سے تم بدلہ لو گے؟"

"سماج سے بدلہ لوں گا جو مجھے چین سے جینے نہیں دیتا۔ یہ مطلبی دنیا میری دشمن ہے، مرتے وقت تک کسی کو چین سے نہیں جینے دوں گا۔"

"پھر دوست کی ضمانت، مہتا کا اعتماد؟ اور چندن کور کی حسرتوں کا کیا بنے گا؟" اس کا جواب نہیں مل سکا تو وہ رضائی ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کھلی کھڑکی سے سنسان محلے کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنے ماضی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ختم ہونے والے دشمن پھر نظر میں آ گئے ہیں۔ جدا ہونے والے ساتھی یاد آئے۔ بغیر کسی دوست یا دشمن کے زندگی کیسی پھیکی ہے؟ اس نے سوچا، بچن اور اچلا کہاں ہوں گے؟ ہوشیار کیا کرتا ہو گا؟ کیا وہ لوگ مجھے بھول گئے ہوں گے؟ وہ اپنی زندگی کے جھمیلوں میں اتنے الجھ گئے ہوں گے کہ میری کچھ خبر ہی نہیں لیتے؟ مگر اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے خود ان کو جدا کیا ہے، جہاں ہوں گے، اپنا ماضی چھپا کر جی رہے ہوں گے۔ بھگوان کرے ان کی زندگی پر پولیس کا سایہ نہ پڑے۔ اسی لمحے راستے سے ایک سایہ بلڈنگ میں داخل ہوا۔ جگت نے آنکھیں تیز کر کے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی، مگر سفید داڑھی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تب اس نے آواز دی۔

"کون ہے......؟"

وہ شخص لرز گیا۔ "میں ہوں۔" جواب ملا۔ "کونے کی کوٹھری والا سردار جی۔"

"اوہ!" جگت جھینپ گیا۔ "ست سری اکال۔" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا جس مکان کے کرائے داروں کو اس کا پڑوسی اچھا نہیں لگتا اس کی چوکیداری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر دانت پیس کر بڑبڑایا۔

"کوٹھری خالی کرنے کی فکر میں کیوں اپنی نیند حرام کر رہا ہوں؟ ایک بار فیصلہ کر لیا کہ نہیں جانا تو بس! بات ختم ہوئی۔ کرایہ داروں کی ایسی تیسی۔ جگا زیادہ بھلائی دکھاؤ گے تو بزدل بن جاؤ گے۔ سالے میرے سامنے آنکھیں نہیں اٹھاتے اور میری بیوی کو مکان خالی کرنے کے لیے پریشان کرتے ہیں۔ بس اب ادھر یا ادھر......!"

خیالات کو ذہن سے جھٹک کر جگا سونے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ برابر سوئی ہوئی چندن کور کو چادر اوڑھانا چاہتا تھا کہ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ جگا کے کانوں سے ٹکرائے۔

"نہیں نہیں...... وہ ایسے نہیں ہیں۔" چندن نیند میں بڑبڑائی۔ پھر چار چھ الفاظ سمجھ میں نہ آئے۔ البتہ آخری جملہ یہ سنائی دیا۔ "وہ خاندانی ہیں۔ تم سے بڑھ کر ہیں۔"

جگت نے سرد آہ بھری۔ نیند میں بھی وہ میری فکر کرتی ہے اس نے سوچا پھر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہیں یہ فکر اسے پاگل نہ کر دے۔ میرا ایک غلط قدم اس کی زندگی برباد کر دے گا۔ سے سو پر مہتا پر غصہ آیا۔ مجھے انہوں نے اتنے سخت امتحان میں کیوں ڈال دیا؟ اسی طرح جگت نے ساری رات گزار دی۔

صبح چندن نے اٹھ کر دیکھا تو چونک پڑی۔ جگت گھر کا

سامان تھیلوں میں بھر رہا تھا۔

"یہ کیا کررہے ہو؟" چندن نے حیرت سے پوچھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ ہو۔ "تم کب بیدار ہوئے؟"

"سویا ہی کون ہے؟" جگت نے نصف بھرے تھیلے کو ہلا کر کہا۔ "دن طلوع ہونے کا انتظار کررہا تھا۔"

چندن کور جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ وہ جگت کا ارادہ سمجھ گئی تھی۔ "دوسرا سہارا تلاش کیے بغیر ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟" چندن محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"یہ تو پتہ نہیں۔" جگت سنجیدہ ہوگیا۔ "اب یہاں سے دل اٹھ گیا ہے۔"

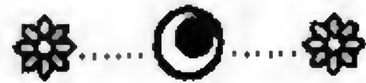
سوا ڈیڑھ ماہ دکھ سکھ کی طرح کاٹ ہی دیں گے۔" چندن کور کے چہرے پر صبح کی دھوپ کا سا اجالا پھیل گیا۔ پچھلی رات اس نے بھیانک خواب دیکھا تھا۔ جگت پڑوسیوں سے مار دھاڑ کرچکا تھا۔ دو چار زخمی کردیے تھے۔ پولیس آئی اور اسے ہتھکڑی پہنا کرلے گئی۔ وہ اور ست پال روتے رہ گئے تھے۔ وہ بند آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب کی کھلی آنکھوں سے الٹی تعبیر دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں اٹھتے ہی چل پڑنے کے لیے کس نے کہا تھا؟" پھر ہاتھ سے سامان چھین کر بولی۔ "آج تمہاری چھٹی ہے اس لیے آرام سے جائیں گے۔"

جگت اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کھڑے ہوکر چندن کور کو اپنے قریب کھینچ لیا اور بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "غلام تمہارا حکم ماننے کے لیے آمادہ ہے۔"

"ارے چھوڑو! کھڑکی کھلی ہے۔" چندن نے مصنوعی غصے سے کہا تو جگت نے اور زور آزمایا۔

"کھلی رہنے دو پڑوسیوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ڈاکو بھی پیار بھرا دل رکھتا ہے۔" یہ سن کر چندن نے اپنے بازو اس کی پشت کے گرد کس لیے۔



ڈھلتی دوپہر کو کوٹھری خالی کرکے تینوں چل پڑے۔ جگت نے تھانے پر تھیلا اٹھایا اور چندن کور نے ست پال کو ساتھ لیا۔ ان کو سامان کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر پڑوسیوں کو تعجب ہوا اور ساتھ ہی سکون بھی ہوا۔ جگت ساتھ تھا اس لیے کوئی عورت چندن سے پوچھنے کی ہمت نہ کرسکی کہ کہاں جاؤ گے؟ کیا دوسری جگہ مل گئی ہے؟ تینوں چپ چاپ سیڑھیاں اترنے لگے۔ جگت نے سب کی طرف ناراضگی کی نظروں سے دیکھا اور آنکھوں میں ڈانٹا' سالے بزدل۔ اس نے سوچا' اگر کسی سے کچھ نہ کہنے کی چندن کو یقین دہانی نہ کرائی ہوتی تو وہ سب کو کھری کھری سنا دیتا۔ وہ چھوٹا سا میدان عبور کرکے بڑے دروازے کے قریب رک گیا۔ گھوم کر اس نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہوئے لوگوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ بے چارے مارے ڈر کے گھروں میں چھپ گئے۔ ان کی حالت پر جگت ہنس دیا۔

"چلو!" کچھ آگے گئی ہوئی چندن نے آواز دی اور جگت نے قدم بڑھائے۔

"ارے..... تم لوگ کہاں جارہے ہو؟" سامنے سے آنے والے سردار جی نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو سنا تھا کہ تم لوگ ابھی یہیں رہوگے۔" اس کی سفید داڑھی اور آواز سے جگت پہچان گیا کہ رات جسے آواز دی تھی وہی سردار جی ہیں۔

"ہم تو رہنا چاہتے تھے مگر تم لوگوں کو ہمارا پڑوس کھٹکتا ہے۔ اس لیے جارہے ہیں۔" جگت نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

چندن کور کو ڈر لگا کہ کہیں جاتے وقت وہ لڑ نہ پڑے اس لیے فوراً بول پڑی۔ "یہ ڈاکو تھے' جیل سے آئے ہیں' لہٰذا بے چارے پڑوسی گھبرا رہے ہیں۔"

سردار جی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

"یہ تو ہمیں بھی پتہ نہیں ہے۔" چندن کور کی آواز میں لاچاری تھی۔

"ارے کوئی اس طرح جاتا ہے؟" سردار جی نے محبت بھری سختی سے کہا۔ "ان جیسا ڈاکو مکان میں رہتا ہو تو چوری

وغیرہ کا ڈر نہیں رہتا۔" پھر وہ بلند آواز میں بولے۔ "کل رات میں مکان میں داخل ہوا تو انہوں نے ایسی آواز دی کہ میں اپنے گھر میں آنے کے باوجود ڈر گیا۔"

جگت کو فخر سا ہوا یہ آدمی اسے پوری طرح پہچان گیا ہے۔ پھر بھی لوٹنا چھوٹی بات تھی۔

"سردار جی! تمہاری ہمدردی کا شکریہ۔ مگر دوسرے لوگ تمہارے جیسے سمجھدار نہیں ہیں۔" مگر سردار جی نے جگت کے شانے سے تھیلا اتار لیا اور اندر جانے لگے۔ "تم لوگ اس طرح گھر چھوڑ کر جاؤ اس میں ہماری عزت جائے گی۔"

پھر بھی جگت اور چندن دروازے پر کھڑے رہے۔ سردار جی ان کی الجھن سمجھ گئے۔ وہ زور سے بولے۔ "ارے کرائے دارو! اپنے چہرے تو دیکھو ایسے مرد کو یہاں سے نکالنے کی تمہاری کیا حیثیت ہے؟" مگر کون جواب دیتا؟ سردار جی کا جوش بڑھا۔ انہوں نے پھر ہانک لگائی۔

"یہ جگا اب یہیں رہے گا۔ جسے اختلاف ہو باہر آئے۔" جگت کو لطف آ گیا۔ اس نے چندن کور کی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کہ دونوں سوچتے کہ کیا کریں' سردار جی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ کوٹھری کھول کر سامان اندر ڈالتے ہوئے بولے۔ "اب وہاں کیا کھڑے ہو؟ اوپر آ جاؤ۔" پھر نرم لہجے میں کہا۔ "اس بزرگ کے سفید بالوں کی عزت رکھ لو۔"

چندن کور آگے بڑھی۔ پھر جگت بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ جس کوٹھری کو پانچ منٹ قبل وہ خالی کر گئے تھے اسی کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے دونوں کو عجیب سا لگا۔ سردار جی خوش ہوتے ہوئے بولے "اس خوشی میں جگا! آج رات گانے بجانے کا پروگرام کریں گے۔ مالک مکان موہن لعل کو بلائیں گے۔ سارے گاؤں کو پتہ چلنا چاہیے کہ جگا ہمارا پڑوسی ہے۔"

ان کی مسرت دیکھ کر چندن کور کا دل بھر آیا۔



بعض اوقات آفت بھی رحمت بن جاتی ہے جگت کو اس کا تجربہ ہونے لگا۔ جو پڑوسی چندن کور کو کوٹھری خالی کرنے کے لیے کہہ رہے تھے وہی اب اسے سنبھال کر رکھنے لگے۔

"بہن! آج مٹھائی بنائی ہے اصلی گھی کی' اپنے شوہر کو چکھانا۔" پڑوسیوں کی محبت نے چندن کو بڑی الجھن سے آزاد کر دیا۔ مالک مکان کی دو جوان لڑکیاں چندن اور ست پال کو اپنے گھر لے جاتیں۔

"ہمیں جگا کی باتیں سناؤ۔" ویرو کی بات آتی تو دونوں بہنیں تعجب سے پوچھتیں اپنے شوہر کی محبوبہ کی اس طرح کھلے دل سے بات کر رہی ہو جیسے تم کو ویرو سے ذرا بھی جلن نہ ہو۔"

چندن مسکراتی۔ "مجھ میں یہ بات نہیں ہے اور مجھے سیکھنی بھی نہیں ہے۔"



پیرول کے پونے تین ماہ جگت نے بحفاظت گزار دیئے تو پولیس والوں کو فکر ہوئی۔ جگا ذرا بھی گڑبڑ کیے بغیر پیرول کے تین ماہ گزار دے گا۔ اس ڈاکو کو ایک بار بھی جوش میں نہیں لایا جا سکا؟ پولیس افسر سوچتے۔

جگت پر گہری نظر رکھی جاتی۔ کوئی نئی آفت کھڑی ہوتی تو پولیس ڈیپارٹمنٹ اس کی بدنامی کے لیے شکاری کی طرح تیار ہو جاتا مگر آخری لمحے آفت کے بادل چھٹ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتے۔

اس آدمی کو کسی غیبی قوت کا سہارا ہے...... ورنہ سارے داؤ الٹے نہ ہو جاتے۔ پولیس چیف کے کان میں یہ بات بھی آئی تھی کہ وزیر اعلیٰ نے جگا پر نظر رکھنے کے لیے اپنا خاص آدمی بھیجا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس ڈر کے مارے جگا کو کسی جھوٹے کیس میں پھانسنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی مگر پیرول کا ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو ان کا ضبط جواب دے گیا۔ ان کو جگا کو جذبات میں لانے کا کھلا تجربہ کرنا پڑا......!

چھٹی کا دن تھا' جگت کی انگلی تھامے ست پال جگت کے ساتھ حاضری لگوانے جا رہا تھا۔ پیرول کے دن کم

ہوتے جارہے تھے۔ ہر دن اسے سزا میں سے کم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ جیل میں رہنے سے باہر کا ماحول اسے سزا جیسا معلوم ہوتا تھا۔ قدم قدم پر اسے احتیاط رکھنا تھی۔ بے عزتی برداشت کرنی تھی۔ کوئی ناانصافی ہو رہی ہو تو درمیان میں نہیں پڑنا تھا۔ یہ سب اصول قید کی زنجیروں سے زیادہ وزن دار تھے۔

"باپو! تم روز روز جیل کیوں جاتے ہو؟" راستہ چلتے ہوئے ست پال نے پوچھا۔ "وہ ہمارے گھر کے پاس جو لڑکا رہتا ہے کہہ رہا تھا کہ خراب آدمی جیل جاتے ہیں۔ تم تو خراب آدمی نہیں ہو پھر بھی......!" اس کی بات ختم ہو اس سے پہلے عقب سے آتی ہوئی تیز رفتار پولیس جیپ نے جگت کو ہوشیار کردیا۔ پہلے تو گھوم کر دیکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر جیسے جگا کے اندر سے کسی نے کہا ہٹ جاؤ! جلدی سے ہٹ جاؤ اور پھر جگت نے جلدی سے لڑکے کو راستے سے دور دھکیل دیا اور جسم کو سمیٹ لیا۔ اسی لمحے جیپ سرسراتی ہوئی قریب سے گزر گئی مگر کہنی کے قریب کرتے کی آستین پھٹ گئی۔ کئی لوگ چیخے بھی۔ "ارے کیا ہوا؟ بے چارہ ذرا سا بچ گیا۔" پھر کچھ دور بریک کی آواز کے ساتھ جیپ رکی، پھٹی ہوئی آستین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگا کا دماغ قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے پولیس جیپ کو گھورا اور دانت پیس لیے۔ گالی دینے کے لیے زبان میں ہلچل سی ہونے لگی مگر ست پال اس سے چمٹ گیا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"باپو! تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"

بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگت کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ ست پال ساتھ نہ ہوتا تو وہ اس طرح کھڑا نہ رہتا بلکہ جیپ کے ڈرائیور کی گردن پکڑ کر دو تین تھپڑ ضرور لگا دیتا۔ ابھی ارادہ ملتوی نہیں ہوا تھا کہ کھڑی ہوئی جیپ سے افسر ٹائپ کا ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ آدمی قریب آیا تو ہاتھ آزماؤں گا۔ جگا سوچ رہا تھا مگر وہ بیٹھا بیٹھا ہونٹ چبا رہا تھا۔ شاید جگا کے مزاج کا اندازہ کر رہا تھا۔ آٹھ دس آدمی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دھیمے لہجے میں ایک نے گالی دی۔

"سالے! اندھوں کی طرح چلاتے ہیں......ان سے کون پوچھنے والا ہے؟ کون پوچھنے والا ہے؟" یہ الفاظ جگت کو کھٹکے۔ وہ آستین چڑھا کر لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا مگر جیپ دوڑنے لگی۔ جگت کو شرمندگی ہوئی۔ حالانکہ اسے خبر نہیں تھی کہ امتحان کی گھڑی گزار کر قدرت نے دوسروں کو شرمندہ کیا تھا۔



"اب دو دن باقی رہ گئے ہیں۔" چندن کور نے مسرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ "پھر وہی جدائی۔"

"دو نہیں صرف ایک دن چندن!" جگت نے مسکرا کر کہا۔ "کل صبح کی گاڑی میں تمہیں بھیج کر شام کو میں جیل چلا جاؤں گا۔"

"نہیں......میں تمہیں جیل روانہ کرکے پھر گاڑی پکڑوں گی۔" چندن کور مضبوط لہجے میں بولی۔ "تمہیں مہتا کے سپرد کرکے جاؤں گی۔"

"سچ کہنا چندن! تمہیں ڈر ہے کہ میں بارہ گھنٹے تنہا رہا تو کوئی طوفان اٹھا دوں گا؟" جگت نے پرمذاق انداز میں پوچھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ابھی تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہوا۔"

چندن نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم پر تو پورا اعتماد ہے، مگر تقدیر آخری لمحے میں دغا نہ دے جائے یہ ڈر لگتا ہے۔ میرے نصیب میں یہی چکر رہا ہے۔"

جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ جدا ہوتے ہوئے چندن کور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی بیوی بیٹے کو گاڑی میں بٹھا کر رخصت کرنے کا زندگی میں ایک موقع مل رہا تھا وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رشتے دار گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہوں، انجن کی سیٹی بجے اور گاڑی حرکت میں آئے وہ گھڑی عجیب ہی پرلطف ہوتی ہے۔ آج تک ہمیشہ چندن سے چھپ چھپا کر ملنا اور جدا ہونا یہی ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کے سامنے اسے "پھر ملیں گے" کہنے کی خواہش وہ دبا نہ سکا۔ اس نے درمیان کا راستہ

نکلا۔

"ہم ایسا کریں گے شام کی بجائے میں صبح جیل لوٹ جاؤں گا۔ تمہاری گاڑی روانہ ہو اس کے بعد اسٹیشن سے سیدھا مہتا کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب تو مطمئن ہو؟" جواب میں چندن صرف مسکرا دی۔ اسٹیشن سے جیل تک کا راستہ بھی اسے لمبا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے سارے راستے فکر رہے گی۔ اس نے یہ بات جگت کو نہ بتائی۔

زندگی میں پہلی بار تین ماہ تک کھلے عام ساتھ رہنے کے بعد دونوں جدا ہو رہے تھے۔ گاڑی کی روانگی میں پندرہ منٹ کی دیر تھی۔ ست پال کو اب باپو سے محبت ہو گئی تھی۔

"باپو! تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔ چندن خاموش رہی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں جگت کو مشورہ دے رہی تھیں۔ "سنبھل سنبھل کر۔" جیل پہنچ جانا! آخری ڈیڑھ ماہ سے ایک خاص بات اس کی زبان پر آ کر لوٹ جاتی تھی۔ ابھی کہے یا نہیں؟ اس الجھن میں تھی۔

"پہنچ کر فوراً خط تحریر کرنا۔" جگت نے اسے پانچویں بار کہا تب چندن بولی۔

"اس سے پہلے آپ جیل پہنچنے کا تار دیں گے۔ گھر جاتے ہی مجھے خوشخبری سننی ہے۔"

دونوں کی نظریں بار بار ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں۔ سیٹی بجی تو جگت نے چندن کور کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"ست پال کا خیال رکھنا۔" چندن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ جی بھر کر جگت کو دیکھ لینا چاہتی تھی۔ کہیں آنسو درمیان میں نہ آ جائیں اس لیے اس نے جلدی سے آنکھیں خشک کر دیں پھر اس نے بمشکل کہا۔

"اب اکیلے ست پال کا نہیں، تمہارے دوسرے بچے کا بھی خیال رکھنا ہے......" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ شرم سے نیچے دیکھنے لگی۔

"اچھا......؟" جگت چونک پڑا۔ جوش سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ پلیٹ فارم سے بوگی میں جا کر چندن کو پیار کرے۔

"تم نے آج تک مجھے کیوں نہیں بتایا؟" حرکت کرتی ہوئی گاڑی کے ساتھ پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے اس نے پیار بھری سختی سے پوچھا۔ "بتاؤ! اس بار لڑکا ہوگا یا لڑکی؟" وہ دوسروں کی موجودگی بھول کر پوچھنے لگا۔ گاڑی تیز ہو رہی تھی۔

"جو بھی ہو......" چندن کور نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ "تمہیں تمہارے آنے والے بچے کی قسم دے کر کہتی ہوں کہ سیدھے جیل پہنچ جانا۔" چندن کور کی آواز دور ہوتی گئی اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی۔ جگت کافی دیر تک نظروں سے اوجھل ہوتی گاڑی کو دیکھتا رہا۔



"جگا آیا...... جگا آیا......" جگت جیل کے دروازے میں داخل ہوا اور قیدیوں نے شور مچا دیا۔ وہ مسرت سے چیخ رہے تھے۔ سلامت واپس آ گیا۔ جگا روز جیل میں حاضری دینے آتا تھا اس کے باوجود آج وہ پیرول سے لوٹا تھا اس کی خوشی سب سے انوکھی تھی۔ سبھی قیدیوں نے سوچا کہ بھگوان نے ان کی دعا سن لی ہے۔ جگت کے نقش قدم پر چل کر کبھی ہمارے قدم بھی جیل سے باہر جائیں گے۔

"باہر کس بات کا شور ہے؟" مہتا نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"صاحب! جگا آ گیا ہے۔" ابھی میٹ نے اپنے الفاظ مکمل ہی کیے تھے کہ جگت نے آفس میں قدم رکھا۔ سوپر مہتا کے چہرے پر حیرت ابھر آئی۔

"جگا......!" ان کی آواز پیار سے بھیگ گئی۔ وہ کچھ رک کے پھر بولے۔ "تم آ گئے؟ شام کی بجائے صبح ہی آ گئے؟" سوپر کھڑے ہو کر میز کی دوسری جانب آ گئے جگت مسرت بھرے انداز میں اندر آ کر جھکنے جا رہا تھا مگر مہتا نے اس کے بازو تھام کر کہا۔

"نہیں جگا! آج تو تم سے بغل گیر ہونا ہے۔" ایک دبلا پتلا اور دوسرا کیم شحیم۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ دیکھ کر دوسروں کے دل بھر آئے۔ "تین ماہ مختصر رہے کیوں؟" سوپر نے مزاج پرسی میں پوچھا۔

"نہیں صاحب! بھاری پڑ گئے۔" جگت سنجیدہ ہو گیا۔ "یہی وجہ ہے کہ بارہ گھنٹے پہلے ہی آ گیا۔ باہر کی دنیا

مجھے بڑی جیل دکھائی دی۔ وہاں مجھے آپ جیسا کوئی سوپر نظر نہ آیا اس لیے میں بور ہوگیا تھا۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے چھٹکارا ملا ہو۔"

"ایسا نہ کہو جگا؟" سوپر نے پیٹھ تھپک کر کہا۔ "تمہیں ہمیشہ کے لیے جیل سے رخصت کروں گا تو صحیح آزادی سمجھوں گا۔"

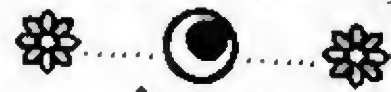
جگت ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس انسان کو کیسی لگن ہے؟ مگر ہمیشہ کی رہائی کی بات اسے خواب ہی نظر آئی۔ جس کا ماضی خون سے رنگا ہو ایسے قیدی کو حکومت کیسے رہا کردے گی؟

"جگا! ایک چیز بھول گیا۔" یہ کہہ کر مہتا نے الماری کھولی۔ جگت متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مہتا نے الماری میں سے بڑا ساز نکالا۔ "تم امتحان میں کامیاب ہوگئے ہو اس کی خوشی میں تم کو یہ ساز دے رہا ہوں۔" جگت نے ساز ہاتھ میں اٹھالیا۔ اس پر جگت کی انگلی پڑتے ہی اس کے تاروں سے ایک میٹھا سا سر نکلا۔ جگا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مہتا کے نرم دل کی آواز ہو۔

"تمہاری رہائی کا حکم آئے تب تک اس پر ہاتھ بٹھالو قدرت نے تم کو پیاری آواز دی ہے۔ یہ آواز سارے ملک اور پوری دنیا میں پھیلے یہی میری خواہش ہے۔ یہ خواہش پوری کرنی ہے یا نہیں؟ تمہارے اختیار میں ہے۔"

جگت کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ الٹا اس نے اپنی ذات سے سوال کیا۔

"جس ہاتھ نے آج تک رائفل اٹھائی ہے اس ہاتھ میں ساز اٹھا کر باہر نکلا تو میں کیسا دکھائی دوں گا......؟"



اب کچھ واقعات خود جگا کی زبانی سنیے!

"پیرول کی میعاد پوری کرکے جیل میں آنے کے چار پانچ ماہ تک میں نے ایسی الجھن میں گزارے کہ آج ان کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔

"کیوں جگا...... کب گھر جاؤ گے؟" تقریباً دو چار قیدی ہر روز یہ سوال کرتے۔

"یار! مجھے کہاں گھر جانے کی جلدی ہے؟" جیسا میری سمجھ میں آتا کہہ دیتا۔ "یہاں مزے ہیں۔ تم سب کو چھوڑنے کے خیال سے دل گھبراتا ہے۔" مگر سچا سنگھ میرا دل سمجھ گیا۔ کبھی میں تنہائی میں بیٹھا خیالوں کی وادی میں گھوم رہا ہوتا تو وہ مجھے ٹوکتا۔

"جگا! گھر یاد آرہا ہے؟ سچ کہنا! بھابھی سے جدا ہوتے وقت تمہیں دکھ ہوا تھا؟"

"گھر کیسے یاد نہ آئے گا؟" میں نے ٹالنے والا جواب دیا۔ "جدا ہوتے وقت مجھ سے زیادہ چندن کو دکھ ہوا تھا۔"

سچ بات تو یہ تھی کہ میں زیادہ تر دیرو کے خیال میں گم رہتا تھا۔ پیرول کے تین ماہ میں ایک بار بھی اسے ملنے کی سوچ دھوکا ثابت ہوئی اس کا بہت صدمہ تھا۔ چندن کو فیروز پور رخصت کرنے کے بعد پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ میں چپ چاپ لدھیانہ چکر لگا آؤں۔ دیرو کو تلاش کروں۔ تب یہ سوال نہیں تھا کہ دیرو کا میرے پاس پتہ نہیں ہے۔ پورے بارہ گھنٹے ہاتھ میں تھے پھر ملنے کی تڑپ کیسی ہے؟ محبوب سے ملاپ کے لیے دل ترستا تو دل میں انگارے سے بھر جاتے ہیں اور مصیبتوں سے انسان جان بچانے لگتا ہے مگر چندن کور نے اسٹیشن سے سیدھے جیل جانے کی قسم دے کر میرے پیر باندھ دیئے تھے۔ لدھیانہ جاکر دیرو ملتی یا نہیں؟ ملاپ ہوتا تو خون خرابہ کیے بغیر لوٹتا یا نہیں؟ ارے پھر واپس ہی کیوں آتا؟ ممکن ہے کہ چندن کور اس خطرے کو پہچان گئی ہو۔ میرے ساتھ کم رہنے کے باوجود وہ میری رگ رگ سے واقف تھی۔ سوپر مہتا سے ملنے جاتا مگر کبھی یہ معلوم نہیں کیا کہ "میری رہائی کا کیا ہوا؟"

پھر بھی وہ خود کہتے۔ "جگا! بات آگے بڑھ رہی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"صاحب! آپ دل پر زیادہ بوجھ نہ رکھیں۔" میں ان کا اور اپنا دل سمجھانے کے لیے کہتا۔ "آپ کی مہربانی سے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ باہر تین ماہ میں پریشان ہوگیا تھا۔"

"سکھ دکھ کی بات نہیں ہے جگا!" وہ جوش میں کہتے۔

"جیل آخر جیل ہے۔ ذمہ داریوں سے آدمی بے فکر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی سچا سنگھ نہیں ہے اس لیے کہتا ہوں کہ میں تم کو گھر رخصت کرنا چاہتا ہوں۔"

"گھر...... صاحب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" میری اس بات پر وہ ناراض ہو جاتے۔

"جگا! ابھی تمہارے دل میں ماں باپ کی طرف سے ناراضگی کم نہیں ہوئی ہے؟ کیوں جھوٹی ضد پر اڑے ہوئے ہو؟ تمہارا گھر ہے' ماں باپ ہیں' کھیتی باڑی ہے' بیوی بچہ ہے سب کچھ ہے' تم پرائے کو اپنا کر لیتے ہو' اپنوں کو کیوں پرائے کہتے ہو؟"

"یہ ضد نہیں' آن کی بات ہے۔ ویرو کی بات پر میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب ویرو کو لیے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا پھر بھی گھر کے فرد کی طرح نہیں' مہمان کی طرح رہوں گا۔"

مہتا ٹھنڈی سانس بھرتے۔ جب بھی ویرو کی بات چھیڑتا وہ پراسرار طور پر خاموش ہو جاتے مگر ان کی آنکھیں جیسے کسی سوچ میں ڈوب جاتیں۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور ویرو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

"جدائی میں بھی ایک طاقت ہے جگا۔" وہ سنجیدہ ہو کر کہتے۔ "پیار میں مایوس ہونے والا فنکار اپنے فن کے ذریعے اپنے درد کا اظہار کرتا ہے۔ خون خرابے سے نہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دوں وہ فوراً بول اٹھتے۔ "تم یہاں ہو' اس دوران کچھ گیت کہہ لو! تمہاری آواز میں تمہارے گیت میں لوگوں کو سنواؤں گا۔"

"لوگوں کو یا قیدیوں کو؟" میں شک ظاہر کرتا۔

وہ پر یقین لہجے میں جواب دیتے۔ "پہلے قیدیوں کو اور پھر لوگوں کو سناؤں گا۔ اتنا یاد رکھنا کہ وقت بڑا منصف ہے۔"

میں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور ویرو کی یاد میں پیار کے گیت کہنے لگا۔ بیٹھا ہوا ساز بجایا کرتا اور گاتا رہتا۔ سچا سنگھ کی صحبت میں کتاب پڑھنا بھی ہوتا۔ گرونانک کی سوانح عمری نے مجھ میں ایسا جوش پیدا کیا کہ میں نے ان کی زندگی پر بھی ایک گیت گایا۔ جب قیدیوں کو سنایا تو وہ سب حیران رہ گئے۔ کسی نے ٹوکا بھی کہ ایسے جوش والا باہر نکل کر سکون سے نہیں رہ سکے گا۔ جیل واپس آئے گا۔



دن گزرتے رہے۔ "بس اب تھوڑے دن باقی ہیں۔" بار بار یہی سننے کو ملتا۔ سوپر مہتا اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے پتہ چلتا کہ میری رہائی کرائے بغیر انہیں چین نہیں آئے گا۔ زندگی میں قدرت کی بڑی مہربانی رہی ہے کہ جو بھی ملا اسے میں نے بھرپور پیار دیا۔ نہیں تو یہ مہتا کو مجھ سے کیا لینا دینا ہے؟ نہ کوئی رشتے داری نہ کوئی قربت رہی ہے پھر بھی میرے جیسے بدنام آدمی کے لیے اتنی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟

ایک دن گیت گا رہا تھا۔ ساز کے تار پر انگلیاں گھوم رہی تھیں۔ آواز بلند کرتا گیا' اسی لمحے کسی کی کھنکتی ہوئی بیڑی کی آواز کان سے ٹکرائی۔ گیت پورا ہونے تک خاموش کھڑا رہا۔ اچانک نظر اٹھی تو چونک پڑا۔

"کون' چنا...... کب آیا؟" میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ اتنا نروس ہو گیا کہ بہت دیر تک بول نہ سکا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

"پاپا جی!" اتنا کہہ کر وہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ میں سمجھ گیا جیل کی تنہائی نے اس کی جوانی کے جوش کو ختم کر دیا ہے۔

"اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہاں سوپر مہتا تمہیں سنبھال لیں گے۔"

"افسوس! کہ میں دیر سے آیا۔ تم تو اب رہا ہو جاؤ گے۔" اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ تمہاری زندگی بدل گئی ہے۔"

"تمہاری زندگی بھی بدل جائے گی۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہاری بدلی یہاں کرائی ہے۔" پھر بات بدلنے کے لیے پوچھا۔ "تمہاری ماں کیسی ہے؟"

"پتہ نہیں......" وہ نیچے دیکھ کر بولا۔

"تم سے ملنے نہیں آتی؟"

"میں نے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پنا سنگھ کا لڑکا لے کر آتی ہے جو مجھے کھٹکتا ہے۔" چنا کے چہرے پر نفرت پھیل گئی۔ میں نے بات سمیٹ لی۔

"آخر وہ تمہاری ماں ہے۔ جب تک میں ہوں تب تک ایک بار اسے ملنے کے لیے بلالو! تمہاری بجائے میں بات کروں گا۔" اس نے اختلاف نہیں کیا۔ چنا ہی ایک ایسا تھا جس نے آخر دم تک میرا ساتھ دیا تھا۔ میری خاطر وہ اپنی زندگی برباد کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچایا۔ ابھی اسے دس سال گزارنے تھے۔ دس سال میں اس کی جوانی دم توڑ دے گی مگر میں لاچار تھا' پھر بھی دل میں خیال آیا کہ باہر نکل کر اس کے لیے کچھ کروں گا۔

"جگا! تمہاری رہائی کا حکم آ گیا ہے۔" سویر مہتا نے اپنے آفس میں بلا کر خبر دی تو جیسے زمین کی گردش تھم گئی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

مہتا نے میری پیٹھ تھپک کر کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ تم کو رہا کرائے بغیر نہیں رہوں گا۔ لو یہ خط پڑھ لو۔" لرزتے ہاتھوں سے میں نے خط لیا۔ مگر لکھائی سمجھ میں نہیں آئی مگر میں نے ان کے چہرے سے پڑھ لیا کہ وہ جیت گئے ہیں۔

"آج تک میں نے کسی کا احسان نہیں لیا تھا...... مگر آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کے لے مجھے دوسرا جنم لینا پڑے گا" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"ارے پاگل! تمہارا دوسرا جنم بہت پہلے ہو چکا ہے۔" مہتا نے ہنس کر میرا ہاتھ تھاما۔ "جب سے تمہارے ہاتھ میں رائفل کی جگہ ساز دیا ہے اس وقت سے۔" میں نے پیار بھرے انداز میں ان کا ہاتھ دبایا۔ آنسوؤں پر بمشکل قابو کیا۔ مہتا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔

"جگا! ابھی تم کو ایک جیل اور جھیلنی ہے۔" میں چونک پڑا۔ وہ ہنس دیئے۔ "صرف ایک یا دو دن کے لیے وزیر اعلیٰ پنجاب سچر صاحب جالندھر جانے والے ہیں۔ وہاں سے تمہاری رہائی ہوگی۔"

"اور آپ؟"

"ہم تو کل صبح ہی جدا ہو جائیں گے۔ میں جالندھر نہیں آسکوں گا۔" ان کی آواز بھاری ہو گئی۔ "جاؤ تم تیاری کرو۔ آج رات تمہارے گیت جی بھر کر سننے ہیں۔ پھر کسے پتہ تم کب ملو گے اور ملو گے تو......"

"تو مجھے بھول نہیں گئے ہو گے۔" میں درمیان میں بول اٹھا۔ "میں بدنام ضرور ہوں' بے ایمان نہیں۔"

"ارے پھر غصے ہو گئے؟" مہتا نے مذاق کیا۔ "جاؤ تیاری کرو۔"

چند لمحے ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے' پھر میں جوش میں دوڑا۔ میں اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے جیل کے دروازے کھل گئے ہوں اور میں ابھی باہر نکل جاؤں گا۔!

جیل سے رخصت کرنے والی آنکھیں آج بھی میری نظروں میں گھومتی ہیں...... سچا سنگھ کی بھوری آنکھیں' چنا کی آنسو بھری آنکھیں' مہتا کی رحم آمیز آنکھیں' قیدیوں کی تجسس بھری آنکھیں اور کچھ کینہ توز آنکھیں۔ اس طرح میں جیل سے باہر نکلا تو حیرت سے' شکوک سے' احترام سے' خوف سے یا نرمی سے دیکھتی ہوئی ہزاروں آنکھوں کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ وزیر اعلیٰ نے مجھے باجے گاجے سے جالندھر شہر میں بلایا۔ ہاروں کے وزن سے میری گردن جھک گئی تھی۔ میری سماعت سے کتنے الفاظ ٹکرائے۔

"دیکھو...... یہ ہے جگا ڈاکو! کئی قتل کیے' کئی ڈاکے ڈالے' اب سدھر گیا ہے۔ جیل سے رہا ہو گیا ہے جیسے جنگ فتح کر کے آیا ہو اس طرح اسے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ کسے پتہ کل کیا کر بیٹھے گا؟ ڈاکو آخر ڈاکو ہوتا ہے......"

پھر سارا شور ختم ہو گیا۔ میں تنہا ہو گیا جو کچھ ہو گیا ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ کچھ دیر تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک بے آسرا چھوٹا سا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک ساز دے کر دنیا میں دھکیل دیا گیا ہے۔ جاؤ! اس کے بل پر زندگی گزارو۔ جالندھر جیل کے دروازے کھلے تو وزیر اعلیٰ سچر نے کہا تھا۔

"تم کو حکومت کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنا ہے۔ کرو گے؟" میں نے اقرار کرلیا۔ سوپر مہتا نے رخصت کرتے وقت مشورہ دیا تھا۔

"جگا! جیل سے باہر بھی اگر کوئی زنجیر پہننی پڑے تو اس کے لیے تیار رہنا' اسی لیے شاید جیل سے باہر آنے سے پہلے ہی ملازمت کی زنجیر میں جکڑ لیا گیا تھا۔

گھر سو پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ گھر جہاں ست پال کا بچپن گزرا' ماں اور باپو کا بڑھاپا کٹا' چندن کی جدائی نے آہیں بھریں...... وہ گھر دور سے دکھائی دیا اور پیر درد کرنے لگے۔ دل وہاں پہنچنے کی جلدی کررہا تھا مگر ذہن روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ "مگر کیوں؟ میرے باپو میرے دشمن نہیں تھے۔ ہمیشہ میری بھلائی چاہتے' پھر بھی دل سے کدورت کیوں نہیں جاتی؟ جالندھر جیل میں جانے سے پہلے فیروز پور سے مہتا نے گھر خط لکھ کر بتادیا تھا کہ تمہارا بیٹا ہمیشہ کے لیے جیل سے رہا ہوکر گھر آرہا ہے۔ کھویا ہوا بیٹا دو دن میں تمہیں واپس مل جائے گا پھر خط میں آخری جملہ لکھا تھا۔ مجھے لینے کوئی نہ آئے' میں سب سے ملنے خود آجاؤں گا۔ میں ایک دم پہنچ کر سب کو چونکا دینا چاہتا تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ پنچھی گھونسلوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ درخت پر چڑیاں چیں چیں کرکے ان کا استقبال کررہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ست پال مسرت سے چیخ اٹھے گا۔

میں چپ چاپ گھر میں داخل ہوا مگر اسی لمحے چیخ سنائی دی۔

"آگئے...... آگیا...... آگیا......" ایک ساتھ مختلف آوازوں کا شور مچ گیا۔ میں جھینپ گیا۔ چوری چھپے جانا تھا اس کی بجائے کھل کر آگیا پھر دوڑا ہاتھ پھیلا کر بڑی بڑی جست بھرتا ہوا سامنے کھڑے ہوئے سب کو ایک ساتھ بانہوں میں بھر لینے کے لیے۔

سامنے سے چھوٹا ست پال۔ "باپو...... باپو" کی چیخ مارتا ہوا مٹھیاں کس کر آنکھیں بند کیے دوڑا آرہا تھا۔ اس کو میں نے اٹھالیا' ماں' باپو اور چندن کور کی مسرت کا اظہار ان کے چہروں سے ہورہا تھا۔

"آیا میرا بیٹا۔" ماں پاگل کی طرح لپٹ گئی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ سینے اور پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ "بھگوان نے آخر ہماری جانب دیکھ لیا۔" پھر آنسو خشک کرتے ہوئے چندن کو کہنے لگی۔ "کھڑی کیا ہو بہو؟ میرے بیٹے کے سر پر سے لیموں اتار۔ اب کسی کی نظر نہ لگے۔"

میں اپنے باپ کے قدموں میں گر گیا۔ انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگایا پھر چندن کی طرف دیکھا۔ شرما کر اس نے سر جھکالیا۔ اسکے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو اس کی مسرت کا اعلان کررہے تھے۔

"ماں...... اب کیوں رو رہی ہو؟ باپو تو آگئے۔ اب ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔" میری بجائے ست پال نے چندن کور کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر لاڈ سے کہا۔ اس کی تپلی انگلیوں پر لگے ہوئے چندن کے آنسو چومنے کے لیے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔



"میں کل شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔" رات کو سونے سے پہلے میں نے دھماکا کیا۔ ماں اور باپو سناٹے میں آگئے۔ "چندن اور ست پال کو بھی ساتھ لے جارہا ہوں۔"

"کہاں لے جاؤ گے؟" باپو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ماں کی آنکھوں سے روشنی اڑ گئی۔ چندن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"میں تم سب سے ملنے آیا ہوں۔" میں کسی جانب دیکھے بغیر بولا۔ "اب کام دھندے سے لگ جانا پڑے گا۔"

"کام دھندہ؟" باپو نے بھاری لہجے میں پوچھا۔ "یہ کھیتی باڑی تمہاری ہے۔ کہاں تک بوڑھے سے محنت کراؤ گے؟"

"میرا کچھ نہیں ہے باپو؟" میں غصے اور چاہت سے بولا۔ "میں اس گھر کا ایک مہمان ہوں۔"

"پھر زمین جائیداد کو میں گلے سے لگا کر پھروں گا؟"

باپو کچھ سخت ہوئے۔ "جانے سے پہلے اپنے ہاتھوں فروخت کردو! پیسے آئیں وہ لے کر ہم سب ساتھ چل دیتے ہیں۔"

"یہ بھی نہ ہوسکے گا باپو۔" ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں رک گیا۔ "میرا کوئی بھروسہ نہیں۔ ملازمت صرف نام کی ملی ہے۔ ورنہ مجھے باہر زیادہ بھٹکنا پڑے گا۔"

"ملازمت......!" ماں اب چیخ پڑی۔ "تمہیں ملازمت کرنی ہے؟ ہمارا بڑھاپا شرماتا ہے۔ جگت! تم کس جرم کی ہمیں سزا دے رہے ہو؟" پھر وہ بول نہیں سکیں۔ رونے سے ان کا گلا رندھ گیا۔

"مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے دو۔" میں نے فیصلہ ظاہر کردیا۔ "تمہارا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے حق بھی نہیں ہے۔ ویسے تمہارا بیٹا ہوں' یہ بھولا نہیں جاسکتا۔ اب میں اپنا گھر بساؤں گا۔ زمین جائیداد لوں گا' تب تم لوگوں کو ساتھ بلالوں گا۔"

کوئی کچھ نہیں بولا۔ رات کو کوئی سو نہیں سکا۔ دوسرا سارا دن بھی سب نے اوپری دل سے گزارا۔ شام ہوتے وقت میں نے صرف اتنا کہا۔ "یہاں سے لدھیانہ جارہا ہوں۔ وہاں سے خط لکھوں گا۔" ماں اور باپو نے چپ چاپ سن لیا۔ تب کہاں خبر تھی کہ ان کی آہوں سے بدلتی ہوئی زندگی میں کیسے سخت موڑ آئیں گے......!



جسم پر موجود لباس میں گھر سے تو نکل گئے' مگر جگت اور چندن نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لدھیانہ جاکر کہاں رہیں گے؟ چندن کور کی یہ خواہش تھی کہ جگت تین چار ماہ باپ کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ اس وقت تک وہ زچگی سے فارغ ہوجائے گی۔

"تم یہاں رہ جاؤ۔ مجھے تو جلدی ملازمت پر پہنچنا ہے۔" جگا بولا۔

"ملازمت کی یا دیری کی تلاش کرنے کی جلدی ہے؟" چندن نے اس کے رخسار پر چپکی دے کر کہا۔ جگت اس کا کان پکڑ کر ہنسنے لگا۔

"دونوں کی۔" جگا نے جواب دیا۔ چندن کور سوچنے لگی کہ جگت کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر وہ پھر پٹری سے اتر گیا تو چندن کے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا پھر جگا سے مخاطب ہوئی۔

"پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لدھیانہ میں میری خالہ کی لڑکی رہتی ہے' اسے زچگی کے وقت بلالوں گی۔ مگر تم نے کوٹھری لے لی ہے یا اسی طرح چل پڑے ہو؟"

"نہیں چندن! میں بے منزل مسافر ہوں۔ جہاں راستہ لے جائے گا چلا جاؤں گا۔ جہاں گھر مل جائے گا رہ لوں گا۔" پھر اس نے جیب سے پیسے نکال کر دکھائے۔ "دیکھو! یہ ساٹھ روپے' جیل کی کمائی پر گزارہ کرنا ہے۔"

چندن نے روپے گن کر دیکھے۔ "انسٹھ ہیں۔" کہہ کر مچی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔ "سچ کہنا کتنے خرچ کردیئے؟" جگت مسکرایا۔ اس نے سوچا چندن گھر بسانے سے پہلے ہی حساب کتاب پوچھنے لگی۔

"سنو! جب جیل سے رہا ہوا تھا تو اکاؤنٹنٹ نے پچاسی روپے اور کچھ کھلے پیسے دیئے تھے۔ پندرہ روپے کی پی' پانچ دس روپے کا کھانا کھایا۔ دو دن لیٹ آتا تو سب خرچ ہوجاتے۔" چندن نے دوپٹے کے آنچل میں روپے باندھ لیے۔

"اب تمہیں کمانا اور مجھے خرچ کرنا ہے۔ بتاؤ کب سے ملازمت پر لگ رہے ہو؟"

"پہلے لدھیانہ پہنچنے دو۔ گھر تلاش کرکے بیٹھیں گے تو پھر ملازمت کے لیے سوچا جائے گا۔" چندن حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ساٹھ روپے کی رقم میں یہ شخص آرام سے رہنے کی بات کررہا ہے؟ گھر کس طرح چلتا ہے اسے کیا خبر؟

"گھر چلانے کی فکر مجھ پر چھوڑ دو۔" چندن نے کہا۔ کچھ دن بہن کے ہاں رہیں گے۔ اس وقت تک ملازمت پکی کرلو۔ تنخواہ کتنی ملے گی؟" چندن نے ادا سے پوچھا۔

"یہ تو پوچھنا بھول گیا۔" جگت احمق کی طرح سر ہلا کر بولا۔ "ہم ڈھائی آدمیوں کا گزارہ ہو جائے اتنی تنخواہ تو دے گا۔"

"جتنی بھی تنخواہ ملے اسی کے مطابق خرچ کریں گے۔" چندن کور نے اطمینان دلایا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر دنیاداری بالکل نہیں جانتا۔ زیادہ تنخواہ کی بات کروں گی تو ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ "مجھے کم پیسوں سے گھر چلانا آتا ہے۔" چندن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

"ارے..... آپ لوگ؟" جگت اور ست پال کو دیکھ کر خالہ کی لڑکی سناٹے میں آ گئی۔ "جیجا جی جیل سے رہا ہو گئے یہ خبر تو اخبارات میں پڑھی تھی لہٰذا مبارکباد دینے تمہارے گھر آنے والے تھے۔" بچے کو گود سے اتار کر ساونت کور چندن سے گلے ملی پھر بہنوئی کے لیے فخر کا اظہار کیا۔

"اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر تمہارے بھائی کی مسرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جب میری بہن چندن کور کو بیاہنے آئے تھے اس وقت بھی تمہارا ایسا رعب نہیں تھا۔" ساونت کور نے آخری الفاظ جگا کی طرف دیکھ کر کہے۔

"تب تو ڈاکو تھا..... خاموشی سے بیاہنے آیا تھا۔" جگت نے لاٹھی کونے میں رکھ کر کہا۔ "ملکھان سنگھ گھر میں نہیں ہیں؟"

"نہیں..... گاڑی لے کر جالندھر گئے ہیں۔" ساونت کور کا شوہر انجن کا فائر مین تھا۔ چھوٹی لائن پر کام کر رہا تھا۔ صبح جاتا تو دوسرے دن واپس ہوتا تھا۔ ساونت کور کو پتہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس کے گھر مہمان بن کر آئے ہیں۔ "ان سے خاص کام تھا؟" ساونت کور نے پوچھا۔

جگت نے اس دوران دو چھوٹی کوٹھریوں والے مکان میں نظر گھمائی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں ان کا گزارہ ہو گا یا نہیں؟

"بہن! ہم تمہارے گھر مہمان ہو کر آئے ہیں۔ جب تک لدھیانہ میں کوئی مکان کرائے پر ملے اس وقت تک کے لیے ہم تمہارے مہمان ہیں۔" چندن نے ساونت سے کہا۔

"ایسا؟" ساونت کور کی آواز میں حیرت تھی۔ "لدھیانہ میں رہو گے۔ میں سمجھی جیجا جی ہم سے ملنے آئے ہیں۔ اچھا ہوا تم لوگ آ گئے۔ ہماری جھونپڑی تمہیں موافق نہیں آئے گی۔ ملازمت پیشہ آدمی کے گھر آرام کہاں؟"

"ہم بھی ملازم پیشہ ہیں۔" چندن خفت سے بولی۔ "ہماری ملازمت دو ایک دن میں پکی ہو جائے گی۔ اس وقت تک ارد گرد مکان مل جائے گا۔" ساونت کور کو یقین نہیں آ رہا تھا عیش و آرام سے بسر کرنے والے زمین جائیداد والے لوگ ملازمت کی بات کر رہے ہیں۔ مگر جگت کی موجودگی میں وہ کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔

جگا دوپہر حکومت کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے دفتر پہنچا۔ وہ پبلک ریلیشن آفیسر کے کیبن کے قریب رعب سے کھڑا ہو گیا۔ "صاحب سے ملنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولنے جا رہا تھا اسی لمحے آفس بوائے نے اسے روک دیا۔

"اے ٹھہرو! تمہیں کس سے ملنا ہے؟ کیا نام ہے؟" جگت نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ اس کی بات نے اسے غصہ دلایا۔ دوسرے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے اس نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

"جگت سنگھ جگا۔" پھر بھی اس پر اثر نہیں ہوا تو بلند آواز میں بولا۔ "جگا ڈاکو۔" آفس بوائے سہمے ہوئے انداز میں غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جگا ہے جس کی تصویر اس نے اخبار میں دیکھی تھی۔ اسی لیے وہ نرم پڑ گیا تھا۔ اب وہ مودب نظر آنے لگا تھا۔

"ذرا ٹھہرنا! میں صاحب کو بتاتا ہوں۔" پھر اس نے ایک کاغذ جگا کی طرف بڑھا کر کہا۔ "اپنا نام صاحب کا نام اور کام لکھ دو۔" جگت نے کاغذ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تو وہ بولا۔ "یہاں کا یہی اصول ہے جگا جی۔"

جگت ہنس دیا۔ اس نے سوچا مہتا سو صحیح کہتے تھے کہ باہر بھی بیڑیاں پہننی پڑتی ہیں۔ اصول کی بات جگت کو بیڑیوں کی زنجیر نظر آئی۔ مگر وہ ملازمت کرنے آیا تھا اس لیے رعب سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے نام پتہ اور

کام کاغذ پر لکھ دیا۔ آفس بوائے اندر چلا گیا۔ جگت سمجھا تھا کہ اسے بھی اندر بلا لیا جائے گا۔ مگر آفس بوائے نے آ کر کہا۔

''بیٹھو! تھوڑی دیر کے بعد صاحب بلائیں گے۔''

جگت نے آس پاس دیکھا مگر بیٹھنے کے لیے جو بینچ تھی۔ وہ خالی نہیں تھی۔ اسے کھڑا رہنا پڑا۔ پون گھنٹہ بیت گیا' پھر بھی باری نہ آئی۔ پیر تھکنے لگے۔ ایک دو بار خیال گزرا واپس چلا جائے۔ جہنم میں جائے ملازمت' مگر چندن کور کو کیا جواب دیتا؟ بڑے رعب سے باپ کا گھر چھوڑ کر چل پڑا تھا۔ ملازمت ملنے کا رعب بھی جمایا تھا۔ اب اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

تقریباً سوا گھنٹے بعد آفس بوائے نے کہا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''

جگا مونچھوں کو بل دیتا ہوا اندر گیا۔ اس نے جیب سے سفارشی خط نکال کر صاحب کی میز پر رکھا۔ پرکاش دیو نے اس کی جانب دیکھا' پھر خط پر اڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ جگت کو اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا۔ بیٹھنے کو کہنے کے لیے صاحب نے سات منٹ ضائع کیے۔

''ابھی میرے پاس آفیشل لیٹر نہیں آیا۔'' صاحب نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ''دو دن کے بعد آنا۔'' جگت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی کلرک فائل پر صاحب کے دستخط لینے آیا۔ صاحب مصروف ہو گیا اور جگا کو باہر آ جانا پڑا۔

جگا بمشکل دو دن گزار کر پھر دفتر پہنچ گیا۔ اس بار ملاقات کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صاحب نے فوراً بیٹھنے کو کہا مگر جواب اندازے سے مختلف تھا۔

''ابھی آرڈر نہیں آیا۔ ایسے کام میں دیر لگتی ہے۔' جگت ڈھیلا پڑ گیا۔ صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ڈاکوؤں اور جیل کی زندگی کے لیے پوچھ گچھ' گھر بار کے متعلق معلوم کیا' پھر آہستہ سے بولے۔ ''تمہارے جیسے خاندانی شخص کے لیے گانے بجانے کی ملازمت اچھی نہیں۔ یہ تو چھوٹے لوگوں کا کام ہے۔'' جگت نے جواب نہیں دیا تو صاحب نے دوسرا عذر پیش کیا۔ ''تنخواہ معمولی ہوتی ہے۔ ساٹھ روپے میں گھر کا پورا بھی نہیں ہوتا۔''

ساٹھ کا ہندسہ جگت کو کھٹک گیا۔ پھر سوچنے لگا صاحب اس کی اتنی فکر کیوں کر رہا ہے؟ وزیر اعلیٰ جیسے بڑے آدمی نے اس سے ملازمت کی درخواست کی تھی اور وہ افسر اسے الٹی بات سمجھا رہا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ رشوت دیئے بغیر سرکاری محکموں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسے یہ صاحب ایسا دکھائی نہ دیا مگر پھر بھی اسے اس کی بات میں ایسی جھلک محسوس ہوئی۔

''میں سمجھتا ہوں مجھے آرڈر لینے کے لیے چندی گڑھ جانا پڑے گا۔'' جگت نے کھڑے ہو کر کہا۔ افسر سمجھا جگا اسے رعب میں لینا چاہتا ہے اس لیے صاف الفاظ میں بولا۔

''چندی گڑھ کیوں؟ دہلی جاؤ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔'' پھر ذرا نرم آواز میں بولا۔ ''وزیر صاحبان بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بات کر کے بھول جاتے ہیں۔ ممکن ہے تمہیں اپنی پہچان کرانی پڑے تب انہیں یاد آئے کہ تم کون ہو؟''

سمجھ لو

- نہ اتنا میٹھا بنو کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کڑوا بنو کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔
- اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔
- آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔
- گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔
- جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

یوسف رضا پرویز...... ڈیرہ غازی خان

"اچھا۔۔۔۔۔" جگت نے ہونٹ چبائے۔ "میں چنڈی گڑھ ہو آؤں پھر پتہ چلے گا تمہیں آرڈر لا کر ہی دکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ جوش میں باہر نکل گیا۔ جگا کو اپنے پیچھے صاحب کی ہنسی سنائی دی۔ جگت کو محسوس ہوا جیسے یہ ہنسی اس سے کہہ رہی ہو کہ یہ ڈاکا ڈالنے سے آسان کام نہیں ہے۔

چنڈی گڑھ جا کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھیم سین لچر سے ملازمت کا آرڈر لے کر جگت لوٹ رہا تھا تو بہت خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑا ڈاکا ڈال کر آ رہا ہو۔ دنیاداری میں پڑنے کے بعد انسان معاشرتی پابندیاں بہرحال قبول کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جگا ساٹھ روپے تنخواہ کس طرح قبول کر لیتا؟ جگت کو اپنی لیاقت ثابت کرنے کا پروانہ مل گیا تھا۔ جگت کو صرف آمدنی ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ ویرو کا خیال بھی اب اسے پریشان کرنے لگا۔ کسے پتہ کہ اب تک ویرو لدھیانہ میں ہی ہوگی یا کسی اور گاؤں میں رہنے لگی ہوگی؟ پوچھ گچھ کرنے سے ویرو کا پتہ ملنا مشکل تھا۔ وہ سرکار کی پبلسٹی کے لیے گاؤں گاؤں گیت گاتا پھرے گا تو کبھی نہ کبھی ویرو سے بھی ٹکراؤ ہو جائے گا۔ وہ جیل سے باعزت طور پر رہا ہوا تھا اس کا پتہ ویرو کو چل گیا ہوگا۔ وہ سوچتا کہ اگر ایک بار ویرو مجھے مل گئی تو پھر میں اسے کبھی نظر سے دور نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے لیے مجھے چاہے کچھ بھی قربانی دینی پڑے۔ ایسے ہی خواب دیکھتا ہوا ملازمت کی زنجیر پہن کر جگت لدھیانہ پہنچا۔

ملازمت پکی ہوگئی۔ یہ جان کر چندن کور کتنی خوش ہوگی؟ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی اسے لالٹین کے اجالے میں چندن کا اداس چہرہ نظر آیا تو جگت کی مسرت غائب ہوگئی۔ ساونت کور منہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناراضگی تھی۔ چندن کے رخسار پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں چغلی کھا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں جھگڑا کر چکی ہیں۔ اچھی طرح جھگڑا ہوا تھا۔ ست پال نیچے زمین پر سو گیا تھا۔ نیند میں بھی اس کی سسکیاں بند نہیں ہوئی تھیں۔ ساونت کور کھڑی ہو کر اندر چلی گئی۔ جگت نے چندن کی جانب دیکھا جیسے چندن حلق میں پھنسی ہوئی کسی چیز کو اندر اتارنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جگت نے محسوس کیا وہ حلق پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"ملازمت مل گئی ہے۔" جگت نے ماحول کی اداسی دور کرنے کے لیے بات کی۔ "دو دن بعد کام پر لگ جانا پڑے گا۔ پہلے مکان کرائے پر لیں گے۔" چندن کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ مگر آنکھیں گھومتی ہوئی گھر کے سامان کے تھیلوں پر جا کر رک گئیں۔ جگت کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"ہمیں اسی وقت یہاں سے چلنا ہے۔" مدھم مگر مضبوط آواز میں چندن بولی۔ "تم آ جاؤ میں اسی کا انتظار کر رہی تھی۔" سخت سے سخت باتیں برداشت کرنے والی چندن کور یہ کہہ رہی تھی۔ اس لیے جگت سمجھ گیا کہ بات حد سے بڑھ گئی ہے۔

"تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا یا نہیں؟" جگت نے پوچھا۔

"کھانے پینے کو آگ لگ گئی۔" چندن بمشکل آنسوؤں پر قابو پا کر بولی۔ "یہ نادان بچہ دو گھونٹ دودھ زیادہ پی گیا اس میں اس کی خالہ وہ باتیں تک کہہ گئی جو کہنے کی نہیں ہوتیں۔" وہ کچھ دیر رکی۔ جگت کے چہرے پر جوش جھلکنے لگا۔ "دس بار وہ کہہ چکی ہے کہ مہمان ہو کر پڑے ہیں تو کیا ہماری عزت لو گے؟"

جگت کا غصہ چڑھ گیا۔ ملکھان سنگھ گھر نہیں تھا۔ عورت سے لڑنا اچھی بات نہیں تھی۔ چندن کور چارپائی سے اٹھ گئی۔ اس نے سوئے ہوئے ست پال کو گود میں اٹھایا۔ "تم سامان کا تھیلا اٹھا لو۔ آج کی رات کسی دھرم شالا میں گزار دیں گے۔"

جگت الجھن میں پڑ گیا۔ اس طرح رات کے وقت گھر سے باہر نکلنے کا چندن کو فیصلہ کرنا پڑا اس کی وجہ سے اسے ساونت کور پر غصہ آیا۔ وہ اندر بیٹھ کر سب کچھ سننے کے باوجود بھی صرف رات بھر ٹھہرنے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ بے عزتی جگت سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے تھیلا اٹھا لیا اور دروازے کی جانب بڑھ کر

چندن سے بولا۔

"چلو۔" چندن کور نے نکلنے میں دو منٹ دیر کردی۔ دوپٹے کے آنچل میں بندھی ہوئی رقم میں سے پانچ کا نوٹ نکال کر پالنے میں سوئی ہوئی ساونت کور کی لڑکی کی مٹھی میں رکھ دیا۔ اب تک بمشکل بچی ہوئی دس روپے کی رقم کے بل پر وہ ڈھائی افراد گھر کی چوکھٹ سے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی چند قدم بڑھے ہوں گے کہ ساونت کور نے پوری قوت سے دروازے بند کرلیے۔ اس وقت جگت کا جی چاہا کہ جا کر بند دروازے پر زوردار لات مار کر اسے اکھاڑ دے۔ مگر چندن ساتھ تھی جو بے عزت ہو کر بھی جاتے ہوئے بہن کے بچے کے ہاتھ میں پانچ روپے دینا نہیں بھولی تھی۔ اس چندن کے ملائم دل کو صدمہ پہنچانے والا کام وہ نہیں کرسکتا تھا۔ شدید سردی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھیرا جم گیا ہو۔ لوگ سو رہے تھے۔ گلیاں سنسان تھیں۔ جگت اور چندن محلے سے باہر آئے۔ بڑے راستے پر آ کر وہ لوگ رک گئے۔ کہاں جانا ہے؟ اس سے وہ لاعلم تھے۔ سرائے کا پتہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ دونوں لاچار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اب چندن کور محسوس کررہی تھی رات ساونت کور کے گھر میں گزارتے تو بہتر تھا۔ راستے سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے جگت نے پوچھا۔

"سردار جی! نزدیک کوئی سرائے ہے؟" وہ سکھ اچنبھے سے مسافروں کو دیکھنے لگا۔

"نزدیک تو نہیں البتہ اسٹیشن پر ملے گی۔ اسٹیشن کی جانب دو میل کے فاصلے پر۔"

دونوں نے قدم بڑھائے۔ "ماں! مجھے سردی لگ رہی ہے، بھوک بھی لگی ہے۔" بھوکا سویا ہوا ست پال نیند میں بڑبڑایا۔ چندن اسے تھپکیاں دینے لگی۔

"بیٹا! کچھ دیر رک جاؤ۔" جگت کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے سوچا راستے میں کوئی ہوٹل ہو تو لڑکے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ دو فرلانگ مزید چل کر چندن ہانپنے لگی۔ پیٹ میں بھی بچہ تھا اور گود میں بھی۔ اس طرح دو بچوں کا بوجھ ایک ساتھ اٹھا کر چلنا بہت مشکل تھا۔ جگت کے شانے پر تھیلے کا بوجھ تھا پھر بھی اس نے کہا۔

"لاؤ چندن! میں دوسرے شانے پر ست پال کو اٹھائے لیتا ہوں۔" اسی لمحے سامنے سے ایک سائیکل رکشہ آتا نظر آیا۔ جگت نے ہاتھ اٹھایا۔ جوش میں پیڈل گھماتا ہوا رکشے والا آہستہ ہوا مگر اس نے دور ہی سے کہہ دیا۔

"ابھی سواری نہیں لوں گا۔ میرے گھر کی طرف چلنا ہے تو چلو۔"

"نہیں..... سرائے جانا ہے۔" جگت نے نرم آواز میں کہا۔ "ساتھ میں چھوٹا بچہ اور سامان ہے۔ نہیں تو پیدل بھی چلا جاتا۔" رکشے والا الجھن میں پڑ گیا۔ پر غور سے اندھیرے میں جگت کا چہرہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ رکشے سے اترتا ہوا چیخا۔

"ارے..... جگت سنگھ جگا۔" جگت کو یہ آواز جانی پہچانی لگی۔ وہ قریب گیا۔

"کون..... نانک سنگھ؟" جگت بھی پرمسرت انداز میں چیخا۔ مصیبت کے وقت اگر کوئی جاننے والا مل جائے تو خوشی ہوتی ہے۔

"ارے یار! یقین نہیں آرہا۔ جیل کو لرزا دینے والا جگا اس طرح مزدور بن کر تھیلا اٹھائے نظر آئے۔ تھوڑے دن پہلے ہی تو تمہاری تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی جس میں تم ٹھاٹھ باٹھ سے ہار پہنے نظر آرہے تھے۔" جگت جھینپ گیا۔ نانک سنگھ نے شانے پر سے بوجھ اٹھالیا۔ "چلو بھابی! رکشے میں بیٹھ جاؤ۔ بندہ تمہیں جنت تک پہنچادے گا۔" نانک فخریہ لہجے میں بولا۔

"یار جنت تک نہیں، ہمیں سرائے تک جانا ہے۔" جگت مذاق کے رنگ میں بولا۔ "تمہاری بھابھی کے ایک رشتے دار کے مہمان بنے تھے مگر بھی نہیں اس لیے کھڑے کھڑے چل دیئے۔" نانک سنگھ سوچ میں ڈوب گیا۔ جگت کو رکشہ میں بٹھا کر اس نے پیڈل پر زور آزمایا۔

"ارے یار! تم بہت وزنی آدمی ہو۔" نانک سنگھ کی بات سن کر جگت اور چندن کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ اداسی

غائب ہوگئی۔ جگت کو اچانک خیال آیا کہ رکشہ اسٹیشن سے الٹی سمت جارہا ہے۔

"ارے نانک! کدھر لے جارہا ہے؟ سرائے تو اسٹیشن کے قریب ہے۔" جگت اور چندن نیچے اتر کر آس پاس دیکھنے لگے۔ انہیں سرائے کی عمارت کہیں نظر نہ آئی۔ وہاں اردگرد کوئی ایسی بڑی عمارت نہیں تھی جس پر سرائے ہونے کا قیاس کیا جاسکتا۔ اتنی دیر میں نانک تھیلا اٹھا کر چلنے لگا۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔" اس نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھول کر تھیلا اندر رکھا اور چراغ جلایا۔ پھر جگت کی جانب مڑ کر بولا۔ "یہ ہے بندے کی سرائے۔" جگت سمجھ گیا نانک نے انہیں اپنا مہمان بنالیا ہے۔ وہ جیل کی دوستی بھولا نہیں تھا۔ چندن کور نے ست پال کو چارپائی پر سلایا۔ اتنی مختصر کوٹھری تھی کہ اس میں دو آدمی بمشکل سو سکتے تھے۔ جگت نے سوچا کہ وہاں سب کس طرح سما سکیں گے؟

"کھڑے کیا ہو؟ چلو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالیں۔" نانک سنگھ نے کھانے کا ڈبہ کھولا۔ چار پراٹھے، اچار اور آدھا گلاس دودھ تھا۔

"یار! تم کھالو۔ ہمیں بھوک نہیں ہے۔" جگت نے تکلف کیا۔ مگر ست پال آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

"باپو مجھے بھوک لگی ہے۔" دونوں شرمندہ ہوگئے۔ نانک غصے ہوگیا۔

"یار! دوست سے جھوٹا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ پیسے سے غریب ہوں مگر دل بڑا ہے۔ جو کچھ ہے بانٹ کر کھالیں گے۔" ایک ایک پراٹھا تین تین پیالے پانی سے سب نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ اس رات جگت سوچ رہا تھا وہ اس کٹھن دنیاداری سے کب تک مقابلہ کرسکے گا؟

پانچ روپے مہینے کے کرائے والی کوٹھری مل گئی تو گھر چلانے کا بوجھ چندن پر ڈال کر جگت ملازمت سے لگ گیا۔ مگر پہلے ہی دن کام پر جاتے ہوئے وہ چندن سے کہنا نہیں بھولا۔

"تم باہر جاتے ہوئے ویرو کی تلاش نہ بھولنا۔ گردوارے بھی جاتی رہنا۔ وہاں ملاپ ہونے کی امید ہے۔"

"ملے گی تو اس کوٹھری میں بند کردوں گی۔ تم لوٹو گے تب تک جانے نہیں دوں گی۔" چندن کور نے مذاق میں جواب دیا۔ "اپنی زچگی کا کام بھی اسی کے ہاتھ سے کرائیں گے۔"

جگت آہ بھر کر چلا گیا۔ اسے اندر ہی اندر ڈر تھا کہ ویرو اب کبھی نہیں ملے گی۔

جگا نے گاؤں گاؤں بھٹکنا شروع کردیا۔ سرکاری منصوبوں کی تعریفیں کرنا، لوگوں کو جمع کرنا اور تماشے کرکے دوسرے گاؤں بھاگنا۔ پہلے لوگ پبلسٹی کے گانوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر جگا ڈاکو گیت گانے آیا ہے یہ سن کر دوڑ کر آنے لگے۔ پہلے تماشے میں شور مچاتے، جھگڑے کرتے، مذاق اڑاتے مگر جگت کا رعب تھا یا اس کے ڈاکو ہونے کی دھاک کہ لوگ اب چپ چاپ سنتے تھے آہستہ آہستہ جگت اپنے گیت شامل کرنے لگا۔ وہ ہر پروگرام کے آخر میں ویرو کے فراق میں گیت گانا نہیں بھولتا تھا۔ وہ عورتوں کی جانب نظر کرکے درد بھری آواز میں گاتا۔

میرے گیتوں میں تم ہو، خیالوں میں تم
میرے دل میں بھی تم ہو، جوابوں میں تم
میری سانسوں میں تم، میری آہوں میں تم
چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہو نگاہوں میں تم

گیت پورا ہونے کے بعد ہاتھ میں ساز تھام کر بہت دیر تک وہ انتظار میں کھڑا رہتا کہ عورتوں کی بھیڑ میں سے وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور جواب دے گی۔ "نہیں جگت سنگھ! میں دور نہیں واقعی تمہاری نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں ہی تمہاری ویرو ہوں۔" مگر اس کی بجائے ہمیشہ ایک بھاری آواز سنائی دیتی۔

"جگا! کھڑے ہوئے کیوں ہو؟ لوگ چلے گئے۔ اب کس کا دھیان کررہے ہو؟" تب اس کے دل کو دھکا سا لگتا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر گلے میں پہنے ہوئے تعویذ پر ہاتھ پھیر لیتا۔ تنخواہ کے ساٹھ روپے میں سے تیس روپے جیب خرچ میں ضائع ہوجاتے باقی تیس وہ گھر بھیجتا جن

میں سے چندن پچیس روپے گھر میں خرچ کر کے پانچ روپے بچاتی۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر چندن نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ پڑوس میں رہنے والی عورت کو اس کی غریبی پر رحم آیا۔ لڑکی بیس دن کی ہوگئی تو اس نے چندن سے کہا۔

"بہن! تمہیں دودھ نہیں آتا اور بچی کو پالنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسے مجھے دے دو کھانے پینے سے سکھی رہے گی۔" چندن سناٹے میں آ گئی۔ ہائے رے غریبی۔ پیٹ کا جنا دوسرے کو دینا پڑتا ہے۔ بھگوان نے ایسا دن دکھایا مگر پڑوسن کا دل نہ دکھانے کی خاطر کہنے لگی۔

"بہن بیٹی اپنا نصیب ساتھ لاتی ہے کسے پتہ اس کے جنم سے ہماری غریبی دور ہو جائے۔"

سال بیت گیا۔ مگر غریبی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ چندن کو ملیریا ہوگیا۔ پانچ پانچ کر کے بچائی ہوئی سو پچاس کی رقم بیماری کھا گئی۔ جگت اداس رہتا تھا۔ اسے چاروں جانب مایوسی اور اداسی نظر آتی تھی۔ ماضی کی یاد اسے ستاتی تب رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ ویرو کی یاد میں دل بے چین ہو جاتا۔ ملازمت سے نفرت ہونے لگی۔ تنخواہ بڑھ کر بمشکل پچھتر تک پہنچی تھی۔ دوسرے سال جالندھر رہنے جانا پڑا۔ سو پر مہتا ریٹائر ہو کر جالندھر میں ہی رہتے تھے۔ ان سے ملنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ دو سال میں اس نے نہ تو نام ہی کمایا نہ ہی خوشحال ہوا۔ پھر بھی منہ دکھانے کے لیے ہو آیا۔

"جگا اچھا ہوا تم ملنے آ گئے۔ امرتسر میں کانگریس کا کنونشن ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر وہاں آئیں گے۔ میں تمہیں سفارشی خط لکھ دیتا ہوں۔ گیتوں کے پروگرام میں تمہیں بھی موقع ملے گا۔" جگت کو مسرت نہیں ہوئی۔ پھر بھی پچاس روپے ملنے کا سہارا تھا۔ اس کے پاس پہننے کے لیے صرف ایک جوڑی لباس تھا۔ لیڈروں کے سامنے جانے کے لیے اس نے ایک جوڑا اور سلوانے کے بارہ آنے گز کا کپڑا خریدا۔



ملک کے مشہور لیڈروں کے سامنے ایک کے بعد ایک آئٹم پیش ہونے لگا۔ جگت کا نمبر بارہواں تھا۔ فکر اور جوش میں وہ پردے کے پیچھے ٹہل رہا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ میں تھامی ہوئی لاٹھی سے کھیل رہا تھا۔ گیارہواں آئٹم شروع ہوا تب جگت نے آنکھیں بند کرلیں۔ حلق میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ اب اس کا نام لیا جائے گا۔ اس کے کان کھڑے ہوئے مگر دوسرے کا نام پکارا گیا۔ اس کا دماغ گرم ہوگیا۔ اس نے پروگرام کے منتظم سے فریاد کی۔ "دوسرے جانے پہچانے آرٹسٹوں کو پہلا چانس دینا پڑا۔ دو چار آئٹم کے بعد تمہارا نام بھی پکارا جائے گا۔" اس نے جواب دیا جگت نے ہونٹ چبائے۔ اس لاچاری کے لیے وہ کیوں یہاں آیا؟ اسے اپنی ذات پر غصہ آیا۔ سب جگہ سفارش چلتی ہے۔ خوشامد سے کام ہوتا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ آخر سولھویں آئٹم میں اس کا نام پکارا گیا۔ صافے کے سرے کو بلند کرتا ہوا جگت سب کے سامنے پیش ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں سسی پنوں کا فراقیہ گیت چھیڑا۔ اس کی آواز میں ویرو کا درد شامل تھا اور ساتھ ہی بے درد دنیا کے خلاف غصہ بھی۔

"یہ کون ہے؟" ایک آواز سنائی دی۔ گیت پورا ہونے کے بعد خاموشی میں یہ بھاری آواز تھی۔ یہ پنجاب کانگریس کے صدر پرتاب سنگھ کیروں کی آواز تھی۔ "اس کا ایک اور آئٹم ہونا چاہیے۔"

جگت گیت ختم کر کے ڈائس کے پیچھے چلا گیا۔ منتظم نے آ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ "پاپا جی! تم چھا گئے۔" پھر آہستگی سے بولا۔ "کیروں صاحب نے تمہارے دوسرے آئٹم کا مطالبہ کیا ہے۔" جگت کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب قیمتی بننے کا موقع تھا۔

"مجھے کچھ دیر آرام کرنا پڑے گا۔ پندرہ بیس منٹ جانے دو۔"

"بالکل...... آرام کرلو۔" وہ اب ادب سے پیش آ رہا تھا۔ "تمہارے لیے کچھ منگواؤں؟"

"منگوانا ہے تو شراب منگوا دو! آواز اور کھل اٹھے گی۔"
جگت کو میدان ملا۔ اس لیے دوسرے گیت میں اس نے دیس کے لیڈروں کو جھڑکا۔ اس کا رچا ہوا گیت "جاگتے رہنا" سن کر کانگریس کے لیڈر یہ سوچ کر خوش ہوئے گیت میں اکالی لیڈروں پر چوٹ ہے۔ جگت کا یہ گیت فائدہ مند ثابت ہوا۔ لیڈروں نے پانچ سو روپے انعام دیئے۔ دوسرے لوگوں نے دس دس پندرہ پندرہ کر کے دو سو روپے دیئے اور فنکار کی قدر کی۔ ہر زبان پر جگا کا نام چڑھ گیا۔ وقت پلٹ گیا۔ ملازمت کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ گاؤں گاؤں خود پروگرام کرنے لگا۔

تین سال بیت گئے۔ جالندھر کی ماڈل ہاؤس کالونی میں چھوٹا سا ایک مکان بنا جس کے دروازے پر تختی لگ گئی۔ "جگت سنگھ جگا ریڈیو آرٹسٹ اور سنگر" چندن کے چہرے پر عجیب سی چمک آ گئی۔ ایک وقت کے ڈاکو شوہر نے ساری دنیا کے سکھ اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔ وہ فخر کے ساتھ جگت کو دیکھتی۔

"چندن! اب ماں اور باپو کو بلا لیں۔ لانے کے لیے کوئی اچھا دن منتخب کر لیں۔ کیوں؟" دونوں طویل عرصے سے ماں جی اور باپو سے نہیں ملے تھے۔ صرف خط سے خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ انہیں بلانے کو جگا نے خط لکھا کہ وہ انہیں لینے آنے والا ہے تو اس کے جواب میں تار آیا۔

تار پڑھ کر دونوں کے دل ٹوٹ گئے۔

"تمہارے باپو ہارٹ فیل سے گزر گئے۔"

جگت نے ماں کے پاس پہنچنے تک آنسو روکے رکھے۔ مگر ماں نے جب کہا۔

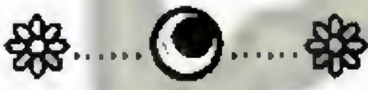
"بیٹا! تمہارا خط پڑھ کر ان کی خوشی دل میں نہیں سماتی تھی۔ میرے بدنام بیٹے نے نام پیدا کیا وہ فخر سے ناچ اٹھتے تے۔" تو جگت کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے ماں کی گود میں سر رکھ کر دل ہلکا کیا لیکن اس سے بڑا صدمہ اسے اس وقت ہوا جب ماں کو ساتھ لے جانے کی بات کی۔

"نہیں جگت! میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم جس طرح میرے گھر مہمان آتے ہو اسی طرح کبھی کبھی میں بھی آتی رہوں گی۔" ماں کے چہرے کی سرخی دیکھ کر جگت کے دل میں کانٹا چبھ گیا۔

"ماں جی! تم کبھی مجھے خدمت کرنے کا موقع دو۔" چندن گڑگڑائی۔ "بیٹے کی طرح ضد کرو گی یہ کیسے چلے گا؟"

"بہو بیٹی! تم عورت ہو۔ ماں کا دکھ جانتی ہو۔ انکار کرتے وقت خود میرا دل بھی دکھا ہے مگر اس سے زیادہ اس وقت دکھا تھا جب جگت نے یہاں رہنے سے انکار کیا تھا۔ وہ گھاؤ ابھی مندمل نہیں ہوا۔" وہ بلند آواز میں بول گئیں۔ پھر ہانپنے لگیں۔ سانس لینے کے لیے کچھ رکنے کے بعد مزید بولیں۔ "اس کی طرح میری رگوں میں بھی ایک جاٹ کا خون دوڑ رہا ہے۔"

ماں نے یہ کہہ دیا۔ جگت بجھ گیا۔ باپو کی موت اور ماں جی کی ضد کا اسے گہرا صدمہ ہوا۔ بوجھل دل سے وہ جالندھر لوٹ گیا۔



"جگا جی! ایک کام کے لیے آئے ہیں۔" محلے کے دو چار بڑے آدمی جگا سے مخاطب ہوئے۔

"اپنے علاقے میں ایک رفاع عامہ اسکول قائم کرنا ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے؟" جگت نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں...... زمین دلانے میں مدد کرنی ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ "راستے کی اس جانب لالہ جی کا پلاٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ وہاں اسکول بنایا جا سکتا ہے مگر......!"

"مگر کیا؟"

"لالہ جی زمین فروخت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟" جگت الجھن میں پڑ گیا۔ وہ لوگ کچھ دیر خاموش رہے پھر ایک نے ہمت کی۔

"تھوڑا رعب دو! وہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔" جگت سمجھ گیا۔ دل میں ہنسا۔ "یہ لوگ میرے رعب کو استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر اچھے کام میں ساتھ دینا چاہیے۔ بستی کے بچوں کا

بھلا ہو تو وہ چاہے برا بن جائے کوئی بات نہیں۔ اس نے کہہ دیا۔

"تم لوگ جاؤ! رات ہوتے ہی راج اور مزدوروں کو اس جگہ پر بھیج دینا۔ اسکول بن جائے گا۔"

"مگر خریدے بغیر چناپی؟" سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"جگا سے کام کرانا ہے تو اسی طرح ہوگا۔" جگت جوش میں آ گیا۔ "تم لوگ آرام سے سوتے رہنا' چٹکی بجاتے میں کام نمٹا دوں گا۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے اور جگا سوچنے لگا کہ رائفل کس سے لی جائے؟ وہ چودہ سال بعد پہلی بار رائفل اٹھانے والا تھا مگر ایک نیک کام کے لیے۔



خیراتی اسکول کی عمارت بنانے کے لیے زمین دلانے کا فرض جگت نے اپنے سر لیا تو چندن نے جگت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ سب تمہیں ہولی کا ناریل بنا رہے ہیں۔"

"چندن! تم مجھے اتنا احمق سمجھتی ہو؟"

"بیوقوف تو تم کو تمہارے دشمن نے بھی نہیں سمجھا ہوگا۔" چندن جلدی سے بولی۔ "مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں جھگڑالو ضرور مانتی ہوں۔ زبان چلاتے چلاتے نہ جانے تم کب ہاتھ اٹھا دو۔" جگت ہتھیلیاں مسلنے لگا تو چندن نے طنز کیا۔ "کیوں..... ابھی سے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے؟" جگت کے ہاتھ رک گئے پھر اس نے پیار بھرے انداز میں ہنس کر اپنی سرخ ہتھیلیوں کے ہالے میں چندن کا چہرہ سما لیا۔

"تمہارے رخسار مسلنے کے لیے کھجلی ہوتی ہے۔"

"ارے ذرا شرم کرو! چار بچوں کے باپ ہو گئے ہو پھر بھی ابھی دل نہیں بھرا؟"

جگت نے دونوں رخساروں پر چٹکیاں بھر لیں۔

"بچوں سے بھر پایا مگر تم سے نہیں۔"

چندن رخسار سہلانے لگی۔ "کیسے جنگلی ہو؟ اگر مجھ سے دل نہیں بھرا تو دوسری لے آؤ! ویرا بھی بوڑھی نہیں ہوئی ہوگی۔" چندن کور نے مذاق میں کہا مگر جگت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے ویرو شدت سے یاد آنے لگی۔ چندن سمجھ گئی۔ جگت کو جیل سے رہا ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے اور ویرو اب تک نہیں ملی تھی۔ پھر اس کی یاد تازہ کرنے سے فائدہ کیا؟ جگت آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ سردی کی دوپہر تھی اس لیے دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو ویرو کی یاد تھپکیاں دے رہی تھی۔ چندن کور نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اچانک جگت اٹھ کر صافہ باندھنے لگا تو چندن ڈر گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اس لالہ جی کے پاس اسکول کا سودا کرنے۔"

"سودا کرنے یا چھین لینے؟" چندن نے کہنا چاہا مگر ارادہ بدل دیا اور بولی۔ "سمجھانے سے کام نکل جائے تو بہتر ہے۔ ہو سکے تو محلے والوں میں سے ایک آدھ کو ساتھ رکھ لینا۔"

"دوسرا کوئی مشورہ دینا ہے؟" یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔

"وہ زمین مجھے فروخت نہیں کرنی۔ سودا کرنے کی بات کہاں ہوئی ہے؟" لالہ جی نے کہا۔

"تم نے پانی کے مول خریدی تھی۔ سونے کے دام لینے میں کیا اعتراض ہے؟" لالہ جی میں جگا سے زبان چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ ان لوگوں نے یہ کام جگا جیسے سر پھرے پر ڈال دیا تھا اس سے لالہ جی دل میں ناراض تھے۔ انہوں نے جلدی سے بات مختصر کی۔

"ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں میں وہ زمین فروخت نہیں کروں گا۔"

جگت کچھ دیر تک لالہ جی کو گھورتا رہا۔ لالہ جی نے سر جھکا لیا جیسے وہ جگا کی نظریں برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ جگت سمجھ گیا کہ اس شخص کو لالچ نے گھیر لیا ہے۔ زمین کے بڑھتے ہوئے دام دیکھ کر یہ مزید لالچ نہیں چھوڑے گا۔ "جیسی تمہاری مرضی....." یہ کہہ کر وہ سر ساتا ہوا باہر نکل

گیا۔ اس کی چال میں جوش تھا جو لالہ جی کی نظر میں نہیں آیا ہوگا۔

اندھیرا پھیلنے لگا۔ جگت جسم پر کمبل اوڑھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے چندن کچھ پوچھے جگت نے کہا۔

''پینے کے لیے دوست کے گھر جا رہا ہوں۔'' پھر مزید بولا۔ ''اگر زیادہ پی گیا تو رات وہیں رہ جاؤں گا۔ انتظار نہ کرنا۔'' پھر بھی چندن رات بھر انتظار کرتی رہی۔ دوست کی رائفل لے کر وہ لالہ جی کی زمین پر پہنچ گیا۔ شام ان لوگوں سے کہہ آیا تھا۔

''میں لالہ جی سے مل آیا ہوں۔ کام شروع کردیں۔ پھر مصالحت ہو جائے گی۔'' لہٰذا کاریگر، مزدور اور سامان وغیرہ جگت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔

''چلو! کام شروع کردو۔'' جگت نے شانے پر رائفل رکھ کر کہا۔ ''پہلے بنیاد ڈالو! رات بھر میں چار دیواری کھڑی کردو۔'' سب کو جوش میں لانے کی غرض سے جگت لوک گیت گانے لگا۔ پیٹرومیکس کے اجالے میں بنیاد بھر دی گئی۔ نصف شب کے بعد چنائی شروع ہوگئی اور صبح تک چار دیواری کھڑی ہوگئی۔ ''ماڈل اسکول'' کا عارضی بورڈ لگا کر جگت روانہ ہوگیا۔ راستے میں دوست کو رائفل لوٹا کر گھر جا کر سوگیا۔ محلے کے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کل تک تو میدان تھا اور آج رات بھر میں اسکول کی عمارت کیسے کھڑی ہوگئی؟ یہ جادو کس نے کیا؟ یقیناً یہ تو جگا کا کام ہے۔ گاؤں کے قریب بچے چار میل پیدل چل کر پڑھنے جاتے۔ یہ دکھ اب ٹل گیا۔

دھوپ سر پر آگئی تب چندن نے جگت کے سر پر سے چادر ہٹائی۔ ''اٹھو! پولیس چیف آئے ہیں۔'' سورج کی کرنیں پلکوں میں چبھنے لگیں۔

''اسے کیا کام پڑ گیا؟''

''پھر انجام بنتے ہو؟'' چندن بڑبڑائی۔ ''تمہارے کارنامے کا ڈھنڈورا سارے گاؤں میں بج گیا ہے۔'' یہ سن کر جگت چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چندن سے نظر نہیں ملا سکا۔ ہاتھ منہ دھو کر ڈرائنگ روم میں گیا۔

''آئیے صاحب! اچانک اس طرف؟'' اپنے چہرے کے تاثرات ظاہر نہ ہو جائیں اس کے لیے تولیے سے مسلسل چہرہ صاف کررہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر صاحب نے ٹوکا۔

''آنکھوں میں ساری رات جاگنے کا خمار معلوم ہوتا ہے جگا۔''

''ہاں صاحب! ڈاکو تھا تو بیداریاں کھٹکتی نہیں تھیں۔'' پھر ہلکی سی آواز میں بولا۔ ''اب گھر والی نے بارہ بجے کے بعد باہر رہنے کی ممانعت کردی ہے۔''

''پھر بھی رات تم نے ممانعت ٹھکرادی۔'' چیف نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تھانے بلانے کی بجائے دوستی کا لحاظ کر کے گھر آیا ہوں۔''

''اوہ...... یہ بات ہے؟'' جگت ہنس دیا۔

''لالہ جی نے فریاد کی ہے کہ کسی نے ان کی زمین پر رات بھر میں غیر قانونی چنائی کرلی ہے۔'' پھر مسکرا کر بولا۔ ''مگر لالہ جی نے تمہارا نام نہیں لیا۔ کل شام تم ان سے ملنے گئے تھے؟''

''تب تم کو سب کچھ معلوم ہے کھنہ صاحب!'' پھر اقرار کے انداز میں بولا۔ ''میرے سب بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں اس میں میرا مفاد نہیں۔ میں نے یہ سب گاؤں کے غریب بچوں کے لیے کیا ہے۔ تمہارا قانون اعتراض کرتا ہے تو گرادو اور کیا؟'' آخری الفاظ جوش کی بجائے پیار میں کہے گئے تھے۔ چیف کو حیرت ہوئی جگا نے غلط رویہ نہیں رکھا۔ رعب نہیں دکھایا۔ اپنے ذہن میں سوچا ہوا کام کر آیا ہے پھر بھی کہتا ہے کہ دیواریں گرانی ہیں تو گرادو! ایک اچھے کام کے لیے غلط قدم اٹھایا ہے۔ چیف کے دل میں ہمدردی جاگی۔ اسے لالہ جی پر غصہ آیا۔ زمین فروخت کرنے میں اس کے باپ کا کیا جاتا تھا؟ وہ چائے پی کر کھڑا ہوگیا۔

''لالہ جی کو جو کچھ کرنا ہو کر گزرے۔ مگر تمہیں ایک بات کہے دیتا ہوں جگا! بغیر لائسنس رائفل رکھنا جرم ہوتا ہے۔''

"تمہیں اس کا بھی پتہ چل گیا؟ میں سمجھتا تھا کہ بغیر لائسنس رائفل رکھنا جرم نہیں، استعمال کرنا جرم ہے۔" جگت نے ہنس کر کہا پھر مذاق میں بولا۔ "وہ تو کبھی کبھی شانے پر رائفل رکھنے کو دل ہو جاتا ہے۔ برسوں پرانی عادت ہے۔"

"پھر کبھی رائفل چلانے کو بھی دل چاہے گا۔ خیال رکھنا۔" یہ کہہ کر پولیس چیف چلا گیا۔

جگا دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ لوٹا تو چندن راستہ روکے کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ "اب تمہیں بھی کچھ فریاد کرنی ہے؟" جگت نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھ کر سوال کیا۔ چندن نے ہٹ کر اندر جانے کا راستہ دیا۔

"دوست کے ہاں رکنے کا کہہ کر یہ کارنامہ کرنے گئے تھے؟"

"چندن! تم ہی کہو۔ لالہ جی کے پاس کافی زمین ہے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا ایسے نیک کام کے لیے دینے میں ان کے باپ کا کیا جاتا ہے؟"

"اور تم ہی کہو کہ اس طرح رائفل لے کر دادا گیری کرنے نہ گئے ہوتے تو تمہارے بیٹے کا کیا جاتا؟"

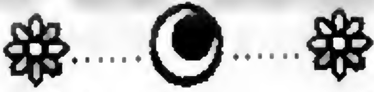
"اب تمہاری اجازت لے کر جاؤں گا۔ بس؟" جگت نے بات ٹالنے کے لیے محبت سے کہا۔

"یعنی آپ پھر رائفل اٹھائیں گے؟" چندن نے آنکھیں دکھا کر پوچھا تو جگت ہنس دیا۔

"یار! یہ قدرت کی بھی کیسی بلہاری ہے۔ پولیس والے سب دوست بن گئے لیکن گھر کی بیوی پولیس کی طرح پوچھ گچھ کر کے پریشان کرتی ہے۔" پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ایک جرم معاف کر دو بادشاہ! پھر یہ غلام کبھی گستاخی نہیں کرے گا۔" تب چاروں بچے مسرت سے تالیاں پیٹنے لگے۔

"شاباش بابو! گھر میں ڈرامہ کرنے لگے۔" یہ سن کر چندن شرما گئی۔ جگت دونوں بچوں کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھمانے لگا۔

"ڈرامہ پورا ہوا۔ اب تماشہ دیکھو۔" گھر کی فضا خوشگوار ہوگئی۔



حکومت ملک گیر بنیاد پر نوجوانوں کو فوجی تربیت دے رہی تھی اور رضا کار دستے منظم کیے جا رہے تھے۔ جالندھر رضا کار دستوں کی ذمہ داری جگت کے سپرد کی گئی۔ جوان لڑکے اور لڑکیوں کو رائفل ٹریننگ دینے میں اسے لطف آتا تھا۔

ایک شام کی بات ہے رضا کار دستے کی چھاؤنی سے گھر جانے کے لیے وہ صافہ ٹھیک کر رہا تھا کہ کسی نے آ کر کہا۔ "جگا جی! وہ لڑکی آپ کو بلا رہی ہے۔" اس نے دور کھڑی ہوئی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

جگت نے اس جانب دیکھا۔ صافے پر اس کے ہاتھ جم گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ فاصلے پر لڑکی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ جگت چونکا وہ بیس سال پہلے کی ویرو دکھائی دے رہی تھی۔ لڑکی رائفل کی نال پر انگلیاں پھیرتی ہوئی دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبائے سر جھکائے کھڑی تھی۔ جگت کا دوڑ کر اس کے قریب جانے کو دل چاہا مگر خود پر قابو پالیا۔ دوڑنے کی بجائے وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ ایک جذبہ ایک سنسنی اور دھڑکتا دل...... پانچ چھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اس کے پاؤں رک گئے۔ جوش میں وہ بھول گیا کہ بیس سال کے بعد ویرو اس طرح جوان کیسے دکھائی دے سکتی ہے؟ اسی لمحے لڑکی نے گردن گھمائی' قدرت کی کاریگری نے جگت کے دل پر اثر کیا۔ چہرہ مہرہ وہی ہونے کے باوجود وہ ویرو نہیں تھی' نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی بیس اکیس سالہ لڑکی میں اسے ویرو نظر آئی۔ جیسے رائفل لے کر کہنا چاہتی ہو جگت سنگھ! تمہیں میری ادھوری آس پوری کرنے کے لیے اس سماج سے انتقام لینا ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بھول گئے؟ پہچان نہیں سکے؟ جگت الجھن میں پڑ گیا۔

"تم نے مجھے بلایا ہے؟ مگر میں تو تمہیں نہیں جانتا۔" لڑکی کے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ رائفل کے سہارے دو قدم آگے بڑھی۔

"میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں رضا کار دستے کی

رائفل فورس میں ہوں۔ بہت دن سے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔" جگت کو اب خیال آیا کہ اس نے لڑکی کو پہلے بھی دیکھا تھا مگر نام سے واقف نہیں تھا۔ یہ ویرو نہیں ہے؟ پھر بھی اس کا نام ویرو ہوتو......؟ جگت نے سوچا۔

"میرا نام گرودیو کور ہے۔" لڑکی کے ہونٹوں سے پھول جھڑے۔ "مجھے سنگیت کا شوق ہے۔ کچھ گانا بھی آتا ہے۔ آپ ایک بار ہمارے گھر آئیں چائے وغیرہ پینے۔"

"تمہارے گھر؟" جگت ابھی تک ویرو کے خیال میں تھا۔ "میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔"

"یہاں سے آپ کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ہماری کوٹھی پڑتی ہے۔" پھر جلدی سے بولی۔ "ابھی چلیں۔" ویرو اسی طرح بولتی تھی۔ بولتے وقت وہ آنکھوں کی پتلیوں کو اسی طرح گردش دیتی تھی۔ انجانی ہونے کے باوجود یہ لڑکی اسے جانی پہچانی نظر آئی۔ "چل رہے ہیں؟" اس نے شیریں لہجے میں پوچھا تو جگت انکار نہ کرسکا۔ وہ لڑکی کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔

"آپ بیٹھیں! میں ماں کو بلاتی ہوں۔" یہ کہہ کر لڑکی کمرے میں چلی گئی۔ جگت کو یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ دل کے طوفان کو چھپانے کے لیے اس نے میز پر پڑی ہوئی نوٹ بک اٹھالی۔ کھول کر دیکھی، جو گیت وہ اکثر گاتا تھا پہلے صفحے پر تھا۔ "میرے گیت میں تم ہو خیالوں میں تم" ویرو کی یاد میں لکھا ہوا گیت یہاں؟ جگت کے ذہن میں سنسنی ہونے لگی۔ دوسرے گیت بھی اسی کے تھے۔

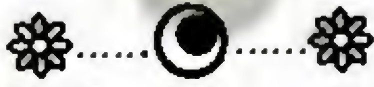
"آپ نے میری نوٹ بک دیکھی؟" لڑکی کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ "میں نے آپ کے سارے گیت اتار لیے ہیں۔" پھر عقب میں آتی ہوئی ماں سے بولی۔ "یہ جگت سنگھ ہیں ماں جی! اس دن ہم پروگرام دیکھنے گئے تھے وہی۔" جگت نے ہاتھ جوڑ کر مسرت کا اظہار کیا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ چائے پینے کے دوران گرودیو کور پیار بھری نظروں سے جگت کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ جگت چلنے کے لیے کھڑا ہوا تو لڑکی کی ماں نے کہا۔

"بھائی! تم سے ایک کام کرانا ہے۔" جگت نے سوچا کہ بیٹی کو سنگیت سکھانے کے لیے کہے گی۔ "اس کوٹھی کا نصف حصہ ہم نے کرائے پر دیا تھا۔ کرایہ دار ایسے گھس آئے ہیں کہ خالی نہیں کرتے۔" ماں نے عاجزی سے کہا۔ "تم انہیں سمجھا کر خاموش کرادو۔"

جگت کو یہ عجیب سا لگا۔ اس نے دیکھا ماں نے جو کام بتایا گرودیو کور کو اچھا نہیں لگا۔ لڑکی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جگت بولا۔ "ماں جی! سمجھا کر کام نکالنا مجھے کم آتا ہے۔ میرا ماضی چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"اسی وجہ سے تمہیں یہ کام بتایا ہے۔" ماں جی نے سچ بول دیا۔ "انہیں سمجھانے میں ہم نے کمی نہیں رکھی۔"

"پھر ٹھیک ہے آپ کا کام ہوجائے گا یہ سمجھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے گرودیو کور پر نظر ڈال کر جگت رخصت ہوگیا۔ راستے کے موڑ پر آیا تو ویسے ہی گردن گھما کر دیکھا۔ گرودیو کور کھمبے کے سہارے کھڑی تھی۔ جگت نے شرما کر قدم تیز اٹھانا شروع کردیے۔



گرودیو کور ایک دن خوش ہو کر جگت کے گھر آئی۔ "جگا جی! خوشخبری دینے آئی ہوں۔ وہ کرائے دار مکان خالی کر گئے۔" پھر چندن کور سے کہا۔ "بہن جی! انہوں نے ہماری مشکل حل کردی۔ تین سال سے ہم تنگ آگئے تھے۔" جگت اس کی حسین مسکراہٹ پر خوش ہو رہا تھا۔ گرودیو کور شرما گئی۔ پھر جگت نے تیزی سے نظر گھمالی۔ "تم نے انہیں تین ہی دن میں کس طرح تنگ کردیا؟ یہ تو بتاؤ۔" لڑکی سوال کر بیٹھی۔ چندن کو بھی مذاق سوجھ گیا۔

"تنگ کرنے کے لیے انہیں تین دن تو کیا تین گھنٹے کافی ہیں۔"

"نہیں چندن! اس میں واقعی تین دن لگے تھے۔" جگت نے خلوص سے کہا۔ "تم ناراض نہ ہوتو بتاؤں؟"

"یہ ناراض نہیں ہوں گی اس کا میں یقین دلاتی ہوں۔" گرودیو کور جوش میں بولی۔ چندن کور کو اس لڑکی سے محبت سی محسوس ہوئی۔ اسی لیے وہ اسے خوش دیکھنا

چاہتی تھی۔ پھر بھی اسے چڑانے کے لیے چندن نے اس کے بازو پر چٹکی بھر کر کہا۔

"اری میری بجائے یقین دلانے کا حق تم نے کب سے لے لیا؟"

گرودیو کور ہنس پڑی۔ "ہاں بتائیں انہیں کس طرح تنگ کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ایک دن ہم اس کی دکان پر گئے۔" جگت کہنے لگا۔ "میرے ساتھ تین چار دوست تھے۔ میں اپنے ہمراہ ایسے لوگوں کو لے کر گیا تھا جو صورت سے ہی غنڈے دکھائی دیں۔ ہم ٹائر خریدنے کے بہانے گئے تھے۔ ہم لوگ آپس میں اس طرح سرگوشیاں کرنے لگے کہ سیٹھ اور لڑکوں کا دھیان ادھر جائے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک آدھ ہتھیار تھا۔ جیسے میں ٹائر دیکھنے نہیں بلکہ باپ بیٹوں کی پہچان کرانے دوستوں کو ساتھ لایا ہوں۔ میں نے ایسا ظاہر کیا۔"

"اور وہ ڈر گئے؟" گرودیو کور درمیان میں بولی۔

"سنو تو سہی۔" جگت نے اسے ڈانٹ دیا۔ "اس طرح ڈر کر وہ اتنا خوبصورت مکان خالی کرنے والے نہیں تھے۔ میں نے دوسرا طریقہ آزمایا۔ میں رہا بدنام آدمی لہٰذا فریاد کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے ایک کرائے کے جوتشی کو میں نے اس کی دکان پر بھیجا۔ اس نے سیٹھ کو بھڑکا دیا۔ فلاں ستارہ ٹکرا رہا ہے۔ کوئی اچانک آفت آنے والی ہے۔ موت کا سایہ نظر آ رہا ہے۔" "اور بے چارے کے پیر ٹھنڈے ہو گئے۔" جگت کچھ رکا پھر آگے کہنے لگا۔ "آخری جھٹکا دو دن پہلے دیا۔ تم لوگوں کو ایک رات دوسری جگہ گزارنے کی کہہ کر چار پانچ آدمیوں نے گھر میں ایسا شور شرابا کیا جیسے نشے میں چور ہوں۔ کچھ اندر اندر جھگڑے جیسے چھریاں چلنے والی ہوں ایسا خطرناک ماحول پیدا کر دیا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گئے کہ اب روز رات کو ہم یہاں محفل جمائیں گے۔" پھر جگت اس طرح بولا جیسے ان لوگوں پر رحم کھا رہا ہو۔ "بے چارے بری طرح پریشان ہو گئے۔"

"ہاں! وہ جاتے جاتے بڑبڑا رہے تھے کہ جو بدمعاشوں کو گھر میں لا کر تماشہ کریں ان کے پڑوس میں رہنا اچھے آدمیوں کا کام نہیں۔" گرودیو کور ہنس کر بولی۔

"بے چارے شریف آدمی۔" جگت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "عارضی طور پر رہنے آئے اور بنگلہ ہتھیا لیا۔"

"جیسے آپ نے کبھی کسی کا کچھ نہیں ہتھیایا ہو۔" چندن نے منہ بنا کر کہا۔ گرودیو کور کی موجودگی میں اسے جگت کو چڑانے کا لطف آتا۔

"تم میاں بیوی لڑ پڑو گے بھئی۔" گرودیو کور جلدی سے بولی۔ "جگا جی! مجھے آپ کو گرو بنانا ہے۔"

"گرو.....؟" جگت چونکا۔ "اور میرے جیسے بدنام شخص کو؟"

"بدنام نہیں بلکہ ایک اچھے فنکار کو۔" گرودیو اب آزادی سے بول رہی تھی۔ "کل سے میں سنگیت سیکھنے آنے والی ہوں۔" جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ گرودیو کور کا شوخ مزاج اسے پسند تھا۔ مگر اسے دیکھتے ہی دیرو کی یاد آ جاتی اور وہ بے چین ہو جاتا۔

"بڑے آدمی کی طرح کس سوچ میں ڈوب گئے؟ بمشکل تمہیں ایک چیلی گرو بنانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ ہاں کہہ دو۔" چندن کور نے جلدی سے کہا۔ جگت ہنس دیا۔

"تم نے ماں باپ کی اجازت لی ہے؟"

"بالکل! وہ سن کر خوش ہوئے۔" گرودیو کور نے جواب دیا۔

"اس طرح نہیں، تمہارے باپو مجھ سے کہیں تو میں مانوں گا۔" جگت نے صاف لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سیکھنے کے لیے تمہیں یہاں رہنا پڑے گا۔"

"اس کی اجازت بھی میں نے لے لی ہے۔" گرودیو کور پر جوش انداز میں بولی۔

"پھر بھی اپنے باپو کو لے آ تو بات کریں گے۔" چندن کور کو جگت کی بات مناسب لگی۔

"ہاں! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔" چندن نے جگت کی تائید کی۔



گرددیوکور اپنے باپو کی طرف دیکھ کر اشارہ کررہی تھی۔

''کہیے! اب کس بات کا انتظار کررہے ہیں؟''

اس کے باپو خاموش بیٹھے رہے۔ جگت نے خاموشی توڑنے کی غرض سے چندن کو مخاطب کیا۔''بزرگ کے لیے کچھ بنا کرلاؤ۔'' پھر مہمان سے ہی پوچھا۔''کیا پئیں گے چائے یا لسی؟''

چندن کور اٹھنا چاہتی تھی کہ اسے گرددیوکور نے روک لیا۔''بہن! میں چائے بنا کرلاتی ہوں۔ باپو کم چینی والی چائے پیتے ہیں۔'' گرددیوکور کے اندر جانے کے بعد اس کے باپو نے بات شروع کی۔

''جگت سنو! گرددیوکور کی مرضی تم سے گانا سیکھنے کی ہے۔'' جگت نے یہ الفاظ غور سے سنے۔

''آپ کی کیا مرضی ہے؟''

''صحیح بات کہوں؟'' پھر رک کر آگے بولے۔''پہلے تو انکار کیا جوان بچی ہے اگر عام جگہوں پر گائے گی تو شادی کے سلسلے میں مشکل ہوگی مگر اس کی آواز اچھی ہے۔ پہلے کچھ لوگوں نے کہا بھی تھا کہ اسے سنگیت کی تعلیم دلاؤ! لڑکی نام پیدا کرے گی۔ یہی سب سوچ کر ہم راضی ہوئے ہیں۔''

''مگر میرے پاس بھیجنے میں ایک خطرہ ہے۔ یہ شاید آپ نے نہیں سوچا ہوگا۔''

گرددیوکور کے باپو چونکے۔''خطرہ......؟''

''میں رہا بدنام آدمی۔'' جگت کہنے لگا۔''میرے ساتھ بہت سی لڑکیاں اکثر پروگرام دینے آتی ہیں۔ ان سے بھی کہتا ہوں کہ لوگوں کی باتوں کی پروا ہے تو میرے ساتھ نہ آؤ۔'' جگت رک گیا۔

گرددیوکور کے باپو سن رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آرہے تھے۔''گرددیوکور جب یہاں سے جالندھر شہر تک رکشہ میں بیٹھ کر جائے گی تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ میرے گھر میں رہے گی تو لوگوں میں مختلف افواہیں بھی گرم ہوں گی۔ ان سب باتوں کے متعلق آپ نے سوچا۔

اسی لمحے گرددیوکور اندر آئی۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ اس نے جگت کے آخری الفاظ سنے۔ اس نے باپو کی جانب تیز نظروں سے دیکھا۔ اپنے ارادے کی مضبوطی دکھانے کے لیے باپو نے آنکھوں کے ذریعے بیٹی کو جواب دیا۔

''تمہاری خواہش میں سمجھتا ہوں۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔''

''جگت سنگھ!'' انہوں نے کھنکار کر کہا۔''تمہارے متعلق مجھے اب تک بہت سی باتیں سننے کو ملی ہیں مگر لوگوں کی باتوں کی مجھے پرواہ نہیں۔ یہ یہاں رہ کر سنگیت میں ترقی کرے گی تو مجھے سکون ہے۔'' چندن کور گرددیوکور کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ گرددیوکور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نظر آئی مگر جگت ابھی سنجیدہ تھا۔

''بزرگ! میری جانب سے بے فکر رہنا۔ میں اسے تمہاری امانت کی طرح حفاظت سے رکھوں گا۔ مگر......!''

''رک کیوں گئے جگا؟'' انہوں نے فوراً پوچھا۔

''ایک بات آپ کو بتادوں۔ انسان کا کسی چیز کی لگن ہونے کے بعد واپس ہونا مشکل ہوتا ہے۔ دو چار ماہ بعد آپ اس کا ارادہ بدلنا چاہیں گے تو لڑکی شاید آپ کی بات نہ مانے۔'' جگت نے یہ الفاظ محفوظ کرکے کہے تھے۔ چندن کور محسوس کررہی تھی کہ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر تھا مگر گرددیوکور درمیان میں بول اٹھی۔

''ہاں باپو جی! میں تعلیم شروع کرنے کے بعد مکمل کرکے رہوں گی۔''

''بیٹی! میں تمہاری عادت سے واقف ہوں۔'' چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے وہ بولے۔''تم اپنی ضد پوری کیے بغیر نہیں مانو گی۔''

اگر یہ بات انہوں نے ہنستے ہوئے نہ کہی ہوتی تو اس کا مطلب بدل جاتا۔ گرددیوکور نے خوش ہوکر پہلے پتا کے چرن چھوئے پھر جگت کے چرن چھونے لگی۔''آج سے

میں تمہاری شاگرد اور تم میرے گرو۔" وہ چندن کی جانب بڑھی مگر چندن نے اسے جھکنے نہیں دیا۔
"تم تو میری چھوٹی بہن کے برابر ہو۔" یہ کہہ کر اسے سینے سے لگالیا۔ مسرت کے دو آنسو گرودیو کور کی پلکوں پر چمکنے لگے۔
"گرودیو کور!" جگت نے انہیں جدا کرنے کے لیے کہا۔ "باپو کی موجودگی میں تمہاری تعلیم کی ابتدا ہوگی۔ جاؤ اندر سے ہارمونیم لے آؤ۔" گرودیو کور ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی گئی اور ہارمونیم اٹھالائی۔ سر ملائے اور گلا صاف کر کے آواز اٹھائی۔
"میرے گیت میں تم ہو خیالوں میں تم ہو....." جگت چونک اٹھا۔ گرودیو کور کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی اور جگت کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ سر بلند ہوتے گئے اور درد کی گہرائی بڑھتی گئی۔ تب مجبور ہو کر اس نے بھیگی پلکوں کو زور سے دبایا اور آنسوؤں کا ریلا رخساروں پر بہہ کر عجیب سا گرم لمس پہنچانے لگا لیکن دل میں ٹھنڈک ہونے لگی۔ ہارمونیم پر گھومتی گرودیو کی انگلیاں رک گئیں۔ آواز بھی رک گئی۔ گرودیو کور کی پلکیں بھی بوجھل تھیں۔ کمرے میں غمگین خاموشی چھا گئی۔
تھوڑے دنوں میں گرودیو کور نے گھر کے سب افراد کو اپنی محبت سے متاثر کر دیا۔ سب کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ بچوں کو وقت پر سکول بھیجتی، ان کے کپڑے سنبھالتی اور سگی ماں کی طرح ان سے پیار کرتی۔ چندن کو کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی۔
"تم نے بہت سال کام کیا اب آرام کرو۔" یہ کہہ کر وہ شوخی سے ہنس دیتی۔
"گھر کی ذمہ داریاں تم نے اس طرح سنبھال لی ہیں کہ جیسے ہمیشہ رہنے والی ہو۔" چندن کہتی۔
"ہمیشہ کے لیے ہی رہنے آئی ہوں۔" گرودیو کور رخسار پر بہتا ہوا پسینہ کرتے کی آستین سے پونچھ کر پراٹھا سینکتی ہوئی بولی۔ "مجھے دھکے دو گے تب بھی نہیں جاؤں گی۔"
"ارے باپ رے....." باورچی خانے کے سامنے چارپائی پر بیٹھی ہوئی چندن ہاتھ کا اشارہ کر کے بولی۔ "کوئی اچھا لڑکا ملا تو تمہیں فوراً نکال باہر کروں گی۔ سمجھیں؟"
مذاق کے باوجود گرودیو کور کا چہرہ بجھ گیا جیسے پراٹھا اتارتے ہوئے انگلیاں جل گئی ہوں، اسی طرح اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کچھ دیر تک چندن کور کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں نہ جانا چاہوں پھر بھی رخصت کر دو گی؟ سچ سچ اپنے من کی بات کہنا بہن! میں تمہارا کچھ چھین لوں گی کبھی تم نے ایسا محسوس تو نہیں کیا؟"
چندن جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ ایک بار دیرو نے بھی اسی طرح کی بات پوچھی تھی۔ "تم نے یہ کیا کہہ دیا؟" چندن بولی۔ پھر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "سچ جاننا چاہتی ہو تو کہہ دوں، میرا مطلبی دل چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ یہاں رہو۔ چار دن پہلے ڈاکٹر سے ایکسرے کرانے گئی تھی تو میں نے ڈاکٹر سے صاف کہہ دیا تھا کہ صاحب! جو بیماری ہو کہہ دینا۔ مجھے اب سردار جی یا بچوں کی فکر نہیں ہے۔"
"تم نے ڈاکٹر سے ایسا کہا؟" گرودیو کور چونک پڑی۔
"وہ اپنے ہی آدمی ہیں۔" چندن کور ہنس دی۔ "انہیں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ کہاوت ہے کہ ماں مرے مگر خالہ جئے۔"
"کیا مرنے جینے کی بات چل رہی ہے؟" جگت نے قریب آکر پوچھا۔ گرودیو کور چولہے کو پھونک مارنے لگی۔
"اس طرح چور کی طرح اندر آکر تم نے ہماری باتیں کیوں سنیں؟" چندن نے جگت کو آنکھیں دکھائیں۔
جگت اپنا صافہ کھونٹی پر ٹانگتا ہوا بولا۔ "چندن! اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں، تم سے کہے دیتا ہوں کہ ہمارا چنا پانچویں کور رہا ہونے والا ہے۔ اگلے دن مجھے یاد دلانا۔ میں اسے لینے فیروز پور جاؤں گا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"
"چنا بھائی رہا ہونے والے ہیں؟" چندن خوش ہوگئی پھر اسے کچھ یاد آیا۔ "مگر تم ماں بیٹے کو جدا کیوں کر رہے ہو؟

اتنے سال بعد وہ جیل سے آ رہا ہے اسے گھر جانے دو! پرم جیت کے ساتھ کچھ دن رہنے دو پھر لے آنا۔"

"چندن! تم جانتی ہو ماں بیٹے کے درمیان زہر گھل گیا ہے۔ چنا جیل سے سیدھا اپنے گھر جائے گا تو اپنے سوتیلے بھائی سے جھگڑا کر بیٹھے گا۔ ہم اسے یہاں رکھ کر اس کی ماں کی طرف سے خفگی کم کر سکیں گے۔"

"پھر تو یہ عمدہ بات ہے۔" چندن کور کو اطمینان ہوا۔ اپنے دل سے انتقام کی آگ بجھا کر دوسرے کو بھی اسی راستے پر چلانے کی جگت کی دلچسپی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر اسے مذاق سوجھ گیا۔ "اے گرودیو کور! سردار جی کا ایک ساتھی ہمارے ہاں آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہے اسی سے تمہارا معاملہ فٹ کر دیں گے۔"

"تم ڈاکو سے بیاہی ہو اس لیے مجھے بھی ڈاکو سے چپکانا چاہتی ہو؟ مجھے گھر سے نکالنے کی اتنی جلدی ہے؟" گرودیو کور نے کہا۔ دونوں کے درمیان تکرار میں حصہ لینے کے لیے جگت کود پڑا۔

"تم فکر نہ کرنا تم کو یہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔ جانا ہو تو چندن جا سکتی ہے۔" چندن نے آنکھیں نکالیں تو جگت نے جلدی سے کہا۔ "کیوں! ڈاکٹر نے تم کو ہسپتال میں داخل ہونے کو نہیں کہا؟ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔" جواب میں چندن جگت کے سینے پر گھونسے برساتی ہوئی بولی۔

"سردار جی کی نیت خراب ہو رہی ہے...... کیوں؟"



کار فیروز پور کی جانب تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ پھر بھی جگت کو رفتار کم معلوم ہو رہی تھی۔

"ہنومان! ابھی رفتار کم ہے۔ ذرا اسپیڈ بڑھاؤ۔" جگت نے کار چلانے کے لیے ایک ڈرائیور رکھا تھا وہ اسے اپنے مرحوم دوست جیسا دکھائی دیتا تھا اس لیے وہ اسے ہنومان کے نام سے پکارتا تھا۔ پہلے وہ ہنومان کہنے پر چونکا کہ جگت اس کو اصلی نام کی بجائے ہنومان کیوں کہتا ہے؟ مگر جب جگت نے ہنومان کی دوستی کی داستان سنائی تو وہ خوش ہو گیا۔ "پھر تو مجھے یہ نام بھی منظور ہے۔" اس کا مزاج بھی ہنومان جیسا تھا۔ کار چلانے پر اکثر جگت کو ٹوکنا پڑتا۔

"بھائی صاحب! ذرا اسپیڈ کم کر دو۔ ورنہ اخبارات میں پھر خبر آئے گی کہ جگا ڈاکو کے ہاتھوں ایک اور قتل۔" مگر جگت نے اب جس وقت رفتار بڑھانے کی بات کی تو وہ ہنس دیا۔

"کتنے لوگوں کو لپیٹ میں لینا ہے یہ بھی کہہ دینا! چنا کو جیل سے لینے جا رہے ہو اس کے ساتھ کیا مجھے جیل چھوڑ آنے کا خیال ہے؟" مگر جگت چنا کے خیال میں گم تھا۔ جیل سے رہا ہوئے اسے دس سال ہوئے مگر وہ بمشکل سات آٹھ مرتبہ اس سے ملنے جا سکا تھا۔ اب چنا اپنی ماں سے جیل میں ملاقات کر لیتا تھا۔ ماں اس سے کہتی تھی۔

"گھر آؤ تو تمہاری شادی کر دوں گی۔" چنا زیادہ خوشی کا اظہار نہ کرتا۔

"جیل کاٹ کر آئے ہوئے شخص سے کون شادی کرنے کو تیار ہوگی ماں! اس کی بجائے اپنے اجیت کا گھر بساؤ۔"

"نہیں بیٹا! پہلے بڑا بھائی بیاہا جائے گا' پھر چھوٹے کی باری پھر وہ ابھی بمشکل پندرہ سولہ برس کا ہے۔ ابھی تو اسے پڑھانا ہے۔" پرم جیت جب یہ بات کہتی تو چنا اپنے سوتیلے بھائی سے نفرت کا اظہار چہرے سے نہ کرتا۔ آخری بار جگت جیل میں پروگرام کرنے گیا تھا تو چنا نے تمام قیدیوں سے کہہ رکھا تھا۔

"جگا باہر پروگرام دینے جاتے ہیں تو پانچ سو یا ہزار روپے لیتے ہیں' ہم بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔" پروگرام پورا ہونے کے بعد قیدیوں کی جانب سے اکٹھی کی ہوئی رقم جگت کو دینے کا کام بھی چنا کے سپرد کر دیا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" چنا نے پیسے دیئے تو جگت غصے میں آ گیا۔ "تم لوگ مجھے پیسے دے رہے ہو؟" پھر اس کی جانب نظریں گھما کر بلند آواز میں بولا۔ "جیل کے برے دنوں میں تم لوگوں نے ساتھ دیا۔ مجھے اپنا سمجھ کر پیار دیا اور

دو گھنٹے تم کو خوش کرنے آیا ہوں تو اس کی قیمت دے رہے ہو؟''

''پاپا جی! تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم قیمت دے رہے ہیں؟'' چنا بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم سب کے پیار کا نذرانہ ہے جگا جی! یہ لینے سے انکار کرو گے تو ہمارے دل دکھیں گے۔'' کچھ بحث کے بعد جگا نے رقم لے لی۔

''میں یہ پیسے رکھ لیتا ہوں مگر اپنے لیے نہیں، جیل کاٹتے ہوئے کسی قیدی کے بے آسرا خاندان کو تم لوگوں کی طرف سے دے دوں گا۔'' جدا ہوتے وقت جب چنا نے کہا کہ میں ایک ماہ بعد رہا ہو رہا ہوں تو جگت کو خیال آیا کہ دس سال کتنی تیزی سے بیت گئے تھے؟

''چنا! باہر آ کر کام سے لگ جانا۔'' اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دروازے تک ساتھ جاتے ہوئے جگت نے سمجھایا۔ ''گھر جاتے ہی تمہاری ماں کو صدمہ ہو، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔''

''بہت کوشش کرتا ہوں پاپا جی!'' چنا نے دل کی بات کہہ دی۔ ''ماں کی جانب سے نفرت نہیں جاتی۔ ممکن ہے ماں کی طرف سے نفرت دل سے نکل جائے مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ پنا سنگھ کے لڑکے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون نہیں اترے گا۔''

جگت کو اس کی حالت پر ہمدردی جاگی۔ باہر نکلتے ہی اگر چنا سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تو زندگی بگڑ جائے گی۔ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔

''چنا! رہائی کے دن میں تمہیں لینے آؤں گا۔ کچھ دن میرے ساتھ رہنا۔ ٹھیک لگے تو میرے ساتھ کھیتی باڑی کرنا۔'' چنا کو یہ بات پسند آئی۔ جس کے ساتھ ڈاکے ڈالے اس کے ساتھ کھیتی باڑی۔ باقی زندگی گزارنے کو ملے تو یہ خوشی کی بات تھی۔ اس نے جگت کا ہاتھ دبایا۔

''پاپا جی! میرے دل کی بات تمہاری زبان پر آ گئی۔'' پھر دروازے کے پاس سے واپس لوٹتے ہوئے بولا۔ ''مگر تم اس دن جلدی آ جانا! ماں کو میں نہیں سمجھا سکوں گا۔''

جگت ڈرائیور کو اسی لیے جلدی چلانے کو کہہ رہا تھا۔ اچانک کار کو جھٹکا لگا۔ ''کیا ہوا؟ گاڑی کیوں روک لی؟'' وہ چیخ پڑا۔

''گاڑی کے اسپرنگ سے کچھ گرنے کی آواز آئی ہے۔'' ڈرائیور نے باہر آ کر کہا۔ ''میں ذرا دیکھ لوں۔'' نیچے کے دو بولٹ نکل گئے تھے۔ ابھی دس میل کا فاصلہ تھا۔ ریپیرنگ کے بغیر آگے بڑھنے میں ڈرائیور کو خطرہ نظر آیا اور ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا۔

''چنا تو گھنٹہ بھر پہلے چلا گیا ہے۔'' فیروز پور جیل کے گیٹ پر اسے خبر ملی۔ ''اس کی ماں کل رات سے آئی ہوئی تھی۔ صبح رہا ہوتے ہی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔''

''مگر میں اسے لینے آنے والا تھا۔'' جگت کو ذرا سا غصہ آ گیا۔

''چنا نے بہت انکار کیا مگر ماں نے کہا کہ پہلے ایک بار گھر آ جا! پھر جہاں بھی جانا ہو چلے جانا۔ وہ پھر بھی نصف گھنٹے تک رکا رہا۔ جاتے ہوئے کہتا گیا پاپا جی آ ئیں تو ہم اسٹیشن پر ہیں۔ وہیں بھیج دینا۔''

''گاڑی کب روانہ ہوتی ہے؟''

''وہ تو اب جا چکی ہوگی۔'' جواب سن کر جگت کار کی جانب جھپٹا۔

''ہنومان! گاڑی امرتسر کی جانب دوڑاؤ۔'' اس کی آواز میں فکر جھلک رہی تھی کسی انجانے ڈر کی وجہ سے......!



''بیٹا! تم آنے والے ہو یہ جان کر اجیت دو دنوں سے کیسا خوش ہے۔ کہتا ہے کہ بڑے بھائی سے ملنے کے لیے میرا دل بے چین ہے۔'' سارے راستے ماں نے یہ بات مختصر طریقے سے دہرائی۔ چنا بار بار اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اب پرانی عداوت بھول جا! تجھے پنا سنگھ سے دشمنی تھی مگر اجیت نے تو تمہاری ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ سگا بھائی نہ سہی پھر بھی نصف بھائی تو ضرور ہے۔ امرتسر سے گھر جاتے ہوئے اس نے اپنے دل کو مضبوط کر لیا تھا۔ راستے میں دکاندار ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو! پرم جیت کا چنا جیل سے رہا ہو کر آ رہا ہے۔ ماں ایک سال

سے اس کی رہائی کے لیے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آخر اس کے سکھ کا سورج طلوع ہو ہی گیا۔

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ماں چنا کو جلدی چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"بیٹا! مغرب کے وقت گھر میں قدم رکھنا نحوست ہوتی ہے۔ پہلے پہنچ جانا بہتر ہے۔" ماں بیٹے اگلی گلی میں داخل ہوئے۔ چنا کے دل میں ہلچل ہونے لگی۔ سولہ برس کے بعد گھر لوٹا تھا۔ اس کے پیچھے ماضی کی پرچھائیں تھیں اور سامنے مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے گھر کے پاس برسوں سے کسی پہریدار کی طرح کھڑے ہوئے املی کے بوڑھے درخت کو دیکھا۔ اس کے تنے کے پیچھے اس کا سوتیلا بھائی اجیت چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ تنے کے پیچھے چھپے ہوئے اجیت کے کانوں میں یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

"چنا! گھر جاتے ہی اجیت کو سینے سے لگا لینا۔ اپنے رہا ہونے کی خوشی میں اسے مٹھائی دینا۔ تم دونوں میری دو آنکھیں ہو۔" ابھی یہ الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ تنے کے پیچھے سے اجیت باہر آ گیا۔ چنا کے سینے پر چھری سے وار ہوا۔ اس وقت تک دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہو گیا ہے؟ اجیت کے چہرے پر خون جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے زہر برس رہا تھا۔ اچانک حملے سے نیچے بیٹھے ہوئے بدحواس چنا کو لات مار کر اجیت نے چت لٹا دیا اور اوپر بیٹھ کر کئی وار کیے۔ پرم جیت چیخ اٹھی۔

"اجیت! اجیت۔" وہ اس سے لپٹ کر اسے روکنے لگی مگر سولہ سال کے لڑکے نے ماں کو دھکا دے دیا۔ اس کا چہرہ غصے اور نفرت سے بگڑ گیا تھا۔ چنا نے اس کے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو چھری کی تیز انی بازو میں اتر گئی۔ پاگل کی طرح اجیت نے چنا کا سینہ چیر دیا۔

"میں اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ لے...... لے...... لے۔"

"اوہ...... اوہ! بچاؤ، بچاؤ" کی چیخوں سے لوگ دوڑتے ہوئے آ گئے۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کے پانچ سات منٹ کے درمیان یہ سب کچھ ہو گیا۔ چار چھ آدمیوں نے اجیت کو پکڑ لیا۔

"سالے! بے وقوف۔" لوگوں نے چانٹے مارے اور اس سے چھری چھین لی۔ مگر اب اجیت کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ خون میں لت پت چنا کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ پتھر کے ساتھ سر ٹکرا کر پرم جیت بے ہوش ہو گئی تھی۔

اجیت ہانپتا ہوا خون سے بھرے ہوئے ہاتھ مسل رہا تھا۔ کار کا ہارن سنائی دیا۔ مجمع کے درمیان راستہ پیدا کرنے کے لیے ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو دو چار آدمیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ہے۔ لاش پڑی ہوئی ہے۔"

جگت کار سے باہر آ کر جھپٹا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اندر پہنچا تو قدموں کے قریب چنا کی لاش نظر آئی اور وہ دل دہلانے والی آواز میں گرجا......

"چنا......!" دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ اسے نظر کے سامنے پولیس کے درمیان کھڑا ہوا اجیت نظر آیا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ جگت نے مٹھیاں کس لیں، کلائی کی رگیں ابھر آئیں۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ خونی نظروں سے اجیت کو دیکھنے لگا۔ اجیت نے منہ پھیر لیا جیسے جگت کی تیز نظریں برداشت نہ کر سکا ہو۔

کچھ ہی دیر میں جگت کے ذہن پر شیطان سوار ہو گیا۔ چنا کے بہیمانہ قتل نے اس کے خون میں آگ لگا دی تھی۔ وہ لاش کے پاس پڑی ہوئی خون آلود چھری کی دھار پر نظر ڈال کر قدم بڑھائے جا رہا تھا، اسی لمحے ہوش میں آئی ہوئی پرم جیت اس سے لپٹ گئی۔

"بیٹا جگا! اس میں کسی کا قصور نہیں، یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔ میں پیار میں بے قابو ہو کر چنا کو یہاں لے آئی۔ دو بھائیوں کی دشمنی دور کرنے کی مجھے جلدی تھی۔" روتی ہوئی تڑپتی ہوئی جگت کے سینے پر سر مارتی وہ بڑبڑا رہی تھی۔ پھر دوڑ کر اس نے نیچے سے چھری اٹھائی اور مجرم بیٹے کے

سامنے گرجی۔

"لے...... اب اسے میرے سینے میں مار دے اور اپنی پیاس بجھالے! مجھے زندہ رکھ کر بھی تو نے مار دیا ہے۔" جگت نے اسے پکڑ لیا تو پرم جیت پاگلوں کی طرح گرجی۔ "سب بیٹے دشمن بن گئے۔ بھگوان! اب کبھی عورت کو جنم نہ دینا۔ اگر دے تو ماں نہ بنانا۔" اس کی دلخراش چیخوں، تڑپ اور آنسوؤں سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جگت کا دل بھی آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا جوش ختم ہو گیا۔ اس نے پرم جیت کو نیچے بٹھا کر چنا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"دوست! مجھے معاف کرنا...... مجھے دیر ہو گئی۔" پھر اسی ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔



دوسرے دن دوپہر کو سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ جگت گھر پہنچا۔

"کل شام سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" چندان نے ٹوکا پھر جگت کے چہرے پر صدمہ دیکھ کر سمجھ گئی۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ "کیا ہوا...... چنا کو نہیں لائے؟"

جگت چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چندن نرم آواز میں پھر بولی۔ "میں کہہ رہی ہوں کہ اس کی ماں اس طرح نہیں بھیجے گی، اچھا ہوا گھر چھوڑ آئے۔"

"چھوڑ آیا...... مگر......" جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ "گھر نہیں شمشان میں۔"

"کیا......؟" چندن کی چیخ نکل گئی۔

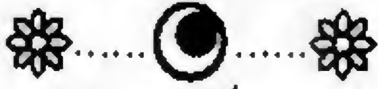
"اس کے سوتیلے بھائی نے چنا کو گھر پہنچنے ہی نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی ختم کر دیا۔" جگت بمشکل بولا۔ پھر چارپائی پر لیٹتا ہوا بولا۔ "شراب کی بوتل لے آؤ۔" چندن کے پیر زمین سے چپک گئے۔ دل میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے بمشکل کہا۔

"اور اس لڑکے کا کیا بنا؟"

جگت نے اسے عجیب طرح سے دیکھا، پھر ہونٹ چبا کر بولا۔ "بچ گیا...... میرے ہاتھوں ایک قتل ہونے سے رہ گیا۔" پھر مزید کچھ نہ کہنا چاہتا ہوا اس طرح سے پہلو بدل کر سو گیا۔ پھر بھی چندن سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"بے چاری چنا کی ماں...... اس پر کیا گزری ہو گی؟"

"وہ پاگل ہو گئی ہے۔" جگت بڑبڑایا۔ "سولہ برس بعد گھر آئے بیٹے کو سولہ سال تک جتن سے پالے ہوئے بیٹے نے قتل کر دیا۔ یہ اس سے کیسے برداشت ہو سکتا تھا؟"



دوسرے دن کافی دھوپ نکل آنے کے بعد چندن نے اسے اٹھایا۔ "اٹھو! دس بجے ہیں۔ کل سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ ناشتہ کر لو۔" جگت انگڑائی لے کر بیٹھ گیا۔ جسم میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ کتنا سویا اسے اس کا ہوش نہیں تھا۔ نل پر جا کر منہ دھونے کے بعد چہرے پر تازگی آ گئی۔ چندن کور ناشتہ لے کر آئی۔ جگت نے گھر میں نظر گھمائی۔

"بچے اسکول جا چکے ہیں؟" چندن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد کا سوال نہ پوچھا جائے اس لیے ادھر ادھر ہونے کے لیے چندن نے قدم بڑھائے مگر جگت نے روک دیا۔ "ارے گردد یو کور کیوں نظر نہیں آ رہی؟" چندن کا چہرہ اتر گیا، پھر بھی کہنا پڑا۔

"اپنے گھر گئی ہے۔"

"مگر میں نے اسے کل بھی نہیں دیکھا تھا۔" دوسرے سوال سے چندن کور لرز گئی۔

"کل سے گئی ہے۔" چندن کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ گردد یو کور ہفتے میں ایک بار دو چار گھنٹے کے لیے اپنے ماں باپ سے ملنے جاتی تھی مگر کبھی ٹھہرتی نہیں تھی۔ اس لیے جگت کو تجسس ہوا۔

"اس کے گھر سب ٹھیک تو ہیں؟ تم ہو آئیں؟"

"ہاں......" دونوں سوالوں کا جواب دیا گیا مگر دل کی پریشانی کو دبا نہ سکی۔ "کل ست پال کو بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ آج صبح میں خود ہو آئی۔" جگت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ میں تھاما ہوا پراٹھے کا ٹکڑا اس نے واپس رکھ دیا۔ ڈری ہوئی چندن نے بغیر پوچھے کہہ دیا۔ "اب وہ واپس نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے بھیجنے سے انکار کر دیا

ہے۔" چندن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"مگر کیوں.....؟" جگت نے تعجب سے پوچھا۔

"کیونکہ....." چندن ہچکچاتی آواز میں بولی۔ "یہاں رہنے سے ان کی بیٹی بدنام ہوجائے گی۔ انہیں یہ ڈر لگا ہوا ہے۔"

"مگر گرودیو کور نے کیا کہا؟" جگت کی آواز میں سختی بھی تھی۔

"وہ بے چاری تو میرے سامنے بری طرح رو رہی تھی۔ اپنی ماں کی موجودگی میں کچھ بول نہ سکی۔"

"یہ بات ہے۔" جگت نے دانت پیس لیے پھر آگے کچھ کہنے کی بجائے خیالات میں کھوگیا۔ اس کا غضب آلود چہرہ دیکھ کر چندن ڈر گئی۔



گھر میں اداسی چکر لگا رہی تھی۔ کوئی اس کا نام نہ لیتا تھا مگر گرودیو کور چاروں طرف چلتی پھرتی نظر آتی تھی چندن کو بے چینی میں اور جگت کو خاموشی میں گرودیو کور کی موجودگی نظر آتی تھی۔ بے چینی کا بوجھ برداشت نہ ہوتا تو چندن چھپ کر رو لیتی۔ خاموشی ناقابل برداشت ہوتی تو جگت گیت گا لیتا۔

"میرے گیت میں تم ہو خیالوں میں تم ہو۔"

چندن کور سوچ میں گم ہوجاتی وہ اس وقت کسے یاد کرکے گیت گا رہا ہے؟ ویرو کو یا گرودیو کور کو؟ گرودیو کور کے جگت کی شاگرد بن کر گھر میں آنے کے بعد ایک دو بار جگت سے چندن نے کہا تھا۔

"اب مجھے موت کا ڈر نہیں ہے۔"

"کیوں..... مرنے کی بہت جلدی ہو رہی ہے؟" جگت نے اسے چڑایا۔ "دن بدن موٹی ہوتی جارہی ہو۔"

"چربی بڑھنے سے زندگی نہیں بڑھتی۔ کیا سمجھے؟" چندن نے سنجیدہ ہوکر کہا۔ "عورت کو موت کا ڈر ایک وجہ سے ہوتا ہے۔"

"کون سی وجہ سے؟" جگت نے پوچھا۔

"بچے بے سہارا ہوجانے کی۔" چندن نے نظریں جھکا کر کہا۔ اب مجھے ڈر نہیں' گرودیو کور انہیں سنبھال لے گی۔"

"بے سہارا ہونے کی عورت کو فکر ہوتی ہے۔" جگت نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "مرد کا کیا ہوگا اس کی پروا بھی ہوتی ہے؟"

"جو میرے بچوں کو سنبھالتی ہے وہ شوہر کو بھی سنبھال لے گی۔" پھر چندن اوپر دیکھ کر بولی۔ "کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا؟"

"کیا بک رہی ہو؟" جگت نے غصہ دکھایا۔ "وہ بھلی لڑکی آواز ٹھیک کرنے آئی ہے اور تم اپنے بچوں کو اس کے گلے باندھ کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو؟" چندن کور مسکرانے لگی۔ تب جگت نے سوچا کہ ان دونوں نے آپس میں کچھ طے کرلیا ہے' وہ ناراض ہوکر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چندن کھلکھلا کر ہنس دی۔ "تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ جیسے میں کل مرجاؤں گی۔"

"چندن! تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟" جگت نے منہ بنا کر کہا۔ "ایسی بات اگر باہر نکل جائے تو رائی کا پربت ہوجائے گا۔ پتہ ہے؟"

"باہر والوں نے تو رائی کا پربت بنانا شروع بھی کردیا ہے۔ مجھے بہت سی عورتیں بغیر پوچھے مشورہ دے گئیں' ارے تمہارا دماغ پھر گیا ہے؟ گھر میں کنواری لڑکی کو رکھ کر تم زندگی بگاڑنا چاہتی ہو۔ مرد سے دل لگ گیا تو گھر اور شوہر سب کچھ لے کر بیٹھ جائے گی۔ انہیں میں کیا جواب دیتی ہوں بتاؤں؟" جگت نے متجسس نظروں سے اسے دیکھا تو چندن بولی۔ "میں کہتی ہوں' یہ تم لوگوں کو اچانک میری فکر کیوں ہوگئی؟ تین ماہ ہسپتال میں رہی تو کوئی خبر لینے نہیں آیا۔ کنواری لڑکی کا میرے مرد سے دل لگ جائے تب کی بات الگ ہے۔ مگر فی الحال تو میرے بچوں کا اور میرا دل اس سے لگ گیا ہے۔ وہ ہمیں پرائی نہیں لگتی۔"

جگت دل میں چندن کے خلوص پر خوش ہوا مگر چہرے پر لاتعلقی رہنے دی۔ "تم نے ایسا کہا؟"

"میں نے سچ کہا۔" پھر وہ رک گئی۔ مگر چند لمحے بعد بولی۔ "یاد ہے کئی سال پہلے ہمالیہ کے سادھو گھر آئے تھے؟

تب تم ڈاکو تھے۔ سادھو نے کہا تھا کہ جلد یا بدیر گھر میں سوت آئے گی۔تم دوسری شادی کرو گے۔''

''تم ابھی تک اس بات کو نہیں بھولیں چندن؟'' جگت جذبات میں بہتا ہوا بولا۔''بیس سال بیت گئے' ابھی میری دوسری شادی نہیں ہوئی۔اب تک تمہیں وہ بات سچ معلوم ہوتی ہے؟''

''سادھو بابا کی بہت ساری باتیں سچ نکلی ہیں۔'' چندن پر جوش لہجے میں بولی۔''اب ایک ہی بات باقی رہ گئی ہے۔''

''ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں چندن۔'' جگت نے جذبات میں کہا۔''نہیں تو ویرو اتنے سال ہم سے دور کیوں رہتی؟'' جگت بات ختم کرنے کے انداز میں کھڑا ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ ویرو ملتی تو کچھ اور سوال ہی کہاں تھا؟ مگر اب وہ آس دھوکا تھی۔ گرودیو کور کے باپ نے جگت کے گھر اپنی بیٹی کو آنے سے روکا تو چندن کو ہی صدمہ ہوا۔ وہ جھوٹے تصور میں کیوں گم رہی؟ کیوں خواب کے محل تعمیر کیے؟ قدرت نے اسی لیے اسے سزا دی تھی۔ گرودیو کور کے مستقبل سے کھیلنے کی اس نے حسرت کی تھی؟ پرائی لڑکی سے کیوں دل لگا بیٹھی؟

اس وقت جگت اپنے دل کو ملامت کر رہا تھا۔ چنا کی موت کے غم میں اسے ویرو زیادہ یاد آنے لگی تھی۔ گلے میں موجود تعویذ پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ ذہن کو ٹٹولنے لگا۔ گرودیو کور میں ویرو کو دیکھا یہ اپنی ذات کو دھوکا دینے کے برابر تھا۔ اس کی نوٹ بک میں اپنے گیت لکھے ہوئے دیکھے' ویرو کی یاد میں لکھا ہوا گیت وہ خوب چاہ سے گاتی تھی اسی لیے گرودیو کور میں ویرو دکھائی دی۔ دل کی خالی جگہ میں کسی کو بسانے سے کمی پوری نہیں ہوتی۔ تمہارے جیون میں اب بھی ویرو داخل نہیں ہوگی' مگر تمہارے دل سے وہ کبھی نہیں جائے گی۔ قدرت نے گرودیو کور کے لیے جو کچھ کیا شاید اچھا ہی کیا۔ چندن کو صدمہ ہوا ہے مگر آئندہ اس کا دل بھر جائے گا۔

''میں گرودیو کور کے گھر ہو آئی۔'' باہر سے آکر چندن جگت کے برابر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سنی ان سنی کر کے جگت چارپائی پر لیٹ گیا۔ چندن کہنے لگی۔''آج مجھے گرودیو کور سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔''

''کیا بات ہوئی؟'' جگت تجسس نہ روک سکا۔

''پہلے چار پانچ بار گئی تو گرودیو کور کی ماں نے لوٹا دیا۔ مگر آج میں نے سختی کی ہے۔''

''سختی؟'' جگت چونکا۔

''میں نے کہا مجھے گرودیو کور سے ملنے نہیں دو گے تو سردار جی خود آئیں گے۔''

''پھر......؟''

''پھر کیا؟ یہ سن کر اس کی ماں نرم پڑ گئی۔ وہ تمہارا مزاج جانتی ہے اس لیے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بولی کہ بہن! ہم عورتوں کی بات میں مردوں کو درمیان میں کیوں لاتی ہو؟ پھر کچھ بھاری لہجے میں بولی۔''بیٹی کے مستقبل کو سوچ کر ماں باپ کو سختی کرنا پڑتی ہے۔ تم اس سے خوشی سے ملو۔'' چندن اتنا کہہ کر رک گئی۔ جگت کا منہ کھلا ہوا تھا۔

''تم نے میری دھاک استعمال کی؟''

''ہاں اس کی ماں نے کہا کہ گرودیو کور کو سمجھانا! ہم نے ایک لڑکا تلاش کر لیا ہے۔ شادی کی ہاں کر دے۔'' یہ الفاظ چندن نے کچھ غصے میں کہے پھر اصل بات پر آئی۔''اسے دیکھ کر دل تڑپ گیا۔ اتنے دنوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ جیسے برسوں کی بیمار ہو۔'' دونوں کی آہیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر چندن کہنے لگی۔''مجھے دیکھ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ چھوٹے بچے کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے مجھے تڑپا دیا۔ جیسے اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے چندن آبدیدہ ہو گئی۔ جگت خاموش رہا اور چندن کور کو بولنے دیا۔''رونے کے بعد اس نے بچوں کی اور تمہاری خیریت پوچھی' ملازمہ کو تنخواہ دی یا نہیں؟ گھر کا حساب کون رکھتا ہے؟ مجھے یاد کرتے ہیں؟ سردار جی کو پروگرام دینے اکیلے جانا پڑتا ہوگا۔ اس نے بہت سارے سوال کیے۔ میں نے مختصر جواب دیئے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا بھی تلاش کر لیا ہے۔ تم

کیوں......؟'' میں اتنا ہی بولی تھی کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کو گھورتی ہوئی بولی۔ ''بہن! انہوں نے زبردستی قید میں ڈال رکھا ہے۔ مگر میں نہیں ڈگمگاؤں گی۔ میں ان سے ایک بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ اگر زبردستی کی تو مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' چندن جوش میں کہہ رہی تھی۔ جگت کو بھی غصہ آ گیا۔

''ویسے لڑکی ہے بہادر۔ یہ سن کر اس کی ماں سناٹے میں آ گئی ہوگی؟''

''پہلے سناٹے میں آ گئی' پھر چڑ گئی۔'' چندن کی آواز نرم ہو گئی۔ ''اس نے گرودیو کور سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے ہاتھ دھونے کو تیار ہیں مگر عزت نہیں جانے دیں گے۔ اپنی بیٹی کو کہنے سے سکون نہ ہوا تو مجھ سے کہا کہ تمہارے ساتھ چھ ماہ رہی تو ہماری لڑکی کتنی بگڑ گئی ہے۔''

''تمہیں اس نے ایسا کہا؟'' جگت نے مٹھیاں کس لیں۔

''تمہیں بھی سنانا تھیں' ہم کہاں کہنے آئے تھے کہ اپنی بیٹی کو بھیجو؟ میں ایسا نہ کہہ سکی جگت سنگھ۔'' چندن کی آواز بھرا گئی۔ ''ایسی بے عزتی ہونے کے بعد میں کب تک وہاں رکتی؟ غصے میں پیر پٹختے ہوئے چلی آئی۔'' سناٹا چھا گیا۔ چندن کور کی سانسوں میں درد جھلک رہا تھا۔ جگت خاموش کھڑا رہا۔ اگر پہلے کبھی ایسا ہوتا تو جگت شاید پوری بات بھی نہ سنتا اور ہاتھ میں لاٹھی اٹھا کر چل پڑتا حساب صاف کرنے' مگر اس کی بجائے وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ چندن ناراضگی کے انداز میں کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔ جگت سوچ رہا تھا کہ کون سی کمزوری اسے روک رہی ہے؟ کیا کوئی ان دیکھی قوت؟ ویرو کا دیا ہوا تعویذ؟ مہتا صاحب کی بخشی ہوئی آزادی؟ لوگوں کی طرف سے ملا ہوا پیار؟ یا اولاد کی ذمہ داری؟ نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مگر...... مگر کیا؟ اس نے اپنی ذات سے سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا آخر میں کس رشتے سے لڑکی کو اس کے ماں باپ سے چھین لوں؟ اسے لا کر گھر میں کس رشتے سے رکھوں؟ سوالوں کے چکر نے جگت کے ذہن کو تھکا دیا۔

دن گزرتے رہے۔ چندن کور گرودیو کور کی جدائی پریشان کرنے لگی۔ آنسو بہاتا اس کا معصوم چہرہ ہر لحہ اس کی نظر کے سامنے رہنے لگا۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور گرودیو کور کے کپڑے واپس دے آنے کے لیے الماری کھولی۔ وہ گم صم بنی کپڑوں کو دیکھ کر اس طرح ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے گرودیو کور کو اطمینان دلانے کے لیے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہی ہو مگر پھر اس کا اطمینان ختم ہو جاتا اور رونے لگتی' نہیں' کپڑے واپس دے آئی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ چندن نے سوچا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ گرودیو کور کا غم بھلانے کے لیے منتیں ماننے لگی۔ وہ کبھی کسی پیر' کسی مہاراج' کسی جوتشی اور کبھی کبھی جادو ٹونے والے سے ملنے لگی۔ کبھی تنہا جاتی اور کبھی جگت کو ساتھ لے جاتی۔ سب امید دلاتے مگر نتیجہ مایوسی میں نکلتا۔ جگت نہ کبھی روکتا نہ ٹوکتا۔ البتہ کبھی کبھی الجھن میں ضرور پڑ جاتا۔ چندن کور کو اس لڑکی کی اتنی چاہت ہو گئی ہے؟ اسے ڈر لگتا کہ اس صدمے میں چندن پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ کبھی خود کو سرزنش کرتا کہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کیا مگر جس عورت نے تمہارے لیے اتنے دکھ برداشت کیے اس کی خاطر ایک قدم نہیں اٹھایا۔ دن تیزی سے گزرتے رہے۔ چندن کی آس ٹوٹنے لگی۔

''خط......!'' آواز دے کر ڈاکیے نے ایک لفافہ دروازے کی جانب پھینکا۔ دوڑ کر لڑکا خط لے آیا۔ تجسس کی خاطر اس نے لفافے پر نام پڑھا۔ ''ارے ماں! یہ تو تمہارا خط ہے۔''

''اے...... یہ تو گرودیو کور کا خط ہے۔'' چندن نے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ کھولتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بھگوان کا نام لیا۔ اندر سے خط نکالتے ہوئے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خط کے الفاظ پر نظر پڑتے ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ برداشت باوجود اس کی چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' جگت کمرے میں دوڑ کر آیا۔ چندن کے لرزتے ہاتھوں اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ کر جگت

کانپ اٹھا۔ ”کس کا خط ہے؟ ماں کی کوئی خبر ہے؟“ جگت نے بیتابی سے پوچھا۔

”نہیں......“ چندن بلند آواز میں بولی پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر خط اس کی جانب بڑھا دیا۔

”گرودیو کو کا خط ہے۔“ ان الفاظ میں منوں کا وزن تھا۔ جھپٹ کر جگت نے خط لے لیا۔ پڑھنے سے پہلے بچوں کو باہر بھیجنے کی خواہش ہوئی مگر اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

”بہن جی! آخری بار تم سے ملنے کے لیے خط لکھ رہی ہوں۔ ماں نے تمہاری بے عزتی کی پھر تم نہیں آئیں۔ یہ اچھا کیا۔ اس بے عزتی کے بدلے میں خود تمہارے گھر آنا چاہتی تھی مگر قدرت کو یہ منظور نہیں معلوم ہوتا۔ جسم اب زیادہ دکھ نہیں جھیل سکتا۔ جسم کا ایک حصہ سن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ فیل کا خطرہ ہے۔ روح تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے اب جسم کی باری ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا گھر والے مجھے کسی کے گلے نہیں باندھ سکیں گے۔ ڈولی کی تمنا تھی اب جنازے سے ان کو سکون ملے گا۔ ہارٹ فیل ہونے والے کو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اس موت کے لیے تیار ہوں۔ زندگی کی قید سے آزادی چاہتی ہوں مگر اس سے پہلے ایک بار مل جانا۔“

جگت کی پلکیں بھیگ گئیں۔ چندن کور کی آنکھیں سوکھ گئیں۔ پتلیاں پھیلا کر اس نے جگت کی جانب دیکھا جیسے اس کی آنکھیں جگت سے جواب طلب کر رہی ہوں۔ ”بولو اس کا ذمہ دار کون ہے؟“ جگت اس کی آنکھوں کی زبان نہ سمجھا۔ شاید سمجھ کر ٹالنا چاہتا تھا۔

”چندن تم جاؤ مل آؤ۔“ جگت نے کہا اور چندن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دانت پیسنے لگی۔ آنکھوں سے آگ برسانے لگی۔ وہ جگت کو سرتاپا دیکھنے لگی۔ ”چندن! تمہیں کیا ہو گیا؟“ جگت ڈر گیا۔

”تم کو کیا ہو گیا؟ یہ میں پوچھ رہی ہوں۔“ چندن کے الفاظ سن کر جگت سناٹے میں آ گیا۔

”کون کہتا ہے کہ تم ڈاکو تھے؟“ ڈاکو لفظ اس طرح طنز میں بولا گیا کہ جگت جھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو چندن؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہوں؟“ چندن آنکھیں نکال کر بولی۔ ”دیرو کا خط پڑھ کر اسے اغواء کرنے گئے تو تم نے کسی سے یہ سوال کیا تھا؟ نہیں کیونکہ اس وقت تم ڈاکو تھے تمہیں کسی کا ڈر نہیں تھا نہ ہی کسی کی پروا تھی۔“ ہانپ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر کچھ بپھر کر بولی۔ ”اب یہ گھر سنگیت بیوی بچے عزت سب تمہارا راستہ روک رہے ہیں یا جیل کا ڈر لگتا ہے؟“

”چندن......!“ بھیانک گرج کے ساتھ جگت چیخ پڑا بچے لرز گئے چندن کا جسم لرز گیا مگر وہ اسے گھورتی رہی۔ ”بولو تمہیں کیا کہنا ہے؟ تم نے آج میری مردانگی کو آواز دی ہے۔ تم میری خاموشی کو بزدلی سمجھ بیٹھی ہو۔“ چندن خاموش رہی۔ جگت کا جوش کچھ کم ہوا۔ ”چندن! آج تک تم نے مجھے قابو میں رکھا کہیں میں جذبات میں بہہ کر کچھ کر نہ گزروں تم اس کے لیے فکر کرتی رہیں۔ اب جبکہ میں اپنی ذات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جذبات کے زہر کو ہضم کر رہا ہوں تب تم مجھے طعنہ دے کر جوش دلا رہی ہو؟ یہ پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ڈاکو تھا؟“

”جگت سنگھ......!“ چندن کور نے سر جھکا لیا۔ ”تم کو میں نے کبھی بزدل نہیں سمجھا مگر بار بار گرودیو کور کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا تم مجھے اس آگ سے نہیں بچاؤ گی تب میں مجرم کی طرح سر جھکا لیتی ہوں آنکھیں بند کر لیتی ہوں مگر اس کی آواز کان سے ٹکراتی رہتی ہے مجھے آزاد کراؤ مجھے رہائی دلاؤ۔“ چندن آنسو پونچھنے کے لیے کچھ دیر رکی پھر کھنکار کر بولی۔ ”اسے پاگل پن سمجھو محبت سمجھو یا حماقت مگر دل دکھتا رہتا ہے۔ گرودیو کور کو کچھ ہو گیا تو اس کی پیاسی روح کی آہ ہمارے خاندان کو تباہ کر دے گی۔“

بچے اب باہر جا چکے تھے۔ جگت زخمی شیر کی طرح آنگن میں ٹہلنے لگا۔ چندن جو کچھ بول چکی تھی اسے دل

میں دہرا رہی تھی۔

"پھر ایک بات کا جواب دو چندن!" جگت اچانک رک کر بولا۔ "کیا میں اسے ماں باپ سے چھڑا کر یہاں لے آؤں، چاہے اس کے لیے مجھے قتل کرنا پڑے، جیل جانا پڑے؟" چندن لرز گئی۔ جگت بولتا رہا۔ "مگر یہاں لاکر ہم اس کی زندگی برباد تو نہیں کریں گے؟ یہ سوچ لینا! لوگ باتیں بنائیں گے، جگا نے دوسری عورت گھر میں ڈال لی ہے۔ میرے منہ پر بولنے کی تو کوئی ہمت نہیں کر سکے گا مگر تم ان سب کو کیا جواب دو گی؟ تمہارے پاس دفاع کے لیے کوئی جواب ہے؟"

"ہاں!" چندن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں کہوں گی میں اسے اپنی چھوٹی بہن مانتی ہوں۔"

"لوگ مانیں گے؟" جگت نے ہنس کر پوچھا۔

"لوگوں کا دل چاہے نہ مانے۔" چندن الجھن میں پڑ گئی۔ "مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ تم اسے نہیں لائے پھر بھی لوگوں کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکے ہیں۔ یہاں رہ کر پہلے ہی بیچاری بدنام ہو گئی ہے۔"

"پھر جاؤ! اس سے مل آؤ۔" جگت نے فیصلہ کر لیا۔ "پوچھ لو گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہے۔"

"تیار ہے۔" چھپائی ہوئی بات چندن جوش میں بول گئی۔ وہ اس طرح ڈر گئی جیسے زبان کٹ گئی ہو۔ بات ٹالنے کی خاطر جھوٹ بولنا چاہا مگر جگت کی تیز نظریں اس کے دل میں اتر چکی تھیں۔ جگت اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ "آخری بار ملنے گئی تھی تب تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ سردار جی سے کہو مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ نہیں تو میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گی۔"

"اور تم نے مجھ سے چھپایا چندن؟" جگت طویل سانس لے کر بولا۔ "پہلے بتا دیتی تو اتنے طعنے نہ دینے پڑتے۔ مجھے اتنی پریشانی برداشت نہ کرنی پڑتی۔"

"مجھے اس نے منع کیا تھا۔" چندن ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "اسے ڈر لگا کہ آپ جذبات میں کچھ کر بیٹھیں گے۔ اس کی ذمہ دار وہی ہو گی۔" جگت کو یہ دلیل پسند نہیں آئی۔ ایک بار ناں نے چندن کا منہ بند کر دیا تھا اور اس نے ویرو کو گنوا دیا تھا۔ اسے گزشتہ بات یاد آ گئی۔

"ہم عورتیں اگر کبھی نیک کام کے لیے سچ کو چھپاتی ہیں مگر نتیجہ اچھا نہ نکلے تو زندگی بھر پچھتاتی رہتی ہیں۔" چندن مجرم کی طرح بولی۔ "ایک اور بات تم سے چھپائی ہے۔ وہ آج آٹھ سال بعد قبول کرتی ہوں۔"

"کون سی بات؟"

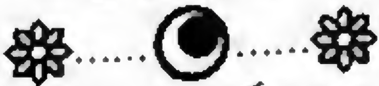
"ویرو کی بات۔" چندن کے ہونٹ کپکپائے۔ یہ سن کر جگت کا سانس سینے میں چلا گیا۔ خوف اور شک سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے آہ بھری۔

"ویرو کی کیا بات ہے؟" جیسے اسے پوچھتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو وہ اس طرح ہانپنے لگا۔

"تمہارے فیصلے کے وقت وہ بڑے مندر میں ملی تھی۔"

"یہ تو تم نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ کیا وہ جھوٹ بات تھی؟"

"نہیں جگت سنگھ! وہ بات ادھوری تھی۔" چندن نے ہونٹ چبائے۔ "ویرو کے ساتھ ایک مرد بھی تھا اور......اور وہ مرد اس کا شوہر تھا۔ ویرو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ اس نے شادی کر لی ہے اور سکھی ہے مگر...... مگر میں نے تم سے اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ یہ سن کر تمہیں دکھ ہو گا۔ تم شاید یہ برداشت نہ کر سکو۔" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی جیسے وہ جگت کی نظر کا مقابلہ نہ کرنا چاہتی ہو اس لیے ایک دم اندر دوڑ گئی۔ جگت سناٹے میں آ گیا۔ ویرو نے گھر بسا لیا اس لیے وہ مجھ سے اوجھل رہنا چاہتی ہے؟ ممکن ہے کہ وہ اب تک ماں بن گئی ہو یہ سوچتے ہوئے جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل سے اٹھتا ہوا کچھ درد آہ بن کر ہونٹوں تک آیا، باقی دل میں ہی دب گیا۔



بیگ بھر کر چندن شام کو گردیو کور کے گھر گئی۔ "گردیو کور کے کپڑے دینے آئی ہوں۔" چندن نے کہا۔

"آیئے آیئے!" گردیو کور کی ماں بڑے پیار سے بولی۔ پھر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور افسوس کا اظہار

کیا۔ ”مگراب وہ کھڑی ہوگی یا نہیں؟ بھگوان جانے۔“
”بہن! تم ایسا نہ بولو۔“ چندن جاننے کے باوجود انجان بن کر بولی۔ ”ایسا کوئی روگ تھوڑا ہی ہوا ہے؟“
”روگ تو اس نے اپنے ہاتھوں لگایا ہے۔“ وہ کچھ کڑواہٹ سے بولی۔ ”وہ ضد کر کے خود اپنی ذات کی دشمن بنی ہے۔“
”میں ذرا اس سے مل لوں۔“ چندن جلدی سے بیگ اٹھا کر کمرے میں گھس گئی۔ ”کہہ دوں کہ تمہاری چیزیں لے آئی ہوں سنبھال لو۔“
گرودیوکور کے پھیکے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ چندن کو دیکھتے ہی وہ بیٹھنے لگی مگر چندن نے اسے روک دیا۔ ”لیٹی رہو۔“ وہ اردگرد دیکھ کر بولی پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے بہانے کہہ دیا۔
”تمہارا خط ملا۔ بیگ میں تمہارے ریشمی کرتے کی جیب میں اس کا جواب ہے۔ تم تیار رہنا آج سے پانچویں دن۔“ بہت احتیاط سے اس نے کہا۔ ”ڈھلتی دوپہر سردار جی تمہیں لینے آئیں گے۔“
کچھ دیر رک کر بولی۔ ”اب کھا پی کر جسم بنانا۔ گھر کے باہر کار کھڑی ہوگی وہاں تک تمہیں پہنچنا ہے۔ پھر سردار جی سنبھال لیں گے۔“
”سچ......؟“ گرودیوکور نے ہاتھ دبایا۔ ”اب میں موت کے فرشتے کو بھی بھگا دوں گی۔“ پھر اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ گرودیوکور کی ماں اندر آئی تو چندن نے بات بدل دی۔
”برابر دوا پینا! بھگوان جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مگر ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔“ چندن بیگ کی جانب اشارہ کر کے گرودیوکور کی جانب دیکھ کر مسکرائی اور چلی گئی۔ ممکن ہے اس کی ماں کو شک ہو جائے، چندن نے اس لیے وہاں زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔



”ماں! آج میں کھڑی ہو سکتی ہوں۔ میرا چلنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔“ گرودیوکور نے احتیاط سے کہا۔ ”ڈاکٹر جھوٹے تھے ماں! تمہاری خدمت نے مجھے خطرے سے بچالیا ہے۔“
”بیٹا! دل تو پاگل بچے کی طرح ہوتا ہے۔ جھوٹی لگن باندھ لیتا ہے۔“ ماں نے سمجھا بیٹی نے جگا کا پیار بھلا دیا ہے۔ جب سے چندن بیگ دے کر گئی تھی گرودیوکور نے جگا کے متعلق کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے ماں بیٹی کو مشورہ دے رہی تھی۔ ”تھوڑے دنوں کی جدائی میں بات ختم ہو جاتی ہے۔“
”ہاں! مگر مجھے باغ میں چلنے پھرنے دو تو دل اور جسم میں تازگی آئے گی۔“
”نہیں بیٹی! ابھی کچھ دن تم کو نیچے نہیں اترنا۔ ٹہلنا ہے تو برآمدے میں ٹہل لو۔“ ماں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے جانے کے بعد گرودیوکور نے ایک بار پھر جگت کا بھیجا ہوا خط پڑھا۔
”جمعرات سیاہ کار، سوا چار بجے تمہاری کوٹھی کے پچھلے دروازے کی دیوار کے برابر۔“
خط کرتے میں رکھ کر وہ برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ ابھی پون گھنٹے کی دیر تھی۔ ماں نیچے جانے دینے کے لیے راضی نہ تھی۔ یہاں سے نیچے جانے کی راہ نکالنی پڑے گی۔ وہ ذہن میں منصوبہ مرتب کرنے لگی۔
سیاہ کار نظر آئی۔ جگت سنگھ تنہا نہ تھا۔ اس کے برابر کوئی بیٹھا تھا۔ گرودیوکور نے کمرے کا دروازہ لگایا۔ ماں باورچی خانے میں شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ محلے میں سناٹا تھا۔ پھرتی سے مگر خاموشی سے تمام کام نمٹاتا تھا۔ برآمدے کی دیوار کودی تو اس کے جسم میں کپکپاہٹ پیدا ہوگئی۔ لڑکی ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ رہی تھی۔ مگر چوکھٹ سے باجے گاجے کے ذریعے نہیں برآمدہ کود کر...... جگت نے کار کی کھڑکی سے دیکھا گرودیو کے پاؤں کمزوری سے کپکپا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اس طرح چوری چھپے لے جانے کی بجائے سامنے سے کھینچ لاؤں مگر چندن نے منع کیا تھا۔ اس بار طاقت سے نہیں عقل سے کام لینا تھا۔ برآمدے سے کچھ دور ایک درخت تھا۔ ابھی گئے سال

اس درخت پر چڑھ کر چور گھر میں گھس آیا تھا مگر کمزور درخت نے دغا کیا وہ نیچے گرا۔ بمشکل بھاگ سکا تھا بیچارہ۔ گرودیوکور کو یاد آیا۔ باپو جی نے تب کہا تھا۔ "یہ درخت سکون کی نشانی ہے۔ ہم اسے نہیں کاٹیں گے۔" جب گرودیوکور نے اس کی ڈالی پر قدم رکھا تو اسے باپو جی یاد آئے۔

"سنبھلنا۔" ایک نرم آواز آئی۔ وہ جگت سنگھ کو صاف دیکھ رہی تھی۔ درخت کی ڈالی کچھ جھکی مگر وہ ہمت کر کے آخری سات فٹ کود گئی۔ باغ کی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی ایک بار اس کا پیر پھسلتے ہوئے رہ گیا۔ وہ دیوار پر آ گئی تو جگت نے کار کا دروازہ کھولا...... باہر نکل کر جگت نے ہاتھ ہلایا۔ جگت کو قریب دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی۔ اس نے خود کو جگت کی بانہوں میں گرا دیا۔ کار کا انجن گرجا' گرودیوکور نے عقب اسکرین سے اپنے مکان پر دکھ بھری نظر ڈالی' پھر جگت کی طرف چاہ بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ کار حرکت میں آئی' دھول اڑی اور کار جالندھر کی حد پار کر گئی۔



چندن ساری رات سو نہیں سکی۔ شام سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ گرودیوکور کا بھائی تیز نظروں سے گھر کو دیکھتا ہوا دو چکر لگا چکا تھا۔ اس کی ماں ایک بار پوچھنے آئی تھی کہ گرودیوکور یہاں تو نہیں آئی؟ چندن انجان بن گئی۔

"کیوں...... کیا گھر میں نہیں ہے؟"

اس کی ماں نے دانت پیس لیے۔ "جگت سنگھ کہاں ہے؟"

"وہ تو صبح سے امرتسر گئے ہیں۔" وہ منہ پھیر کر جھوٹ بولی۔ عزت کے ڈر سے بات پھیلنے نہیں دی۔ مگر گرودیوکور کے گھر والے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ انہوں نے امرتسر کی جانب کار دوڑائی۔ رات گزرنے سے پہلے ان کو گرودیوکور کو پکڑنا تھا ورنہ اس کے بعد کنواری بیٹی کو گھر لانے سے فائدہ بھی کیا؟

چندن کور ہر نصف گھنٹے بعد بھگوان کی پرارتھنا میں دل لگاتی تھی۔ درمیان میں لدھیانہ کے خیالات آ جاتے۔ جگت جج کے پاس گرودیوکور کے بیان لکھوانے گیا تھا کہ وہ راضی خوشی سے اپنا گھر چھوڑ آئی ہے۔

سورج کی روپہلی کرنیں دھرتی پر پڑ رہی تھیں تو دروازے پر کار رکنے کی آواز آئی۔ چندن کو دو چار بار ایسا محسوس ہوا تھا مگر اس بار واقعی دروازہ کھلا اور کار سے گرودیوکور اترتی دکھائی دی۔

"بہن جی!" ہاتھ پھیلا کر ہنستے چہرے سے دوڑتی ہوئی وہ اندر آ گئی۔ چندن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرودیوکور کا استقبال کیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرودیوکور کا استقبال کیا۔ دونوں عورتوں کو چوکھٹ پر روتا چھوڑ کر جگت برابر والے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے پردے میں اداسی جھلک رہی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بخود گردن کی جانب بڑھا' تعویذ سے ٹکرایا۔ اس کے دل میں درد اٹھا۔ آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے گئے۔ انگلی اور انگوٹھے کے درمیان تعویذ کا ڈورا پکڑا' ایک جھٹکا دیا اور ڈورا ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے دردناک آہ نکل گئی۔ تعویذ ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

"ویرو! تم دل میں ہمیشہ رہو گی' مگر پتہ نہیں میں کیوں تعویذ اپنی گردن سے الگ کر رہا ہوں۔" تعویذ ڈبیہ میں بند کر کے بھیگی پلکوں سے اس نے آنسو پونچھ لیے۔ اس کے دل کے ایوان میں گیت کی آواز گونجنے لگی۔

میرے گیتوں میں تم ہو' خیالوں میں تم
میرے دل میں بھی تم ہو' جوابوں میں تم
میری سانسوں میں تم' میری آہوں میں تم
چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہو نگاہوں میں تم

(ختم شد)

